﴿وَأَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ﴾ (القرآن)

گلدستۂ احادیث

(حصۂ پنجم)

سن طباعت (۱۴۳۹ھ)

جس میں حدیث پاک کے اصلاحی مضامین کو دلکش عناوین، مناسب آیات، برمحل احادیث، عبرت آموز واقعات اور اشعار کے ساتھ پرسوز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان شاء اللہ اس گلدستہ سے زندگی کے بے آب وگیاہ میدان میں علم وعمل اور رشد وہدایت کے خوشگوار اور سدابہار پھول کھل اُٹھیں گے۔

مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

مجازِ بیعت

عارف باللہ شیخ الزمان

حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی مدظلہ العالی

تفصیلات

نام کتاب : گلدستۂ احادیث (حصۂ پنجم)

مؤلفہ : مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

تصحیح وتنقیح : قاری ناظر حسین صاحب ہتھوڑوی فلاحی مدظلہ

استاذ: دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر، گجرات

نظر ثانی : مفتی محمد سالم شاہ بھائی بڑودوی

کمپیوٹر کتابت : رشید احمد آچھودی **(فون:09428689113)**

طبع اوّل : ۱۴۳۹ھ مطابق: ۲۰۱۸ء

تعدادِ صفحات : ۵۴۰

کتاب مندرجۂ ذیل جگہوں پر دستیاب ہے۔

(۱) مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی **(09825315073)**

(۲) Farid Book Depot Pvt Ltd
No.2158, M P Street, Darya Ganj, Delhi 110002
Phone: +911123289786, 23289159, 23280786
Mobile: 09910518950,

اجمالی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

تفصیلی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مؤلف

الحمد للّٰہ رب العالمین، و له الکبریاء فی السموات و الأرضین، و صلوات اللّٰہ و سلامه علی سید الأولین و الآخرین، محمد و علی آله و أصحابه أجمعین، و من تبعهم بإحسان إلی یوم الدین. ...... أما بعد.

ربِ کریم کا یہ فضلِ عظیم ہی ہے کہ اس نے ہر زمانے میں اپنے بندوں کو صراطِ مستقیم پر چلانے اور منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے خود اُن ہی میں سے اعلیٰ اخلاق وعمدہ صفات کے حامل افراد واشخاص کو منتخب ومتعین فرمایا، جنہیں ہم نبی اور رسول کہتے ہیں، حق تعالیٰ نے یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرما کر رحمت عالم ﷺ پر ختم فرمایا، ارشاد ہے:

﴿ما کان محمد أبا أحد من رجالکم و لکن رسول اللّٰہ و خاتم النبیین﴾ (الأحزاب: ۴۰)

آپ ﷺ کے بعد کسی بھی نبی کی ضرورت نہیں، عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بلاشبہ یوں تو تمام ہی انبیاء ورُسل اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کے لیے کامل اور مکمل نمونہ تھے؛ لیکن امام الانبیاء والمرسلین، سید الاولین والآخرین، رحمۃ للعالمین ﷺ کی ذات اور زندگی کو رب العالمین نے ہر زمانہ کے ہر انسان کے لیے کامل اور مکمل نمونہ بنایا، چنانچہ فرمایا:

﴿لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ أسوة حسنة﴾ (الأحزاب: ۲۱)

اور یہ اسی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے کہ آج صدیاں گزر جانے کے باوجود الحمد للہ کتبِ

حدیث وگلدستۂ احادیث میں آپ ﷺ کی ذات اور زندگی سے متعلق منسوب تمام ہی باتیں اور چیزیں نہ صرف یہ کہ محفوظ وموجود ہیں؛ بلکہ امت کے عاشقوں کے نزدیک محبوب بھی ہیں، بقولِ شاعر:

فدا ہوں آپ کی کس کس ادا پر — ادائیں ہیں لاکھوں اور بے تاب دل ایک

واضح ہو کہ حضور ﷺ کی طرف منسوب ہر ادا، ہر عمل اور ہر ارشاد کو ''حدیث'' کہا جاتا ہے، چنانچہ ''عینی'' شرحِ بخاری میں ''حدیث'' کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"ما أُضِيفَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ مِنْ قَوْلٍ أَوْ فِعْلٍ أَوْ تَقْرِيرٍ أَوْ صِفَةٍ."

مطلب ہے کہ ''حدیث'' کا اطلاق اُن تمام باتوں پر ہوتا ہے جو حضور ﷺ کی طرف منسوب ہوں، خواہ وہ آپ ﷺ کا قول ہو، یا فعل وعمل ہو، یا آپ ﷺ کی برقرار رکھی ہوئی بات ہو، یا پھر آپ ﷺ کی خصوصیات ہوں، یا ذاتی حالات ہوں۔

البتہ عملی اعتبار سے حدیث کی تین قسمیں ہیں: (۱) منسوخ (۲) مخصوص (۳) مسنون۔

فقیہ النفس، محدث العصر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہٗ نے (تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری: ۱/۵۴ تا ۱/۵۹ میں) اس پر مدلل کلام فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کی پہلی قسم ''منسوخ'' ہے، اس سے مراد وہ بعض احادیث واحکام ہیں جن کا تعلق اسلام کے دورِ اوّل سے تھا، بعد میں ختم ہوگیا، مثلاً ابتداءً نماز کے دوران ضروری بات چیت کی اِجازت تھی، مگر جب آیتِ کریمہ: ﴿وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (البقرة: ۲۳۸) نازل ہوئی، تو حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں کہ "نُهِينَا عَنِ الْكَلَامِ وَ أُمِرْنَا بِالسُّكُوتِ" (بخاری/باب قوله: "وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ" ۲/۶۵۰) ''اس کے بعد ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور نماز کے دوران بات چیت سے روکا گیا۔'' اب ظاہر ہے کہ حدیث کی کتابوں میں دونوں طرح کی روایتیں موجود ہیں، دورِ اوّل کی بھی روایات ہیں جن میں نماز کے دوران ضروری بات چیت کی اِجازت کا ذکر ہے، اور ممانعت کی بھی روایات ہیں، لیکن

اِجازت والی حدیثیں منسوخ ہیں، اس لیے اگر آج کوئی شخص نماز پڑھتے ہوئے بات کرے یا موبائل فون کی گھنٹی بجنے پر بٹن دبا کر کہے کہ "أنا في الصلوٰة" اور دلیل میں حدیث پیش کرے تو یہ غلط ہے، کیوں کہ وہ حدیث منسوخ ہے، اسی طرح کتبِ حدیث میں وہ روایتیں اور حدیثیں بھی موجود ہیں جن میں ابتداءً حضور ﷺ نے قبرستان جانے کی مطلقاً ممانعت فرمادی تھی، مگر بعد میں اس کی اجازت مرحمت فرمائی، فرمایا: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَزُوْرُوْهَا، فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَ تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ." (رواه ابن ماجه، مشكوٰة: ۱۵۴) ''میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے روکا تھا، اب میں اس کی اجازت دیتا ہوں، اس لیے کہ قبروں کی زیارت کرنا تمہیں دنیا سے بے رغبت کردے گا اور آخرت کی یاد دلائے گا۔'' دیکھئے! کتابوں میں زیارتِ قبور سے متعلق دونوں طرح کی روایتیں موجود ہیں، مگر ممانعت والی روایتیں منسوخ ہیں۔ اور حدیث کا منسوخ ہونا کبھی تو تقدیم وتاخیر سے معلوم ہوتا ہے، کبھی کسی قرینہ سے اور کبھی خود حضور ﷺ یا صحابہؓ کی صراحت ووضاحت سے معلوم ہوتا ہے۔

حدیث کی باعتبارِ عمل دوسری قسم ہے ''مخصوص''، اس سے مراد وہ روایتیں اور حدیثیں ہیں جو حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہیں، مثلاً حضور ﷺ کے نکاح میں بیک وقت نو بیویاں جمع ہوئیں، احادیثِ طیبہ سے یہ ثابت تو ہے؛ لیکن یہ حضور ﷺ کی خصوصیت ہے، ''سنت'' نہیں، ارشادِ باری ہے: ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الأحزاب: ۵۰) ''یہ حکم آپ کے لیے ہے، مومنین کے لیے نہیں۔'' ان کے لیے تو وہی ﴿مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ﴾ (النساء: ۳) والا حکم ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ جب نماز کے لیے تکبیر کہی گئی تو حضور ﷺ اپنی نواسی اُمامہ بنت زینبؓ کو گود میں لیے ہوئے گھر سے تشریف لائے، پھر اس بچی کو گود میں اُٹھائے ہوئے پوری نماز پڑھائی، جب رکوع وسجدہ کرتے تو بچی کو نیچے بٹھا دیتے تھے، اگلی رکعت میں پھر اس

کو گود میں لے لیتے تھے، یہ بھی صحیح بخاری کی حدیث سے ثابت ہے۔ (بخاری: ۱/ ۷٤/ باب إذا حمل جارية صغيرة على عنقه فی الصلوٰة) لیکن ظاہر ہے کہ کوئی عقلمند اسے ''سنت'' نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ حضور ﷺ نے یہ عمل زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ کیا اور وہ بھی مسئلہ کی وضاحت کے لیے تھا، کیوں کہ بعض اوقات ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ نماز کا وقت ہو گیا، بچہ چھوٹا ہے، نہ وہ ماں سے جدا ہونے کو تیار ہے، نہ کوئی اور اُسے سنبھالنے والا ہے، تو ایسی مجبوری کی حالت میں بھی ماں نماز قضا نہ کرے، بلکہ بچے کو گود میں اُٹھا کر بھی نماز ادا کر لے، (بشرطیکہ بچہ کا بدن اور کپڑا پاک ہو) حضور ﷺ کا یہ عمل جو حدیث سے ثابت ہے وہ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے تھا۔

بہر کیف کتب حدیث میں موجود بعض حدیثیں یا تو منسوخ ہیں یا مخصوص ہیں، اگر چہ اس قسم کی روایتیں اور حدیثیں بہت ہی کم ہیں اور ان میں امت کے لیے کوئی نہ کوئی نصیحت وہدایت بھی ہے، لیکن وہ حدیث قابل عمل ''سنت'' نہیں ہے۔

حدیث کی باعتبارِ عمل تیسری قسم ہے ''مسنون''، اس سے مراد ''منسوخ'' اور ''مخصوص'' روایات اور احادیث کے علاوہ جتنی بھی روایات اور احادیث ہیں وہ قابل عمل اور ''سنت'' ہیں۔

ان حقائق سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) جو بات حدیث میں موجود اور ثابت ہو ضروری نہیں کہ وہ قابل عمل اور سنت بھی ہو، ثبوت اور چیز ہے، سنت اور چیز ہے، جیسے حضور ﷺ کا ایک کپڑے میں نماز پڑھنا ثابت تو ہے؛ (بخاری: ۱/ ۵۲/ باب الصلوٰة فی الثوب الواحد ملتحفاً به) مگر سنت نہیں، اسی طرح حضور ﷺ کا جوتے پہن کر نماز پڑھنا ثابت تو ہے؛ (بخاری: ۱/ ۵٦/ باب الصلوٰة فی النعال) مگر سنت نہیں۔

(۲) اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ ہر حدیث سے سنت ثابت نہیں ہوتی،

لیکن ہر سنت حدیث سے ضرور ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ حدیث اور چیز ہے، سنت اور چیز ہے، ہر سنت حدیث تو ہے؛ لیکن ہر حدیث سنت نہیں ہے۔

(۳) شریعت اور صاحب شریعت ﷺ نے امت سے سنت پر عمل کرنے کا مطالبہ کیا ہے، حدیث پر عمل کرنے کا نہیں، غور کیا جائے تو ذخیرۂ احادیث میں ایک بھی حدیث ایسی نہیں جس میں حضور ﷺ نے حدیث کو مضبوط پکڑنے یعنی اس پر سختی اور پابندی سے عمل کرنے کا حکم دیا ہو، (البتہ احادیث طیبہ کی حفاظت اور ان کی نشر واشاعت کے فضائل ضرور وارد ہوئے ہیں؛ لیکن جہاں تک تعلق ہے عمل کا تو) ہر جگہ ''سنت'' ہی پر عمل کرنے کا حکم اور تاکید ہے، مثلاً ارشاد ہے:

''تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ، لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا، كِتَابُ اللّٰهِ وَ سُنَّةُ رَسُوْلِهِ.'' (مؤطا، مشکوٰۃ: ۳۱)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے کہ ''عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ'' (أبو داود، مسند أحمد، مشکوٰۃ: ۳۰)

اس لیے صراطِ مستقیم پر چلنے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے عمل بالحدیث کے بجائے عمل بالسنۃ کی ضرورت ہے۔ بقولِ عاشق:

نقش قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے　　اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

علاوہ ازیں حضور ﷺ سے محبت کی پکی علامت بھی عمل بالسنۃ ہے، نہ کہ عمل بالحدیث، چنانچہ ارشاد ہے:

''مَنْ أَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ أَحَبَّنِيْ، وَ مَنْ أَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ.''

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۳۰)

لہٰذا دانائی یہی ہے کہ تمام امور میں حدیث کے بجائے سنت کو تلاش کیا جائے اور اسی پر عمل بھی کیا جائے، پھر اگر زندگی کو سراپا بندگی اور سنت نبوی کے مطابق ڈھالنے کے ساتھ کسی خوش نصیب کو خدمت حدیث سے کسی بھی طرح کی مناسبت حاصل ہو جائے تو اس

کے مقدّر اور مرتبہ کا کیا پوچھنا، سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے خدمت حدیث نبوی میں مشغول رہنے والے علماءِ محدثین حضراتِ صحابہؓ کے بعد امت کا سب سے مبارک، مقدس، مقبول اور قیمتی طبقہ ہے۔ اللّٰھم اجعلنا منھم.

یہ عاجز بندہ اپنے گناہوں پر نادم وشرمندہ بلاشبہ امت کے اس مبارک، مقدس اور مقبول طبقہ میں اپنے کوتاہ علم وعمل کے ذریعہ تو شامل ہو ہی نہیں سکتا؛ لیکن ربِ کریم کے فضل عظیم سے اُمید رکھتے ہوئے اپنے کوتاہ علم وعمل کے باوجود اس مقدس اور مقبول گروہ میں شامل ہونے کی کوشش اور دعا تو ضرور کرسکتا ہے۔

’’گلدستۂ احادیث‘‘ (جس کی پانچویں جلد بحمد اللہ اس وقت پیش نظر ہے) اسی سلسلۃ الذہب میں شامل ہونے کی ایک عاجزانہ کوشش ہے۔

اسی کے ساتھ آج بارگاہِ الٰہی میں یہ اقراری مجرم احساسِ ندامت کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ ’’ربِ کعبہ! دربار میں حاضر ہے ایک بندۂ آوارہ، جس کا حال بقولِ شیخ الاسلام مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہٗ یہ ہے:

سرگشتہ و درماندہ، بے ہمت و ناکارہ
وارفتہ و سرگرداں، بے مایہ و بے چارہ
شیطان کا ستم خوردہ، اس نفس کا دکھیارہ
ہر سمت ہے غفلت کا چھایا ہوا اندھیارہ
آج اپنی خطاؤں کا لادے ہوئے پشتارہ
دربار میں حاضر ہے اِک بندۂ آوارہ
آیا ہوں تیرے در پر خاموش نوا لے کر
نیکی سے تہی دامن، انبارِ خطا لے کر
لیکن تیری چوکھٹ سے اُمید سخا لے کر

اعمال کی ظلمت میں توبہ کی ضیا لے کر
سینے میں تلاطم ہے، دل شرم سے صد پارہ
دربار میں حاضر ہے اِک بندۂ آوارہ
یا رب ! میری ہستی پر کچھ خاص کرم فرما
بخشے ہوئے بندوں میں مجھ کو بھی رقم فرما
بھٹکے ہوئے راہی کا رُخ سوئے حرم فرما
دنیا کو اطاعت سے گلزارِ اِرَم فرما
کر دے میرے ماضی کے ہر سانس کا کفارہ
دربار میں حاضر ہے اِک بندۂ آوارہ

ربِ کریم! تیرے درِ کعبہ کی یہ حاضری بالیقین تیرے فضل وکرم کا نتیجہ ہے، تجھ سے تیرے اسی فضل وکرم اور نبیٔ کریم ﷺ کی قربانیوں کا واسطہ دے کر دست بستہ التجا ہے کہ ہمیں ہمارے والدین، اہل وعیال، اعزہ واقرباء، محسنین ومرحومین کو اور قیامت تک ہماری نسلوں کو اپنی بارگاہ میں قبولیت عطا فرما کر دارین میں اپنی کامل رضا عطا فرمادے، آمین یا رب العالمین، و آخر دعوانا أن الحمدللّٰہ رب العالمین.

العبد العاصی الراجی الی عفو الباری
ابوخلیق محمد شفیق بن مولانا محمد صدیق شاہ بھائی بڑودوی
نزیل الحرم المکی
۲۴/ ذوالحجہ/ ۱۴۳۸ھ/ قبل الجمعہ
مطابق: ۱۵/ ستمبر/ ۲۰۱۷ء

مقدمہ

محقق العصر حضرت اقدس مولانا عتیق احمد صاحب قاسمی بستوی مدظلہ العالی

(استاذِ فقہ و تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

کتاب وسنت اسلام کی دو بنیادیں ہیں، کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑنے اور اُن پر عمل پیرا ہونے سے انسان صراطِ مستقیم پر گامزن رہتا ہے اور جنت کا حصول اس کے لیے آسان ہوجاتا ہے، رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’میں تمہارے لیے دو چیزیں چھوڑ جا رہا ہوں، اگر تم اُن دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہوگے تو تم گمراہ نہیں ہوگے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری سنت۔

اسلام کی صحیح اور سچی پیروی کے لیے امت مسلمہ کے خواص وعوام سب کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے جڑنا ضروری ہے، امت کا رشتہ کتاب وسنت سے جتنا مضبوط واستوار ہوگا اسی قدر صلاح وفلاح ان کے قدم چومے گی اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں برسیں گی۔ امت مسلمہ کتاب وسنت سے جس قدر دور ہوگی گمراہی کے دلدلوں میں پھنستی چلی جائے گی، اس لیے امت کے خواص وعوام، علماء وغیر علماء سب کا کتاب وسنت سے گہرا رشتہ اور وابستگی ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان گمراہیوں اور ہلاکتوں میں پڑتے جارہے ہیں، اس کے باوجود انہیں کتاب وسنت کی طرف رجوع اور اُن سے استفادہ کی توفیق نہیں ہورہی ہے۔

عوام کی بڑی اکثریت کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ قرآن وسنت کا سمجھنا تو صرف علماء کا کام ہے، ہم اُنہیں سمجھ ہی نہیں سکتے، ہمارا رشتہ قرآن سے صرف تلاوت کا ہوسکتا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں، اس طرح کے غلط خیالات کی وجہ سے لوگ کتاب وسنت کے فیوض وانوار سے محروم ہوتے جارہے ہیں اور اُن کی زندگیاں راہِ مستقیم سے دور ہوتی جارہی

ہیں، بلا شبہ کتاب وسنت سے مسائل واحکام کا استنباط تو دقیقہ رَس، خداترس علماء ہی کریں گے، یہ کام عام مسلمانوں کے بس کا نہیں ہے، لیکن قرآنِ پاک کا بڑا حصہ احکامِ فقہیہ کے علاوہ ایمانیات، اخلاقیات، حسنِ معاشرت اور تزکیۂ نفس وغیرہ سے بھی متعلق ہے، قرآن کی جن آیات میں ایمان اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے، ان کا اگر ترجمہ ہی پڑھ لیا جائے تو انسان کا ایمان درست، مضبوط اور تازہ ہوجاتا ہے، توحید، رسالت، عقیدۂ آخرت اور جنت و جہنم کے بارے میں بڑے واضح تصورات دل و دماغ میں بس جاتے ہیں اور ایمان اتنا مضبوط ہوجاتا ہے کہ سخت سے سخت ایمان سوز ماحول میں بھی انسان ایمان کے تقاضوں پر جما رہتا ہے اور ہر طرح کی قربانی دین وایمان کے لیے دینے کو تیار رہتا ہے، یہی حال ان بے شمار احادیث نبویہ کا ہے جو ایمانیات سے متعلق ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایمان کی حقیقت، اجزاء اور ایمان کے متعلقات پر ایسی بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے جو کتاب اللہ کے سوا کہیں نہیں مل سکتی۔ اسی طرح دین کے دوسرے شعبے مثلاً عبادات، اخلاقیات، معاشرتی حقوق، ازدواجی تعلقات، تزکیہ واحسان سے متعلق آیات واحادیث کے ترجمہ کو پڑھ کر ایک مسلمان پختہ اور کامل مسلمان بن سکتا ہے۔

اس لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ امت مسلمہ کے خواص وعوام کو کتاب وسنت سے جوڑنے کی زبردست کوششیں کی جائیں، صرف علماء ہی کتاب وسنت کے معانی سے استفادہ نہ کریں؛ بلکہ عامۃ المسلمین کے لیے بھی استفادہ کی راہیں کھولیں۔ ہمارے بزرگوں نے اسی مقصد سے مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے ترجمے کیے اور تفسیریں لکھیں، خاص طور سے اُردو زبان میں قرآن کے تراجم اور تفاسیر کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے، دوسری مقامی زبانوں میں بھی یہ کام ہورہے ہیں، لیکن ان کی رفتار میں تیزی لانا اور انہیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے، مساجد میں اور دیگر مقامات پر درسِ قرآن اور درسِ حدیث کے حلقے قائم کیے جائیں، فہمِ قرآن کے ذوق کو عام کیا جائے اور اس کی کوشش کی جائے کہ غیر عربی داں دانشور بھی قرآنِ کریم اور احادیث نبویہ کو معانی و

مطالب کے ساتھ پڑھیں۔

ہمارے بزرگوں نے اُردو زبان میں احادیث نبویہ کے تراجم وتشریحات کا سلسلہ بھی جاری کیا اور لوگوں کو احادیث رسول ﷺ سے استفادہ کی ترغیب دی اور اس مقصد کے لیے کتابیں لکھیں۔ اب تو حدیث کی اکثر معتبر کتابوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں، اور منتخب احادیث نبویہ کے ترجمہ وتشریح پر مشتمل کئی کتابیں معروف ہو چکی ہیں، اس سلسلہ میں سب سے اہم کتاب حضرت مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ کی ''ترجمان السنۃ'' ہے، جو چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اگر چہ مصنفؒ کے منصوبہ کے مطابق ان کا وہ کام مکمل نہیں ہو سکا تھا، لیکن ان کی چاروں جلدیں اُردو زبان میں حدیث کے موضوع پر بڑا قیمتی ذخیرہ ہے، یہ کتاب عوام سے زیادہ علماء کے لیے چشم کشا اور بصیرت افروز ہے، متوسط تعلیم یافتہ اُردو داں طبقہ بھی اس کتاب سے خاصۂ استفادہ کرسکتا ہے۔

دوسری اہم ترین کتاب حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''معارف الحدیث'' ہے، جو آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، مولانا موصوفؒ نے پورے ذخیرۂ احادیث کو کھنگال کر موضوعات کے اعتبار سے احادیث نبویہ کا بہترین انتخاب تیار فرمایا ہے، ترجمہ انتہائی آسان اور تشریح متوازن اور دل نشین ہے، یہ کتاب علماء کے علاوہ عامۃ الناس کے لیے بھی بہت مفید ہے اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق ہے۔

ماضی قریب میں اسی طرح کی دو کوششیں اور کاوشیں علماءِ گجرات کی طرف سے منصۂ شہود پر آئی ہیں، ایک حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کی کتاب اور دوسری کتاب عزیز مکرم جناب مولانا مفتی محمد شفیق صاحب بڑودوی زید مجدہم کی کتاب ''گلدستۂ احادیث'' جس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں، ان جلدوں پر اکابر اہل علم کی تقریظات اور تائیدات ثبت ہیں، اس وقت ''گلدستۂ احادیث'' میرے پیش نظر ہے، مولانا موصوفؒ نے بڑی سلیقہ مندی اور مہارت سے مختلف ابواب اور شعبہائے زندگی سے متعلق

15

احادیث نبویہ کا انتخاب تیار کر کے آسان زبان میں ان کا ترجمہ کیا ہے اور ضروری تشریحات کی ہیں، زبان و بیان انتہائی آسان اور عام فہم ہے، تشریح میں نہ حد درجہ اختصار ہے، نہ ضرورت سے زائد تطویل، اس طرح ''گلدستۂ احادیث'' عوام وخواص دونوں کے لیے بہترین گلدستہ بن گیا ہے، جس سے انوارِ نبوت کی بھینی خوشبو مطالعہ کرنے والوں کے دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے اور اسلامی تعلیمات کا ہر باب نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

مصنف کی خواہش تھی کہ میں بھی اس چمنستان کی سیر کر کے اپنے تأثرات لکھوں، واقعہ یہ ہے کہ اس کی سرے سے ضرورت نہیں تھی، بڑے بڑے اکابر اہل علم کی تقریظات اور قیمتی تأثرات کے بعد میری تحریر ان میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کی طرح ہے، لیکن مصنف کے جذبۂ حسن عقیدت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ سطریں لکھی جارہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ''گلدستۂ احادیث'' کو دنیا وآخرت میں قبولیت سے نوازیں اور مسلمان اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں، میں اُمید کرتا ہوں کہ ''گلدستۂ احادیث'' کی اگلی جلدیں بھی مکمل ہوں گی اور دیگر زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ کیا جائے گا۔

عتیق احمد قاسمی بستوی

استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

وارد حال: مدراس

تاریخ: ۱۰/۲/۲۰۱۷ء

تقریظ

فقیہ العصر حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری مدت فیوضہم

(خلیفۂ اجل حضرت مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی قدس سرہٗ وشیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبّ مکرم مولانا مفتی محمد شفیق صاحب بڑودوی زید مجدہم نے اپنے وطن بڑودہ شہر کی ایک مسجد (محمدی مسجد مہابلی پورم، تاندلجہ) میں ہر چہارشنبہ کو بعد نمازِ فجر درسِ حدیث کا سلسلہ شروع کیا، جس سے اللہ تعالیٰ نے شرکاءِ مجلس اور حاضرین کو بہت فائدہ پہنچایا، اسی اِفادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے ان احادیث مبارکہ کو واعظانہ انداز میں از سرِ نو ترتیب دے کر اِفادۂ عام کی غرض سے شائع کرنا شروع کیا، اس وقت میرے سامنے اس کی مطبوعہ چار جلدیں موجود ہیں، اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے ان کو پڑھ نہیں پایا، دو تین جگہوں سے سرسری دیکھا، ماشاء اللہ ترتیب اور انداز مؤثر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو حسن قبول عطا فرما کر قارئین کو اس کتاب سے بیش از بیش فائدہ پہنچائے، دل سے دعا کرتا ہوں۔ فقط والسلام۔

أملاہ

احمد خانپوری

۲۵/ جمادیٰ الاولیٰ/ ۱۴۳۸ھ

مطابق: ۲۳/ فروری/ ۲۰۱۷ء

تقریظ

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم

(مہتمم: دارالعلوم دیوبند، ہند)

جناب مولانا مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی کی گراں قدر تصنیف ''گلدستۂ احادیث'' ہر چہار حصہ اس وقت میرے پیش نظر ہے، مفتی صاحب نے دارالعلوم رحیمیہ باندی پورہ کشمیر میں سال گذشتہ جمعیت علماءِ ہند کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ''المباحث الفقہیہ'' کے اجتماع کے موقع پر یہ کتاب مرحمت فرمائی تھی؛ لیکن اپنے مشاغل کی بنا پر کتاب کی طرف توجہ کرنے کی نوبت نہ آسکی، مفتی صاحب کی توجہ دہانی پر کتاب دیکھی تو جی خوش ہوگیا، واقعی یہ کتاب حضرت نبیٔ اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ کا ایک حسین گلدستہ ہے، جس میں گلستانِ نبوت کے رنگ برنگ کے خوشبودار اور سدا بہار پھولوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا ہے، جس میں ایمانیات، احکام، معاشرت، اخلاقیات اور زندگی کے ہر شعبہ میں نبوی ہدایات سے منتخب احادیث اور آیات کو جمع کیا گیا ہے۔

بنیادی طور پر ہر جلد ایک مفصل چہل حدیث ہے، ہر عنوان کے تحت ایک حدیث کو بنیاد بنا کر اس کی تشریح و توضیح میں حسبِ ضرورت آیاتِ قرآنیہ، احادیث طیبہ، اکابر کے ارشادات اور واقعات کو ذکر کیا گیا ہے، اس طرح گلدستۂ احادیث کی چار جلدیں چہل حدیث کے چار مفصل مجموعے بن گئے ہیں اور اپنے مشمولات کے اعتبار سے بہت مفید اور نافع ہیں، یہ معلوم کر کے مزید مسرت ہوئی کہ کتاب کی پانچویں جلد بھی تیار ہے اور طباعت کے مرحلہ میں ہے۔ ملک کے متعدد اکابر علماءِ کرام اور مشائخ عظام نے گلدستۂ احادیث کے بارے میں اپنے وقیع تاثرات تحریر فرمائے ہیں، ان کی موجودگی میں اس ناکارہ کی تحریر کی کوئی حیثیت نہیں تھی؛ مگر مفتی صاحب کے حکم پر یہ سطریں حاضر ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو مزید دراز کرنے کی توفیق بخشے اور ملت کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند

۲۰/ ۱۱/ ۱۴۳۷ھ

تقریظ

از: قائدملت حضرت مولانا سید محمود اسعد مدنی دامت برکاتہم

(ناظم عمومی: جمعیت علماءِ ہند)

جناب نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ قیامت تک ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور ہر دور میں نسل انسانی اس سے رہنمائی حاصل کرتی ہے، آج بھی نسل انسانی خاص طور سے امت مسلمہ کے لیے یہی رہنمائی فلاح ونجات کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، شخصی، خاندانی، معاشرتی اور بین الاقوامی چاروں حوالوں سے اخلاقی وہدایتی تعلیمات کا جس قدر وسیع اور متنوع ذخیرہ اور اسوہ ونمونہ جناب نبی کریم ﷺ کی سنت وسیرت میں ملتا ہے دنیا کے کسی اور مذہب یا شخصیت کے پاس اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے، لیکن ہمارا حال تو یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ محبت وعقیدت کے ساتھ تو کرتے ہیں اور ان کے مبارک تذکروں سے ثواب وبرکات بھی حاصل کرتے ہیں؛ لیکن اپنے احوال وظروف پر ارشاداتِ نبوی کا انطباق اور سنت رسول کی روشنی میں اپنی اصلاح کے کسی اجتماعی احساس سے دور ہیں۔

اس لیے اخلاقی ومعاشرتی تعلیمات کو معروضی حالات وضروریات کے تناظر میں جدید اسلوب وانداز میں امت کے ہر فرد تک پہنچانے اور سمجھانے کی بڑی ضرورت ہے، خاص طور سے معاشرتی خرابیوں اور ان کے نتائج وعواقب کے تجزیہ سے متعلق احادیث نبویہ کو زیادہ نمایاں طور پر سامنے لایا جائے۔ نیز آج کے عالمی گاؤں کے دور میں جب کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان حدود اور فاصلوں کا برقرار رکھنا مشکل ہے، دورِ نبوی کے واقعات، روایات وارشادات کی روشنی میں اس سلسلے میں رہنمائی ملتی ہے کہ کہاں تک دوسروں کے

ساتھ ایڈجسٹ منٹ (Adjustment) اور کہاں صاف انکار کی گنجائش ہے؟ اور کہاں کوئی درمیانی راستہ نکالا جاسکتا ہے؟ اسی طرح تیزی سے بڑھتے ہوئے عالمی منظر نامہ میں بہت سے پہلوؤں پر سنن واحادیث نبویہ سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

جناب مولانا مفتی محمد شفیق صاحب بڑودوی ایک ذی علم وذی استعداد عالم دین ہیں، جمعیت علماءِ ہند اور دیگر اداروں کی جانب سے مختلف پروگراموں میں ان کی بصیرت پر مبنی تقاریر اور گفتگو سننے کا موقع ملا ہے، ان کی تقریر گیرائی وگہرائی کے ساتھ مؤثر ہوتی ہے، مولانا موصوف نے ''گلدستۂ احادیث'' کے نام سے زیر نظر چار جلدوں پر مشتمل عمدہ کتاب تصنیف کی ہے، موصوف نے عنوانات پر سیرتِ نبی ﷺ کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے وہ عنوان بھی اہم ہے، اور جس ذاتِ بابرکات ﷺ کی باتیں اور اعمالِ طیبہ کو پیش کیا گیا ہے ان کی حقانیت اور بہتری پر تو خود اللہ رب العزت کی شہادت ہے۔

گلدستہ میں مولانا موصوف نے عصرِ حاضر کے بہت ہی اہم وضروری مسائل کا احاطہ کیا ہے، جن میں خاص طور سے عظمتِ قرآن، حسن اخلاق، امت مسلمہ کے مابین اتحاد واتفاق، اسلام میں خواتین کے حقوق، خودکشی کی حرمت ومذمت ودیگر سماجی واخلاقی مسائل کو سامنے لایا گیا ہے، اُمید ہے کہ یہ کتاب طالبانِ علم نبوت کے لیے چراغِ راہ اور بھولے بھٹکوں کے لیے شبِ تاریک میں قندیل ثابت ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اِن کاوشوں کو قبول فرمائے اور امت کے لیے صلاح وفلاح کا سبب بنائے۔ آمین۔

(حضرت مولانا) سید محمود اسعد مدنی
ناظم عمومی: جمعیت علماءِ ہند
۱۵/ ربیع الاول/ ۱۴۳۸ھ/ بروز: جمعرات
مطابق: ۱۵/ دسمبر/ ۲۰۱۶ء

تقریظ

از

حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ صاحب دامت برکاتہم

(مہتمم دارالعلوم لندن، وخلیفہ حضرت اقدس مولانا محمد قمرالزمان صاحب الٰہ آبادی مدظلہٗ)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

علومِ دینیہ میں احادیث پاک ظاہراً اگرچہ کلامِ رسول ﷺ ہیں، مگر معانی کے اعتبار سے وہ ملہم من اللہ ہیں، اور جس طرح نبیٔ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس اقوامِ عالم کے لیے منارۂ نور اور آپ ﷺ کا وجودِ باجود جمیع کائنات کے لیے رحمت ہے، اسی طرح آپ ﷺ کے اقوال وافعال، آپ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا اُسوۂ مقدسہ امت کے لیے مشعل ومخزنِ ہدایت ہے، نجات صرف اور صرف منحصر ہے آپ ﷺ کے ارشاداتِ گرامی پر عمل اور آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں، یہی امت کے لیے دارین میں فوز وفلاح کی ضمانت اور یہی کلید جنت ہے۔

حدیث پاک ایسا فن ہے جس کی نسبت افضل الخلائق، اکمل البشر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے، جب تک اس کرۂ ارض پر انسان نامی ایک مخلوق ہے اور اس میں زندگی کا اثر اور شعور واحساس کا نشو ونما ہے اس وقت تک یہ موتی اسی تابندگی وشادابی کے ساتھ چمکتا رہے گا۔

پیش نظر کتاب **''گلدستۂ احادیث''** میں مصنف محترم نے ان ہی مبارک موتیوں کو لڑی میں پرونے کی ایک کامیاب کوشش فرمائی ہے، جستہ جستہ ان چاروں حصوں کو دیکھا، الحمد للہ! بے حد محظوظ ہوا، مؤلف مکرّم نے اِن مجموعوں میں عام انسانوں کی روز مرّہ پیش آنے

والی زندگی کے متعلق احادیث کو منتخب فرمایا، تشریح میں دل کش عنوانات مقرر فرمائے، دیکھا کہ ان عناوین کو موضوع کے ساتھ کما حقہ ربط ومناسبت ہے، مباحث ومضامین کا تنوع اور توسّع جس کے ضمن میں علوم ومعارف کافی مقدار میں مندرج ہیں، جو بے حد قیمتی اور نادر ہیں، جن سے کتاب کی افادیت چہار گنی ہوگئی، مضامین کی رفعت وبلندی اور ان بلند مضامین کو عام فہم بنانے کی بھرپور سعی فرمائی گئی ہے، استدلال میں دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی روایت کے ساتھ درایت اور نقل کے ساتھ عقل، قارئین کی دل چسپی برقرار رکھنے کے لیے عبرت آموز مستند واقعات اور مقبول شعراء سعدیؒ ورومیؒ کے موزوں اشعار جابجا پیش فرمائے گئے ہیں، آج جب کہ دین اور علم دین سے برگشتگی کے دواعی اپنی قہر فگن قوتوں کے ساتھ عالم اسلام اور امت مسلمہ پر مسلط ہیں ایسے وقت میں مؤلف ومصنف کا احادیث پاک کے ذخیرہ سے آج کی بگڑی ہوئی صورتِ حال کی عکاس حدیثوں کا انتخاب اور ان کے ذریعہ اصلاح کی طرف دعوت یقیناً ایک نیک قدم ہے۔

محبی المحترم فاضل گرامی قدر جناب مولانا مفتی شفیق صاحب پر ربِ ذوالمنن کا خصوصی فضل رہا ہے کہ بیک وقت آپ درس وتدریس کے ساتھ وعظ وتقریر اور تصنیف وتالیف میں مضبوط قدم جمانے کی کوشش فرما رہے ہیں، اور ان شاءاللہ وہ دِن دور نہیں کہ منعمِ حقیقی کی طرف سے ایک وافر حصہ آپ کو عطا ہو، شمع علم پر پگھلنے کے لیے جو صفتِ پروانگی آپ کو ودیعت کی گئی ہے واقعۃً وہ قابل رشک ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی افادیت عام فرمائے، مؤلف کو خوب بلند ہمتی عطا فرمائے کہ اس سلسلۂ مبارکہ کو جاری رکھیں اور اس علمی جدوجہد کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرما کر ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ وَ مَا ذٰلكَ علی اللّٰه بعزیز.

محمد مصطفیٰ

خادم: دارالعلوم لندن

(۱)

اللہ تعالیٰ کی نصرت کب اور کیسے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ لِيْ قَرَابَةً أَصِلُهُمْ، وَ يَقْطَعُوْنِيْ، وَ أُحْسِنُ إِلَيْهِمْ وَ يُسِيْئُوْنَ إِلَيَّ، وَ أَحْلُمُ عَنْهُمْ، وَ يَجْهَلُوْنَ عَلَيَّ، فَقَالَ: "لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ فَكَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ، وَ لَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِيْرٌ عَلَيْهِمْ مَا دُمْتَ عَلٰى ذٰلِكَ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ۴۱۹، باب البر والصلة)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے بارگاہِ نبوی میں عرض کیا کہ حضور! میرے کچھ قرابت دار ایسے ہیں کہ میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ درگذر کا معاملہ کرتا ہوں اور وہ جہالت کا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر بات اسی طرح ہے جیسا کہ تم نے کہی تو تم ان کو خاک پھکاتے ہو، (ان کے چہرے گرم راکھ کی طرح ہو جائیں گے) اور اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے ساتھ برابر رہے گی جب تک تم اس خوش اخلاقی والی خصلت پر برقرار رہو گے۔“

رحمت عالم ﷺ کے حضور ایک دردبھرا نذرانۂ عقیدت اور التجاءِ شفاعت

نبیٔ اکرم، شفیعِ اعظم! دُکھے دِلوں کا پیام لے لو
تمام دُنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں، سلام لے لو

شکستہ کشتی ہے، تیز دھارا، نظر سے روپوش ہے کنارا
نہیں کوئی ناخدا ہمارا، خبر تو عالی مقام لے لو

قدم قدم پہ ہے خوفِ رہزن، زمیں بھی دشمن، فلک بھی دشمن
زمانہ ہم سے ہوا ہے بدظن، تم ہی محبت سے کام لے لو

کبھی تقاضا وفا کا ہم سے، کبھی مذاقِ جفا ہے ہم سے
تمام دُنیا خفا ہے ہم سے، خبر تو عالی مقام لے لو

یہ کیسی منزل پہ آگئے ہیں؟ نہ کوئی اپنا، نہ ہم کسی کے
تم اپنے دامن میں آج آقا! تمام اپنے غلام لے لو

یہ دِل میں ارماں ہے اپنے طیبؔ، مزارِ اقدس پہ جاکے اِک دِن
سناؤں ان کو میں حال دل کا، کہوں میں ان سے سلام لے لو

اللہ تعالیٰ کی نصرت سب سے بڑی طاقت اور ہماری ضرورت ہے:

اللہ رب العزت کی نصرت و مدد سب سے بڑی طاقت اور موجودہ حالات میں امت مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت ہے، کیوں کہ اس وقت امت مسلمہ تاریخ کے تاریک

اور نازک ترین موڑ پر آ کھڑی ہے، حدیث پاک کی پیشین گوئی کے مطابق عالمی طاقتیں ساری دنیا میں ملت اسلامیہ اور اُمت مسلمہ کے خلاف متحد ہو چکی ہیں، ہر جگہ اسلام اور مسلمانوں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، ان کی حیثیت بتیس دانتوں کے بیچ زبان کی سی ہو گئی ہے، ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد اگر ہمارے ساتھ شامل ہو جائے تو پھر ساری دنیا کی عالمی طاقتیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، ہم پر کوئی طاقت اور حکومت غالب نہیں آ سکتی، اس حقیقت کا اعلان قرآن نے اس طرح فرمایا:

﴿ إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ (آل عمران : ۱۶۰)

’’اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں۔‘‘ پھر تم کمزور ہونے کے باوجود قوی، مغلوب ہونے کے باوجود غالب اور کچھ نہ ہونے کے باوجود بہت کچھ ہوں گے، کوئی تمہیں مٹا نہ سکے گا، جیسے نمرود اپنی پوری قوت اور حکومت کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مٹا نہ سکا اور فرعون اپنی پوری طاقت وحکومت کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مٹا نہ سکا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت ان کے ساتھ تھی۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سب سے بڑی طاقت اور موجودہ حالات میں ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت اہل ایمان کے ساتھ ہے:

پھر جہاں تک امت مسلمہ میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں بلکہ امت مسلمہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال ہونے کی بات ہے تو وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا وعدہ و اعلان قرآن نے ایک سے زائد مقامات پر کیا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

﴿ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾ (الروم:۴۷)

’’اہل ایمان کی نصرت و مدد ہماری ذمہ داری ہے۔‘‘

ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ وَ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَآئِكُمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا۝﴾ (النساء:۴۵)

’’اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور رکھوالا بننے کے لیے بھی اللہ کافی ہے اور مددگار بننے کے لیے بھی اللہ کافی ہے۔‘‘

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَ إِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝﴾ (الصٰفٰت : ۱۷۱ تا ۱۷۳)

’’اور ہم پہلے ہی اپنے پیغمبروں کے بارے میں یہ بات طے کر چکے ہیں کہ یقینی طور پر ان کی مدد کی جائے گی اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری فوج ہی غالب ہو کر رہے گی۔‘‘

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْأَشْهَادُ۝﴾ (المؤمن :۵۱)

’’یقین رکھو کہ ہم اپنے پیغمبروں اور ایمان والوں کی دنیوی زندگی میں بھی نصرت و مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی کریں گے جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔‘‘

حق تعالیٰ نے اہل ایمان کے ساتھ اپنی نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے عملی اور واقعاتی دنیا میں اس کو کئی مواقع پر سچ کر دکھایا، مثلاً جنگ بدر کے موقع پر لوگوں نے کھلے عام نصرتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا، جس کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ میں کیا:

﴿ وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ أَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ (آل عمران : ۱۲۳)

’’رب العالمین نے جنگِ بدر کے موقع پر تمہاری اس حالت میں مدد فرمائی جب تم بالکل بے سروسامان تھے۔‘‘ قلیل اور کمزور تھے، صورتِ حال یہ تھی کہ مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی، ان کے پاس ستر اونٹ، دو گھوڑے اور صرف آٹھ تلواریں تھیں۔ (آسان ترجمۂ قرآن:۲۱۸) مگر اللہ کی نصرت کی وجہ سے وہ غالب آ گئے۔

اسی طرح غزوۂ احزاب میں نصرتِ الٰہی تیز ہواؤں اور اَن دیکھے لشکر کی شکل میں آئی، جس سے سارے دشمن خوف زدہ ہوکر بھاگ گئے، سورۂ احزاب میں اس غیبی نصرتِ الٰہی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَآءَتۡكُمۡ جُنُوۡدٌ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا وَّ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا ﴾ (الأحزاب : ۹)

’’اے ایمان والو! یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کیسا انعام کیا جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے تھے، پھر ہم نے ان پر ایک آندھی بھی بھیجی اور ایسے لشکر بھی جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے۔‘‘

غزوۂ اُحد کے موقع پر جب مسلمانوں کی (اجتہادی) غلطی کے نتیجے میں کامیابی ناکامی سے بدل گئی، ستر صحابہؓ شہید ہوئے، خود حضور پاک ﷺ کا چہرۂ انور لہولہان ہوا، دو دانت مبارک شہید ہوئے، وہ حالات بظاہر مایوس کن تھے، تو اس موقع پر تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ لَا تَهِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۝ ﴾ (آل عمران : ۱۳۹)

’’(مسلمانو!) تم نہ تو کمزور پڑو اور نہ غمگین ہو، اگر واقعی تم مومن ہو تو تم ہی سر بلند رہو گے۔‘‘

جسے تو غم سمجھتا ہے خزانہ ہے مسرّت کا — جسے تو چشم تر سمجھتا ہے سر چشمہ ہے رحمت کا

معلوم ہوا کہ مایوس کن حالات میں بھی مسلمانوں کو پست ہمت ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہمت اور ایمانی عزم وعمل کی ضرورت ہے، کیوں کہ قرآن اور تاریخ اسلام کی شہادت کے مطابق اہل ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت ضرور آئے گی۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

ساتویں صدی میں جب اسلامی مملکت کے بادشاہ علاء الدین محمد خوارزم اور چنگیز

خان کے درمیان تجارتی تعلقات کے بعد ایک غلط مخبری کی وجہ سے بادشاہِ وقت چنگیز خان کے تجارتی قافلوں اور اس کے قاصد کو علاء الدین محمد خوارزم کے حکم سے قتل کر دیا گیا تو اس پر تاتاری بادشاہ چنگیز خان نے برافروختہ ہوکر عالم اسلام پر حملہ کر دیا، جس سے اسلامی سلطنت میں ہل چل مچ گئی، مسلمان حواس باختہ ہوگئے، ہر طرف خوف وہراس اور اضطراب وانتشار کا عالم تھا، تاتاری جہاں جاتے وہاں کی حکومت کا تختہ پلٹ دیتے، وہ بلند مقاصد وعزائم کے ساتھ آگے بڑھتے گئے اور کامیاب ہوتے گئے، رفتہ رفتہ سمرقند، بخارا اور پھر بغداد پر بھی انہوں نے مکمل قبضہ کر لیا۔

کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بڑا نصیحت آموز ہے کہ جس وقت تاتاریوں کو فتح اور غلبہ نصیب ہوا تو ایک مرتبہ ہلاکو خان کی بیٹی بغداد میں گشت کر رہی تھی، اس دوران اس نے مسلمانوں کے کسی عالم کے قریب لوگوں کی بھیڑ دیکھی، قریب جا کر اس شہزادی نے عالم دین سے کہا کہ کیا تم اللہ رب العزت کے فیصلوں پر ایمان اور یقین نہیں رکھتے؟ انہوں نے فرمایا: کیوں نہیں، شہزادی کہنے لگی: کیا تمہارا ایمان ویقین ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے غالب کرتا ہے؟ فرمایا: بالکل، وہ کہنے لگی: پھر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غالب کر دیا اور تمہیں مغلوب؟ فرمایا: جی، ایسا ہی ہے، کہنے لگی: کیا یہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں چاہتا ہے؟ فرمایا: بالکل نہیں، کہنے لگی: وہ کیسے؟ فرمایا: کیا تم نے چرواہے کو نہیں دیکھا کہ وہ اپنے ریوڑ کے پیچھے کتے چھوڑتا ہے، تا کہ اگر بکریاں چرواہے اور اپنے ریوڑ سے دور نکل جائیں اور چرواہے کے بلانے سے بھی نہ آئیں تو اُن کتوں کے ذریعہ انہیں دوبارہ ریوڑ میں لایا جائے، فرمایا: بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ کی زمین پر ظالم حکمران مسلمانوں کے حق میں کتے کے مانند ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لیے مسلط کر دیا تا کہ ہم اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف اور ایمان، اعمال اور اخلاق کی طرف رجوع کر لیں، اور جب تک ہم ایسا نہ کریں گے ان کا تسلط باقی رہے گا، اور جب ہم اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اس کے در پر آجائیں گے، اس کی طرف رجوع کر لیں گے تو پھر یقیناً ان کا تسلط ختم ہوجائے گا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال

ہوجائے گی۔ چنانچہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت فرما کر بادشاہِ مصر مظفر سیف الدین کے ہاتھوں تاتاریوں کو شکست دی اور اِتنا ہی نہیں، بلکہ اسی تاتاری قوم میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے شیدائی پیدا فرمائے اور اس طرح وعدۂ ربانی: ﴿ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِأَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَ لَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ○﴾ (الصف:۸) پورا ہوا۔

اور علامہ اقبالؒ کے بقول:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے فسانے سے پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

(مستفاد از: مظاہر علوم/صفحہ:۲۷/شمارہ: اکتوبر/۲۰۰۲ء)

اللہ تعالیٰ کی نصرت سے پہلے ابتلا و آزمائش کا مرحلہ ہے:

البتہ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے پہلے ابتلا و آزمائش کا مرحلہ بھی آتا ہے، ہمیشہ سنت اللہ و عادت اللہ یہی رہی ہے کہ نصرتِ الٰہی سے پہلے اہل ایمان کو مصائب و آزمائش کے مراحل سے گزارا جاتا ہے اور بسا اوقات یہ مرحلہ بہت طول پکڑتا ہے، خود اللہ کے رسول ﷺ اور حضرات صحابہؓ کو بھی اس مرحلہ سے گزرنا پڑا، مکی زندگی میں تیرہ سال تک انہیں خوب آزمایا گیا، اور یہ مرحلہ صرف امت محمد یہ ہی کو پیش نہیں آیا، بلکہ پچھلی اُمتوں کے ساتھ بھی پیش آتا رہا، قرآنِ کریم نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ آخرت میں جنت کی ابدی راحت اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نصرت آزمائش کے بغیر یوں ہی حاصل نہیں ہوتی، چنانچہ فرمایا:

﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَأْتِکُمْ مَثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ ط مَسَّتْھُمُ الْبَأْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ○﴾ (البقرة : ۲۱۴)

22

”(مسلمانو!) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں (یوں ہی) داخل ہوجاؤ گے، حالاں کہ ابھی تمہیں اس جیسے حالات و مصائب پیش نہیں آئے جیسے ان لوگوں کو پیش آئے تھے جو تم سے پہلے ہوگزرے ہیں، ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور انہیں ہلا دیا گیا، یہاں تک کہ رسول اور ایمان والے ساتھی بول اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، یاد رکھو! اللہ کی مدد قریب ہے۔“

پھر یہ ابتلا و آزمائش نصرتِ الٰہی سے پہلے اہل ایمان کے ساتھ مختلف شکلوں میں پیش آتی ہے، کبھی دشمنوں کے خوف کی شکل میں، کبھی جانی و مالی نقصان کی شکل میں، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿ وَ لَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَ الْأَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ط وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ○﴾

”اور ہم تمہیں ضرور بالضرور آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے نیز جان و مال اور پھلوں کی کمی کے ذریعہ، اور آپ خوش خبری دے دیجیے صبر کرنے والوں کو۔“

قرآن نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ابتلا و آزمائش کے اس مرحلہ میں مسلمانوں کو صبر و ہمت اور رجوع الی اللہ سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو نصرتِ الٰہی کے مطلوبہ شرائط کا حقدار بنانا چاہیے۔

نصرتِ الٰہی کی پہلی شرط ایمان و اعمال کی پختگی ہے:

ابتلا و آزمائش کے مراحل سے گزرنے کے بعد بھی کتاب و سنت کی صراحت کے مطابق نصرتِ الٰہی کے لیے کچھ ضوابط و شرائط مقرر ہیں، ان کے بغیر اللہ تعالیٰ کی نصرت نہیں آتی، منجملہ ان کے اللہ تعالیٰ کی نصرت کی پہلی شرط ایمان و اعمال کی پختگی ہے، چنانچہ حق تعالیٰ

نے اہل ایمان سے دشمنوں پر غلبہ اور حکومت عطا کیے جانے کا وعدہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ﴾ (النور : ۵۵)

''اور تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا، اور ان کے لیے اس دین کو ضرور اقتدار (اور قوت) بخشے گا جسے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے اس کے بدلے انہیں ضرور امن دے گا۔''

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے (اپنی نصرت اور) حکومت عطا کیے جانے کی دو بنیادی شرطوں کا ذکر کیا ہے، ان میں پہلی شرط ایمان اور دوسری ایمانی اعمال، ویسے ایمان کے دعوے دار تو سارے ہی مسلمان ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت کے لیے ایمان میں کمال اور اعمال میں پختگی شرط ہے، آج نہ ایمان میں کمال ہے، نہ اعمال میں پختگی ہے، کمی اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں نہیں، بلکہ ہمارے ایمان واعمال میں ہے۔

مومن کے ساتھ غلبہ کا وعدہ ہے قرآن میں
تو مومن ہے اور غالب نہیں، تو نقص ہے ایمان میں

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ کمالِ ایمانی کے ساتھ اعمال میں پختگی ہو تو پھر خواہ ساری دنیا کی طاقتیں ہمارے خلاف متحد ہو کر سازشیں کریں، مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت کی وجہ سے ان کی ساری سازشیں ناکام ہوں گی، اسی کو قرآن میں فرمایا:

﴿ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ﴾ (آل عمران : ۱۲۰)

اگر تم صبر اور تقویٰ سے کام لو تو ان کی چالیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔
اور تقویٰ دراصل کمالِ ایمانی کے ساتھ اعمال میں پختگی کا نام ہے، جو نصرتِ الٰہی کی پہلی

بنیادی شرط ہے۔

ایک عبرت انگیز واقعہ:

ماضی کی تاریخ شاہد ہے کہ جب اہل ایمان تقویٰ، پرہیزگاری اور ایمانی اوصاف سے متصف تھے تو اللہ رب العالمین نے انہیں انتہائی طاقت ور دشمنوں کے مقابلہ میں بھی کامیاب کیا، اس سلسلہ میں وہ واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے جس کو ابن کثیرؒ اور ابن عساکرؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ جب مسلمانوں کے سامنے اس وقت کی سوپر پاور (Super Power) طاقت رومیوں کے پاؤں اُکھڑنے لگے تو روم کے بادشاہ ہرقل نے اپنی قوم کے دانشوروں اور وزراء کو جمع کیا اور تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ جن لوگوں سے تم لڑ رہے ہو وہ تمہاری طرح انسان ہیں یا کچھ اور ہیں؟ ہرقل کے جواب میں لوگوں نے کہا کہ وہ ہماری طرح انسان ہی ہیں، پھر پوچھا کہ وہ زیادہ ہیں یا تم زیادہ ہو؟ لوگوں نے کہا کہ ہم ان سے کہیں زیادہ ہیں، ہرقل نے کہا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ تم ہر محاذ پر بری طرح شکست کھا رہے ہو؟ اس پر سب نے گردنیں جھکا دیں، ایک عمر رسیدہ شخص اُٹھا اور کہنے لگا: مسلمانوں کے غالب ہونے کا اصل راز یہ ہے کہ وہ صائم النہار اور قائم اللیل ہیں، راتوں کو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر نمازیں پڑھتے ہیں، دن میں روزے رکھتے ہیں، وہ دن کے شہ سوار اور رات کے عبادت گزار ہیں، امانت دار ایسے کہ کسی کے مال کو بغیر قیمت چکائے ہاتھ تک نہیں لگاتے، عہد و پیمان کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں، بھلائی پھیلاتے ہیں، برائی مٹاتے ہیں، اگر ان کے درمیان آپس میں اختلاف بھی ہوتا ہے تو ہر فریق حق بات کو بلا چوں و چرا تسلیم کر لیتا ہے، دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ رات میں شراب پیتے ہیں اور دن میں بدکاری میں مبتلا رہتے ہیں، دوسروں کا مال وحق ہڑپ کرتے ہیں، وعدہ خلافی کرتے ہیں، ہمارا کردار ظالمانہ اور ہماری طبیعت مفسدانہ ہے، ہرقل نے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کیا۔ (مستفاد از: دورِ فتن میں راہِ عمل: ۷۸)

آج مسلمانوں کو پھر ان ہی ایمانی واخلاقی صفات سے متصف ہونے کی ضرورت

ہے، اس کے بغیر وہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے مصداق و حقدار نہیں بن سکتے۔

نصرتِ الٰہی کی دوسری شرط اتفاقِ باہمی ہے:

اللہ تعالیٰ کی نصرت کے لیے دوسری بنیادی شرط ایمان و اعمال کی پختگی کے بعد اتفاقِ باہمی ہے، اس میں بھی اگر کمی و کوتاہی ہوئی تو فوراً اللہ تعالیٰ کی نصرت ہٹ جائے گی، دیکھئے! رحمت عالم ﷺ کے دور میں حضرات صحابہؓ ایمان، اخلاق، اخلاص اور اعمال کے جس بلند معیار پر تھے ساری اُمت مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، لیکن اس کے باوجود (اجتہادی و) معمولی اختلاف اور کوتاہی کی بنیاد پر انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت ہٹ گئی، چنانچہ غزوۂ اُحد کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَ عَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ (آل عمران : ۱۵۲)

’’اور اللہ تعالیٰ نے یقیناً اس وقت اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب تم دشمنوں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ تم خود ہی کمزور ہو گئے اور تم نے معاملہ میں باہم اختلاف کیا اور تم نے نافرمانی کی، بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو وہ فتح دِکھا دی جس کو تم چاہتے تھے۔‘‘

معلوم ہوا کہ ایمان و اعمال میں پختگی کے بعد اتفاقِ باہمی نصرتِ الٰہی کے لیے نہایت ضروری شرط ہے، اگر آپس میں نزاع، جھگڑا اور اختلاف ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت ہٹ جائے گی اور بزدلی پیدا ہو جائے گی، اسی لیے حکم فرمایا:

﴿وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ﴾ (الأنفال : ۴۶)

’’اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔‘‘

صاحبو! آپسی اختلاف اور جھگڑے سے جب عام حالات میں بھی بچنا ضروری

ہے تو دشمنوں کی یلغار کے وقت بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگا، آج ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے آپسی اختلاف کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے نظر انداز کر کے ایمانی، قرآنی و اخلاقی بنیادوں پر متحد اور متفق ہو جائیں، اور یہ چیز تقویٰ، تواضع، ایثار و اِخلاص اور قربانی و خوش اخلاقی کے بغیر ممکن نہیں، اور خوش اخلاقی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بداخلاقی کا جواب خوش اخلاقی سے دیا جائے، جب ہمارا یہ حال ہو جائے گا تب اللہ تعالیٰ کی نصرت شاملِ حال ہوگی، اس کے بغیر بھی ہم اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے حقدار نہیں بن سکتے۔

بقولِ شاعر:

تمہاری قوم کی تو ہے بنا ہی دین و ایمان پر ۔۔۔ تمہاری زندگی موقوف ہے تعمیلِ قرآن پر
تمہاری فتح یابی منحصر ہے فضلِ یزداں پر ۔۔۔ نہ قوت پر، نہ کثرت پر، نہ شوکت پر، نہ ساماں پر

نصرتِ الٰہی کی تیسری شرط دینِ الٰہی کی نصرت ہے:

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل کرنے کے لیے تیسری بنیادی شرط دینِ الٰہی کی نصرت ہے، قرآنِ کریم میں اس کی طرف توجہ دِلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (الصف : ۱۴)

’’تم اللہ کے (دین کے) مددگار بن جاؤ۔‘‘

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ﴾ (محمد : ۷)

’’اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔‘‘

دینِ الٰہی کی نصرت میں وہ تمام چیزیں اور کوششیں داخل ہیں جن سے دینِ اسلام

اوراس کا پیغام عام ہو، آج ضرورت ہے کہ ہم دین الٰہی کے احکام و پیغام کو اپنے قول وعمل سے انفرادی واجتماعی طور پر اپنی بساط کے مطابق عام کرنے کی کوشش کریں، اس کے بغیر بھی ہم اللہ تعالیٰ کی نصرت کے حقدار اور لائق نہیں بن سکتے۔

نصرتِ الٰہی کی چوتھی شرط
مادّی اسباب کی تیاری ہے:

اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل کرنے کے لیے چوتھی شرط مادّی اسباب کی فراہمی اور تیاری بھی ہے، اس لیے کہ اللہ رب العزت نے اس دنیا کو اسباب سے جوڑ دیا ہے اور بندوں کو حکم بھی دیا کہ وہ ہر کام کے لیے مطلوبہ اسباب اختیار کریں، اگرچہ اسباب ہی پر سارا دارومدار رکھنا مومن کی شان نہیں، لیکن دشمن پر غلبہ پانے کے لیے ایمان واعمال میں پختگی، اتفاقِ باہمی اور نصرتِ دینِ الٰہی کے ساتھ حتی المقدور مادّی اسباب کا اختیار کرنا بھی ضروری ہے، خود حق تعالیٰ نے اس کی تاکید فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ وَ أَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ﴾ (الأنفال : ٦٠)

’’اور (مسلمانو!) جس قدر طاقت اور گھوڑوں کی جتنی چھاؤنیاں تم سے بن پڑیں ان سے مقابلہ کے لیے تیار کرو، جن کے ذریعہ تم اللہ کے دشمن اور اپنے (موجودہ) دشمن پر بھی ہیبت طاری کرسکو۔‘‘

مادّی اسباب میں میڈیا سمیت وہ تمام ذرائع داخل ہیں جو دشمن کو زیر کرنے اور ان کی سازشوں کو فیل کرنے کے لیے ضروری ہیں، مذکورہ آیت کریمہ کے تحت حضرت شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ’’یہ پوری امت مسلمہ کے لیے ایک اَبدی حکم ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی شوکت قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی دفاعی طاقت جمع کرنے کا اہتمام کرے، قرآنِ کریم نے ’’طاقت‘‘ کا عام لفظ استعمال کرکے بتادیا

ہے کہ جنگ کی تیاری کسی ایک ہتھیار پر موقوف نہیں، بلکہ جس وقت جس قسم کی دفاعی قوت کار آمد ہو اس وقت اسی طاقت کا حصول مسلمانوں کا فریضہ ہے، لہٰذا اس میں تمام جدید ترین ہتھیار اور آلات بھی داخل ہیں اور وہ تمام اسباب ووسائل بھی جو مسلمانوں کی اجتماعی، معاشی اور دفاعی ترقی کے لیے ضروری ہوں۔ افسوس ہے کہ اس فریضے سے غافل ہوکر آج مسلمان دوسری قوموں کے دست نگر بنے ہوئے ہیں اور ان سے مرعوب ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس صورتِ حال سے نجات عطا فرمائے۔ آمین۔ (آسان ترجمۂ قرآن: ۵۴۵)

خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ اس وقت اسلام اور مسلمان ساری دنیا میں آزمائش کے دور سے گذر رہے ہیں، کفر کی ساری عالمی قوتیں اکٹھا ہوچکی ہیں، ضلالت وظلمت کی مکمل سیاہی چھا چکی ہے، ان حالات میں عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اب حالات فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہورہے ہیں، کیوں کہ جب تک رات کی تاریکی وسیاہی مکمل نہیں ہوجاتی تب تک صبح کی روشنی نمودار نہیں ہوتی، ان شاء اللہ العزیز ضلالت وظلمت کے ختم ہونے کا وقت قریب آچکا ہے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہوجائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیں، نیز اپنے ایمان واعمال میں قوت، آپس میں اُخوت، دینِ الٰہی کی نصرت وحفاظت اور اسلامی سیاست کے لیے بیدار اور کمربستہ ہوجائیں، پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آنے میں دیر نہیں لگے گی، یقیناً ارشادِ باری حق اور سچ ہے: ﴿أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۝﴾

اللہ تعالیٰ ہمیں دارین میں اپنی نصرت کا حقدار بنادے۔ آمین۔

اَللّٰهُمَّ أَهِلَّ عَلَيْنَا شَهْرَ رَمَضَانَ بِالْأَمْنِ وَ الْإِيْمَانِ وَ السَّلَامَةِ وَ الْإِسْلَامِ، وَ التَّوْفِيْقِ لِمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰى يَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْإِكْرَامِ.

’’اے اللہ! اس ماہِ رمضان کو ہم پر امن وایمان، سلامتی اور اسلام کے ساتھ لائیے اور ہمیں توفیق دیجیے اُس (عمل) کی جو آپ پسند فرمائیں، اے عزت وبزرگی والے۔‘‘

اَللّٰھُمَّ سَلِّمْنَا لِرَمَضَانَ وَ سَلِّمْهُ لَنَا وَ تَسَلَّمْهُ لَنَا مُتَقَبَّلًا.

''اے اللہ! ہمیں رمضان کے لیے سلامت رکھ اور رمضان کو ہمارے لیے سلامت رکھ اور اسے ہمارے لیے سلامتی کے ساتھ قبولیت کا ذریعہ بنا۔''

۶/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۸ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۲/ جون/ ۲۰۱۷ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا اَنْتَ اَھْلُہٗ، فَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا اَنْتَ اَھْلُہٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا اَنْتَ اَھْلُہٗ، فَاِنَّکَ اَنْتَ اَھْلُ التَّقْوٰی وَ اَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ

(۲)

امتِ مسلمہ کا اتفاق کیوں اور کیسے؟

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: '' تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَرَاحُمِھِمْ وَ تَوَادِّھِمْ وَ تَعَاطُفِھِمْ کَمَثَلِ الْجَسَدِ، اِذَا اشْتَکٰی عُضْوًا تَدَاعٰی لَہٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّھَرِ وَ الْحُمّٰی.'' (متفق علیه، مشکوٰۃ، باب الشفقة والرحمة علی الخلق، ص: ۴۲۲)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم مسلمانوں کو باہمی رحمت و محبت (اور تعلق) میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ جب اس کا ایک عضو بیمار پڑ جائے تو دوسرے اعضاء ایک دوسرے کو بخار اور بے خوابی کی طرف بلاتے ہیں۔'' (مطلب یہ ہے کہ جب ایک عضو بیمار ہو جائے تو پورا جسم بے خوابی، بے چینی اور بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے)

امتِ مسلمہ کے باہمی ایمانی رشتہ کو مٹایا نہیں جا سکتا:

اللہ رب العزت نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایمانی و اسلامی رشتہ میں منسلک
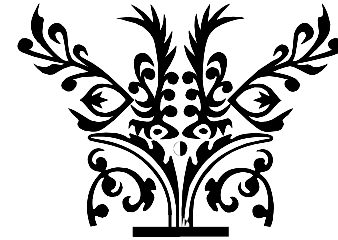
فرمایا ہے، مسلمان دنیا کے کسی بھی گوشہ میں ہو، مغرب میں ہو یا مشرق میں، شمال میں ہو یا جنوب میں، گورا ہو یا کالا، مالدار ہو یا نادار، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، اعلیٰ عہدے پر فائز ہو یا مزدور اور بڑا ہو یا چھوٹا، بہرحال وہ سب آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں، ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ﴾ (الحجرات: ۱۰) تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں؛ یہ ایک ایسا ایمانی رشتہ ہے جسے غفلت کے سبب بھلایا تو جا سکتا ہے مگر مٹایا نہیں جا سکتا، اس ایمانی رشتہ نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک آفاقی اور عالمگیر خاندان کا رُکن بنا رکھا ہے، لہٰذا مسلمانوں کے لیے ایمان کے حصول کے بعد اس ایمانی رشتہ کو قائم رکھنا بہت ہی زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اس ایمانی رِشتہ کو باقی رکھنے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں: (۱) اس بات کا استحضار کہ ہم سب خاندانی وسماجی رِشتہ کی طرح ایمانی رِشتہ سے آپس میں بھائی بھائی ہیں، ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ﴾ (الحجرات: ۱۰) بلکہ حدیث شریف کے مطابق "کمثل الجسد" ہیں۔ (۲) اگر آپس میں بگاڑ اور فساد پیدا ہو جائے تو محض اس بگاڑ وفساد پر نظر رکھنے کے بجائے اصلاح کی فکر اور مخلصانہ کوشش کی جائے، ﴿فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۰) (۳) اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ڈر، ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (الحجرات: ۱۰) جب یہ تینوں چیزیں ہوں گی تو رِشتۂ ایمانی نبھے گا اور ہم اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کے لائق بن سکیں گے۔

ایمانی رشتہ کو باقی رکھنے کے لیے امت مسلمہ کو ایک جسم کے مانند بننا ہوگا:

جہاں تک تعلق ہے پہلی چیز کا کہ مسلمان اور اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، بلکہ ایک جسم کے مانند ہیں، تو مذکورہ حدیث میں اسی کو فرمایا گیا کہ باہمی محبت وتعلق میں اہل ایمان کی مثال ایک جسم کی سی ہے، کہ ایک عضو اگر بیمار ہو جائے تو پورا جسم اس بیماری کی

تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس تمثیل کی معنویت و جامعیت پر غور کرنے سے چند حقائق واضح ہوتے ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر جسم کے مختلف اعضاء ہیں تو امت کے بھی مختلف افراد ہیں اور ہر انسان کو اپنے جسم اور اس کے ہر ہر عضو سے بڑی محبت ہوتی ہے، تو پوری امت مسلمہ بھی چوں کہ ایک جسم کے مانند ہے، لہٰذا امت مسلمہ کا ہر ہر فرد جسم کے ہر ہر عضو کی طرح لائق محبت ہے، لہٰذا ہر ایک سے محبت کی جائے، یہی محبت قربت کا سبب ہوگی، عاجز کے خیالِ ناقص میں اس محبت وقربت کے حصول کے لیے "سلام" جو کہ محبت کا ایک بہترین پیغام ہے اُسے عام کرنے کی ضرورت ہے، ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا، وَ لَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا، أَوَ لَا أَدُلُّكُمْ عَلٰى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ، أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ." (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، ص: ۳۹۷)

ترجمہ: "تم ایمان کے بغیر جنت میں داخل نہیں ہو سکتے، اور تمہارا ایمان باہمی محبت کے بغیر معتبر نہیں ہے، اور تمہارے درمیان محبت پیدا کرنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ سلام کو عام کیا جائے۔"

امت مسلمہ کے مختلف مکاتبِ فکر ایک دوسرے کے وجود کو قبول کریں:

"کَمَثَلِ الْجَسَدِ" ...... سے دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جس طرح جسم انسانی کے اعضاء مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے وجود کو قبول کرتے ہیں اسی طرح امت مسلمہ کے مختلف مکاتبِ فکر کو بھی چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے وجود کو قبول کریں، لیکن یہ عملاً اسی وقت آسان ہوگا جب کہ چند باتوں کو ملحوظ رکھا جائے، اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ

ہے کہ بہت سے مسائل تو وہ ہیں جن میں اختلاف مستحبات کا یا بہت معمولی قسم کا ہے، اگر اس کو ختم نہیں تو اخلاص واعتدال سے کام لیتے ہوئے کم ضرور کیا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اختلاف نظریات تک ہی محدود رہنا چاہیے، ذات اور شخصیات تک نہیں پہنچنا چاہیے، نیز اس کی وضاحت دلیل سے کی جائے، تذلیل سے نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے قربت ومحبت اور خلوص کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے، یہی مسلمان کی اصل شان اور پہچان ہے۔

﴿أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح:۲۹)

بقولِ شاعر:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن

چوتھی بات یہ بھی یاد رکھیے کہ امت مسلمہ میں ایمانی رشتہ کو باقی رکھنے کے لیے ایک مکتب فکر کا دوسرے میں ضم اور گم ہو جانا تو ضروری نہیں، اور نہ یہ بات ممکن ہے کہ تمام مکاتب فکر کے لوگ کسی ایک ہی مکتب فکر کے وجود کو تسلیم کرلیں، اس کے تابع ہو کر اتحاد قائم کرلیں، ایک ہی تنظیم وجماعت کو اپنا مرکز تسلیم کرلیں اور آپس میں کسی قسم کا کوئی فکری ومسلکی اختلاف باقی نہ رہے، کیوں کہ ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ○ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ط ﴾ (هود: ۱۱۸ – ۱۱۹)

ترجمہ: ''اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طریقہ کا پیرو بنا دیتا (مگر کسی کو زبردستی کسی دین پر مجبور کرنا حکمت کا تقاضا نہیں ہے، اس لیے انہیں اپنے اختیار سے مختلف طریقے اپنانے کا موقع دیا گیا ہے) اور اب وہ ہمیشہ مختلف راستوں پر ہی رہیں گے، مگر جن پر تمہارا رب رحم فرمائے۔'' (تو ان کی بات اور ہے)

ہاں، یہ ضرور ممکن ہے کہ ہم باہمی فکری اور مسلکی اختلاف کے باوجود اعضاءِ

جسمانی کی طرح ایک دوسرے کے وجود کو قبول کریں، اس کے لیے ہمیں مسلمانوں کے درمیان مختلف مکاتب فکر کے مابین انضمام کے بجائے متفق علیہ مسائل میں اتفاق واشتراک پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، قرآنِ پاک نے تو غیر مسلموں کو بھی مشترک مسائل پر متحد ہونے کی دعوت دی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ قُلْ يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَّيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○﴾ (آل عمران: ٦٤)

ترجمہ: ''آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! آؤ ہم ایک کلمہ پر متحد اور جمع ہو جائیں جس میں ہم اور تم برابر ہیں، وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور اللہ کو چھوڑ کر ہم میں سے کوئی کسی کو معبود نہ بنائے، پس اگر وہ اعراض کریں تو (مسلمانو!) تم کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔''

غور کیجیے! اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان مشترکہ کلمہ صرف عقیدۂ توحید ہے، پھر اس میں بھی اہل کتاب کا عقیدۂ توحید خالص نہیں تھا، بہت سے یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے تھے، اس کے باوجود قرآنِ کریم نے اس مشترکہ عقیدۂ توحید پر اشتراکِ عمل کی دعوت دی، اگر اہل کتاب اور اہل ایمان مشترکہ کلمہ پر متحد ہو سکتے ہیں تو کیا اہل قرآن اور مسلمان اپنے مشترکہ اور متفق علیہ مسائل پر متحد نہیں ہو سکتے؟ جب کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے درمیان مشترک ومتفق علیہ احکام ومسائل کا دائرہ بہت وسیع ہے، جیسے اللہ جل شانہ کی وحدانیت، رحمت عالم ﷺ کی رسالت، قرآنِ کریم کی حقانیت، دین اسلام کی صداقت نیز دین اسلام کے بنیادی فرائض و واجبات، مستحبات اور محرمات میں یکسانیت، حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام کے تقریباً اَسّی (۸۰٪) فی صد احکام ومسائل ایسے ہیں جن میں امت مسلمہ کے مابین کسی نہ کسی درجہ اتفاقِ

رائے اور وحدت و یکسانیت پائی جاتی ہے، تو کیا ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کے خاطر امت کی حفاظت وتقویت اور بقاو نفع کے لیے ان مشترکہ احکام و مسائل میں متحد نہیں ہو سکتے؟ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

نیز فرماتے ہیں:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں — کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

امت مسلمہ فکری اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرے:

رہی بات ان احکام و مسائل کی جن میں امت کے مختلف مکاتب فکر کے مابین اختلاف ہے، ان کے متعلق حکم یہ ہے کہ اختلافِ رائے کے اظہار میں احتیاط سے کام لیں اور ایک دوسرے کے احترام بلکہ ایثار کو ملحوظ رکھیں، ہم اپنے اسلاف کے یہاں دیکھتے ہیں کہ اہل سنت کا خوارج اور معتزلہ سے سخت اختلاف رہا؛ لیکن اس کے باوجود ان کی تکفیر سے احتیاط برتی گئی، ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ ''تکفیر میں جلد بازی ان طبائع میں زیادہ ہوتی ہے جن پر جہل کا غلبہ ہوتا ہے۔'' کیوں کہ ایمان وہ نعمت ہے جس پر دارین کی نجات موقوف ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کو ایک آسان عمل بنا دیا کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور آخرت پر یقین کا اظہار کرے وہ اسلام کے دائرے میں آ گیا۔ احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمۂ شہادتین پڑھنے سے انسان اسلام کے دائرے میں آجاتا ہے، اس پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوں گے، یہاں تک کہ اس کے دل میں جو کچھ ہے اُس کی تفتیش کا حق بھی ہمیں نہیں ہے، بس عملی زندگی میں اس کے مسلمان

ہونے کی اتنی پہچان ہی کافی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھے، کعبۃ اللہ کو قبلہ تسلیم کرے اور مسلمانوں کا ذبیحہ حلال سمجھے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا وَ اسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَ أَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا، فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَ ذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ، فَلَا تُخْفِرُوْا اللّٰهَ فِيْ ذِمَّتِهٖ." (رواه البخاری، مشکوٰۃ / کتاب الإیمان، ص:۱۲)

ترجمہ: ''جس کسی نے (اہل کتاب میں سے) ہماری طرح نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کیا اور ہمارے ذبیحہ کو (حلال سمجھ کر) کھایا تو وہ ایسا مسلمان ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے اپنے ذمہ میں لے لیا ہے (اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے امن حاصل ہے) لہٰذا جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری میں ہے تم اس کے ساتھ عہد شکنی کر کے اللہ کی ذمہ داری کو نہ توڑو۔''

امت مسلمہ کسی کی تکفیر میں بہت ہی احتیاط سے کام لے:

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان لانا جتنا آسان عمل ہے، اور کسی پر مسلمان ہونے کا حکم لگانا جتنا سادہ اور سہل کام ہے، کسی مسلمان کو دائرۂ ایمان سے باہر قرار دینا اور کسی مسلمان کو کافر کہہ دینا اتنا ہی نازک کام ہے، اس میں نہایت احتیاط برتنے کا حکم ہے، جب تک کسی شخص کے کفر کا یقین نہ ہو جائے، یا یہ بات ثابت نہ ہو جائے کہ وہ قطعیاتِ دین اور ضروریاتِ دین کا انکار کرنے والا ہے، تب تک اس پر کافر ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک حدیث پاک میں ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى أَنَّهُ سَمِعَ ابْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ: "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَيُّمَا امْرِئٍ قَالَ لِأَخِيْهِ: "يَا كَافِرُ" فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا، إِنْ كَانَ كَمَا قَالَ، وَ إِلَّا رَجَعَتْ عَلَيْهِ." (رواه مسلم/ کتاب الإیمان:۸ / باب بیان حال إیمان

من قال لأخيه المسلم : "يا كافر!". مشكوٰة : (٤١١)

ترجمہ : ''حضرت عبداللہ بن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اپنے (مسلمان) بھائی کو ''اے کافر'' کہہ کر پکارا، تو ایسی صورت میں دو باتوں میں سے ایک بات ہوگی، یا تو وہ شخص واقعۃً کافر ہوگا، اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ کلمہ (کفر) خود پکارنے والے کی طرف لوٹے گا۔''

اسی لیے ہمارے فقہاء نے تکفیر کے سلسلہ میں بہت ہی احتیاط سے کام لیا ہے۔

ایک دلچسپ واقعہ :

اس سلسلہ میں امامنا العلام حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کا نہایت دلچسپ واقعہ ہے، جسے علامہ ابن نجیم مصریؒ نے نقل فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سے اس شخص کے متعلق سوال کیا گیا جو یہ کہتا ہے کہ میں نہ جنت کی تمنا کرتا ہوں، نہ جہنم سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتا ہوں، میں مردار کھاتا ہوں، میں بغیر قراءت اور بغیر رکوع اور سجدہ کے نماز پڑھتا ہوں، جو چیزیں میں نے دیکھی نہیں ان کے بارے میں بھی گواہی دیتا ہوں، حق سے گریز کرتا ہوں، فتنہ کو پسند کرتا ہوں، مذکور شخص کے متعلق امام صاحبؒ کے شاگردوں نے عرض کیا: ''حضرت! اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ کیا ایسا شخص بھی مسلمان ہوسکتا ہے؟'' آپؒ نے فرمایا: ''جی ہاں، یہ شخص بھی مسلمان ہے، اس لیے کہ یہ شخص "يَرْجُو اللّٰهَ، لَا الْجَنَّةَ" ''اللہ تعالیٰ کی تمنا رکھتا ہے، جنت کی نہیں''، اسے اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہے، جنت نہیں، اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر لگتا ہے، جہنم سے نہیں، ''اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں''......اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بات سے خائف نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے عذاب دینے میں ظلم کرے گا، مردار کھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مچھلی اور ٹڈی کھاتا ہے، بغیر قراءت اور بغیر رکوع وسجدہ کے نماز پڑھنے کا مطلب ہے کہ وہ نمازِ جنازہ پڑھتا ہے، جو چیزیں دیکھی نہیں ان کے بارے

میں گواہی دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور جنت وجہنم کی گواہی دیتا ہے، حق کو ناپسند کرنے کا مطلب یہ کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے، حالاں کہ وہ حق ہے، اسی طرح فتنہ سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اولاد واموال سے محبت رکھتا ہے، جو کہ فتنہ اور آزمائش ہیں۔

فَقَامَ السَّائِلُ وَ قَبَّلَ رَأْسَهٗ، وَ قَالَ: "أَشْهَدُ أَنَّكَ لِلْعِلْمِ وِعَاءٌ."

یہ سارے جوابات سن کر سوال کرنے والا کھڑا ہوگیا اور اس نے امام صاحبؒ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ علم (اور وسعتِ ظرفی) کے سمندر ہیں۔ (الاشباہ والنظائر مع الحموی: ۸/ ۳۶۸، باب الفن السابع، الحکایات والمرسلات)

امت مسلمہ کے مختلف مکاتب فکر ایک دوسرے سے استفادہ کریں:

خلاصہ یہ ہے کہ مخالف نقطۂ نظر کے حاملین پر کفر کا حکم لگانے سے بہت احتیاط برتنا چاہیے، اپنوں اور مسلمانوں کو کافر بنانے سے کہیں زیادہ غیروں کو اپنا اور مسلمان بنانے کی فکر کی جائے، اور تمام مکاتب فکر والے ایک دوسرے کو اپنی سوچ اور رائے پر مجبور نہ کریں، خلافِ رائے کے اظہار میں بھی احتیاط سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے کے احترام اور ایثار کو ملحوظ رکھیں، بلکہ ایک دوسرے سے جہاں تک ممکن ہو استفادہ کی کوشش کریں، جیسا کہ ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے، چنانچہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک سب سے مستند مجموعۂ حدیث صحیح بخاری ہے، اس کے مؤلفؒ نے جن حضرات سے روایتیں لی ہیں ان میں اَسّی (۸۰) سے زیادہ ان فرقوں سے تعلق رکھنے والے تھے جن سے اہل سنت والجماعت کا سخت اختلاف تھا، ان میں پندرہ مرجیہ، سات ناصبیہ، چھتیس شیعہ، اٹھائیس قدریہ، خوارج اور کچھ دوسرے فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، علامہ سیوطیؒ نے تدریب الراوی میں تفصیل سے

نام بہ نام ان کا ذکر کیا ہے۔

(دیکھئے تدریب الراوی/ص:۸،۲۷،از:''چند اہم علمی وفکری خطاب''صفحہ:۳۲۲، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

یہ تو ماضی بعید کی بات تھی، ماضی قریب کا حال سنئے! محترم کوثر نیازی نے اپنے ایک مضمون ''مشاہدات وتأثرات'' میں- جو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا- مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب حضرت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کا وصال ہوا اور کسی نے حضرت تھانویؒ کو اس کی اطلاع دی، تو بے ساختہ آپؒ نے ان کے لیے دعاءِ مغفرت فرمائی، کسی نے عرض کیا: ''حضرت! مولانا احمد رضا خان صاحبؒ تو آپ کو کافر کہتے تھے اور آپ ان کے لیے دعاءِ مغفرت کر رہے ہیں؟'' تو فرمایا: ''مولانا مجھے اس لیے کافر کہتے تھے کہ میں ان کی سمجھ میں گستاخِ رسول تھا''۔ (جب کہ حقیقت یہ نہ تھی)۔

اسی طرح مولانا احمد علی لاہوریؒ ایک زبردست حنفی عالم تھے، پاکستان میں ایک طویل عرصہ تک ایک بڑی مسجد میں اِمامت وخطابت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے، آپؒ کے عقیدت مندوں کا حلقہ بھی کافی بڑا اور وسیع تھا، اس کے باوجود آپؒ ہمیشہ اِقبال پارک میں مشہور اہلِ حدیث داود غزنویؒ کی اقتدا میں نمازِ عیدین ادا کیا کرتے تھے، اگر آپؒ چاہتے تو عیدین کی نماز اپنی مسجد میں الگ بھی پڑھا سکتے تھے، اور ایسی صورت میں مولانا داود غزنویؒ کی بہ نسبت آپؒ کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی، مگر آپؒ نے اتحاد کا مظاہرہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔(''پرانے چراغ'' مستفاد از: ''دورِ فتن میں راہِ عمل:۵۵)

تمام امت مسلمہ کا باہم شریکِ غم بننا وقت کا تقاضا ہے:

آج بھی اگر ایسا ہو اور امت مسلمہ ''کمثل الجسد'' ہو جائے تو ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنا اور اس میں شریک ہونا بھی آسان ہو جائے گا، ان ہی حقائق کو سمجھانے کے لیے آں حضرت ﷺ نے امت مسلمہ کو جسدِ واحد سے تشبیہ دی ہے، کہ جسم کے تمام اعضاء اگر چہ یکساں اہمیت وحیثیت کے حامل نہیں ہوتے، دماغ تو پورے جسم کا بادشاہ ہے، اس کے چشم و

ابرو کے اشارہ پر جسم کا ہر ہر عضو کام کرتا ہے اور ہر صلاحیت متحرک ہوتی ہے، نیز دل پورے بدن کے لیے پاور ہاؤس ہے، اگر یہ کسی حصہ کو خون کی سپلائی بند کر دے تو لمحوں میں اس حصہ کی موت واقع ہو جائے گی، اسی طرح دیگر اعضاء کا حال ہے، کچھ زیادہ اہم ہیں اور کچھ کم، لیکن جسم کا ہر عضو دوسرے کے درد وغم میں شریک ہے، تو یہی حال امت مسلمہ کا بھی ہونا چاہیے، اس کے ہر فرد اور مکتب فکر کو باہم شریکِ درد وغم ہونا چاہیے، یہی فرمانِ رسول ﷺ اور وقت کا اہم تقاضا ہے۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں یہ سب عملاً اس وقت زیادہ آسان ہوگا جب کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء اور رہنما اللہ تعالیٰ کی رضا کے خاطر اپنی انا کو قربان کر کے جرأت مندی کے ساتھ آگے بڑھیں اور اپنی ذمہ داری کو ادا کریں، کیوں کہ علماء جس بصیرت، خیر خواہی اور محبت کے جذبہ کے ساتھ امت کی بے غرض رہنمائی کر سکتے ہیں کوئی اور گروہ نہیں کر سکتا، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سی کوتاہیوں کے باوجود آج بھی مسلمانوں کے دلوں میں اپنے علماء کی آراء اور فیصلوں کی جو قدر و قیمت ہے کسی اور گروہ کی ہدایات کو وہ درجہ حاصل نہیں، عموماً مسلمان دل کی آمادگی کے ساتھ علماء کے علاوہ بہت کم کسی اور گروہ کی بات قبول کرتے ہیں، لہٰذا امت کے مختلف مکاتب فکر کے علماء ورہنما کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے خاطر پیغامِ محبت کو عام کریں، ایک دوسرے کے تئیں تحمل پیدا کریں، نیز مشترک احکام و مسائل پر متحد ہونے کی نیز اصلاح کی مخلصانہ کوشش کریں، اور مختلف حلقوں کی جانب سے امت مسلمہ میں انتشار وافتراق پیدا کرنے کی جو ناپاک کوششیں کی جا رہی ہیں ان سے خود آگاہ رہیں اور عام مسلمانوں کو بھی آگاہ کریں، جو قومیں دریا کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے مل نہیں سکتی تھیں، ہمارے خلاف آج وہ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں، تو جو امت مسلمہ جسدِ واحد کی طرح بنائی گئی تھی وہ یقیناً ایک ہو سکتی ہے اور آج اسی کی ضرورت ہے، اسی میں ہماری حفاظت وقوت مضمر ہے۔

بقولِ شاعر:

شجر کی شاخ سے تازہ گلاب آئے گا — دِلوں کو کھینچ لے ایسا وقت آئے گا
ہماری قوم ہو جائے گی متحد جس دِن — یقین مانو! اسی دِن انقلاب آئے گا

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ”کَمَثَلِ الْجَسَدِ“ بنادے اور ہمارے آپسی بے جا اختلاف و انتشار کو ختم فرما کر اپنے احکام پر متفق فرمادے۔ آمین۔

۱۸/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۷ھ/ بروز: جمعرات

مطابق: ۲۶/ مئی/ ۲۰۱۶ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
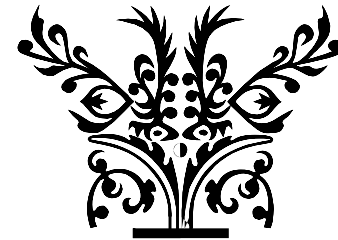
(۳)

جمعیت علماءِ ہند کا تعارف
حقیقت، اہمیت اور ضرورت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ” إِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّتِيْ أَوْ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ عَلٰى ضَلَالَةٍ، وَ يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ، وَ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ.“

(رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ۳۰/ باب الاعتصام بالکتاب والسنة/الفصل الثانی)

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ میری امت (اجابت، مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے والی امت) کو، یا یہ فرمایا کہ امت محمدیہ (کے جمہور علماء یا امت کی اکثریت) کو کبھی کسی ضلالت پر جمع نہیں کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ (مراد حفاظت، نصرت اور رحمت) جماعت پر ہے، اور جو بھی جماعت (اور اس کے اجماع یعنی اس کے متفقہ امور، احکام اور اصول) سے اعراض و انحراف کرے گا وہ اہل جنت سے الگ کر کے تنہا دوزخ میں ڈال دیا

جائے گا۔"

امت کی ایک مقدس اور عنداللہ مقبول جماعت:

اللہ رب العزت نے جیسے ہمارے آقا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو دیگر انبیاء و رُسل علیہم السلام پر بہت سی باتوں میں فوقیت، فضیلت اور خصوصیت عطا فرمائی ہے اسی طرح آقا ﷺ کی امت کو بھی دیگر تمام امتوں پر، بہت سی باتوں میں فوقیت، فضیلت اور خصوصیت عطا فرمائی ہے، من جملہ ان میں سے ایک بڑی زبردست فضیلت اور خصوصیت وہ ہے جس کا تذکرہ قرآن و حدیث میں کیا گیا ہے:

چنانچہ قرآنِ پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۰۴)

حدیث پاک میں مروی ہے:

عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: "لَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِيْ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللّٰهِ، لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ، وَ لَا مَنْ خَالَفَهُمْ، حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ، وَ هُمْ عَلٰى ذٰلِكَ." (متفق عليه، مشكوٰة: ۵۸۳/ باب ثواب هذه الأمة)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس امت میں (خواہ کتنا ہی بگاڑ اور فساد کیوں نہ پیدا ہو جائے، مگر) ایک مقدس اور عنداللہ مقبول جماعت امت میں ایسی ضرور رہے گی جو ہمیشہ حق پر قائم رہتے ہوئے (اصلاح کی کوشش کرتی رہے گی، ملت اور امت کی خدمت میں) سرگرم رہے گی، جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ساری امت کو بیک وقت کبھی کسی گمراہی و برائی پر مجتمع اور متفق نہیں فرمائیں گے، اس جماعت کو نہ وہ لوگ نقصان پہنچا سکیں گے جو اس کی تائید اور اعانت و نصرت چھوڑ دیں گے اور نہ ہی ان کی مخالفت کرنے والے ان کا کچھ بگاڑ سکیں گے،

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا امر یعنی قیامت آجائے، یا اس کی بڑی علامات ظاہر ہو جائیں۔

معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک جماعت (خواہ وہ کسی خاص مقام پر ہی کیوں نہ ہو) ضرور رہے گی، جو دین حق کی سربلندی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے گی، جس کی برکت سے اللہ رب العزت ساری امت کو بیک وقت کبھی کسی گمراہی پر جمع نہیں فرمائیں گے، جس کا تذکرہ حدیث مذکور میں ہوا۔

ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ مَالِكٍ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ أَجَارَكُمْ مِنْ ثَلَاثِ خِصَالٍ، أَنْ لَا يَدْعُوَ عَلَيْكُمْ نَبِيُّكُمْ فَتَهْلِكُوْا جَمِيْعًا، وَ أَنْ لَا يَظْهَرَ أَهْلُ الْبَاطِلِ عَلٰى أَهْلِ الْحَقِّ، وَ أَنْ لَا تَجْتَمِعُوْا عَلٰى ضَلَالَةٍ."

(رواه أبوداود: ۲/ ۵۸۴)

"اللہ تعالیٰ نے تمہیں تین چیزوں سے بچا رکھا ہے: (۱) تمہارا نبی تم پر بددعا نہیں کرے گا، جس کے نتیجہ میں تم سارے (بیک وقت) ہلاک ہو جاؤ، (۲) اہل باطل کبھی (مکمل طور پر) اہل حق پر (اس طرح) غلبہ نہیں پائیں گے (کہ انہیں بالکل مٹا دیں) (۳) تم (تمام امت بیک وقت) کسی گمراہی پر اکٹھے نہیں ہو گے۔"

مطلب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں کسی نہ کسی مقام پر ایک جماعت حق کی نمائندگی کرنے والی ضرور موجود رہے گی۔

قرآنِ کریم نے اسی جماعت کے لیے کامیابی کی خوش خبری سنائی ہے:

﴿وَ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۰۴)

علماءِ دیوبند اور ان کی مختلف شاخیں:

ظاہر ہے کہ امت کی اس مقدس اور عنداللہ مقبول جماعت کا پہلا مصداق تو بالیقین

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں، ان کے بعد ہر دور میں جن لوگوں نے بھی سرکارِ دوعالم ﷺ کی سنت اور صحابہؓ کی جماعت کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دین وشریعت پر استقامت اور قولاً، فعلاً وعملاً کتاب وسنت کی دعوت وتبلیغ کو اپنا فریضہ، وظیفہ اور مقصدِ اعلیٰ بنایا یقیناً وہی اس مقدس اور عنداللہ مقبول جماعت کا مصداق ہیں، جیسے الحمدللہ اس صدی میں علماءِ دیوبند اور ان کی جماعت ہے، گذشتہ ڈیڑھ صدی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرات علماءِ دیوبند اور ان کی جماعت نے دین کے مختلف شعبوں میں دعوت وتبلیغ، تصنیف وتالیف، تحقیق وتدریس، تزکیہ وتصفیہ کے ذریعہ کتاب وسنت کی نشر واشاعت اور مسلک اہل سنت والجماعت کی نمائندگی ووکالت کے ساتھ ساتھ سارے عالم میں اور خصوصاً برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو باقی رکھنے کے لیے جو جدوجہد کی ہے وہ بھی تاریخ اسلامی کا ایک ایسا زرّیں باب ہے جس سے کوئی منصف مصنف ومؤرخ صرف نظر نہیں کرسکتا۔

شاد باش وشاد زی اے سرزمین دیوبند   ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

اور:

شہر نبی کے بعد جو ہم کو پسند ہے   دار العلوم نام ہے، جو دیوبند ہے

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ سے کسی نے پوچھا کہ دیوبندی کیا چیز ہے؟ کوئی مذہب ہے یا فرقہ؟ آپؒ نے فرمایا: ''نہ مذہب ہے، نہ فرقہ، بلکہ ہر معقول پسند دین دار (اہل سنت والجماعت) کا نام دیوبندی ہے۔'' (کرنیں/صفحہ: ۲۸۵، از: ابن الحسن عباسی)

حقیقت بھی یہی ہے، بقولِ شاعر:

چراغوں کی لو سے ستاروں کی ضو تک   تجھے وہ ملیں گے جہاں رات ہوگی

اس بنا پر عاجز کے خیالِ ناقص میں علماءِ دیوبند اور ان کی مقدس جماعت کی مثال:

﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ○ تُؤْتِيْ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا﴾ (إبراهيم: ٢٤-٢٥)

اس پاکیزہ درخت کے مانند ہے جس کی جڑ بہت ہی مضبوط اور شاخیں نہایت ہی بلند ہیں، وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا رہتا ہے۔ اور لوگ برابر اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں، یہی حال علماءِ دیوبند کا ہے، جس طرح کسی مضبوط درخت کی مختلف شاخیں ہوتی ہیں اسی طرح اس شجرۂ طیبہ (علماءِ دیوبند) کی بھی مختلف شاخیں ہیں، من جملہ ان میں ہندوستان میں جمعیت علماءِ ہند ہے اور پاکستان میں جمعیت علماءِ اسلام ہے۔

جمعیت علماءِ ہند کا قیام:

اس کا قیام ملک وملت کے ناگفتہ بہ حالات کے وقت ملک کی آزادی اور ملت کی سربلندی جیسے اہم مقاصد کے تحت وجود میں آیا، ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ اور انگریزوں کا ظالمانہ وغاصبانہ قبضہ وتسلط ہوگیا تو اُن حالات میں سب سے پہلے امت کا رِشتۂ ملت سے مضبوط کرنے کے لیے اولاً حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اپنے رُفقاء کو لے کر ۱۵/محرم الحرام/۱۲۸۳ھ مطابق: ۳۰/مئی/۱۸۶۶ء کو دیوبند کی چھتہ مسجد میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی، جس کو آج اُم المدارس کا شرف حاصل ہے، تاریخ شاہد ہے کہ واقعی علماءِ دیوبند نے اُمت کا رِشتۂ ملت سے بڑی حد تک مضبوط کر دیا، مگر ملک پر چوں کہ ظالم حکومت کا قبضہ تھا اس لیے ملت کی حفاظت کے ساتھ ملک کی حفاظت بھی ضروری تھی، اور ملت کی سربلندی کے ساتھ ملک کی آزادی بھی ضروری تھی، نیز جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں اسلام اور شعائرِ اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی جمعیت واجتماعیت کے لیے کسی تنظیم کا قیام بھی ضروری تھا، کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک مختصر جماعت بھی اگر منظّم ہوکر مقصد اور حکمت کے ساتھ کام کرے تو وہ پوری قوم کو سنبھال سکتی ہے، اس کے برخلاف لاکھوں انسانوں کی بھیڑ اگر جمع کر لی جائے؛ لیکن اس میں تنظیم اور اجتماعیت نہ ہو تو کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

اس لیے علماءِ دیوبند ہی کے ایک گروہ نے حقیقی مسئولیت، تقاضائے وقت اور اصل

ذمہ داری کومحسوس کرتے ہوئے نومبر/ ۱۹۱۹ء کی آخری تاریخوں میں بمقام دہلی علماءِ ہند کی ایک دستوری جماعت یا تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور علماءِ ہند کی ایک معتد بہ جماعت کے اتفاق سے اس کا نام ''جمعیت علماءِ ہند'' رکھا گیا، جس کے پہلے صدر مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور ناظم حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحبؒ منتخب ہوئے۔

جمعیت اور علماء:

جمعیت علماءِ ہند دراصل ہندوستان کے معتبر و مستند علماءِ حقانی وربانی کی جماعت اور تنظیم کا نام ہے، جس کے اراکین کشمیر سے کنیا کماری اور بمبئی سے لے کر منی پور تک ملک بھر کے شہروں اور دیہاتوں میں موجود اور متحرک ہیں، اس لیے حقیقت تو یہ ہے کہ ''جمعیت'' علماء کے بغیر کالعدم ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچائی ہے کہ اگر علماء کے بغیر جمعیت کا کوئی وجود نہیں تو خود علماء کے لیے بھی ملک وملت اور امت کی خدمت کا بہترین پلیٹ فارم جمعیت ہے، اس اعتبار سے گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے جسم اور روح کی طرح لازم وملزوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزِ اوّل ہی سے جمعیت اور علماء کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے، جیسا کہ جمعیت کے قائدین پر ایک نظر ڈالنے سے بھی یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے، چنانچہ قیامِ جمعیت ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک اس کے صدر مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ رہے اور ناظم عمومی سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ رہے، ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۷ء تک اس کے صدر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور ناظم عمومی ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۱ء تک حضرت ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد بہاریؒ رہے، ۱۹۵۷ء سے اس کے صدر سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ رہے تو ۱۹۴۲ء تا ۱۹۶۲ء ناظم عمومی مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ رہے، ۱۹۵۸ء تا ۱۹۷۱ء اس کے صدر فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ رہے اور ناظم عمومی ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۳ء سید الملت

حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ رہے، ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۳ء اس کے صدر حضرت مولانا عبدالوہاب صاحبؒ رہے اور ناظم عمومی ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۳ء فداءِ ملت امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ رہے، ۱۹۷۳ء تا ۲۰۰۶ء اس کے صدر امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ رہے اور ناظم عمومی ۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۱ء حضرت مولانا سید احمد ہاشمیؒ رہے، پھر ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۱ء ناظم عمومی حضرت مولانا محمد اسرار الحق صاحب قاسمی مدظلہ رہے، ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۵ء ناظم عمومی حضرت مولانا مفتی عبدالرزاق صاحبؒ رہے، ۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۱ء ناظم عمومی حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی مدظلہ رہے، ۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۸ء ناظم عمومی قائد جمعیت، مدبر سیاست، جانشین فداءِ ملت حضرت مولانا سید محمود اسعد مدنی مدظلہ رہے، ۲۰۰۶ء تا ۲۰۰۸ء اس کے صدر جگر گوشۂ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی مدظلہ رہے اور ۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۱ء ناظم عمومی حکیم العصر حضرت مولانا حکیم الدین صاحب قاسمی پرتاپ گڑھی مدظلہ رہے، اس کے بعد ۲۰۰۸ء تا حال اس کے صدر امیر الہند حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری مدظلہ استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند اور ناظم عمومی ہیں قائد جمعیت، مدبر سیاست، جانشین فداءِ ملت حضرت مولانا سید محمود اسعد صاحب مدنی مدظلہ ۲۰۱۱ء تا حال۔ (جمعیت علماءِ ہند، خدمات اور لائحۂ عمل/صفحہ:۱۸۲)

الحمدللہ، جمعیت سے منسلک تمام ہی علماء کو اللہ تعالیٰ نے مفاتیح الخیر کا مصداق بنا دیا، تاریخ شاہد ہے کہ انہیں اللہ رب العزت نے ملک وملت اور امت کے لیے خیر کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنا دیا، جیسا کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد سے اب تک جمعیت علماءِ ہند نے جو عظیم الشان کارہائے خیر انجام دیے وہ اس کا واضح ثبوت ہے، توقعات سے کسی قدر کم ہی سہی، مگر ملک کی آزادی اور ملت کی سربلندی کے لیے جمعیت علماءِ ہند نے جو خدمات انجام دیں انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ذیل میں ان کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

جمعیت علماءِ ہند کی آزادی سے پہلے ملکی وملّی خدمات:

۲۳/نومبر/ ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ملک کے مقتدر علماء شریک ہوئے اور جمعیت علماءِ ہند کے قیام کا فیصلہ ہوا، اس میں ملک کی آزادی کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رہائی کا پرزور مطالبہ کیا گیا۔ اس کے بعد ۲۸/ دسمبر/ ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں جمعیت علماء کا پہلا باقاعدہ اجلاس ہوا، جو درحقیقت ایک مشاورتی جلسہ تھا، اس کی تین نشستیں ہوئیں، پہلی نشست کی صدارت حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے کی، جب کہ دوسری اور تیسری نشست کی صدارت حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ (صدرِ جمعیت) نے فرمائی، اسی میں ایک مجلس منتظمہ بنائی گئی اور جمعیت کے ابتدائی دستور کا مسوّدہ پیش کیا گیا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے: ''جمعیت علماء کیا ہے؟'' صفحہ: ۳۰ تا ۱۶، مستفاد از: جمعیت علماءِ ہند، خدمات اور لائحۂ عمل/صفحہ: ۹۷)

۱۹۲۰ء:

۲۲/مئی/ ۱۹۲۰ء کو بحمداللہ جمعیت علماءِ ہند کی کوشش کے نتیجہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور آپؒ کے رُفقاء مالٹا سے رہا ہو کر بمبئی کے ساحل پر پہنچے، ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا، اس کے بعد ستمبر/ ۱۹۲۰ء میں جمعیت کا خاص اجلاس کلکتہ میں ہوا، جس میں ''تحریک ترکِ موالات'' (Non Coopration Movement) شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کی سب سے پہلی تجویز منظور ہوئی، اس اجلاس میں تقریباً دوسو علماءِ کرام شریک تھے، اس سال جمعیت کا دوسرا اجلاسِ عام دہلی میں ۱۹ تا ۲۱ نومبر کو منعقد ہوا، قطب عالم حضرت شیخ الہندؒ اس وقت اگرچہ دہلی ڈاکٹر انصاری کے مکان پر تشریف فرما تھے، لیکن شدتِ علالت کی وجہ سے اجلاس میں شریک نہ ہو سکے، آپؒ کی طرف سے خطبۂ صدارت حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے پیش فرمایا، جس میں آپؒ نے آزادی کی جدو

جہد کے لیے کانگریس کے مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی ترغیب دی، ساتھ ہی دوبارہ پوری قوت کے ساتھ ''ترکِ موالات'' کی تحریک چلانے کی تجویز پاس کرتے ہوئے صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ انگریزی حکومت کے ساتھ موالات اور نصرت و ملازمت کے تمام تعلقات و معاملات رکھنے حرام ہیں، حالاں کہ بعد میں انگریزی حکومت نے جمعیت علماء کا شائع کردہ ''ترکِ موالات'' کا فتویٰ ضبط کرلیا اور اس پر پابندی لگائی، پھر بھی جمعیت علماءِ ہند خلافِ قانون اس فتویٰ کو بار بار شائع کرتی رہی۔

۱۹۲۱ء:

جمعیت علماءِ ہند کی تیسرا اجلاسِ عام ۱۸ تا ۲۰ نومبر کو لاہور میں زیرِ صدارت مولانا ابوالکلام آزادؒ منعقد ہوا، اس پورے اجلاس میں بھی ''ترکِ موالات'' کا مسئلہ چھایا رہا، نیز امیر الہند کے انتخاب کی تجویز بھی پیش ہوئی، علاوہ ازیں اسی سال جب مالابار کے موپلہ مسلمانوں کے جوشِ ایمانی اور مجاہدانہ جذبہ کو ختم کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے سخت ترین مظالم ڈھائے تو اس موقع پر سب سے پہلے جمعیت علماءِ ہند ان کی مدد کے لیے سامنے آئی، پچاس ہزار کی خطیر رقم روانہ کی، جو اس وقت بڑی رقم تھی، اور پورے ملک کو ان مظالم سے آگاہ کر کے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی۔
(مستفاد از: ''تحریک آزادی میں جمعیت علماءِ ہند کا کردار''/صفحہ:۲)

۱۹۲۲ء:

۹-۱۰/ فروری کو مرکزی مجلس منتظمہ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، جس میں انفرادی سول نافرمانی کے جواز کا اعلان کیا گیا، پھر ۲۲/ مارچ کو دہلی میں مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا، جس میں طے کیا گیا کہ ۱۷/ اپریل کو خلافت اسلامیہ کے دوبارہ قیام کے سلسلہ میں پورے ملک میں ''یوم دعا'' منایا جائے، اس کے بعد ۲۴ تا ۲۶/ دسمبر کو جمعیت علماءِ ہند کا چوتھا اجلاسِ عام

زیر صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بہار میں منعقد ہوا، جس میں بطورِ خاص کونسلوں کے مقاطعہ کی تجویز پاس ہوئی۔

۱۹۲۳ء:

اس سال برطانوی حکمرانوں کی شاطرانہ سیاست نے ہندو مسلم مثالی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور آزادی کے خواب کو چکنا چور کرنے کے لیے شدھی سنگٹھن (فتنۂ ارتداد) کی تحریک شروع کی، جس کے نتیجہ میں پورے ملک میں فرقہ وارانہ فساد کے شعلے بھڑکنے لگے، اس موقع پر ایک طرف جمعیت علماءِ ہند نے فسادات کی روک تھام اور ہندو مسلم اتحاد برقرار رکھنے کی انتھک کوشش کی، تو دوسری طرف اس کے مقابلہ اور انسداد کے لیے جمعیت علماءِ ہند نے ایک مستقل شعبہ قائم کیا، جس کا نام ''شعبۂ تبلیغ وحفاظت اسلام'' تجویز کیا گیا، بحمد اللہ اس شعبہ کی منظّم جد وجہد سے ہزار ہا ہزار مسلمان دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور ان کی تربیت کا باقاعدہ انتظام کیا گیا۔ ۱۶/ جولائی کو جمعیت علماء کی مجلس منتظمہ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں گائے کی قربانی کی پابندی کے سلسلہ میں یہ اہم تجویز منظور ہوئی کہ قربانی اسلام کا اہم ترین مسئلہ ہے اور ابتداءِ اسلام سے مسلمان اس سنت ابراہیمی پر عمل کرتے آئے ہیں، جن جانوروں کی قربانی کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے ان میں سے ہر جانور کی قربانی کا قانونی حق تمام مسلمانوں کو دیا گیا ہے، اس حق کے استعمال میں کسی کو مداخلت کرنے کا اختیار نہیں۔ اسی سال ۶/ نومبر کو جمعیت علماءِ ہند نے قادیانی کے کافر اور خارجِ اسلام ہونے کا فتویٰ مرتب کر کے ملک بھر میں تقسیم کیا۔

۱۹۲۴ء:

۲۶/ستمبر کو دہلی میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ''اتحاد کانفرنس'' ہوئی، جس میں جمعیت علماءِ ہند نے بھرپور حصہ لیا اور اکابر جمعیت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ،

شیخ الاسلامؒ، سحبان الہندؒ، امام الہندؒ اور دیگر مقتدر لیڈروں نے شرکت کی، اس وقت حکومت کی طرف سے بار بار توہین وانہدامِ مساجد کی کاروائیاں پیش آتی رہتی تھیں، جن کی وجہ سے جمعیت نے واضح طور پر اعلان کیا کہ شعائر اللہ یعنی مساجد وغیرہ کو انہدامی کاروائیوں سے بچانا تمام مسلمانانِ ہند کا اہم ترین فریضہ ہے۔

۱۹۲۵ء:

اس سال جمعیت علماءِ ہند نے اُس مسودۂ قانون کی مخالفت کی جس میں حکومت ہند نے حج وعمرہ کے لیے حجاز کا سفر کرنے والوں پر واپسی ٹکٹ کی خریداری لازم کر دی تھی، نیز حضرت مولانا عبد الحلیم صدیقی صاحبؒ کو نمائندہ کی حیثیت سے حجازِ مقدس بھیجا گیا، تاکہ وہ سلطان ابن سعودؒ سے ملاقات کر کے ہندوستانی حجاج کی مشکلات کے سلسلہ میں تحقیق کریں، اور اسی سال جمعیت علماءِ ہند کا ترجمان ہفت روزہ ''الجمعیت'' جاری کیا گیا۔ (جس میں بلا کسی تصویر کے خبریں شائع کی جاتی ہیں)

۱ تا ۳/ جنوری کو مراد آباد میں جمعیت علماءِ ہند کا پانچواں اجلاسِ عام منعقد ہوا، جس کی صدارت ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحبؒ نائب امیر شریعت صوبہ بہار واُڑیسہ نے فرمائی، اس اجلاس میں بھی دہلی اور بھرت پور کی بعض مساجد کے انہدام پر غم وغصہ کا اظہار کیا گیا۔

۱۹۲۶ء:

سلطان ابن سعودؒ کی دعوت پر جمعیت علماءِ ہند کا ایک وفد مؤتمر اسلامی مکہ مکرمہ میں شرکت کے لیے حجازِ مقدس گیا، اس وقت کے صدرِ جمعیت مفتیٔ اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ، سکریٹری مولانا عبد الحلیم صدیقی صاحبؒ، مولانا محمد عرفان صاحبؒ، اراکین میں مولانا احمد سعید صاحبؒ، مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ اور مولانا نثار احمد صاحبؒ تشریف لے گئے، ۱۱ تا ۱۴/ مارچ کو جمعیت علماءِ ہند کا ساتواں اجلاسِ عام کلکتہ میں زیرِ صدارت

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ منعقد ہوا، جس میں اہم تجاویز پیش کی گئیں، مثلاً شہر قاضیوں کا تقرر، مکمل ہندوستان کی آزادی، اصلاحِ معاشرہ، تبلیغ دین، اُردو کی ترویج و اشاعت اور انگریزی میں تفسیر قرآن کی اشاعت وغیرہ قابل ذکر ہیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب کانگریس بھی مکمل آزادی کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہ کرسکی تھی، کانگریس نے مکمل آزادی کا مطالبہ ۱۹۲۹ء میں کیا تھا، مگر یہ ان مردانِ حق اکابر جمعیت کی بے خوفی اور بے باکی تھی کہ انہوں نے ملک سے انگریزوں کو چلے جانے کا فیصلہ سنا دیا۔

۱۹۲۷ء:

۲ سے ۵/ دسمبر تک جمعیت علماءِ ہند کا آٹھواں اجلاسِ عام پشاور میں زیر صدارت علامہ انور شاہ کشمیریؒ منعقد ہوا، جس میں مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی صورتِ حال پر غور کیا گیا اور مختلف موضوعات پر جن میں اصلاحِ معاشرہ، آزادیٔ ہند، اوقاف کی حفاظت، اتحاد بین المسلمین اور تعلیم دین وغیرہ پر تجاویز منظور کی گئیں، حضرت سید الملت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ نے ''جمعیت علماء کیا ہے؟'' میں اسے بیان فرمایا ہے، افادۂ عام کے پیش نظر اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جارہا ہے:

''جمعیت علماءِ ہند کا یہ اجلاس مدارسِ اسلامیہ کے بانیوں، منتظموں اور کارکنوں کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کراتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی مشغولیت اور کم فرصتی اور ضروریاتِ زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے مدارسِ عربیہ کے دینی نصاب کو اس طور پر مرتب کریں جو ان کی مذہبی حالت کو درست کرنے اور مذہبی واقفیت بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ زمانہ کی ضرورتوں کو بھی ایک حد تک پورا کرسکے، اور تمام مدارسِ عربیہ دینیہ کا ایک نظام ہو اور سب اسی نظام کی پابندی کریں، تاکہ یہ تفریق اور انتشار جو مذہب وقوم کے لیے سب سے زیادہ مضرت رساں ہے دور ہو اور منظّم طور پر دینی تعلیم عام ہوجائے اور تعلیم کا حقیقی فائدہ حاصل ہو، اس ریزولیوشن (Resolution) کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ اجلاس مفصلۂ ذیل

حضرات کی کمیٹی معین کرتا ہے کہ وہ نصاب تجویز کرکے جمعیت علماء کے سامنے پیش کرے، تاکہ جمعیت اسے منظور کرکے مدارسِ عربیہ میں رِواج دینے کی سعی شروع کردے، کمیٹی کے ارکان یہ ہوں گے: مولانا انور شاہ کشمیری، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا سجاد بہاری، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا فضل حق رامپوری، اس کمیٹی کو اختیار ہوگا کہ اگر ضرورت سمجھیں تو دوسرے ماہرین تعلیم کا اِضافہ کرلیں۔

جمعیت علماءِ ہند کا یہ اجلاس عربی مدارس کے بااختیار کارکنوں سے درخواست کرتا ہے کہ طلبہ کی جسمانی صحت کے قیام وترقی کے لیے جسمانی ورزش کا طریقہ جاری کریں اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ورزش بھی لازم کردی جائے، تاکہ طلبہ کا بڑھتا ہوا شوق اساتذہ کی نگرانی میں شرعی حدود سے بھی متجاوز نہ ہو اور ان کی صحت وقوت کی بقاوترقی کا بھی کفیل ہو۔

جمعیت علماءِ ہند کا یہ جلسہ مسلمانانِ صوبۂ سرحد سے عموماً اور علماءِ کرام صوبۂ سرحد سے خصوصاً پرزور استدعا کرتا ہے کہ مذہبی احکام کی تعمیل واطاعت کو اپنی مذہبی اور قومی نجات کا واحد ذریعہ سمجھیں اور تمام ان مہلک اور تباہ کن رسوم کی اصلاح کے لیے کھڑے ہوجائیں جنہوں نے مسلمانوں کی دینی اور معاشرتی ومالی حالت کو تباہ کررکھا ہے، شادیوں میں دعوتوں اور جہیزوں کی حدود متعین کردی جائیں، تاکہ کوئی ان سے تجاوز نہ کرسکے، اسی طرح غمی کی رسوم میں قوم کی مالی حالت اور احکام مذہبی کے موافق اصلاح کی جائے، ان رسوم کی ادائیگی کے لیے سودی اور غیرسودی قرضے لینے کا طریقہ قطعاً بند کردیا جائے، یہ تمام فضول اور لایعنی امور جو محض عار وننگ کے خیال یا محض نام ونمود کے لیے لازم کردیے گئے ہیں ترک کردیے جائیں، غیرمشروع تماشوں اور تھیٹروں اور ہر قسم کی بداعمالیوں وبداخلاقیوں کے خلاف منظّم طور پر جدوجہد کی جائے، ان تمام امور کی انجام دہی اور نگرانی اور ضبط قائم رکھنے کے لیے قومی کمیٹیاں مقرر کی جائیں اور مشروعہ وغیرمشروعہ کے امتیاز کے لیے علماءِ کرام ان کمیٹیوں میں

داخل ہوں اوران کی رہنمائی کریں، کمیٹی کے فیصلے قوم کی متفقہ طاقت سے نافذ کیے جائیں اور اس فیصلے کے خلاف کرنے والے کو قومی مجرم قرار دیا جائے۔

جمعیت علماءِ ہند کا یہ اجلاس اس آسمانی فیصلہ اور احکامِ الٰہی کا اعلان کرتا ہے کہ خدائے برتر نے میت کے ترکہ میں مردوں اور عورتوں کے جو حقوق متعین فرمائے ہیں ان کی تعلیم اور ادائیگی ہر مسلمان پر فرض ہے، ہندوستان کے جن صوبوں میں شرعی قانونِ میراث کے خلاف اس رواج پر عمل ہو رہا ہے کہ عوتوں کو میراث نہ دی جائے، وہاں کے علماءِ کرام کو جمعیت کا یہ اجلاس پرزور طریقے سے استدعا کرتا ہے کہ مسلمانوں کو اس قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کے سخت عذاب اور قہرِ الٰہی سے آگاہ کریں اور تمام مسلمانوں سے درخواست ہے کہ اس رواج کو مٹانے اور اس کی جگہ شرعی قانونِ میراث کو جاری کرنے کے لیے متفقہ کوشش شروع کردیں اور جس قدر جلد ممکن ہو اس ہندوانہ رواج اور دورِ جاہلیت کے سیاہ داغ کو مسلمانوں کے چہروں سے مٹادیں۔

جمعیت علماءِ ہند کا یہ اجلاس مسلمانوں سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ لڑکیوں کی شادی پر روپیہ لینے کی رسم کو بہت جلد مٹادیں اور متفقہ طور پر فیصلہ کردیں کہ لڑکی کے معاوضہ میں شوہر سے کوئی رقم وصول نہ کی جائے اور شادیوں میں اسلامی شادی اور شریعت مقدسہ کی پابندی کا پورا لحاظ رکھا جائے، ہاں، اگر نکاح کے وقت شوہر سے مہرِ معجّل کے طور پر کوئی رقم لی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر اس کا لحاظ رکھا جائے کہ مہر کی یہ رقم لڑکی کا حق اور خالص اس کی ملک ہے، لڑکی کے اولیاء کو ہرگز یہ حق نہیں کہ وہ مہرِ معجّل وصول کرکے برادری کو کھلائیں، یا لڑکی کی رضامندی کے بغیر کسی دوسرے کام میں لائیں، اگر ایسا کریں گے تو یہ صریح ظلم ہوگا۔

عموماً ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کی اخلاقی پستی اور مذہب سے بیگانگی اور طرح طرح کے جرائم کے ارتکاب کا بڑا سبب ان کا روز افزوں افلاس ہے، اس لیے یہ اجلاس تمام باشندگانِ ہند سے عموماً اور خصوصاً مسلمانوں سے پرزور استدعا کرتا ہے کہ وہ ملکی

اور صرف ملکی تجارت وصنعت کو اپنے ہاتھ میں لیں اور اس کو فروغ دینے کی پوری کوشش کریں، خصوصاً لباس میں وہ دیسی کپڑا استعمال کریں جس کا سوت ہندوستان کی بوڑھیوں، بیواؤں اور غرباء کے ہاتھوں تیار ہوتا ہے، تاکہ ان مفلوک الحال ہم وطنوں کی زندگی آرام سے گزرے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسے تاجروں کی ہمت افزائی کریں جو دیسی تجارت و صنعت کو فروغ دے رہے ہوں۔

چوں کہ مسلمانوں کے بہت سے مذہبی معاملات ایسے ہیں جن میں حاکم مسلم کا فیصلہ ضروری ہے، اور غیر مسلم حاکم کا فیصلہ شرعی طور پر نافذ نہیں ہوتا، اور حکومت موجودہ نے مسلمانوں کی اس مذہبی ضرورت کو اب تک پورا نہیں کیا، اس بنا پر مسلمان سخت مذہبی مشکلات میں مبتلا ہیں، مثلاً ظالم اور جاہل شوہروں سے ان کی مظلوم عورتوں کی کوئی خلاصی نہیں ہوسکتی، مرتدہ کا نکاح فسخ ہونے میں اس کے شوہر کے حقوق زائل ہوجاتے ہیں، خیارِ بلوغ میں شرعی طور پر حکم فسخ حاصل نہیں ہوسکتا، طلاق کے بہت سے مسائل اُلجھے رہ جاتے ہیں، اس لیے یہ اجلاس گورمنٹ سے مطالبہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کی ان مذہبی مشکلات کے حل کے لیے بااختیار شرعی قاضی مقرر کردے، جن کے انتخاب کا حق مسلمانوں کو ہو، تاکہ ان قضاۃ کی عدالتوں میں ایسے معاملات کا شرعی فیصلہ ہوسکے۔

جمعیت علماءِ ہند کا یہ جلسہ حسب ذیل حضرات کی کمیٹی مقرر کرتا ہے: مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ثناءاللہ صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب، مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، مولانا محمد نعیم صاحب، مولانا قطب الدین، مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحکیم پیشاوری صاحب۔

جمعیت علماءِ ہند کا یہ اجلاس اس کی بھی درخواست کرتا ہے کہ مسلمان زکوٰۃ، عشر، خراج اور صدقات کے لیے ایک شرعی بیت المال قائم کریں، پھر مستحقین میں پوری امانت داری سے اسے صرف کریں۔ وغیرہ......

یہ ایک جھلک ہے ان تجاویز کی، ایک صدی گذرنے کے بعد بھی ان کی اہمیت و افادیت باقی ہے۔

اسی سال جب حکومت ہند کے دستور کی تبدیلی کا سوال پیدا ہوا تو حکومت برطانیہ نے سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ آئینی اصلاحات کے مطالبات کا جوش سرد ہو جائے اور ملک کی آزادی کی تحریک کچھ عرصہ کے لیے کھٹائی میں پڑ جائے، اس اجلاسِ عام میں سب سے پہلے جمعیت علماءِ ہند نے سائمن کمیشن کا مکمل بائکاٹ کیا اور اعلان کیا کہ کوئی ہندوستانی اس کمیشن سے تعاون نہ کرے، کانگریس نے بھی اس سے اتفاق کیا اور بالآخر دونوں کے اتفاق اور پرامن احتجاجی جلسوں کے نتیجہ میں ۳۱/ مارچ کو یہ کمیشن ناکام ہو گیا۔

علاوہ ازیں کتاب ''رنگیلا رسول'' کے مقدمہ کے سلسلہ میں جسٹس کنور دلیپ سنگھ نے جانب داری سے کام لیا، جس کے خلاف مسلمانوں نے احتجاج کیا، اس موقع پر بھی جمعیت علماءِ ہند نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے جسٹس کنور دلیپ سنگھ کو ہائی کورٹ کی جیوری سے علاحدہ کردے۔

۱۹۲۸ء:

اس سال آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ میں شرکت کے لیے جمعیت علماءِ ہند کی طرف سے چند نمائندے منتخب ہوئے، جن کے اسماءِ گرامی یہ ہیں: (۱) مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب (۲) مولانا عبدالحلیم صدیقی (۳) سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب (۴) مولانا حسین احمد مدنی صاحب (۵) مولانا ریاست حسین صاحب (۶) مولانا حسرت علی موہانی (۷) مولانا محمد سجاد صاحب (۸) مولانا محمد عرفان (۹) مولانا محمد شفیع فرنگی محلی۔ بعد میں مزید ناموں کا اضافہ کیا گیا، اس وفد نے ''نہرو رپورٹ'' پر سخت تنقید کی، جس میں مکمل آزادی کے مطالبہ سے بچنے اور برطانوی حکومت کے زیر سایہ آئینی مراعات حاصل کرنے کی بات

کہی گئی تھی، نیز نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں یہ بھی طے کیا کہ اگر کانگریس نے مسلمانوں کی جائز ترمیمات کو قبول نہ کیا تو جمعیت کے نمائندے کانگریس سے اشتراکِ عمل نہ کریں گے۔ چوں کہ یہ تنقید معقول اور وزنی تھی، اس لیے بعد میں کانگریس نے بھی اس کو مسترد کر دیا۔

۱۹۲۹ء:

اس سال جمعیت علماءِ ہند نے گاندھی جی کی ''دانڈی مارچ'' اور نمک سازی تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور دیگر قومی کارکنوں کے ساتھ اکابر جمعیت بھی گرفتار ہوئے، اسی سال جمعیت نے حکومت وقت کے سامنے ''تحدیدِ عمرِ ازدواج'' اور سول میرج قانون (جو ''شاردا ایکٹ'' کے نام سے مشہور ہے) پیش کرنے پر پرزور احتجاج کیا اور ملک بھر میں سول نافرمانی کا پروگرام بنایا اور اس کی بھرپور مخالفت کر کے اس کو بے اثر کر دیا، کیوں کہ یہ ایکٹ مسلم پرسنل لا میں مداخلت تھی۔

۱۹۳۰ء:

۲۲/ اپریل کو قصہ خوانی بازار پشاور میں برطانوی حکومت نے سرحد کے غیور پٹھانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، سینکڑوں جوان شہید ہوئے، تو جمعیت علماءِ ہند کے صدر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مولانا محمد نعیم لدھیانویؒ پر مشتمل وفد تحقیقات کے لیے گیا، ظالم حکومت نے وفد کو پشاور جانے کی اجازت نہیں دی تو وفد کے اراکین نے راولپنڈی میں قیام کر کے رپورٹ مکمل کی، جب رپورٹ شائع ہوئی تو سامراجی اقتدار کے ایوان میں زلزلہ آ گیا، حکومت نے رپورٹ کو ضبط کر لیا، اس کے بعد ۳ تا ۶/ مئی کو جامع مسجد امروہہ میں جمعیت علماءِ ہند کا نواں اجلاسِ عام منعقد ہوا، جس میں قصہ خوانی بازار کے شہیدوں کے لیے پورے ملک میں ۳۰/ مئی کو یومِ دعا منانے کا اعلان کیا گیا، اسی اجلاس میں جمعیت علماء نے کانگریس کے ساتھ مل کر دوبارہ آزادی کی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کیا، ۱۱/ اکتوبر کو صدرِ جمعیت

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور اس کے ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعیدؒ کو قانونِ تحفظِ عامہ و بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے قید بامشقت کی سزا دی گئی اور آپؒ کی جگہ شیخ الاسلامؒ کو قائم مقام صدر بنایا گیا۔

۱۹۳۱ء:

۳۱/ مارچ تا یکم اپریل کو جمعیت علماءِ ہند کا دسواں اجلاسِ عام کراچی میں منعقد ہوا، جس میں ہندو مسلم فسادات پر اظہارِ نفرت، سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ اور فلسطین میں برطانیہ کی یہود نواز پالیسی پر مذمت کی گئی۔

۱۹۳۲ء:

اس سال آزادی کے لیے تحریک سول نافرمانی پوری شدت سے جاری رہی اور جمعیت کے اہم قائدین گرفتار کر لیے گئے، نیز جمعیت علماءِ ہند کے اجلاسوں اور میٹنگوں میں برابر اوقاف کے تحفظ اور ان کی آمدنی کے جائز تصرف پر زور دیا جاتا رہا، اس سال اس کوشش میں جمعیت کو کامیابی ملی اور اسلامی اوقاف کے تحفظ سے متعلق قانون کا مسودہ صوبہ یوپی اور بہار کی کونسلوں میں منظور کرا لیا گیا۔

۱۹۳۳ء:

۲۹ تا ۳۱/ اگست کو مرادآباد میں جمعیت کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا، اس میں تحریک سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ساتھ میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ جمعیت علماء کامل آزادی کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی رہے گی۔

۱۹۳۴ء:

اس سال حکومت کشمیر کی جانب سے مسلمانوں پر مظالم کے خلاف احتجاج کیا گیا،

نیز یوپی اسمبلی میں پیش کردہ وقف بل میں شرعی حدود کی رعایت رکھتے ہوئے ترمیمات پیش کی گئیں اور اجودھیا میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر مظالم کے خلاف پرزور احتجاج کیا گیا، علاوہ ازیں ۱۰ تا ۱۲/ اگست کو مرادآباد میں جمعیت علماء کا اجلاس ہوا، جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ جمعیت علماء کونسلوں کے لیے ایسے ہی اُمیدواروں کی حمایت کر سکتی ہے جو یہ وعدہ کریں کہ مذہبی قوانین کی تیاری میں جمعیت علماءِ ہند کی ہدایات کی پابندی کریں گے۔

۱۹۳۵ء:

اس سال حکومت ہند کا جو دستور بنایا گیا تھا اس میں مسلمانوں کی مذہبی و ملی مشکلات کے حل کے لیے جمعیت علماءِ ہند نے ایک فارمولا پیش کیا جو مجلس عاملہ کی میٹنگ میں ۳۱/ اگست/ ۱۹۳۱ء میں مرتب ہوا تھا، یہ ''مدنی فارمولا'' کے نام سے معروف ہے، اگر اس فارمولے کے مطابق دستور بنایا جاتا تو کافی حد تک مسلمانوں کی مشکلات حل ہو جاتیں اور ملک تقسیم نہ ہوتا، بہر حال گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ذریعہ مسلمانوں کو جو مراعات بھی حاصل ہوئیں وہ اسی فارمولے کی بنا پر شامل ہوئیں۔

۱۹۳۶ء:

یکم و ۲/ فروری کو مرادآباد میں مرکزی جمعیت کا مشاورتی اجلاس ہوا، جس میں سہارن پور، تھانہ بھون اور علماءِ پنجاب نے شرکت فرمائی، اس میں قانونِ فسخ نکاح کا مسودہ پیش کیا گیا اور طے کیا گیا کہ مسودہ کو اسمبلی میں پاس کرائے جانے کی کوشش کی جائے، اسی سال جمعیت کی حمایت سے مسلم لیگ کو الیکشن میں سو فی صد کامیابی حاصل ہوئی۔

۱۹۳۷ء:

جمعیت علماءِ ہند کی کوششوں سے شریعت اپلی کیشن ایکٹ بنایا گیا، جو آج تک

نافذ ہےاور یہ بات خاص ہے کہ خود شریعت اپلی کیشن ایکٹ میں جمعیت علماءِ ہند کا نام لکھا ہے کہ اس جیسی مضبوط جماعت کے مطالبہ پر یہ ایکٹ بنایا جارہا ہے۔

۱۹۳۸ء:

۸/ جنوری کی شب میں دہلی کے ایک عظیم الشان اجلاس میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں بلاتفریق مذہب و ملت ہندوستانیوں کے لیے متحدہ قومیت کی وکالت کی اور اس کو قرآن وسنت سے ثابت کیا، حالاں کہ اس وقت مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کی جانب سے مذہب پر مبنی قومیت کے تصورات پیش کیے جارہے تھے۔

۳/ اگست کو جمعیت کی مجلس عاملہ کا اجلاس زیر صدارت حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ دہلی میں منعقد ہوا، جس میں فلسطین میں برطانوی سامراج کے مظالم کے خلاف سخت غم وغصہ کا اظہار کیا گیا اور تمام مسلمانوں سے سول نافرمانی کی اپیل کی گئی اور کہا گیا کہ کوشش کریں کہ ہندوستان کی صوبائی حکومتیں مسلمانانِ ہند کی طرف سے برطانوی حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ قضیۂ فلسطین کو اہل فلسطین کی مرضی کے موافق جلد از جلد طے کرے، اسی کے ساتھ قاہرہ میں قضیۂ فلسطین سے متعلق مؤتمر عالم اسلام کی میٹنگ میں شرکت کے لیے جمعیت علماءِ ہند کی جانب سے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا عبدالحق مدنی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے گئے، علاوہ ازیں مشترک تعلیم گاہوں کا نام ''وِدیا مندر'' رکھنے پر جمعیت علماء نے احتجاج کرتے ہوئے تجویز منظور کی کہ اس نام سے ایک خاص فرقہ کے تعلق کا اظہار ہوتا ہے، اس لیے اس نام کو تبدیل کر کے ایسا نام رکھا جائے جو تمام ہندوستانیوں کے لیے یکساں قابل قبول ہو۔

۱۹۳۹ء:

۲۷ تا ۲۹/ مئی کو جمعیت علماءِ ہند نے برطانوی حکومت کے فلسطین سے متعلق

قرطاسِ ابیض کو عربوں کے ساتھ ناانصافی قرار دیا اور پرزور مطالبہ کیا کہ عربوں کو بلا تاخیر آزادی دی جائے۔ ۲۵/ستمبر کو جمعیت علماءِ ہند نے دوسری جنگ عظیم میں کسی طرح کا تعاون نہ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے جبری بھرتی کی پرزور مخالفت کی، نیز لکھنؤ میں شیعوں کی طرف سے تبرّا ایجی ٹیشن (Agitation) کی پرزور مذمت کی گئی کہ اس خلافِ آئین وخلافِ انسانیت حرکت کو جمعیت ملک کے امن کے لیے خطرۂ عظیم سمجھتی ہے، تبرّا کسی حالت میں اور کسی بھی وقت قابل برداشت نہیں ہے، لہٰذا حکومت جلد از جلد ایکشن لے کر حل کرے، اور مدحِ صحابہؓ سنیوں کا مذہبی، آئینی وشہری حق ہے، اس میں ہرگز مداخلت نہ کی جائے۔

۱۹۴۰ء:

اس سال حضرت سید الملۃ مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی کتاب ''علماءِ ہند کا شاندار ماضی'' کو ضبط کرلیا گیا اور حضرت مصنفؒ کو گرفتار کرلیا گیا، تو جمعیت علماءِ ہند نے اپنی مجلس عاملہ منعقدہ ۱۳/ جولائی میں اُسے ایک جابرانہ اقدام قرار دیا، جمعیت علماء پہلے بھی دوسری جنگ عظیم میں تعاون نہ دینے اور جبری بھرتی کی مخالفت کر چکی تھی، اب اس اقدام کی بھی مذمت کی، تو نتیجۃً جمعیت علماءِ ہند کے رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کرلیا گیا، جن میں حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا محمد قاسم شاہجہاں پوریؒ، مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوریؒ، مولانا شاہد میاں فاخری الٰہ آبادیؒ، مولانا محمد اسماعیل سنبھلیؒ اور مولانا سید اختر الاسلامؒ خاص قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۱ء:

۵-۶/ جنوری کو جمعیت علماءِ ہند کے اجلاسِ عاملہ میں طالبانِ آزادی کی تحریک ''ستیاگرہ'' کی حمایت کرتے ہوئے اعلان کیا گیا کہ سول نافرمانی میں عدمِ تشدد کا راستہ اپنایا جائے، کیوں کہ موجودہ حالات میں یہی مفید ہے۔

۱۹۴۲ء:

۱۸-۱۹/ مارچ کو لاہور میں منعقدہ مجلس عاملہ کے اِجلاس میں طے کیا گیا کہ عصر حاضر کی ضرورتوں کے تحت مسائل کے حل کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے، جمعیت علماء نے مسلم ارکان سے اپیل کی کہ وہ ایکٹ (۸) ۱۹۳۹ء میں یہ ضروری ترمیم کرادیں جس میں غیر مسلم جج سے نکاح فسخ کرانے کا تذکرہ ہے، کیوں کہ غیر مسلم جج سے فسخ نکاح کرانے سے شرعاً نکاح فسخ نہیں ہوتا۔ ۵/ اگست کو جمعیت علماءِ ہند کی مجلس عاملہ کے چار مقتدر ارکان مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ اور مولانا عبدالحلیم صدیقی لکھنویؒ کے دستخطوں سے ایک اخباری بیان جاری ہوا، جس میں کھلے لفظوں میں کہا گیا کہ ''انگریز ہندوستان چھوڑ دے، اور ہم ''آزاد ہندوستان'' سے وہ ہندوستان مراد لیتے ہیں جس میں مسلمانوں کا مذہب، ان کی اسلامی تہذیب اور قومی خصوصیات آزاد ہوں، اس کے بعد ۸/ اگست کو کانگریس نے اپنے اجلاسِ بمبئی میں ''کوئٹ انڈیا'' (Quit India) کی تجویز پاس کی، جس کی پاداش میں کانگریس کی طرح جمعیت علماء کے رہنما بھی گرفتار ہوئے، حضرت شیخ الاسلامؒ جون/ ۱۹۴۱ء ہی میں گرفتار کر لیے گئے تھے، نیز اسی سال جمعیت علماءِ ہند نے نظریۂ قیامِ پاکستان کی پوری قوت کے ساتھ مخالفت شروع کردی۔

۱۹۴۳ء:

۲۵-۲۶/ اکتوبر کو جمعیت علماءِ ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں ہوا، جس میں اہم تجاویز منظور کی گئیں، ایک تجویز میں بنگال کے بھیانک قحط کے نتیجہ میں ہونے والے بے شمار جانی و مالی نقصانات کی تلافی کی اپیل کی گئی اور ساتھ ہی مولانا بشیر احمد صاحبؒ کو کلکتہ جا کر بنگال کے ناگفتہ بہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے مقرر کیا گیا اور وہ معصوم بچے جن کے

والدین اور سرپرست بھوک کا شکار ہو کر جاں بحق ہو گئے تھے ان کی نگرانی اور تربیت کے لیے جمعیت کے کام سے اتفاق رکھنے والے مدارس و تربیت گاہوں کا انتظام کیا گیا اور قحط زدگی کے تعلق سے مرکزی و صوبائی حکومت کی طرف سے برتی جانے والی لاپرواہی کی سخت مذمت کی گئی، اس کے علاوہ ابتدائی طور پر ضرورت مند اور بے سہارا افراد کی مدد کے لیے مرکز سے مالی تعاون دیا گیا۔

۱۹۴۴ء:

۱۷ تا ۱۹/ جولائی کو جمعیت علماءِ ہند نے حکومت ہند سے پرزور مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے لیے فریضۂ حج کی ادائیگی کا فوراً انتظام کیا جائے، چوں کہ مسلمان دو برس سے اس فریضہ کی ادائیگی سے محروم ہیں، جس کی وجہ سے ان میں سخت اضطراب اور بے چینی پائی جاتی ہے، اب چوں کہ راستہ صاف ہے، اس لیے حکومت فوراً توجہ دے، ۸-۹/ نومبر کو جمعیت نے حکومت پنجاب کی اس تعلیمی اسکیم کی مذمت کی جس میں جبریہ تعلیم سے مذہبی تعلیم کا استثنا کر دیا گیا تھا، جمعیت نے اس اِقدام کو مسلمانوں کے حق میں مذہبی مداخلت قرار دیتے ہوئے پنجاب گورمنٹ اور حکومت دہلی سے مطالبہ کیا کہ جبریہ تعلیم میں مذہبی تعلیم کو داخل رکھا جائے، نیز دہلی کی ان مساجد کے سلسلہ میں جو سرکاری عمارتوں، کوٹھیوں اور اِحاطوں کے اندر تھیں غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے گورمنٹ سے مطالبہ کیا کہ مساجد مسلمانوں کا مذہبی شعار ہیں، اس لیے مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے، مرمت اور دیکھ بھال کرنے کی فوراً اجازت دی جائے اور مساجد کو محلّہ کی قید و بندش سے آزاد کیا جائے۔

۱۹۴۵ء:

۱۴-۱۵/ اپریل کو جمعیت علماء نے گورمنٹ سے مطالبہ کیا کہ کرنل پی ایم سائیکس کی کتاب ''اے ہسٹری آف پرشیا'' جس میں حضور ﷺ اور حضرت جبرئیلؑ کی فرضی

تصاویر شائع کی گئی ہیں فوراً پابندی لگائے یا ان تصاویر کو کتاب سے خارج کر دے، ۴/ مئی کو جمعیت کا چودھواں اجلاسِ عام سہارن پور میں منعقد ہوا، جس میں اہم تجاویز منظور ہوئیں، ان میں اُردو کے خلاف معاندانہ کارروائیوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا کہ جس طرح ہندوستان کی تقسیم کا تخیل بدیشی حکمرانوں کا پیدا کیا ہوا ہے، اسی طرح اُردو کو مسلمانوں کی زبان اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان کا تخیل بھی ان ہی کی ذہنی اختراع ہے، نیز اجلاس میں ملک کی تقسیم کی تجویز کی سخت تنقید کی گئی اور اس کے متبادل کے طور پر مدنی فارمولا پیش کیا گیا، علاوہ ازیں جلد از جلد حصولِ آزادی کے لیے ہندوستانیوں کے متفقہ محاذ بنانے کی اپیل کی گئی۔

۱۹۴۶ء:

۲۸-۲۹/ مارچ کو دہلی میں مجلس عاملہ کا اجلاس حضرت شیخ الاسلامؒ کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں برطانوی وزارتی مشن کے اس طرزِ عمل کو کہ اس نے اپنی ملاقاتوں کے پروگرام میں قوم پرور مسلمانوں کے مشترکہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے کسی نمائندے کو شامل نہیں کیا مذمت کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ کسی ایسے مسئلہ کو قبول نہیں کیا جائے گا جو اسلامی مفاد کے خلاف ہو۔

۱۵-۱۶/ اپریل کو مجلس عاملہ میں آزادئ ملک، مسلم پارلیمنٹری بورڈ، آزادئ مذہب، کلچر، ثقافت، زبان، رسم الخط، مذہبی تعلیم مذہبی تبلیغ، پرسنل لا، مذہبی عقائد و اعمال، عبادت گاہیں اور اوقاف جیسے امور پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ یہ امور بطور فنڈامنٹل رائٹس (بنیادی حقوق) ہوں، جن میں حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہو، ساتھ ہی صوبوں کی مکمل آزادی، خود ارادیت، مساوات تعداد ہندو مسلم کے فارمولے پیش کیے گئے۔ ۱۰ تا ۱۲/ جون کی مجلس عاملہ میں جمعیت علماءِ ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ آسام لائن سسٹم کے تحت جو ہندو مسلم خلافِ قانون آباد ہو چکے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور مسئلہ کے حل تک تمام سرحدوں کو بند کر دیا جائے، اسی کے ساتھ حکومت سے یہ

بھی مطالبہ کیا گیا کہ وہ کشمیر نیشنل کانفرنس کے تمام مطالبات تسلیم کر کے ہی اس مسئلہ کو حل کر سکتی ہے، متشددانہ کاروائی مسئلہ کا حل نہیں ہے، اسی سال مسلم پارلیمنٹری بورڈ نے حضرت شیخ الاسلامؒ کی قیادت میں پارلیمانی الیکشن لڑا، الیکشن کے دوران مسلم لیگیوں نے ان اکابر جمعیت کے ساتھ وہ طوفانِ بدتمیزی کھڑا کیا جس کا ایک شریف آدمی تصوّر بھی نہیں کر سکتا، مگر اکابر نے ہمت نہ ہاری اور جس بات کو حق سمجھا اسے ضرور کہا، اس وقت پورے ملک کے مسلمانوں کا ذہن اس قدر خراب ہو چکا تھا اور وہ پاکستان کے نعرے اور آزادی کے متعلق دِکھائے جانے والے خوابوں سے اِتنے بدمست ہو چکے تھے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود مسلم پارلیمنٹری بورڈ کو صرف ۱۶ فی صد نشستیں ملیں اور مسلم لیگ ۸۴ فی صد سیٹوں پر کامیاب ہوئی۔

۱۹۴۷ء:

اس سال جمعیت علماءِ ہند نے برطانیہ کے تقسیمی پلان پر اظہارِ بے زاری کرتے ہوئے کہا کہ جو پلان برطانیہ نے ہندوستانی لیڈروں کو سونپا ہے اس میں نہ تو مکمل آزادی کا ذکر ہے اور نہ ہندوستان کی وحدت کا، بلکہ پنجاب و بنگال تک کے ٹکرے کر دیے گئے ہیں، اس پلان کی وجہ سے مسلمانانِ ہند تین حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور تقریباً پانچ کروڑ مسلمان ایک ایسی اکثریت کے حوالے کر دیے گئے ہیں جس کی تعداد ۲۵ کروڑ ہے، مسلمانوں کی یہ تباہی ان کی گمراہانہ رہنمائی کا نتیجہ ہے، اگر اس نقصان دہ تقسیم کو ہی قبول کرنا تھا تو اس کا بہترین موقع وہ تھا جب کہ مسٹر گاندھی اور مسٹر راج گوپال آچاریہ اس تقسیم کو پیش کر رہے تھے، یا جب کہ کیبنٹ مشن سے گفتگو ہو رہی تھی، لیکن اس وقت پاکستان کو چھلکا اور سایہ کہہ کر مسٹر جناح نے رد کر دیا تھا، اگر یہ جھوٹا اور بے حقیقت پاکستان اس وقت قبول کر لیا جاتا تو مسلمان یوں تباہ و برباد نہ ہوتے، جمعیت علماء نے کانگریس کے رویہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس نے اس تقسیم کو منظور کر کے ملک کے مفاد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اپنے

اصول سے کھلا انحراف کیا ہے۔ (کارروائی مجلس عاملہ،۲۴/ جون، دہلی)

۱۵/ اگست/ ۱۹۴۷ء کو مجاہدین ملت کی بیش بہا قربانیوں کے بعد ہندوستان کی آزادی کا اعلان تو ہوا، لیکن برطانوی شاطر حکمراں اپنی پھوٹ ڈالنے والی سیاست میں کامیاب ہو چکے تھے، اس مبارک گھڑی میں ہندو مسلم اتحاد کی وہ عمارت جس کی تعمیر میں جمعیت علماءِ ہند کے اکابر کی مساعیٔ جمیلہ شامل تھیں وہ لرزہ براندام ہوگئی، نفرت کی آندھیوں میں صدیوں کے پروردہ رِشتے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئے، تقریباً اٹھائیس برس میں فرقہ وارانہ یگانگت، مفاہمت اور ملکی اتحاد کا جو سرسبز درخت کھڑا ہوا تھا اس کی جڑیں ہل گئیں، تقسیم ہند اور تبدیل آبادی کی ہولناک تباہی اور بے مثال قتل و غارت گری نے ساری خوشیاں خاک میں ملا دیں اور تقسیم کے جو خطرات جمعیت علماءِ ہند کے اکابر پیش کر رہے تھے وہ ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے، ایسے نازک وقت میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے بعد اگر کوئی سہارا تھا تو وہ ان کی جماعت جمعیت علماءِ ہند ہی تھی، جس نے اس بھیانک تاریکی میں اُمید کا چراغ روشن کیا، لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دیا اور حوصلوں کو بلند کیا، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ، امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ اور سید الملۃ مولانا محمد میاں صاحبؒ اس وقت کوہِ استقامت بن کر ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ ان اکابر جمعیت کے احسانات کا بدلہ چکانے سے قاصر ہے۔

۲۷-۲۸/ دسمبر کو جمعیت علماءِ ہند کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی صدارت میں ایک کنونشن لکھنؤ میں منعقد ہوا، جسے ''آزاد کانفرنس'' کہا جاتا ہے، اس میں جمعیت نے پارلیمانی سیاست سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کیا کہ وہ باضابطہ متحرک سیاست میں حصہ نہیں لے گی اور صرف دینی و رفاہی خدمات تک خود کو محدود رکھے گی، اور یکم فروری ۱۹۴۸ء کی مجلس عاملہ میں اس کی تائید کر دی گئی۔ (البتہ جمعیت علماءِ ہند نے انفرادی طور پر ہر رُکن کو غیر

فرقہ وارانہ سیاسی جماعت میں حصہ لینے کا اختیار دیا)۔ (مستفاد از: ''جمعیت علماءِ ہند، خدمات اور لائحۂ عمل/صفحہ: ۹۷تا۱۰۵)

آزادی کے بعد جمعیت علماءِ ہند کی دینی و رِفاہی خدمات:

اس کے بعد جمعیت علماءِ ہند نے اپنی سرگرمیوں کے لیے دینی، قومی، سماجی و رِفاہی خدمات کا میدان خاص کر لیا، کیوں کہ آزادی کے بعد وہ وقت آیا جس میں مسلمانانِ ہند تقسیم در تقسیم کے نتیجہ میں قریب قریب وہاں کھڑے تھے جہاں ابتداءِ اسلام میں مسلمان تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ جمعیت پر ہمیشہ سیاست کے بجائے شریعت اور حضور ﷺ کی سیرت کا غلبہ رہا ہے، جس کی ایک بہترین مثال جمعیت علماءِ ہند کا سفید اور سیاہ دھاری والا پرچم ہے، جو در حقیقت اس فاتح اعظم کے پرچم کی تاریخی یادگار ہے جس نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کے بجائے انہیں معاف کیا اور امن وامان کا پیغام دیا، چنانچہ ایک سائل نے حضرت براء بن عازبؓ سے حضور ﷺ کے پرچم کے متعلق سوال کیا تو فرمایا: ''كَانَتْ سَوْدَاءَ، مُرَبَّعَةً مِنْ نَمِرَةٍ.'' (رواه الترمذي و أبو داود، مشكوٰة:۲۳۸) (حضور ﷺ کا بڑا پرچم) سیاہ رنگ کا تھا اور اس کا کپڑا چوکور چتکبرا تھا۔ ''سوداء'' سے مراد یہ ہے کہ غالب رنگ سیاہ تھا، لیکن بالکل سیاہ بھی نہ تھا، بلکہ اس میں خطوط کی شکل میں سفید نشانات بھی تھے، اس لیے اس کو ''نمرۃ'' سے تشبیہ دے کر سمجھایا کہ چیتے جیسا۔ (مستفاد از: ''مظاہر حق جدید'': ۳/ ۸۶۵)

علاوہ ازیں جمعیت علماءِ ہند کے رہنماؤں نے ہمیشہ رہنمائی اور قیادت کے لیے حضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھا، جس طرح ابتداءِ اسلام کے مکی دور میں حضور ﷺ نے اپنی امت کو تیرہ سالہ مشکلات و مصائب سے نکالا اور حوصلہ دیا، بالکل اسی طرح صبر و استقلال اور دعوت الی اللہ کی راہ اختیار کرتے ہوئے ہندوستان میں منتشر ملت کی حوصلہ

افزائی اور رہنمائی میں جمعیت علماءِ ہند نے آزادی کے بعد سے اب تک قومی، سماجی، دینی اور ملی اعتبار سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں، من جملہ ان میں سے درجِ ذیل چند خدمات عدیم المثال ہیں۔

آزادی کے بعد جمعیت علماءِ ہند کی چند عدیم النظیر دینی وملی خدمات

(۱) فرقہ پرستوں سے مقابلہ
اور فرقہ وارانہ فساد کے متاثرین کی بازآبادکاری:

فرقہ پرستی کا جو طوفان تقسیم ہند کی زمانے سے شروع ہوا تھا وہ جمعیت علماءِ ہند کی کوششوں سے کچھ حد تک دب گیا تھا، لیکن ۱۹۶۱ء میں جبل پور کے بھیانک فرقہ وارانہ فساد نے اس افسوس ناک باب کو پھر کھول دیا، اس فساد میں مسلمانوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا، اس موقع پر ایک طرف تو جمعیت علماءِ ہند نے ہندوستان کے تمام اصحاب الرائے، سنجیدہ اور با اثر حضرات کو اپنی جماعتی حیثیت اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بالاتر ہو کر کسی ایک جگہ صورتِ حال پر غور وفکر اور مسلمانوں کے محفوظ مستقبل کے لیے لائحۂ عمل ترتیب دینے کے لیے جمع ہونے کی اپیل کی، دوسری طرف جمعیت علماءِ ہند کے اکابر نے عین فساد کے موقع پر جبل پور پہنچ کر فساد رُکوانے اور مسلمانوں کی عزت وآبرو کی حفاظت کی نادرِ مثال قائم کی، جبل پور کے بعد بھی ملک بھر میں جب کہیں بھی فساد ہوا جمعیت علماءِ ہند نے اپنی روایت کے مطابق ہمیشہ پہلے پہنچ کر بڑی خدمت انجام دی، خاص طور سے ۱۹۶۷ء میں گجرات، احمد آباد کا فساد، ۱۹۷۹ء میں جمشید پور کا فساد، تقسیم وطن کے بعد آسام کے مسلمانوں کو بنگلہ دیشی قرار دے کر وطن سے بے وطن کرنے، جائدادوں اور املاک سے محروم کرنے کی سازشیں ہوئیں تو فداءِ ملت مولانا سید اسعد مدنیؒ نے اس ظلم پر سخت اعتراض کیا، اس سلسلے میں ۲۸/ستمبر/ ۱۹۷۹ء کو ملک بھر میں یومِ آسام منانے کی اپیل کی اور آسام کی دو تنظیموں جن سنگرام پریشد اور چھاتر

سنگھ کے خلاف مقابلہ کرتے ہوئے حکومت سے جائز شہریوں کے لیے نیشنل رجسٹر آف سیٹیزن جاری کرائے گئے، اس کی کاپیاں جمعیت علماءِ آسام کے ضلعی دفاتر میں رکھوائی گئیں، اس کے بعد جمعیت نے ذیلی عدالتوں سے لے کر ہائی کورٹ تک اور گلی سے پارلیمنٹ تک اس معاملہ کو اُٹھایا اور آج بھی وہ اس سلسلہ میں جدوجہد کر رہی ہے۔

۱۹۸۰ء میں مراد آباد کا فساد، ۱۹۸۲ء میں میرٹھ کا فساد، ۱۹۸۳ء میں نیلی آسام کا فساد، ۱۹۸۴ء میں بھیونڈی کا فساد، ۱۹۸۷ء میں میرٹھ و ہاشم پورا کا قتل عام، ۱۹۸۹ء میں بھاگل پور کا فساد، اس میں جمعیت نے فساد زدگان کی ریلیف کے لیے کم وبیش دس لاکھ روپے خرچ کیے، ۱۹۹۰ء میں حیدر آباد کا فساد، ۱۹۹۲ء میں ۶/نومبر کو بابری مسجد شہید کر دی گئی اور پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے، نہایت بے دردی سے منصوبہ بند طریقہ پر مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا، بمبئی میں تاریخ کا بدترین فساد ہوا، جمعیت علماء کے مرکزی دفتر کا رابطہ پورے ملک سے قائم رہا اور اطلاعات اور فیکس کے ذریعہ فسادات کی روک تھام کے سلسلہ میں جمعیت نے تاریخی خدمات انجام دیں۔

۲۰۰۲ء میں گجرات کے احمد آباد کا فساد، ۲۰۱۲ء میں آسام کا فساد اور ۲۰۱۳ء میں مظفر نگر کا فساد، یہ انتہائی بھیانک قسم کے فسادات ہیں جن میں حضرت فداءِ ملت مولانا سید اسعد مدنیؒ سے لے کر آج تک حضرت امیر الہند مولانا قاری سید عثمان صاحب مدظلہٗ اور قائد جمعیت، جانشین فداءِ ملت مولانا سید محمود مدنی مدظلہٗ، حضرت حکیم العصر مولانا حکیم الدین قاسمی مدظلہٗ کے ساتھ سبھی سربراہانِ جمعیت عین فساد کے موقع پر متاثرہ علاقوں میں گئے اور فساد کے متاثرین کی دادرسی کی، بازآبادکاری کا عمل بھی بخوبی انجام دیا اور فسادیوں کے خلاف عدالتوں میں قانونی چارہ جوئی کی، آج بھی ایسے بہت سارے مقدمات جمعیت علماءِ ہند لڑ رہی ہے۔

(۲) قدرتی آفات سے متاثر ہونے والوں کی امداد:

قدرتی آفات مثلاً سیلاب اور زلزلہ وغیرہ سے متاثر ہونے والوں کے لیے جمعیت علماءِ ہند کی خدمات نایاب ہیں، جہاں پر بھی ایسا کوئی قدرتی حادثہ ہوتا ہے بلاتفریق مذہب و ملت جمعیت علماءِ ہند لوگوں کی مدد کرتی ہے، مثلاً ماضی میں بہار کا سیلاب، بمبئی کا سیلاب اور آسام کا سیلاب اور حال میں کشمیر اور چینئی کے سیلاب کے متاثرین کے لیے جمعیت علماءِ ہند نے بڑی خدمات انجام دی ہیں، کشمیر میں تقریباً ۷۶۳ مکانات تعمیر کر کے متاثرین کے حوالے کیے گئے، اسی طرح چینئی میں جمعیت نے ماضی قریب میں ۱۰۰ مکانات تعمیر کرائے، ۲۶/ جنوری/ ۲۰۰۱ء میں گجرات کے زلزلہ سے متاثر علاقوں میں ریلیف اور بازآبادکاری کا انتظام بالخصوص یتیم بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ''چلڈرن ویلج'' انجار میں ایک مثالی اور منفرد ادارہ قائم کیا گیا۔ یقیناً ان خدمات کی وجہ سے جمعیت اور وہ لوگ جو کسی بھی اعتبار سے اس کا ذریعہ بنے وہ خدمت خلق سے متعلق جتنے بھی فضائل ہیں ان کے حقدار ہیں۔

(۳) تحفظِ شریعت اور فتنۂ ارتداد کے خلاف جدوجہد:

آزادی کے بعد فتنۂ ارتداد نے سر اُٹھایا، پنجاب، ہماچل، گجرات اور راجستھان وغیرہ میں دین سے دوری کی وجہ سے مسلمانوں اور غیروں کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہ رہ گیا تھا، ساتھ ہی جہالت کی وجہ سے لوگ مرتد ہو رہے تھے، اس کے خلاف مقابلہ اور جدوجہد کے لیے جمعیت علماءِ ہند نے ایک تنظیم ''اصلاح المسلمین'' کے نام سے قائم کی، جس کا بنیادی مقصد حضرت شیخ الہندؒ کے منشا کے مطابق ملک بھر میں مکاتب دینیہ کا قیام عمل میں لانا ہے، الحمد للہ، اس وقت جمعیت علماءِ ہند کی کوشش سے اس کے ذمہ داران ملک بھر میں دس ہزار سے زائد مکاتب چلا رہے ہیں۔ (تحریک آزادی میں جمعیت علماء کا کردار/صفحہ:۵)

اسی کے ضمن میں محکمۂ شرعیہ کا قیام بھی عمل میں آیا، تا کہ ملک کے مسلمان اپنے نجی

نزاعی معاملات اور مسائل میں محکمۂ شرعیہ کی طرف رجوع کر کے اس کو حل کریں، نیز مسلمانوں میں دینی و اصلاحی شعور پیدا کرنے کے لیے ملک بھر میں ہر سال دس روزہ ''اصلاحِ معاشرہ'' کا پروگرام منعقد کیا جاتا ہے، جس کے لیے ذمہ دار افراد اور علماء پر مشتمل کمیٹیاں تشکیل دی جاتی ہیں، الحمد للہ، پورے سال ان کی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں، جس کے بہتر سے بہتر نتائج سامنے آرہے ہیں۔ یقیناً اس خدمت کی وجہ سے بھی جمعیت اور اس کی برکت سے وہ لوگ جو کسی بھی اعتبار سے اس کا ذریعہ بنے وہ تحفظِ شریعت کے فضائل کے حقدار ہیں، مثلاً ایک روایت میں ہے:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "رِبَاطُ يَوْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَ مَا فِيْهَا." (متفق عليه، مشكوٰة : ۳۲۹)

''اللہ کی راہ میں ایک دِن سرحد کی حفاظت میں گزارنے کا ثواب دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔''

جب سرحد کی حفاظت کا اِتنا ثواب ہے تو شریعت کی حفاظت کا ثواب کتنا ہوگا؟

(۴) تحفظِ اوقاف کے لیے جدوجہد:

ہندوستان میں موقوفہ جائداد اور مسلم اوقاف پر غاصبانہ قبضوں، نیز نااہل متولیوں کی جارحانہ گرفت اور خیانت کے نتیجہ میں ملت اسلامیہ بہت سی مالی، اقتصادی اور مذہبی دشواریوں کا شکار ہوگئی، واقعہ یہ ہے کہ اگر اوقاف کا تحفظ کیا جائے اور اس کی آمدنی کا صحیح انتظام وانصرام کیا جائے تو ملت اسلامیہ کے بہت سے مالی اور اقتصادی مسائل بڑی حد تک حل ہو سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جمعیت علماءِ ہند نے اپنے یومِ تاسیس سے لے کر اب تک الحمد للہ اوقاف کے مسائل کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا، چنانچہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً سترہویں اجلاسِ عام میں جو ۲۷ تا ۲۹/ اپریل/ ۱۹۳۶ء کو حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا اس میں اوقاف کے مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ

''وقف مذہبی حیثیت سے ہمیشہ قابل احترام رہا ہے، یہ واقف کی ''الباقیات الصالحات'' میں سے ہوتا ہے، جس کے ذریعہ ضرورت مندوں کو دائمی فائدہ اور واقف کو ہمیشہ اجر وثواب ملتا ہے، دورِ حاضر میں مسلمانوں کی اقتصادی مشکلات اور ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی اوقاف کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، مسجد اور دوسری عبادت گاہوں، خانقاہوں، قبرستانوں، نیز مذہبی و دینی درسگاہوں کی مالی ضرورتیں، تعلیمی وظائف، یتیموں اور بیوہ عورتوں کی نگہداشت اور اس طرح کی اہم دینی اور ملی ضرورتوں کو ان کے ذریعہ پورا کیا جاسکتا ہے، مگر افسوس کہ انقلابِ زمانہ نے ان کو ختم کردیا ہے۔''

جمعیت علماء نے مختلف موقعوں پر مختلف مؤثر تجاویز کے ذریعہ اوقاف کی بحالی، درستگی اور اصلاح کے لیے قانونی اقدامات کو آگے بڑھایا، اس سلسلہ میں پارلیمنٹ میں بھی (حضرت فداءِ ملتؒ کے ذریعہ) آواز اُٹھائی گئی اور کہا گیا کہ سیکولر اسٹیٹ صرف اسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے اور بین الاقوامی سطح پر نیک نام ہوسکتی ہے جب کہ ملک میں مختلف فرقے اپنی مذہبی ضرورتیں بآسانی پوری کرتے رہیں، ان کے مذہبی اِدارے محفوظ ہوں اور وہ آزادانہ طور پر ترقی کررہے ہوں، اس لیے اوقاف کا تحفظ صرف مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ ہی سے ضروری نہیں؛ بلکہ سیکولرزم کی کامیابی کے لیے بھی اہم ہے، نیز حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ مرکزی وقف ایکٹ کے ماتحت آنے والے تمام علاقوں میں اوقاف کی جائداد کی ناجائز فروخت اور انقلابات پر قانونی پابندی لگائی جائے اور اب تک جو ناجائز قبضے ہوئے ہیں ان کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی بنادی جائے، علاوہ ازیں جمعیت علماءِ ہند نے عوام الناس کو بھی بار بار اس طرف توجہ دلائی کہ اوقاف کی نگرانی کے لیے عام انتخاب کے ذریعہ ایسی کمیٹیاں مقرر کریں جو معتبر علماء اور بااثر اصحاب الرائے لوگوں پر مشتمل ہوں اور جس متولی کی خیانت اور نااہلیت ثابت ہو اسے اوقاف کی نگرانی و کمیٹی سے معزول کرکے کسی دیندار اور متقی شخص کو متولی مقرر کریں۔ تحفظِ اوقاف کے سلسلہ میں جمعیت علماءِ ہند کی اوقاف کی جائداد کو رنٹ کنٹرول ایکٹ سے مستثنیٰ کرانے کی کوشش بھی قابل ذکر ہے۔ (مستفاد از: ''جمعیت علماءِ ہند،

خدمات اور لائحۂ عمل'' /صفحہ:۳۷۲تا۳۷۵)

(۵) ''ادارۃ المباحث الفقہیہ'' کا قیام:

جمعیت علماءِ ہند نے اپنے قیام کے اغراض ومقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک طرف تو ملک کی آزادی کے لیے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور دوسری طرف ملت کی سربلندی کے خاطر مختلف میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، من جملہ ان کے ''ادارۃ المباحث الفقہیہ'' کا قیام بھی ہے، اس لیے کہ ملت اسلامیہ کے جدید پیش آمدہ مسائل کے شرعی حل کے لیے اجتماعی غور وفکر کرنے کا حکم ہے، چنانچہ ایک موقع پر رحمت عالم ﷺ سے عرض کیا گیا کہ ''كَيۡفَ نَفۡعَلُ إِذَا جَاءَ نَا أَمۡرٌ لَمۡ نَجِدۡهُ فِيۡ كِتَابِ اللّٰهِ وَ لَا فِيۡ السُّنَّةِ؟'' اگر ہمیں کوئی ایسا امر پیش آئے جس کا حل کتاب وسنت میں نہ مل سکے تو ہمیں اس موقع پر کیا کرنا چاہیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

اِجۡمَعُوۡا لَهُ العَابِدِيۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ، فَاجۡعَلُوۡهُ شُوۡرىٰ بَيۡنَكُمۡ، وَ لَا تَقۡضُوۡا فِيۡهِ بِرَأۡيٍ وَّاحِدٍ.'' وَ فِيۡ رِوَايَةٍ : '' تَشَاوَرُوۡا الۡفُقَهَاءَ وَ العَابِدِيۡنَ.''

(إحياء العلوم : ١/١٠٤)

یعنی ایسے مسائل کے حل کے لیے امت کے نیک اور صالح فقہاء کو جمع کرو اور ان کے باہمی مشوروں سے حل نکالو، کسی ایک شخص کی رائے کی پیروی نہ کرو۔ بقول صدرِ جمعیت، امیر الہند حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری مدظلہ اس فرمان کی تعمیل میں عہد خیر القرون میں دورِ فاروقی میں اس طرح کی دو مجلسوں کا ذکر ملتا ہے، ایک مجلس میں امیر المومنین سیدنا عمر فاروق، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم شریک تھے اور دوسری مجلس میں حضرت علی، حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ حضرات صحابہؓ کے بعد تابعین کے دور میں فقہاءِ سبعہ (۱) حضرت سعید بن المسیبؒ (۲) عروہ بن زبیرؒ (۳) قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ (۴) عبیداللہ بن عتبہ بن

مسعودؓ (۵) خارجہ بن زید بن ثابتؓ (٦) سلیمان بن یسارؒ اور (۷) ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوفؓ) کی اجتماعی جد و جہد اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا پیش آمدہ مسائل میں ان حضرات سے مشاورت کرنا اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔ اس کے بعد جب فقہاءِ اربعہ کا دور آیا تو حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ نے چالیس افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دی، جس نے اجتماعی اجتہاد کو پروان چڑھایا۔ بعدازیں عہد قریب میں ہمارے ہندوستان کے عہد عالم گیری میں ۲۳/ افراد پر مشتمل فقہاء کی اس مجلس نے اجتماعی غور وفکر اور جد و جہد کر کے پیش آمدہ مسائل کے حل کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے، جس کو آج دنیا ''الفتاویٰ الھندیہ'' یا ''فتاویٰ عالم گیری'' کے نام سے جانتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی جد و جہد اور علماءِ صالحین و فقہاءِ عابدین کے باہمی مشوروں کے ذریعہ نئے نئے مسائل کے حل کو تلاش کرنے میں جو فوائد ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ کسی مسئلہ کا حل فردِ واحد نکالے تو اس میں غلطی اور خطا کا امکان ہے، اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے ہمارا اجتماعی طور پر غور وفکر کرنا غلطی سے بچنے اور درستگی تک پہنچنے کے لیے بہترین راہ ہے، اسی بنا پر اس دور میں عالم عرب اور خود برصغیر میں اجتماعی غور وفکر کے متعدد ادارے سرگرمِ عمل ہیں۔

الحمدللہ، جمعیت علماءِ ہند کے اکابر نے بھی ۱۹۷۰ء میں شریعت کے اصول وضوابط کے مطابق جدید پیش آمدہ مسائل کی تحقیق و تنقیح اور اجتماعی غور وفکر کے لیے حضرت سید الملۃ مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کی نگرانی میں ''ادارۃ المباحث الفقھیہ'' قائم فرمایا، جس کے زیر انتظام ملک کے مختلف خطوں میں ۱۳ فقہی اجتماع ہو چکے ہیں، جن میں امت مسلمہ کو پیش آمدہ بیسیوں مسائل کا شرعی حل تلاش کر کے ایک اہم مذہبی ضرورت کو پورا کرنے کا فریضہ انجام دیا گیا ہے۔

الغرض آزادیٔ ہند کے بعد سے اب تک جمعیت علماءِ ہند نے جو فقید المثال ملی و رفاہی خدمات انجام دی ہیں ان کا یہ ایک مختصر جائزہ ہے۔

جمعیت علماءِ ہند کی اہمیت اور اس سے وابستگی کی ضرورت:

یہ حقیقت ہے کہ جمعیت علماء صرف اپنی تاریخ کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ تحریک کی وجہ سے بحمداللہ آج تک زندہ ہے، جمعیت علماءِ ہند کی اس تاریخ اور تحریک سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، یہ اس وقت ہندوستان میں مستند علماءِ حقانی و ربانی کی سب سے پرانی اور بڑی تنظیم ہے، الحمدللہ، جمعیت علماءِ ہند نے اپنے قیام سے لے کر اب تک ملت کی سربلندی اور امت کی رہبری کی ہر ممکن کوشش کی ہے، اس لیے ان شاء اللہ یہ جمعیت اس حدیث پاک کا مصداق ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا:

" لَا یَزَالُ مِنْ أُمَّتِی أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللّٰهِ، لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ، وَ لَا مَنْ خَالَفَهُمْ، حَتّٰى یَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ، وَ هُمْ عَلٰى ذٰلِكَ."

(متفق علیه، مشکوٰۃ:٥٨٣/ باب ثواب ھٰذہ الأمة)

اور جب تک روئے زمین کے کسی بھی حصہ وخطہ میں اس جیسی جماعت کا قیام ہوگا تب تک یہ امت اجتماعی طور پر کسی گمراہی پر متفق اور متحد نہیں ہوگی، جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے:

"إِنَّ اللّٰهَ لَا یَجْمَعُ أُمَّتِی أَو أُمَّةَ مُحَمَّدٍ عَلٰى ضَلَالَةٍ."

صاحبو! اس حقیقت کو بھی نہ بھولو کہ اہل علم اور اہل خیر کی جماعت ہمیشہ شر کے راستے کی سب سے بڑی رُکاوٹ ہوتی ہے، جس کا اشارہ آیت قرآنیہ سے بھی ملتا ہے:

﴿ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَ أَنْتَ فِیْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۝﴾ (الأنفال: ٣٣)

جب ابوجہل نے اپنی سرکشی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عذابِ الٰہی کو طلب کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً ارشاد فرمایا: محبوبم! جب تک آپ ان میں موجود ہیں ان پر

اللہ تعالیٰ کا عمومی عذاب نہیں آ سکتا، اور آپ کے بعد بھی جب تک امت مجموعی طور پر استغفار کا اہتمام کرے گی عمومی عذابِ الٰہی سے محفوظ رہے گی۔ (بخاری: ۲/۲۷۰)

اسی لیے رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو امانیں رکھی ہیں، جب تک یہ دونوں یا ان میں سے ایک امت کے درمیان ہے تب تک امت پر اللہ تعالیٰ کا عمومی عذاب نہیں آ سکتا، ان میں سے ایک امان تو رحمت عالم ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی، جو اللہ تعالیٰ نے اُٹھا لی اور دوسری باقی ہے، یعنی استغفار کا التزام واہتمام۔ (اس سے آج بھی عمومی عذابِ الٰہی سے حفاظت ہوگی)۔

(مستفاد از: نور البیان: ۲/۴۶۳)

حاصل یہ کہ حضور پاک ﷺ کا وجود خیر کا ذریعہ تھا اور یہی شر اور عذابِ الٰہی سے رُکاوٹ کا بڑا ذریعہ تھا، لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آج بھی خیر اور اہل خیر کا وجود شر اور عمومی عذابِ الٰہی سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

اور یہ ثابت ہوگیا کہ بحمد اللہ، جمعیت علماءِ ہند اہل علم واہل خیر کی جماعت ہے، اس لیے ان شاء اللہ اس جماعت کا وجود شر اور عمومی عذابِ الٰہی سے حفاظت کا ذریعہ بنا رہے گا۔
پھر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ "یَدُ اللّٰہِ عَلَی الجَمَاعَۃِ" (ترمذی، مشکوٰۃ: ۳۰) اللہ تعالیٰ کی نصرت، حمایت حفاظت اور رحمت (اہل خیر) کی جماعت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لیے ایک موقع پر رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنِ ابنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: "اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الأَعْظَمَ، فَإِنَّہٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ." (رواہ ابن ماجه من حدیث أنسؓ، مشکوٰۃ: ۳۰)

بڑی جماعت (یا جمہور علماءِ امت) کا اتباع کرو۔ اس لیے کہ ان کی حیثیت بھی اولوالامر کی ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد جن کی اطاعت واتباع شرعی امور میں کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ وہی جماعت ہے۔ اب جو بھی ان کے متفقہ امور واحکام سے

اعراض وانحراف کرے گا وہ جہنم رسید کر دیا جائے گا، اسی کو قرآنِ پاک نے دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيرًا ○ ﴾

جو شخص بھی ہدایت ظاہر ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرے گا اور مؤمنین (کاملین، مراد علماءِ ربانیین) کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ کی پیروی کرے گا ہم اس کو اسی راہ کے حوالہ کر دیں گے جو اس نے خود اپنائی ہے اور اُسے دوزخ میں جھونکیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ (العیاذ باللہ العظیم)

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ علماءِ دیوبند کی یہ نمائندہ جماعت جمعیت علماءِ ہند بھی منیبین کی جماعت ہے اور قرآنِ پاک میں ایک مقام پر منیبین کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے:

﴿ وَ اتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ﴾ (لقمان: ۱۵)

اس کا صحیح مصداق تو جمعیت کے وہ اکابر تھے جو گذر چکے، اب وہ دوبارہ آنے والے نہیں، لیکن جو اس وقت موجود ہیں انہیں بھی غنیمت سمجھنا چاہیے، تحصیل تبرک اچھی چیز ہے، لیکن اسی کے انتظار میں موجود کو گنوا دینا بھی دانائی نہیں۔

کتاب وسنت کے ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ کسی بھی زمانہ میں اگر اہل خیر اور علماءِ حقانی وربانی کی جماعت ہو تو اس کے وجود کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس سے وابستگی اختیار کرنی چاہیے اور اس کے شرعی واجتماعی امور کا اتباع کرنا چاہیے، حتی الامکان مخالفت سے بچنا چاہیے، یہی دورِ فتن میں عافیت اور اجتماعیت کا بہترین ذریعہ ہے، ایک حدیث میں اس کا اشارہ بھی ملتا ہے:

عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُونَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْخَيْرِ، وَ كُنْتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ أَنْ يُدْرِكَنِي، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّا

كُنَّا فِىْ جَاهِلِيَّةٍ وَّ شَرٍّ، فَجَاءَ نَا اللّٰهُ بِهٰذَا الخَيْرِ، فَهَلْ بَعْدَ هٰذَا الخَيْرِ مِنْ شَرٍّ ؟ قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ: وَ هَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الشَّرِّ مِنْ خَيْرٍ ؟ قَالَ : نَعَمْ، وَ فِيْهِ دَخَنٌ، قُلْتُ وَ مَا دَخَنُهٗ؟ قَالَ: قَوْمٌ يَسْتَنُّوْنَ بِغَيْرِ سُنَّتِىْ، وَ يَهْدُوْنَ بِغَيْرِ هَدْيِىْ، تَعْرِفُ مِنْهُمْ وَ تُنْكِرُ، قُلْتُ : فَهَلْ بَعْدَ ذٰلِكَ الخَيْرِ مِنْ شَرٍّ ؟ قَالَ: نَعَمْ، دُعَاةٌ عَلٰى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوْهُ فِيْهَا، قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! صِفْهُمْ لَنَا، قَالَ: هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا، وَ يَتَكَلَّمُوْنَ بِأَلْسِنَتِنَا، قُلْتُ : فَمَا تَأْمُرُنِىْ إِنْ أَدْرَكَنِىْ ذٰلِكَ ؟ قَالَ تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ إِمَامَهُمْ، قُلْتُ : فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَ لَا إِمَامٌ ؟ قَالَ : فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الفِرَقَ كُلَّهَا، وَ لَوْ أَنْ تَعَضَّ بِأَصْلِ شَجَرَةٍ حَتّٰى يُدْرِكَكَ المَوْتُ، وَ أَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ." (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٦٢، كتاب الفتن / الفصل الأول)

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ دیگر صحابہؓ تو حضور ﷺ سے خیر کے بارے میں سوالات کرتے تھے، جب کہ میں شر اور فتنہ میں مبتلا ہو جانے کے خوف سے اسی کے متعلق سوالات کیا کرتا تھا، ایک دن میں نے اپنی عادت کے متعلق حضور ﷺ سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''حضور! ہم لوگ اسلام سے پہلے جاہلیت اور شر میں مبتلا تھے، پھر اللہ رب العالمین نے ہمیں (آپ کے ذریعہ) یہ ہدایت اور خیر عطا فرمائی، تو کیا اس خیر کے بعد بھی شر ہے؟'' فرمایا: ''ہاں، خیر کے بعد بھی شر کا زمانہ آئے گا، مگر اس میں "دَخَن" ہوگا۔'' جس کے معنیٰ دھواں اور کدورت کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اس خیر کے بعد جو شر کا زمانہ آئے گا اس میں خیر شر سے ملی ہوئی ہوگی، اہل خیر کے ساتھ اہل شر، اہل سنت کے ساتھ اہل بدعت مخلوط ہو جائیں گے۔

یا پھر یہ مطلب ہے کہ خود اہل خیر کی زندگی میں بھی کچھ نہ کچھ شر ہوگا، اہل سنت کی زندگی میں بھی کچھ نہ کچھ بدعت کا دخل ہوگا، حضرت حذیفہؓ کے استفسار پر کہ حضور! اس کدورت کے مل جانے سے کیا اثرات رونما ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے گی جو میرے طریقے سے ہٹ کر دوسرا طریقہ اختیار کرے گی اور لوگوں

کو بھی اس کی ترغیب دے گی، ان کی بعض باتیں تم پسند کرو گے اور بعض ناپسند۔'' حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''حضور! اس خیر کے بعد بھی کوئی شر ہے؟'' فرمایا: ''ہاں، ایسے لوگ ہوں گے جو جہنم کے دروازے پر کھڑے ہو کر (اپنی گمراہیوں کی طرف) بلانے والے ہوں گے، جو ان کی دعوت قبول کرے گا وہ اس کو جہنم میں دھکیل دیں گے۔'' یعنی مفاد پرست اور گمراہ لوگوں کی جماعت ہوگی، جو لوگوں کو طرح طرح کے فریب اور مکاریوں کے ذریعہ اور مختلف قسم کے لالچ کے راستوں سے گمراہی کی دعوت دیں گے اور ہدایت سے ضلالت کی طرف، خیر سے شر کی طرف، سنت سے بدعت کی طرف راہ بتائیں گے، اور چوں کہ یہ جہنم کا راستہ ہے اس لیے حضور ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ جہنم کے دروازوں پر کھڑے ہیں، اب جو ان کی مانے گا وہ اسے بھی اپنے ساتھ جہنم میں لے جائیں گے۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! اُن داعیانِ جہنم کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرمایئے کہ وہ کون اور کیسے لوگ ہوں گے؟ (آیا وہ مسلمان ہوں گے یا کفار؟) فرمایا کہ ''وہ لوگ ہم ہی میں سے ہوں گے اور ہماری زبان میں بات چیت بھی کریں گے۔'' اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ لوگ ہمارے خاندان سے ہوں گے، یا پھر مسلمانوں میں سے ہوں گے، یعنی لوگ ان کو مسلمان سمجھیں گے، (جب کہ حقیقت میں ایسا نہ ہوگا)۔ یا پھر مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام میں سے ہی گمراہ ہونے والے ہیں۔ اور ''ہماری زبان میں بات چیت کریں گے'' کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ عربی میں بات کریں گے، اس میں اشارہ ہے کہ یہ اہل عرب ہوں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ غیر عرب ہو کر بھی عربی میں بات چیت کریں گے اور اس فضیلت مآب زبان کو گمراہی کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنالیں گے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلامی اور دینی زبان میں بات کریں گے، مثلاً قرآن و حدیث کے حوالوں سے بات چیت کریں گے، یا اسلامی اصطلاحات میں بات چیت کریں گے، تاکہ لوگوں کو بآسانی گمراہ کیا جا سکے۔

(مستفاد از: ''حدیث نبوی اور دورِ حاضر کے فتنے/ صفحہ: ۲۷۶ تا ۲۷۷)

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''حضور! اس زمانہ کے متعلق آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کو لازم پکڑلو۔'' مطلب یہ ہے کہ مختلف فرقوں سے ہٹ کٹ کر کتاب وسنت اور اسلام کے طریقہ پر چلنے والی مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کی اطاعت کرتے رہو۔ حضرت حذیفہؓ نے آخری سوال کیا کہ ''حضور! اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت اور امیر نہ ہو تو کیا کروں؟'' فرمایا: ''پھر کسی جگہ یکسوئی حاصل کرو، خواہ اس کے لیے تمھیں کسی درخت کی جڑ میں پناہ لینی پڑے، حتیٰ کہ موت آجائے۔''

ہمارا خیال یہ ہے کہ جب تک جمعیت علماءِ ہند اپنے مقاصد کے مطابق موجود و متحرک ہے تب تک کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ موقع نہیں ہے، اس لیے کہ الحمدللہ، ہمیں پورا اطمینان ہے کہ دورِ فتن میں جمعیت علماء جماعتِ حقہ ہے، اس سے وابستہ ہوکر بزرگوں کی اس امانت کو اسے مزید تقویت پہنچانی چاہیے۔

ورنہ......

اپنے مرکز سے اگر دور نکل جاؤ گے غائب ہوجاؤ گے، افسانوں میں ڈھل جاؤ گے
اپنی ہی مٹی میں چلنے کا سلیقہ رکھو سنگ مرمر پہ چلوگے تو پھسل جاؤ گے
دے رہے ہیں جولوگ تمھیں رِوایت کا فریب ان کی تاریخ پڑھوگے تو دہل جاؤ گے
تم ہو اس زندہ و جاوید رِوایت کے چراغ تم کوئی شام کا سورج ہو کہ ڈھل جاؤ گے؟
سورج ہمیں ہر شام یہ درس دیتا ہے مغرب کی طرف جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے

حق تعالیٰ جمعیت کو ہماری اجتماعیت اور ملکی وملی قوت کا ذریعہ بنادے۔ آمین یارب العالمین۔

۹/ رجب المرجب/ ۱۴۳۷ھ

مطابق: ۷/ اپریل/ ۲۰۱۷ء/ بروز جمعہ (بزمِ صدیقی، بڑودہ)

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَصَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَإِنَّکَ أَنْتَ أَھْلُ التَّقْوٰی وَ أَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ

(۴)

اسلام کا پیغام انسانیت کے نام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِيِّ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ قَالَ: ''لَیَنْتَھِیَنَّ أَقْوَامٌ یَفْتَخِرُوْنَ بِآبَائِھِمُ الَّذِیْنَ مَاتُوْا، إِنَّمَا ھُمْ فَحْمٌ مِنْ جَھَنَّمَ، أَوْ لَیَکُوْنُنَّ أَھْوَنَ عَلیٰ اللّٰہِ مِنَ الْجُعْلِ الَّذِیْ یُدَھْدِہُ الْخِرَاءَ بِأَنْفِہٖ، إِنَّ اللّٰہَ قَدْ أَذْھَبَ عَنْکُمْ عُبِّیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَ فَخْرَھَا بِالْآبَاءِ، إِنَّمَا ھُوَ مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ، أَوْ فَاجِرٌ شَقِيٌّ، النَّاسُ کُلُّھُمْ بَنُوْ اٰدَمَ، وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ.'' (رواہ الترمذی و أبو داود، مشکوٰۃ: ۴۱۷/ باب المفاخرۃ و العصبیۃ)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ اپنے (کفر وشرک پر) فوت شدہ آباؤ اجداد پر فخر کرنے سے باز آجائیں، وہ تو دوزخ کا کوئلہ ہیں، (اس کے باوجود اگر لوگوں نے فخر کرنا نہ چھوڑا تو) وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس گندے کیڑے سے بھی بدتر ہوجائیں گے جو اپنی ناک سے گندگی کریدتا ہے، بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا تکبر اور آباؤ اجداد پر فخر کرنا دور کردیا ہے، انسان یا تو متقی مومن ہے، یا شقی کافر، اور تمام ہی انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اور آدم علیہ السلام (کی اصل) مٹی سے ہے۔''

اسلام کا پہلا عمومی پیغام انسانیت کے نام:

اللہ رب العزت کے اعلان اور قرآن کے فرمان کے مطابق پوری انسانیت کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے وجود سے ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی قدرت سے پیدا فرمایا، پھر آپ ہی سے ماں حوّا رضی اللہ عنہا کو پیدا فرمایا، اس کے بعد اس مقدس جوڑے سے ساری انسانیت کو وجود عطا کیا، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ﴾ (النساء : ۱)

ترجمہ: ”اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے، اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، پھر ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو وجود بخشا۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ (الحجرات : ۱۳)

ترجمہ: ”اے لوگو! بے شک ہم نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو (لیکن یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری شرافت و کرامت کی بنیاد اتفاقات کو نہیں، اکتسابات کو بنایا ہے، لہٰذا اب) اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔“

ان آیاتِ مبارکہ میں اسلام کا پہلا عمومی پیغام انسانیت کے نام یہ دیا گیا کہ ”تم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہو، ایک ہی درخت کی شاخیں ہو، ایک ہی گلدستہ کے پھول ہو۔“ یہی بات مذکورہ حدیث میں فرمائی گئی کہ ”النَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْ آدَمَ“ ”تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔“ خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی، گورے ہوں یا کالے، لال ہوں یا پیلے،

پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ، امیر ہوں یا غریب، تمام کے تمام اصلاً حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، یہی پیغام پیغمبر اسلام ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا:

” إِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، وَ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ.“ (مسند أحمد)

ترجمہ: ”تمہارا باپ بھی ایک ہے، اور تمہارا رب بھی ایک ہے۔“ تمہارا اللہ بھی ایک ہے اور ابا بھی ایک ہے، تم سب کا رب اللہ ہے، اور ابا حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اس میں وحدت، محبت اور اخوّت کا سبق ہے۔

صاحبو! جس طرح دنیا کے تمام مسلمان آپس میں اسلامی رشتہ سے بھائی بھائی ہیں، اسی طرح دنیا کے تمام انسان آپس میں انسانی رشتہ سے بھائی بھائی ہیں، کیوں کہ سب کی اصل ایک ہی ہے، اس لیے سب کے سب ایک ہی کنبہ اور خاندان کے مختلف افراد ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے کہا تھا:

یہ پہلا سبق ہے کتابِ ہُدیٰ کا کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا

اسلام کا دوسرا عمومی پیغام انسانیت کے نام:

جب ساری دنیا کے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں تو پھر ان کے آپس میں بحیثیت انسان کوئی اونچ نیچ نہیں ہے، دنیا میں ہر انسان بحیثیت انسان لائق تکریم اور قابل احترام ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ ﴾ (بنی إسرائیل : ۷۰)

ترجمہ: ”ہم نے بنی آدم کو باعزت، لائق تکریم اور قابل احترام بنایا ہے۔“ اور ظاہر ہے کہ بنی آدم میں دنیا کے تمام انسان داخل ہیں، صرف مسلمان نہیں، جیسا کہ بغداد کے عظیم مفتی علامہ آلوسی صاحب روح المعانی اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

” أَيْ جَعَلْنَاهُمْ قَاطِبَةً بَرَّهُمْ وَ فَاجِرَهُمْ ذَوِيْ كَرَمٍ، أَيْ شَرَفٍ وَ

مَحَاسِنَ." (روح المعانی:٦/١٧١) "مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام ہی انسانوں کو عظمتوں اور مختلف خوبیوں والا بنایا ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد، (اور مسلم ہو یا غیر مسلم) حق تعالیٰ نے ہر فردِ بشر کو الگ الگ صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا اور بحیثیت انسان ہر ایک کو لائق تکریم اور قابل احترام بنایا ہے۔"

یہ اسلام کا انسانیت کے نام دوسرا عمومی پیغام ہے کہ "دنیا کا ہر انسان بحیثیت انسان لائق تکریم اور قابل احترام ہے" خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، گورا ہو یا کالا، پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ، امیر ہو یا غریب اور حاکم ہو یا محکوم، لہٰذا کسی کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھا جائے، بلکہ ہر ایک کو اس کے مرتبہ ومقام کے مطابق عزت دی جائے، اسی کو ایک حدیث پاک میں فرمایا:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "أَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ." (رواه أبوداود، مشكوٰة / باب الشفقة والرحمة على الخلق/ص:٤٢٤)

ترجمہ: "نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمام لوگوں کا ان کے مقام کے مطابق اکرام کرو۔"

سیرتِ طیبہ میں تکریم انسانی کے نمونے:

حضور ﷺ نے ساری زندگی اسلام کے اس پیغام کو اپنے قول وعمل کے ذریعہ عام کیا، چنانچہ سیرتِ طیبہ میں اس کے متعدد نمونے ملتے ہیں، مثلاً آپ ﷺ نے متعدد بادشاہوں کے نام جو خطوط لکھوائے تو ان میں ان بادشاہوں کو اسی مناسب لقب سے ملقب و مخاطب کیا جس لقب سے ان کی رعایا انہیں پکارا کرتی تھیں، جیسے روم کے بادشاہ ہرقل کے لیے "عَظِيمُ الرُّوم"، ایران کے بادشاہ کسریٰ کے لیے "عَظِيمُ الفَارِس"، اور حبش کے بادشاہ نجاشی کے لیے "عَظِيمُ الحَبْش" وغیرہ۔

(بخاری / باب کیف کان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ)

یہاں عظیم سے مراد ہے عظمت والی شخصیت، باعزت ہستی، اس میں مخاطب کا اکرام واحترام مقصود تھا، اسی طرح ابوجہل جو آپ ﷺ کا سخت ترین جانی دشمن تھا، آپ

ﷺ کو تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع نہ چھوڑتا تھا اس کے باوجود چوں کہ اس میں فیصلہ کرنے اور لوگوں کے (دنیوی) معاملات حل کرنے کی صلاحیت تھی، جس کی وجہ سے لوگ اسے "ابو الحکم" (فیصلہ کرنے والا، فیصلہ کرنے میں ماہر) کہتے تھے، تو روایتوں میں آتا ہے کہ خود حضور ﷺ بھی اس کو جانی دشمن ہونے کے باوجود "ابوالحکم" کے لقب سے مخاطب فرماتے تھے۔

(سیرت ابن ہشام: ١/٣٨٩)

نیز مکہ مکرّمہ میں حضور ﷺ کے ایک اور جانی دشمن ابوسفیان بھی تھے، جو مشرکین مکہ کے سردار تھے، فتح مکہ تک ایمان نہ لائے تھے، حضور ﷺ کی دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، اس کے باوجود فتح مکہ کے وقت حضور ﷺ نے عمومی معافی کا اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ." (مسلم / کتاب الجهاد) "جو بھی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کے لیے امن ہے۔" تو آپ ﷺ کا یہ اعلان بھی ابوسفیان کے اکرام واحترام کے لیے ہی تھا۔

اور اتنا ہی نہیں کہ زندگی بھر آپ ﷺ نے ہمیشہ بلاکسی فرق کے بحیثیت انسان ہر ایک کے ساتھ اکرام واحترام کا معاملہ فرمایا؛ بلکہ مرنے کے بعد بھی انسانی تعظیم وتکریم کو ملحوظ رکھا، چنانچہ ایک موقع پر رحمت عالم ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا، تو آپ ﷺ بطورِ اکرام کھڑے ہو گئے، کسی نے عرض کیا کہ حضور! یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "أَلَيْسَتْ نَفْسًا؟" (بخاری / کتاب الجنائز) "کیا وہ انسان نہیں تھا؟" الغرض آپ ﷺ بحیثیت انسان خود بھی ہر ایک کا اکرام واحترام فرماتے تھے اور لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے کہ جب حق تعالیٰ نے تمام بنی آدم کو لائق تکریم اور قابل احترام بنایا تو اس کی رعایت کرنا ضروری ہے۔

اسلام کا تیسرا عمومی پیغام انسانیت کے نام:

اسلام کا تیسرا عمومی پیغام انسانیت کے نام یہ ہے کہ "حق تعالیٰ نے ساری دنیا میں

عمومی نفع اٹھانے کی جتنی بھی چیزیں بنائی ہیں اور نعمتیں پیدا فرمائی ہیں وہ صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں؛ بلکہ وہ ساری دنیا کے تمام ہی انسانوں کے لیے ہیں۔'' ان میں سب کے سب برابر کے حقدار ہیں، کیوں کہ بحیثیت انسان فضائل میں سب برابر ہیں تو اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ عمومی اسباب و وسائل کے استعمال میں بھی سب برابر کے حقدار ہیں، اسی مضمون کو قرآنِ پاک میں اس طرح بیان کیا گیا:

﴿وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ﴾ (الإسراء: ۷۰)

اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا (ان کے لیے زمینوں، سمندروں اور فضاؤں میں سواریاں مہیا کیں) اور پاکیزہ نفیس چیزیں (اور نعمتیں) ان کو (بلا کسی فرق کے) عطا فرمائیں۔

اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم خود بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں اور نعمتوں سے نفع اٹھاؤ اور دوسروں کو بھی اس کا موقع دو، یعنی خود بھی چین سکون سے رہو اور دوسروں کو بھی رہنے دو، خود بھی جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو۔

اسلام کا چوتھا پیغام انسانیت کے نام:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس نظام کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے لیے اسلام نے چوتھا عمومی پیغام انسانیت کے نام ''بقاءِ باہم'' کا پیش کیا، مطلب یہ ہے کہ دنیا کے مختلف لوگوں کو اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور زبان کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہے، اسلام مسلمانوں کو یہ تعلیم ضرور دیتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کو دینِ حق اور ہدایت کی دعوت دیں، لیکن اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان کو مجبور نہ کیا جائے؛ بلکہ ان کے عقیدے و عمل کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دیں، چنانچہ اہلِ مکہ نے ایک موقع پر رحمتِ عالم ﷺ کے سامنے مصالحت کے دو فارمولے رکھے: ایک یہ کہ ہم بھی آپ کے خدا کی عبادت کریں اور اس کے بدلہ میں آپ بھی ہمارے معبودوں کی عبادت کریں، دوسرا فارمولہ یہ تھا کہ سال متعین کر لیں، ایک سال دونوں

فریق آپ کے خدا کی عبادت کریں، اور دوسرے سال دونوں فریق مل کر بتوں کی عبادت کریں، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں کسی سچے اور پکے مسلمان کے لیے تو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتیں، کیوں کہ جیسے روشنی اور تاریکی جمع نہیں ہوسکتی اور دن و رات کا اکٹھا ہونا محال ہے اسی طرح توحید کے ساتھ شرک کا جمع ہونا محال اور ناممکن ہے، اس لیے اسلام نے صلح کا تیسرا فارمولہ صلح کل کے بجائے ''بقاءِ باہم'' کی صورت میں پیش کیا کہ اگر تم کو مذہب و ملت پر اور دین و ایمان پر اطمینان نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، آخرت میں سب کا فیصلہ ہو جائے گا، لیکن دنیوی زندگی میں ہم تم سے اس بارے میں کوئی تعرض نہیں کرتے، اسی طرح جن لوگوں نے اس دینِ حق کو قبول کیا ہے تم بھی ان سے کوئی تعرض نہ کرو، ہم دونوں اپنے اپنے طریقۂ عبادت اور ملت پر قائم رہتے ہوئے سماج میں بقاءِ باہمی اور خوشگواری کے ساتھ زندگی گزاریں، ہر قوم اپنی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنے میں آزاد ہے، بشرطیکہ اس سے دوسری قوموں کو تکلیف نہ پہنچے، اس مضمون کو قرآن نے یوں بیان فرمایا:

﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَ لِیَ دِیْنِ ۝﴾ (الکٰفرون)

ترجمہ: ''تم کہہ دو کہ اے حق کا انکار کرنے والو! میں ان چیزوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو، اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں، اور میں نہ (آئندہ) اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔''

ان آیات میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ ایمان اور کفر کے درمیان اس طرح کی مصالحت تو قابلِ قبول نہیں ہے جس سے حق اور باطل کا فرق ختم ہو جائے اور دینِ برحق میں کفر یا شرک کی ملاوٹ قبول کر لی جائے، البتہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے امن کا معاہدہ ہوسکتا ہے، جس کے لیے اسلام نے چوتھا عمومی پیغام انسانیت کے نام بقاءِ باہم کی

شکل میں دیا۔

خلاصہ :

الغرض اسلام نے انسانیت کے نام جو پیغامات دیے ان کا خلاصہ یہی ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، انسانی رشتہ سے سب ہی آپس میں بھائی بھائی ہیں، بحیثیتِ انسان ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے، فضائل ووسائل میں سب برابر کے شریک اور حقدار ہیں، لہٰذا انسانی رشتہ سے ہر ایک کے ساتھ مدارات یعنی خندہ پیشانی وخوش اخلاقی سے پیش آئیں، ضرورت کے وقت مواسات یعنی آپس میں خوشی وغمی کے موقع پر نفع رسانی اور غمگساری کا معاملہ کیا جائے، نیز مخلوط سماج میں رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ معاملات یعنی تجارت اور ملازمت وغیرہ کا تعلق بھی ضروری ہے، جو ہونا بھی چاہیے، البتہ موالات یعنی ایسا تعلق جو انسان کے فکر وعمل پر اثر انداز ہو اور انسان اپنی تہذیب وثقافت سے محروم ہوتے ہوئے دوسری قوموں کے ساتھ فکری ومذہبی اعتبار سے جذب ہو جائے، اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کو اپنے اندر مکمل طور پر جذب کرنے کی کوشش کرے، ظاہر ہے کہ یہ بقاءِ باہم کے منصفانہ اصول اور عقل وعدل کے بھی خلاف ہے، اس لیے اسلام نے دنیا کے عام انسانوں کے ساتھ مدارات، مواسات اور معاملات کا تو حکم دیا؛ لیکن موالات سے منع فرمایا، جو عین عقل وعدل کے مطابق ہے، الحمدللہ، سچے مسلمانوں نے ہمیشہ ہر زمانہ میں اسلام کے ان انسانیت کے پیغامات وہدایات پر عمل کر کے دکھایا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان باتوں پر توفیق عمل سے نوازے۔ آمین۔

۷/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۷ھ، بروز: پیر

مطابق: ۱۳/ جون/ ۲۰۱۶ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَصَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَإِنَّکَ أَنْتَ أَھْلُ التَّقْوٰی وَ أَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ

(۵)

آزادی کی حقیقت اور یومِ آزادی کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "یَا مُعَاذُ! مَا خَلَقَ اللّٰہُ شَیْئًا عَلیٰ وَجْہِ الْأَرْضِ أَحَبَّ إِلَیْہِ مِنَ الْعِتَاقِ، وَ لَا خَلَقَ اللّٰہُ شَیْئًا عَلیٰ وَجْہِ الْأَرْضِ أَبْغَضَ إِلَیْہِ مِنَ الطَّلَاقِ." (مشکوٰۃ المصابیح: ۲۸۴، رواہ الدارقطنی: ۴/۳۵)

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے معاذ! غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرنا (اور کرانا) اللہ رب العالمین کے نزدیک روئے زمین پر جتنی پسندیدہ چیزیں ہیں ان میں سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔ (کیوں کہ اس آزادی کی وجہ سے وہ مخلوق کی غلامی جو ایک طرح کی بندگی ہے، اس سے نجات پا کر اللہ تعالیٰ کی غلامی وبندگی کے لیے فارغ ہو جاتا ہے) اور روئے زمین پر جتنی بھی

حلال چیزیں ہیں ان میں سب سے ناپسندیدہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک (وہ) طلاق ہے۔‘‘ (جو بلا کسی خاص مجبوری کے دی جائے)

تمہید:

اللہ تعالیٰ نے مجموعی طور پر اس دنیا میں تین طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں: (۱) جمادات (۲) نباتات (۳) حیوانات۔ جمادات سے مراد ایسی مخلوق اور چیزیں ہیں جن میں نمو (بڑھوتری) اور حرکت کی صلاحیت اور طاقت نہیں ہوتی، جیسے زمین، پتھر اور لوہا وغیرہ، ان کا حال یہ ہے کہ جہاں رکھ دیے جائیں پڑے رہتے ہیں، اسی طرح لوہے کو جس سانچے میں ڈھال دیا جائے ڈھل جاتا ہے، اس میں انکار کی مجال نہیں۔ اور نباتات سے مراد پودے اور درخت ہیں جن میں بڑھوتری اور افزائش کی صلاحیت تو ہوتی ہے، لیکن نقل وحرکت کی صلاحیت اور طاقت سے بظاہر محروم اور بے شعور ہیں، ایک معمولی آدمی بھی جس پودے کو جہاں چاہے لگا سکتا ہے، پودا پورا درخت تو بن سکتا ہے، لیکن اپنی جگہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور حیوانات سے مراد وہ جاندار مخلوق ہے جن میں اللہ رب العالمین نے نمو، نقل وحرکت اور احساس وشعور کی صلاحیت رکھی ہے اور انہیں خاص فضیلت بخشی ہے، بلکہ یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی دونوں مخلوقات کو اسی تیسری مخلوق کی خدمت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

آزادی ہر انسان کا فطری وپیدائشی حق ہے:

اور ظاہر ہے کہ حیوانات میں سب سے عظیم مخلوق انسان ہے، انسان کو اللہ رب العالمین نے عقل وشعور کی جو صلاحیت عطا فرمائی کسی اور جاندار مخلوق کو اس کا سوواں حصہ بھی عطا نہیں ہوا، یہ اسی کا اثر ہے کہ اپنی اسی خداداد عقل وشعور کو کام میں لاتے ہوئے ایک معمولی انسان بھی غیر معمولی حیوان کو اپنا تابع اور غلام بنا لیتا ہے، مگر خود کسی کی غلامی اور قید میں رہنا

گوارا نہیں کرتا، کیوں کہ آزادی ہر انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے، حق تعالیٰ نے کسی بھی انسان کو غلام نہیں بلکہ آزاد پیدا فرمایا ہے۔

چنانچہ منقول ہے کہ دربارِ فاروقی میں ایک مصری نے جب اپنے حاکم حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے محمد بن عاص کے کوڑا مارنے کی شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے بدلہ دلواتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا؟ حالاں کہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا ہے۔ (سیرۃ عمرؓ لابن الجوزیؒ: ۹۷)

آزادی بہت بڑی اور پسندیدہ نعمت ہے:

واقعہ یہ ہے کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی اور پسندیدہ نعمت ہے، جیسا کہ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے، مگر اس کی راحت ومسرت وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے غلامی کی زندگی دیکھی ہو، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ’’آزادی کی تکلیف بھی غلامی کے آرام سے بدرجہا بہتر ہے۔‘‘ حقیقت یہ ہے کہ آزادی سے بڑھ کر کوئی راحت ومسرت نہیں، اور غلامی سے بڑھ کر کوئی مشقت ومصیبت نہیں۔

منقول ہے کہ بنو اسرائیل جو دراصل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا نام ہے، فلسطین کے علاقہ کنعان کے باشندے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام طویل غلامی کی زندگی کے بعد جب مصر کے حکمران بنے تو آپ نے اپنے سارے خاندان کو مصر بلا کر آباد فرما لیا تھا، کچھ عرصہ یہ لوگ وہاں اطمینان سے رہے، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد مصر کے بادشاہوں نے جنہیں ’’فرعون‘‘ کہا جاتا تھا بنو اسرائیل کو غلام بنا کر جب ان پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھانے شروع کیے اور سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو فرعون کی غلامی میں دیکھا تو بے چین ہو گئے، اور توحید ورسالت کی بنیادی ومرکزی دعوت کے ساتھ ہی آپ نے فرعون سے بنو اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيٓ إِسْرَائِيلَ﴾ (الشعراء: ۱۷)

''بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔'' (انہیں تکلیف مت پہنچا، انہیں غلامی کی زنجیر سے آزاد کر)۔

قرآنِ کریم ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے روبرو اپنے احسانات کی طویل فہرست پیش کرتے ہوئے حریت پسندی و آزادی کی اس آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سینہ میں بھڑک رہی تھی تو آپ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ تیری وہ عنایتیں اور شفقتیں بنو اسرائیل کی غلامی کا معاوضہ نہیں بن سکتیں، کیوں کہ آزادی سے بہتر کوئی نعمت نہیں، اور غلامی سے بدتر کوئی مصیبت نہیں۔

اسلام میں آزادی کی اہمیت:

یہی وجہ ہے کہ فطری طور پر آزاد پیدا ہونے والا دنیا کا ہر انسان عملی اور فکری طور پر بھی آزاد ہی رہنا چاہتا ہے، اسلام دینِ فطرت ہے، اس لیے اسلام دنیا کے ہر انسان کو اصلاً آزاد ہی تسلیم کرتا ہے، کیوں کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام جن سے انسانوں کی یہ ساری نسل وجود میں آئی آزاد ہی پیدا ہوئے تھے، لہٰذا آزادی ہر انسان کی اصلی حالت ہے اور غلامی ایک عارضی چیز ہے، جو جنگ یا ظلم وستم کے نتیجہ میں طاری ہوتی ہے، اور اسلام انسان کو غلام بنانے کے لیے نہیں، بلکہ غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے آیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام آزادی کو بہت بڑی نعمت اور آزاد کرانے کو نیکی قرار دے کر اس کی ترغیب دیتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ (البلد: ۱۳) ''غلامی سے آزادی دلانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نیکی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہؓ نے کثرت سے غلاموں کو آزاد کیا ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن خانؒ نے ''النجم الوہاج'' کے حوالہ سے بعض صحابہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد نقل کی ہے کہ حضرت عباسؓ نے ۷۰، حضرت عائشہؓ نے ۶۹، حضرت عثمانؓ نے ۲۰، حضرت حکیم بن حزامؓ نے ۱۰۰، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ۱۰۰۰، حضرت ذوالکلاعؓ نے ۸۰۰۰ اور

58

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ۳۰،۰۰۰ غلام (صرف ایک دن میں) آزاد کیے ہیں۔ (فتح العلام شرح بلوغ المرام: ۲/۳۳۲)

مطلب یہ ہے کہ صرف سات صحابہؓ نے انتالیس ہزار دو سو انسٹھ (۳۹،۲۵۹) غلام آزاد کرائے، اور ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ دیگر ہزاروں صحابہؓ نے جو (لاکھوں) غلاموں کو آزاد کرایا وہ ان میں شمار نہیں کیے گئے ہیں۔ (از: ''تراشے'': ۹۷)

آج اللہ رب العزت کسی کو توفیق دے تو وہ قیدیوں کو آزاد کرانے کی فکر کرے، ان شاء اللہ غلاموں کو آزاد کرانے کی فضیلت حاصل ہو جائے گی، روایات میں ہے کہ جو شخص کسی کو غلامی سے آزاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس مردِ مومن کو جہنم سے آزاد فرمائے گا۔

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً مُسْلِمَةً أَعْتَقَ اللّٰهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْوًا مِنَ النَّارِ حَتّٰى فَرْجَهٗ بِفَرْجِهٖ.''

(متفق علیه، مشکوٰة: ۲۹۳)

اور اتنا ہی نہیں کہ صرف اسلام نے انسان کو آزادی کی ترغیب دی، بلکہ بعض جرائم و معاصی کا کفارہ اور معافی اس بات کو قرار دیا کہ غلاموں اور باندیوں کو آزاد کیا جائے، مثلاً قتل خطا، قسم، روزہ، ایلاء اور ظہار وغیرہ کا کفارہ یہ بھی ہے کہ غلام اور باندی کو آزاد کیا جائے، علاوہ ازیں اسلام میں وہ مذاق بھی حقیقت پر محمول ہے جس میں غلام اور باندی کو آزاد کیا جائے، حدیث پاک میں مروی ہے:

''ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ، وَ هَزْلُهُنَّ جِدٌّ: النِّكَاحُ، وَ الطَّلَاقُ، وَ العِتَاقُ.'' (كنز العمال / كتاب الطلاق، من قسم الأقوال)

یعنی ''تین چیزوں کی حقیقت تو حقیقت ہے ہی، مذاق بھی حقیقت ہے: (۱) نکاح (۲) طلاق اور (۳) عتاق (آزادی)۔''

مطلب یہ ہے کہ (نکاح اور طلاق کی طرح) مذاق میں بھی اگر کسی نے اپنے غلام یا

باندی کو آزاد کردیا تو وہ آزاد ہوجائیں گے۔اس روایت میں اگر چہ علماء نے کلام کیا ہے،لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی نے مذاق میں بھی غلام آزاد کیا تو عندالاحناف وہ آزاد ہوجائے گا، کیوں کہ آزادی ہر انسان کا بنیادی، فطری اور پیدائشی حق ہے، جو اسے بہر حال ملنا ہی چاہیے۔

بندوں کی اصل آزادی اللہ تعالیٰ کی غلامی میں ہے:

دین اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ انسان مخلوق میں سے کسی کی بھی غلامی کے لیے پیدا نہیں ہوا، وہ تو صرف اور صرف اپنے خالق اور حقیقی مالک کی غلامی کے لیے ہی پیدا ہوا ہے،اس لیے حکم ہے:

﴿يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ۝﴾ (البقرة: ۲۱)

’’اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمھیں اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ تم متقی (اور اپنے خالق و مالک کے مقرب) بن جاؤ۔‘‘

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ دنیا کے ہر انسان کی حقیقی اور اصلی آزادی تو اپنے خالق و مالک کی غلامی میں ہے،اسی کو شاعر اسلام علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اللہ تعالیٰ کی بندگی دنیا میں در در کی غلامی سے اور آخرت میں قید دوزخ سے مکمل آزادی دلاتی ہے، اسلام کا حقیقی آزادی کے سلسلہ میں یہ وہ پیغام ہے جس کو سفیر اسلام حضرت ربعی بن عامرؓ نے رستم ایران کے دربار میں پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

" اَللّٰهُ ابۡتَعَثَنَا لِنُخۡرِجَ مَنۡ شَاءَ مِنۡ عِبَادَةِ العِبَادِ إِلىٰ عِبَادَةِ اللّٰهِ وَحۡدَهٗ، وَ مِنۡ ضِيۡقِ الدُّنۡيَا إِلىٰ سَعَتِهَا، وَ مِنۡ جَوۡرِ الۡأَدۡيَانِ إِلىٰ عَدۡلِ الۡإِسۡلَامِ. " (البداية والنهاية: ۳۹/۷)

’’اللہ رب العالمین نے ہمیں اپنی خلافت کا منصبِ عظیم اسی لیے عطا فرمایا تاکہ

ہم دنیا کے انسانوں میں سے جسے اللہ تعالیٰ چاہے اس کو بندوں کے ظلم اور در بدر کی غلامی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی غلامی و بندگی کا قرینہ سکھائیں، اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعتیں عطا کریں، اور مذاہب باطلہ کے ظلم و جور اور ظالمانہ رسومات سے نجات دلا کر اسلام کا منصفانہ اور شریعت مطہرہ کا عادلانہ نظام عطا کریں۔‘‘

ہندوستان کی عظمت وفضیلت:

اسلام کے اس عادلانہ نظام اور پیغام کو عام کرنے کے لیے قرونِ اولیٰ کے مسلمان حضرات صحابہؓ دنیا کے مختلف ممالک میں پھیل گئے، تو جنوبی ایشیا کا عظیم اور وسیع ملک ہمارا وطن عزیز ہندوستان کیسے محروم رہ سکتا تھا؟ جس کی حرمین شریفین اور مسجد اقصیٰ کے بعد ایک خاص عظمت وفضیلت ہے، کیوں کہ احادیث مبارکہ میں ہندوستان کی عظمت وفضیلت سے متعلق دو طرح کی روایتیں ملتی ہیں: (۱) وہ جن میں ”نزول آدم بالهند“ کا تذکرہ ملتا ہے۔ (۲) وہ جن میں ”غزوة الهند“ کا تذکرہ ملتا ہے۔ جہاں تک ”نزول آدم بالهند“ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ میں سے حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے کبارِ صحابہ اور تابعین میں سے قتادہؒ کی روایات کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے (جنت نشاں) غیر منقسم ہندوستان کے مشہور جزیرہ سراندیپ اور حضرت حوا علیہا السلام کو جدہ میں اُتارا گیا، پھر دونوں کا عرفہ (یا دوسری روایت کے مطابق مزدلفہ) میں اجتماع ہوا۔ (فتح القدیر: ۱۷)

کہا جاتا ہے کہ سراندیپ (سری لنکا) میں جہاں حضرت آدم علیہ السلام نے پہلا قدم جنت سے اُتر کر زمین پر رکھا تھا وہاں آج ضلع سٹون کے ایلیا نامی مقام کے پہاڑ پر ایک بڑے پیر کا نشان موجود ہے، جس کی لمبائی ایک میٹر اور چوڑائی آدھا میٹر ہے۔ (خطباتِ آزادیٔ وطن: ۲/ ۱۴۸)

علاوہ ازیں ہندوستان کی عظمت وفضیلت سے متعلق ایک روایت میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" نَزَلَ آدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْهِنْدِ، فَاسْتَوْحَشَ، فَنَزَلَ جِبْرَئِيْلُ، فَنَادٰى بِالْأَذَانِ، فَلَمَّا سَمِعَ ذِكْرَ مُحَمَّدٍ، قَالَ لَهٗ:" وَ مَنْ مُحَمَّدٌ هٰذَا؟" قَالَ:" هٰذَا آخِرُ وُلْدِكَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ." (رواه الطبرانی و أبو نعیم فی الحلیة : ۷۱)

''جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے سرزمین ہند میں اُتارے گئے، تو آپ کو وحشت اور اجنبیت محسوس ہوئی، تو حق تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا، انہوں نے اذان دی، جس سے حضرت آدم علیہ السلام کی وحشت دور ہوگئی، اذان کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ محمد کون ہیں جن کا تذکرہ اذان میں ہوا؟ تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ کی اولاد میں جتنے بھی انبیاء ورسل تشریف لائیں گے ان میں آخری نبی ہیں۔''

الغرض حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے ہندوستان کی زمین پر تشریف لانے سے اس کی عظمت وفضیلت بڑھ گئی، گویا ہندوستان انسانیت کا پہلا دارالخلافت بن گیا اور اس کی مٹی میں جنت کی خوشبو بس گئی، غالبًا اسی کا اثر ہے کہ ہندوستانی خوشبو تمام دنیا میں ''عودِ ہندی'' کے نام سے مشہور ہوگئی۔ حضرت آدم علیہ السلام کے ہند کو اپنا وطن بنانے سے ہندوستان ہمارا پدری وطن اور یہاں کا ہر باشندہ اس کا فرزند بن گیا۔

اس کے بعد آپ کو حج کا حکم دیا گیا، چنانچہ حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کے بقول حضرت آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے پیدل چل کر چالیس حج اور سوعمرے کیے۔
(از: ''خطباتِ آزادیٔ وطن:۲/۱۵۲)

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے سرزمین ہند میں آئے تو نورِ محمدی آپ کی پیشانی میں بطورِ امانت تھا، لہٰذا اس اعتبار سے نورِ محمدی کا ابتدائی ظہور بھی اسی جنت نشان ہندوستان سے ہوا، جیسا کہ علامہ سیوطیؒ نے درِ منثور میں (صفحہ:۵۵)

پر اشارہ فرمایا ہے۔

علاوہ ازیں ہندوستان کی عظمت وفضیلت پر مشتمل وہ روایتیں بھی ہیں جن میں رحمت عالم ﷺ نے غزوۂ بدر کے شرکاء کی طرح غزوۂ ہند کے شرکاء کے لیے بھی جنت کی بشارت سنائی ہے، چنانچہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ ثَوْبَانَ مَوْلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" عِصَابَتَانِ مِنْ أُمَّتِیْ أَحْرَزَهُمَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ، عِصَابَةٌ تَغْزُوْ الْهِنْدَ، وَ عِصَابَةٌ تَكُوْنُ مَعَ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ." (رواہ النسائی : ۵۲/باب غزوة الهند)

''آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ جہنم سے محفوظ فرما کر جنت عطا فرمائے گا، ایک وہ گروہ جو ہندوستان سے جہاد کرے گا، (اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت واشاعت کی کوشش کرے گا) اور دوسرا گروہ وہ ہے جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ (قربِ قیامت میں) ہوگا۔'' اللّٰهم اجعلنا منهم.

یاد رکھو! آزادیٔ ہند کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے اکابر اور علماء کی رہبری میں جس قدر جنگیں لڑیں اور کوششیں کیں ان کا بنیادی مقصد بھی تو دین کی حفاظت و اشاعت تھا، اس لیے کیا بعید ہے کہ رب کریم مجاہدین وطن اور شہداءِ چمن کو بھی غزوۃ الہند کی فضیلت وبشارت کا حقدار بنادے۔ وما ذٰلك على اللّٰه بعزيز.

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد:

ہندوستان کی اسی عظمت وفضیلت کے پیش نظر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو اس سے بڑا لگاؤ تھا، یہی وجہ ہے کہ وصالِ نبی ﷺ کے چار سال کے بعد دورِ فاروقی ۱۵ھ میں جب ارتدادی فتنے دب گئے اور فتوحات کے دروازے کھلے تو حضرت عمرؓ نے طائف کے مشہور قبیلہ بنوثقیف کے حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کو طائف سے عمان اور بحرین کا گورنر بنا کر

بھیجا، انہوں نے بحرین آکر اپنے بھائی حضرت حکم بن ابی العاص ثقفیؓ کو ہندوستان کے مشہور صوبہ گجرات روانہ کیا، کیوں کہ اس زمانہ میں ہندوستان کا سمندری دروازہ گجرات ہی تھا، اس لیے قرونِ اولیٰ کے مسلمان ہندوستان میں بھروچ اور بمبئی تشریف لائے، بعض تاریخی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سمرہ بن عبدالرحمٰنؓ بھی گجرات کے مشہور علاقہ ''کچھ'' (جسے تاریخ کی عربی کتب میں ''کس'' لکھا ہے) تشریف لائے۔

کتب تاریخ کی صراحت کے مطابق ان کے علاوہ بھی تقریباً پچیس (۲۵) صحابہؓ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تشریف لائے، بارہ حضرت عمرؓ کے عہد میں، پانچ حضرت عثمانؓ کے عہد میں، تین حضرت علیؓ کے زمانے میں، چار حضرت معاویہؓ کے دور میں، ایک یزید بن معاویہ کی حکومت میں، ان میں مخضرمین بھی ہیں اور مدرکین بھی، مخضرمین سے مراد وہ حضرات ہیں جنہوں نے زمانۂ جاہلیت بھی پایا اور زمانۂ اسلام بھی، لیکن وہ آپ ﷺ کی زیارت نہ کرسکے، اور مدرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صرف حضور ﷺ کا زمانہ پایا ہو، لیکن زیارت نہ ہوئی ہو۔ (ماخوذ از: فقہاءِ ہند: ۱/۱۰، تراشے: ۱۱۸)

جب صحابۂ کرامؓ یہاں تشریف لائے تو یہاں کے عوام جو اپنے راجاؤں کے مظالم سے ایک تو پہلے ہی پریشان تھے، دوسرے ہندوستان کے خمیر میں پیار اور اس کی مٹی میں محبت ہے، اس لیے جب ہندوستان کے باشندوں نے مسلمانوں کی ایمانداری، امانت داری، اصول پسندی اور انصاف پروری، خوش اخلاقی اور رحم دلی جیسی پاکیزہ صفات کا مشاہدہ کیا تو وہ اسلام اور مسلمانوں کے قریب ہونے لگے، اور اس طرح رفتہ رفتہ ہندوستان کے عوام میں دین اسلام پھیلنے لگا، مسلمانوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہونے لگا، یہاں تک کہ ۹۳ھ میں حضرت محمد بن قاسم ثقفیؒ نے ہندوستان کی سرزمین پر دین اسلام کا پرچم لہراتے ہوئے مسلمانوں کی حکمرانی کی بنیاد ڈالی، ان کے بعد سلطان محمود غزنویؒ، سلطان شہاب الدین غوریؒ، سلطان قطب الدین ایبکؒ، سلطان شمس الدین التمشؒ، سلطان علاؤ الدین خلجی،

سلاطین تغلق، لودھی، اور سوری کے بعد مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کا دور آیا، جو ۱۵۲۲ء میں سلطان ظہیر الدین بابرؒ سے شروع ہوکر ۱۸۵۷ء میں (مغلیہ خاندان کے آخری اور سولہویں بادشاہ) بہادر شاہ ظفرؒ پر انگریزوں کے ناجائز قبضہ اور تسلط کی وجہ سے ختم ہوا۔

مسلمانوں نے ہندوستان کو مالا مال کیا:

مسلمانوں کی یہ پہچان رہی ہے کہ وہ جس ملک کو اپنا وطن بنا لیتے ہیں اس کی حفاظت وترقی کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، چنانچہ ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلم سلاطین وفاتحین نے بھی اپنے ایک ہزار سال کے دورِ حکومت میں ہندوستان کو لوٹا نہیں، بلکہ اسے گہوارۂ امن و امان بنایا، اسے منظّم اور مہذب کر کے مالا مال کیا، تہذیبی اور تمدنی ہر اعتبار سے ملک کو ترقی دی، محفوظ ترین قلعے اور یادگار عمارتیں تعمیر کروائیں، اسے حرمین شریفین اور مسجدِ اقصیٰ کے بعد سارے جہاں سے اچھا بنا دیا۔ سبحان اللہ۔

یہ اہل جنوں بتلائیں گے کیا ہم نے دیا ہے عالم کو
سو بار سنوارا ہے ہم نے اس ملک کے گیسوئے برہم کو

یہ حقیقت ہے کہ ملک کے مراکزِ سیاحت (Tourist Points) کی ترقی بڑی حد تک مسلمانوں ہی کی رہین منت ہے، آج جو کچھ ہارڈ کرنسی اس ملک کو مل رہی ہے اس میں مسلمانوں کی شاندار تعمیرات کو بڑا دخل ہے، خود جواہر لال نہرو نے ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک کو بہت کچھ دیا ہے۔

لیکن جب مسلمانوں میں مجموعی طور پر تین خرابیاں پیدا ہوگئیں: (۱) ایمان واخلاق میں گراوٹ، (۲) دعوتِ دین سے غفلت، (۳) اور دل میں دنیا کی محبت، تو جیسے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد بنو اسرائیل کے ساتھ ہوا کہ ان سے اقتدار چھین کر انہیں عزت کی بلندی سے قعرِ مذلت میں دھکیل دیا گیا، مسلمانوں کے ساتھ بھی وہی تاریخ دہرائی

گئی۔

کسی نے صحیح کہا ہے:

قوتِ فکر وعمل پہلے فنا ہوتی ہے — پھر کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے

ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط:

جس کی مختصر داستان کچھ اس طرح ہے کہ ۱۶۰۰ء کے شروع میں ہندوستان کی سیاسی اور معاشی حالت نہایت کمزور ہو چکی تھی، اس راز سے باخبر ہو کر انگریز تجارت کے بہانے سے (کالی کٹ) بندر سے ہندوستان آئے، اور جہاں گیر ابن اکبر سے اجازت لے کر ۱۱/ جنوری/ ۱۶۱۱ء میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' (مشرقی ہند دستہ) کے نام سے کلکتہ، مدراس، بمبئی، گجرات اور ملک کے دیگر صوبوں میں کمپنیاں قائم کیں اور انہیں خوب ترقی دی، یہاں تک کہ کچھ ہی عرصہ میں انگریز اپنے دیگر حریفوں سے بازی لے گئے، پھر جب تجارت پھیل گئی تو کمپنیوں کی حفاظت کے لیے چھوٹی چھوٹی فوج رکھنے لگے، جس سے ایک طرف تو انہیں تقویت ملی، دوسری طرف حاکموں اور نوابوں کی عیاشی اور آپسی لڑائی سے ملکی حکومت مزید کمزور ہونے لگی، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے طرح طرح کی چالیں چلیں، تدبیریں کیں، ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کا اصول بڑے پیمانے پر اختیار کیا، اس کے لیے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا، غلط فہمیاں پھیلائیں، اس طرح ہندوستان کو تہذیبی اور تمدنی ہر اعتبار سے کمزور کر کے آہستہ آہستہ اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم اور مضبوط کیا۔

ہندوستان میں جنگِ آزادی

مگر ملک کے بعض حکمرانوں کو انگریزوں کی شاطرانہ وعیارانہ چال کا اندازہ ہو گیا، انہوں نے یہ محسوس کیا کہ انگریزوں کا تسلط ملک میں آئے دن بڑھتا جا رہا ہے اور دِن بدِن یہ ملک پر حاوی ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا ان کو ملک سے نکالنا بہت ضروری ہے، اس کے لیے

مشرقی ہندوستان میں سب سے پہلے نواب سراج الدولہؒ نے ہمت کی اور باقاعدہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں انگریزوں کے ساتھ جنگ کی، جس میں انہیں اپنوں کی غداری کی وجہ سے شکست ہوئی، اور برٹش فوج نے ان کو دارالسلطنت مرشد آباد میں شہید کر کے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر پوری طرح قبضہ کر لیا، زمین داروں کی زمین چھین لی، لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر دیا، ہندوستانی لوگ اپنی جان بچا کر جنگلوں کی طرف بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر شیر میسور، بلند ہمت اور غیور فرماں روا حضرت فتح علی خان ٹیپو سلطانؒ انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کے لیے میدان میں آئے، آپؒ نے ۱۷۸۲ء میں حکمراں بنتے ہی انگریزوں کے ساتھ مختلف جنگیں لڑیں، سب سے پہلے ۱۷۸۳ء میں انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں آپؒ نے فتح پائی، انگریز اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے بے چین تھے، اس لیے انہوں نے ۱۷۹۲ء میں پوری تیاری کے ساتھ اچانک حملہ کر دیا، تو بعض وزراء کی بے وفائی کی وجہ سے ٹیپو سلطانؒ کو انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا، جس میں بطورِ تاوان تین کروڑ روپے، نصف علاقہ اور اپنے دو شہزادوں کو بطورِ یرغمال دینا پڑا، (اس سے مراد وہ فرد یا جماعت ہے جو شرائط کی پابندی کی ضمانت میں دشمن کے حوالے کیا جائے) مگر اللہ رب العزت نے آپؒ کو نہایت بالغ نظری، دور اندیشی اور غیر معمولی صلاحیت و ذہانت سے نوازا تھا، اس لیے کچھ ہی عرصہ میں ۱۷۹۹ء میں آپ نے حالات پر قابو پا لیا، اس کے بعد آپؒ نے انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کا عزم کر لیا، اس کے لیے آپؒ نے خاص میزائل بنوائیں، نیز سلطانِ ترکی سلیم عثمانی اور دیگر مسلم بادشاہوں کے علاوہ ہندوستان کے ریاستی نوابوں اور حاکموں کو بھی آمادہ کیا، مگر افسوس کہ ملک کی سیاسی حالت کی خرابی کی وجہ سے بیرونی ممالک سے تو کوئی مدد مل نہ سکی، اندرونِ ملک بھی جنوبی ہند کے بعض امراء کی چاپلوسی اور گھر کے بھیدیوں کی بے وفائی کی وجہ سے آپ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، اور بالآخر اس مجاہدِ ہند، محبّ وطن ٹیپو سلطانؒ نے ۴/ مئی/ ۱۷۹۹ء کو شری رنگا

پٹنم میں جامِ شہادت نوش فرمالیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

آپؒ کا مشہور تاریخی مقولہ ہے کہ ''گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دِن کی زندگی بہتر ہے۔''

بقولِ غالبؔ ؎

شیر اچھا ہے جسے مہلت ایک روزہ ملی — یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود؟

مؤرخین منصفین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر ٹیپو سلطانؒ کے ساتھ اپنے ہی لوگ بے وفائی اور غداری نہ کرتے تو انگریزوں کا اسی وقت سارے ہندوستان سے خاتمہ ہو جاتا، خود انگریزوں کو بھی احساس تھا کہ ٹیپو سلطانؒ ایک ایسی چٹان ہے جسے راستہ سے ہٹانا ضروری ہے، سلطانؒ کے ہوتے ہوئے بظاہر ہم اپنے منصوبوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے، اسی لیے جب انگریزی جنرل ہورس (Horse) کو ٹیپو سلطانؒ کی شہادت کی خبر ملی تو ان کی نعش کے پاس کھڑے ہو کر اس نے کہا تھا کہ ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔'' اور واقعی پھر ان کے حوصلے بہت ہی بڑھ گئے، کیوں کہ ان کے سامنے اب بظاہر ایسی کوئی طاقت نہ تھی جو ہندوستان میں ان کا مقابلہ کر سکتی، اس لیے ٹیپو سلطانؒ کی شہادت کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی کی جانب رُخ کیا، اور مغلیہ خاندان کے چودھویں بادشاہ شاہ عالم ثانی سے ۱۸۰۶ء میں ایک شاطرانہ معاہدہ تحریر کرا لیا کہ ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا'' یہ نعرہ بلند کیا جانے لگا کہ ''حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم۔''

شاہ عبدالعزیزؒ کا فتوائے جہاد اور اس کے اثرات:

ان حالات میں جب کہ انگریزوں کے ظالمانہ وغاصبانہ تسلط کی وجہ سے ہندوستان کا امن وامان خطرہ میں پڑ گیا اور ملک کے ساتھ ملت کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا، یہاں اسلام اور اس کے احکام پر عمل کرنا دشوار ہو گیا، تو سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے

ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ جاری فرمایا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس ملک میں برسرِ اقتدار جو طاقت وحکومت ہے اس سے بغاوت اور جنگ کرنا یا پھر اس ملک سے نکل جانا مذہباً فرض ہے، اس فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ جگہ جگہ جنگِ آزادی کے شعلے بھڑکنے لگے، سوئے ہوئے جذبے اور حوصلے انگڑائیاں لینے لگے، علماء اپنی درسگاہوں اور مشائخ اپنی خانقاہوں سے میدان میں نکل پڑے، اور فتویٰ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہو گئے، جنگِ آزادی کی فضا ہموار کی جانے لگی، اس کے لیے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ہی کے ایک خلیفہ اور تربیت یافتہ شاگرد حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ نے اپنے شیخ کے مشورہ سے جنگِ آزادی کی عظیم تحریک شروع فرمائی۔ ؎

اس بزمِ جنوں کے دیوانے ہر راہ سے پہنچے محفل تک
بے تابی ان کی عام ہوئی صحراؤں سے لے کر ساحل تک

انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو جنگِ آزادی کے لیے آمادہ اور تیار کیا، اس کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے لیے گوالیار کے راجہ کو بھی تیار کیا، جس کے لیے انہوں نے سرحد کے علاقہ کو منتخب کیا اور پشاور کو اپنا مرکز بنا کر ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست بھی قائم کر دی، اس کے بعد ارادہ یہ تھا کہ کشمیر ہوتے ہوئے آگے کا رُخ کیا جائے گا، لیکن ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' ۱۸۳۱ء میں جب انگریزوں سے مقابلہ کے لیے کشمیر کی طرف بڑھنا شروع کیا تو بالاکوٹ میں اپنے ہی لوگوں کی بے وفائی، غداری اور بدعہدی کی وجہ سے سکھوں سے لڑائی پر مجبور ہونا پڑا، جو انگریزوں کے ایجنٹ تھے، اور جنہوں نے ابتدا ہی سے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا، افسوس کہ بالاکوٹ میں انگریزوں کے ایجنٹ سکھوں کے ساتھ لڑائی کے نتیجہ میں تحریکِ آزادی کی مہم کامیاب نہ ہو سکی، اس میں حضرت سید احمد بریلویؒ، حضرت شاہ اسماعیلؒ اور دیگر بہت سے افراد شہید ہوئے، مگر اس تحریک کی ناکامی کے بعد بھی حضرات علماء اور ہندوستان کے غیور لوگ خاموش نہیں بیٹھے، بلکہ حتی الامکان ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش کرتے

رہے۔

یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا زمانہ آگیا، تو پھر ایک بار ہندو مسلم اور ملک کی دیگر اقوام نے مل کر انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ کرنے کا ارادہ کرلیا، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کی سرپرستی میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے لیے دو محاذ بنائے گئے، ایک محاذ انبالہ پر، جس کی قیادت حضرت مولانا جعفر تھانیسریؒ کے پاس تھی، اور دوسرا محاذ شاملی پر، جس کی قیادت خود حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ فرمارہے تھے، مگر وسائل کی کمی اور کچھ اپنوں کی غداری کی وجہ سے اس میں بھی ناکامی ہوئی، اس میں بڑے بڑے علماء کے علاوہ فوجی بھی زخمی اور شہید ہوئے، مثلاً حضرت حافظ ضامنؒ شہید ہو گئے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ زخمی ہوئے، انگریزوں نے پرچم ہند کو لال قلعہ سے اُتار کر ۲۰/ستمبر/۱۸۵۷ء میں یونین جیک یعنی برطانیہ کا جھنڈا لہرادیا، انگریزوں نے اس جنگ کو غدر یعنی بغاوت کا عنوان دے کر ظلم وستم اور دہشت گردی کا وہ بازار گرم کیا کہ ہندوستان کی اب تک کی تاریخ میں اس سے زیادہ تاریک دور کوئی نہیں تھا، عہدِ مغلیہ کے آخری (سولہویں) بادشاہ بہادر شاہ ظفرؒ کو بغاوت کے جرم میں جلاوطن کر کے رنگون میں قید کر دیا گیا، لال قلعہ کی مرکزیت ختم ہو گئی، چوں کہ اس وقت مسلمانانِ ہند اپنے امراء وعلماء کی قیادت میں آزادئ ہند کے لیے سرگرمِ عمل تھے اس لیے تحریکِ جنگِ آزادی کے ناکام ہونے کا سب سے زیادہ نقصان بھی مسلمانوں ہی کو بھگتنا پڑا، دو لاکھ مسلمان شہید ہو گئے، جن میں ساڑھے اکاون ہزار علماء تھے، صرف دہلی ہی میں پانچ سو علماء کو پھانسی دے دی گئی، دہلی کے چاندنی چوک سے لے کر پشاور کی جامع مسجد تک ہر درخت پر پھانسی کا پھندا تھا، مسلمانوں کی آبادی والے شہر کھنڈر بنا دیے گئے، انہیں ہجرت اور نقل مکانی پر مجبور کیا گیا، اور یہ سارے ناقابل بیان مظالم بس ایک نعرۂ آزادی کے سبب تھے۔ ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے   دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کہتے ہیں کہ مسلمان تھانہ بھون سے ہجرت پر مجبور کیے گئے، مسلمان جب دو سال کے بعد گھر پہنچے تو ایک سو بتیس شہیدوں کی لاشیں درختوں پر جھول رہی تھیں۔

(''الجمعیت'' کی خصوصی اشاعت ''تحریک ریشمی رومال نمبر''/صفحہ:۶۶، بابت: ۱۰/صفر/۱۴۳۵ھ مطابق: ۱۵/دسمبر/۲۰۱۳ء)

ظلم پھر ظلم ہے، جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے، جب گرتا ہے تو جم جاتا ہے

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس ملک کی آزادی میں جتنا خون مسلمانوں کا بہا ہے اگر سرزمین ہند بطورِ ثبوت اُسے اُگل دے تو مسلمانوں کی وفاداری پر شک کرنے والے غدار اُسی میں غرق ہو کر رہ جائیں، واقعہ یہ ہے کہ ملک کے خاطر بڑی بڑی قربانیاں دے کر ملک کے مسلمانوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم ملت کی طرح ملک کے بھی وفادار ہیں اور ملت کی طرح ملک کی حفاظت کے لیے بھی جانِ عزیز کو قربان کر سکتے ہیں، ان مجاہدین مخلصین کے متعلق ربِ کریم کی ذاتِ عالی سے اُمید ہے کہ وہ انہیں غزوۃ الہند کے شرکاء وشہداء کا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔ وما ذلك على الله بعزيز.

دارالعلوم دیوبند کا قیام اور تحریک ریشمی رومال:

۱۸۵۷ء میں ملک میں مکمل غلبہ حاصل کرنے کے بعد وائسرائے برطانیہ نے اپنے ہندوستانی مشیروں سے رائے طلب کی کہ بتاؤ ہندوستان میں انگریزی حکومت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ تو اس وقت کے ہندوستان میں رہنے والے سب سے بڑے انگریز سیاست داں ڈاکٹر ولیم یور نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ ''ہندوستان میں مسلمان سب سے زیادہ بیدار ہیں، اور جنگِ آزادی عموماً مسلمانوں نے لڑی ہے، مسلمانوں میں جب تک جذبۂ جہاد موجود ہے تب تک ہم لوگ ان پر حکومت نہیں کر سکتے، اس لیے جذبۂ جہاد ختم کرنا ضروری ہے، اور جذبۂ جہاد کو ختم کرنے کے لیے ایک تو علماء کو عوام سے اور قرآن کو مسلمان سے جدا کرنا ضروری ہے۔''

اس رپورٹ کے بعد ۱۸۶۱ء میں قرآنِ کریم کے تین لاکھ نسخے بدبخت انگریزوں نے جلا دیے، مگر ؎

یہ ہم نہیں کہتے، تاریخ بتاتی ہے ہمیں — مٹ گئے دینِ محمد کو مٹانے والے

علاوہ ازیں لارڈ میکالے نے ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا کہ اس کا حامل جسمانی طور پر ہندوستانی رہے، مگر ذہنی طور پر وہ انگریز بن جائے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ملک وملت کے تحفظ کے لیے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اپنے رفقاء کو لے کر ۱۵/محرم الحرام/۱۲۸۳ھ مطابق: ۳۰/مئی/ ۱۸۶۶ء کو دیوبند کی تاریخی مسجد چھتہ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، جس کے پہلے استاذ صاحب معرفت بزرگ حضرت ملا محمود دیوبندیؒ اور پہلے شاگرد مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے، جو بعد میں ''شیخ الہند'' اور حضرت تھانویؒ کے بقول ''شیخ العالم'' کہلائے۔

ان دونوں محمود کے اجتماع کا نتیجہ الحمدللہ ملک وملت کے لیے نہایت ہی محمود ثابت ہوا، کیوں کہ قیامِ دارالعلوم دیوبند کا بنیادی مقصد ملت کی تعلیم وتربیت کے ساتھ تقاضائے وقت کے مطابق ملک کی آزادی کے لیے خاموش مگر پر جوش تحریک چلانا بھی تھا، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۴ء میں جب جرمنی اور برطانیہ کے درمیان پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا تو چوں کہ انگریزوں نے اپنے مسلح ومنظم فوجیوں اور شاطرانہ چال سے نصف دنیا کو غلام بنا رکھا تھا، اس لیے انگریزی افواج پوری دنیا میں اپنے دشمنوں سے برسرِ پیکار تھیں، ان حالات میں حضرت شیخ الہندؒ نے برطانیہ مخالف ایک عالم گیر تحریک (جو تحریک ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہوئی) چلانے کا فیصلہ کیا، اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے حریت پسند، آزادئ ملک کے خواہش مند مجاہدین کے علاوہ بیرونِ ملک کی انگریز مخالف حکومتوں عرب، ترکی، جرمنی، افغانستان، ایران اور آسٹریلیا وغیرہ کی مدد سے انگریزوں پر ایسا حملہ کیا جائے کہ ان کے ناپاک وجود سے ملک پاک ہوجائے، اس سلسلہ میں قائدِ تحریک حضرت شیخ الہندؒ نے مختلف

اقدامات کیے، اپنے شاگردِ رشید اور خادمِ خاص مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو افغانستان میں کابل کی طرف روانہ کیا، تاکہ دولتِ افغانیہ کے اراکین سے مل کر تحریک کے لیے ہمدردیاں حاصل کی جائیں، اور خود حج کے عنوان سے حجازِ مقدس تشریف لے گئے، تاکہ اس وقت کی حکومت خلافتِ عثمانیہ سے فوجی امداد کی راہیں ہموار کی جاسکیں، مکہ مکرّمہ پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز میں مقیم ترک گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی، انہیں ہندوستان کی صورتِ حال اور آزادئ ہند کے سلسلہ میں اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا، غالب پاشا نے حضرت شیخ الہندؒ کے خیالات سے اتفاق کیا، بلکہ خلافتِ عثمانیہ ترکیہ نے برطانیہ کے خلاف اپنی حکومت کے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے افغانستان کے راستے ہندوستان پر ترکی حکومت کے حملے کے ارادے سے بھی باخبر کیا، حضرت شیخ الہندؒ کے لیے یہ خبر بہت ہی حوصلہ افزا تھی، آپؒ نے کمالِ دانشمندی سے کام لیتے ہوئے ترکی کے گورنرِ حجاز غالب پاشا اور وزیر جنگ انور پاشا سے اپنی اور اپنے منصوبے کی حمایت میں پیغامات حاصل کر کے ایک زعفرانی ریشمی کپڑے پر تحریر کر کے ایک مخصوص صندوق کے بیچ میں رکھ کر نہایت خفیہ طریقہ سے مولانا ہادی حسن خان جہاں پوریؒ کے سپرد کیا، تاکہ وہ ہندوستان جا کر مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے پاس اسے افغانستان پہنچا دیں۔

ادھر ہندوستان کے راستہ افغانستان میں مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے ذریعہ غالب نامہ جب پہنچا تو مجاہدینِ وطن کے جوش وخروش میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا، اور انہوں نے انگریزی غلامی کے طوق کو مکمل طور پر اُتار پھینکنے کے ارادہ سے اپنی جد وجہد میں مزید اضافہ کر دیا اور بڑی حد تک انہیں کامیابی بھی ملی، ان حالات میں امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ضروری سمجھا کہ تحریک آزادی کے سلسلہ میں ملنے والی کامیابی اور کام کی تفصیلات قائدِ تحریک حضرت شیخ الہندؒ تک پہنچائی جائیں، تاکہ آئندہ کے لیے مشورہ اور کام کا طریقہ معلوم کیا جاسکے، اس مقصد کے پیشِ نظر مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے بھی ایک خط حضرت شیخ الہندؒ کے نام ریشمی رومال پر تحریر کیا اور ایک نومسلم عبدالحق نامی شخص کو شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے حوالہ

کرنے کے لیے دیا، تاکہ وہ حج میں جائیں تو خط حضرت شیخ الہندؒ کے حوالہ کردیں، لیکن کسی نامعلوم سبب کی وجہ سے اس قاصد نے یہ تحریر شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے بجائے اپنے سابق اقارب نواز کے حوالہ کردی، جو انگریز کا جاسوس تھا، اس نے یہ شرمناک حرکت کی کہ ملتان ڈویژن کے کمشنر کو یہ خط دے دیا، اور اس کے واسطہ سے سی.آئی.ڈی. اس تحریک پر مطلع ہوگئی۔

قسمت کی خوبی دیکھئے! ٹوٹی کہاں کمند　　　دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

پھر کیا تھا؟ تحریر سے وابستہ تمام افراد کی گرفتاریاں اور ان پر سختیاں شروع ہوگئیں، دوسری طرف اس زمانہ میں امریکہ نے برطانیہ اور روسی اتحاد وتعاون میں اپنی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار انگریز حکومت کو پیش کردیے، جس سے ان کو مزید قوت حاصل ہوگئی، مزید برآں والیٔ مکہ شریف حسین جو انگریزوں کا وفادار تھا اور ان ہی کے اشارہ پر اس نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف حجاز میں بغاوت کردی، جس سے عرب علاقوں میں موجود ترکوں کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اب ظاہر ہے کہ جس خلافت عثمانیہ ترکی پر حضرت شیخ الہندؒ نے بھروسہ کیا تھا وہی ناکام ہوگئی تو اس سے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال کے کامیاب ہونے کے راستے بھی بظاہر بند ہوگئے۔

حجاز میں انگریزوں کے پھیلائے ہوئے اس فتنہ کا لازمی اثر ہندوستان پر بھی ہوا، بالخصوص پورے ملک کے مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی، اس موقع پر انگریزوں نے نہایت شاطرانہ چال چلتے ہوئے خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی کو خفیہ طور پر مکہ مکرّمہ بھیجا، تاکہ وہ علماءِ حرم سے ایک ایسا فتویٰ لائے جس میں شریف حسین والیٔ مکہ کی بغاوت کو حق بجانب قرار دیا گیا ہو، اس مقصد کے تحت خان بہادر نے والیٔ مکہ شریف حسین کے درباری اور چاپلوسی ملاؤں سے ایک استفتا اور اس کا جواب مرتب کرایا، جس میں ترکی قوم کو مطلقاً کافر قرار دیا گیا تھا، اور خلافت عثمانیہ ترکیہ کو غلط اور شریف حسین کی بغاوت کو صحیح بلکہ ضروری قرار

دیا گیا تھا، اس فتویٰ پر شریفی علماء سے دستخط حاصل کرنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کے پاس لایا گیا، تو آپؒ نے صاف انکار کردیا، جس کا انگریز کو بخوبی اندازہ تھا، اور آپؒ کا یہ انکار ہی حجاز میں آپؒ کی گرفتاری کا سبب بن گیا، ترکوں کی تکفیر کے فتویٰ پر دستخط کے انکار کو بہانہ بنا کر شریف حسین نے جدہ میں مقیم کرنل ولسن (معتمد برطانیہ) کے حکم پر حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کا آرڈر جاری کیا، چنانچہ ۲۳/صفر/ ۱۳۳۵ھ اتوار کی شب کو حضرت شیخ الہندؒ اور آپؒ کے ساتھ مولانا وحید احمد فیض آبادی مدنیؒ، مولانا عزیر گل پشاوریؒ اور مولانا حکیم سید حسنؒ کو مکہ مکرمہ سے گرفتار کر کے جدہ بھیج دیا گیا، جب کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو ایک روز قبل انگریزی حکومت کو برا کہنے کی پاداش میں مکہ مکرمہ کی جیل میں بھیج دیا گیا تھا، تو آپؒ نے خواہش ظاہر کر کے اپنے استاذِ مکرم حضرت شیخ الہندؒ کے پاس جدہ جیل میں رہنے کو ترجیح دی، ۱۷/ ربیع الاول/ ۱۳۳۵ء تک اسیرانِ فرنگ کا یہ مختصر قافلہ جدہ میں رہا اور ۱۸/ ربیع الاول/ ۱۳۳۵ھ مطابق: ۱۲/ جنوری/ ۱۹۱۷ء کو مصر روانہ کیا گیا، جہاں جیزہ کے سیاسی قید خانہ میں تقریباً ایک ماہ تک رکھا گیا، فرداً فرداً نہایت سختی سے سبھی کی تفتیش ہو رہی تھی، مگر راز سے پردہ اٹھانا تو درکنار، کسی نے زبان تک نہ کھولی، بے تکلف گونگے اور بہرے بنے رہے، گویا ہر ایک نے یہ عہد کرلیا تھا کہ

زندگی بھر زبان نہ کھولیں گے　☆　تم پکاروگے، مگر ہم نہ بولیں گے

بالآخر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا، سب ہی کو اندیشہ بلکہ یقین تھا کہ پھانسی ہوگی، مگر بظاہر ثبوت فراہم نہ ہوسکا، اس لیے پھانسی کی سزا نہیں دی جاسکی، اس کے بعد ۲۴/ ربیع الثانی/ ۱۳۳۵ھ مطابق: ۱۶/ فروری/ ۱۹۱۷ء کو جیزہ سے مالٹا (جو انگلینڈ کا جزیرہ ہے) روانہ کیا گیا، ان میں حضرت مولانا حکیم سید نصرت حسن تو چند مہینے بیمار رہ کر ۱۹/ ذوالقعدہ/ ۱۳۳۶ھ میں انتقال فرما کر شہید مالٹا ہوگئے، بقیہ رفقاء نے حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ نہایت عزم وہمت اور صبر واستقلال سے اپنا وقت گزارا، اکثر وقت عبادت میں گزرتا رہا۔

حضرت شیخ الہندؒ کا معمول کچھ اس طرح رہا کہ عشاء کی نماز کے بعد اپنے وظائف سے فارغ ہو کر کچھ آرام فرماتے، دو بجے کے قریب سخت ٹھنڈی کے باوجود اُٹھ کر وضو فرماتے، احتیاط اور اخلاص کا یہ عالم تھا کہ ساتھیوں کے آرام میں خلل نہ آنے دیتے تھے، نمازِ تہجد ادا فرماتے، اس کے بعد اشراق پڑھ کر کمرے میں جاتے، چائے نوش فرماتے، پھر تلاوت فرما کر ترجمہ پر نظر ثانی فرماتے، اس کے بعد مولوی وحید احمد کو سبق پڑھاتے، کھانے کے بعد قیلولہ، پھر وضو کر کے تلاوت فرماتے اور ظہر تک الحزب الاعظم پڑھتے، ظہر بعد کبھی مولانا وحید احمد کا سبق تو کبھی ترجمہ، عصر سے مغرب تک تسبیحات میں مشغول رہتے، بعد مغرب رفقاء کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، پھر اپنی جگہ جا کر عبادت میں مشغول ہو جاتے، کہتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے یہیں قرآن کریم کا ترجمہ مکمل فرمایا۔

(مستفاد از: ’’حضرت شیخ الہندؒ، حیات اور کارنامے‘‘)

اسی دوران ان کی رہائی کی ہندوستان بھر میں کوششیں اور تحریکیں جاری رہیں، خصوصاً تحریک خلافت کے قائد مولانا محمد علی جوہرؒ نے برطانیہ جا کر براہِ راست وہاں کے وزیر اعظم لائڈ جارج کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ’’دیوبند کے مولانا محمود حسن صاحب ہندوستان کے بہت بڑے مذہبی پیشوا ہیں، ہندوستان کے عوام ان کی رہائی کے لیے فکر مند ہیں، اگر ان کی جلد رہائی نہ ہوئی تو نتائج بڑے خطرناک ہوں گے۔‘‘ جس کے نتیجہ میں ۳ سال ۱۹ دِن مالٹا کی جیل میں گزار کر ۲۲/ جمادیٰ الثانیہ/ ۱۳۳۸ھ مطابق: ۱۲/ مارچ/ ۱۹۲۰ء بروز جمعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الہندؒ کو اپنے رفقاء سمیت رہائی عطا فرمائی، آپؒ تقریباً تین ماہ کے سفر کے بعد ۲۰/ رمضان المبارک/ ۱۳۳۸ھ مطابق: ۷/ جون/ ۱۹۲۰ء کو بمبئی کے ساحل پر پہنچے، جہاں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند (والد گرامی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ) مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ اور گاندھی جی جیسے قوم و ملت کے رہنماؤں کے ساتھ ہزاروں لوگوں نے اسیرانِ مالٹا کا پر تپاک استقبال کیا، تحریک خلافت

نے آپؒ کو ’’شیخ الہند‘‘ کا خطاب عطا کیا۔

’’بھارت چھوڑو‘‘ (Quit India) تحریک کا آغاز:

حضرت شیخ الہندؒ نے مالٹا کی رہائی کے بعد تین اہم امور کی طرف متوجہ فرمایا:

(۱) اپنی تمام تر توجہات اتحادِ ملت اور قرآن کی خدمت پر مرکوز کر دیں، جس کے لیے آپؒ نے پر زور کوششیں فرمائیں اور جگہ جگہ مکاتب قرآنیہ و مدارسِ دینیہ کا جال بچھایا۔ (۲) قدیم و جدید (دینی و عصری) تعلیم اور ملی و قومی تحریکوں کے درمیان فاصلہ ختم یا کم کیا جائے۔ جس کا سب سے بڑا مظہر آپؒ کا سفر علی گڑھ اور تاسیس جامعہ ملیہ ہے۔ (۳) تمام ہندوستانی عوام کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنا کر آزادیٔ ہند کے لیے ایک عوامی تحریک کا آغاز کیا جائے۔ جس کے لیے آپؒ نے امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کا اور غیر مسلموں میں موہن داس کرم چند گاندھی (جن کو بعد میں مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے گاندھی جی سے ’’مہاتما گاندھی‘‘ کا خطاب عطا کیا) کا انتخاب کیا۔

اسی ضمن میں ’’ترکِ موالات‘‘ (Non Cooperation) کا فتویٰ جاری کیا گیا، جس کا مضمون یہ تھا:

(۱)...... تمام مسلمان دشمنِ اسلام (انگریز) کا تعاون ترک کر دیں۔

(۲)...... سرکاری اعزازات وخطابات واپس کر دیں۔

(۳)...... ملکی مصنوعات ہی کا استعمال کریں۔ (انگریزی مصنوعات کے استعمال سے احتراز کریں)۔

(۴)...... ملک کی کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دیں۔

(۵)... سرکاری (انگریزی) اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کریں۔

یہ فتویٰ ذوالقعدہ/ ۱۳۳۸ھ مطابق: ۱۹۱۹ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے دستخط سے

جاری ہوا، اس کے بعد یہی فتویٰ ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماءِ ہند نے ترکِ موالات کے حکم شرعی ہونے کا فیصلہ فتویٰ کی صورت میں ۴۷۴ علماءِ کرام کے دستخطوں کے ساتھ جاری کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریز حکومت کا تعاون کرنا، ان کی ملازمت میں رہنا، ان کی فوج میں بھرتی ہونا وغیرہ سب حرام ہے۔ (اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ بواسیر اور کثرتِ بول جیسے امراض کی وجہ سے ۱۳۳۹ھ مطابق: ۳۰/نومبر/۱۹۲۰ء کو وفات پا گئے)

مگر آپؒ کی تحریک آزادی نے اپنے مضمرات واثرات کا رنگ دکھانا شروع کیا، ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثالی اتحاد پیدا ہو گیا تھا، کیوں کہ دونوں کا مقصد اور نشانہ انگریز تھے، مگر گاندھی جی ''اہنسا'' (عدمِ تشدد) کے نظریہ کے ساتھ چلنا چاہتے تھے، اس لیے جب گورکھپور کے موضع چوری چورا میں عوام نے ایک پولس اسٹیشن کو آگ لگا دی تو اس واقعہ سے نالاں ہو کر گاندھی جی نے اچانک تحریک کا ساتھ نہ دینے کا اعلان کر دیا، درحقیقت یہ گاندھی جی کی اجتہادی غلطی تھی، جس سے عوام نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

اس کے بعد جب ۱۹۴۲ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو اسی دوران ۸/اگست/۱۹۴۲ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ایک اجلاس ''کوئٹ انڈیا'' (Quit India) کے عنوان سے بمبئی میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، جس کو ایک طرف کانگریس کامیاب بنانے کی فکر میں تھی، تو دوسری طرف انگریزی حکومت اسے ناکام کرنے پر تلی ہوئی تھی، ۹/اگست/۱۹۴۲ء کو صبح پورے ملک میں یہ خبر گونج اٹھی کہ ہندوستان کے تمام لیڈر گرفتار کر لیے گئے، اس کے ردِ عمل میں ہندوستان کے تمام عوام نے غصہ میں آ کر انگریزی حکومت کے سارے نظام کو تہس نہس کر دیا، ریلوے لائن اکھاڑ دی، اسٹیشنوں کو آگ لگا دی، تار کاٹ دیے، تھانے جلا دیے، ایسا لگتا تھا کہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہے، اور حضرت شیخ الہندؒ اور آپؒ کے تمام ہی رفقاء کی تحریک کی سلگتی چنگاری شعلۂ جوالہ بن گئی، ہر ہندوستانی باشندہ انگریزی حکومت کے خلاف دیوانہ ہو گیا تھا، ان حالات میں انگریزوں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اب

ہندوستان پر ہمارا تسلط آسان نہیں، دوسری طرف انگریز نے گہوارۂ امن وامان ہندوستان کو اچھا خاصا لوٹ کر بالکل ویران کر دیا تھا، گندی سیاست، عصبیت اور فرقہ واریت کے ناپاک بیج ہندوستانیوں کے سینوں میں بو دیے تھے، اس لیے انہوں نے یہاں سے رخصت ہونے ہی میں اپنی عافیت سمجھی، اور بالآخر ۱۵/اگست/۱۹۴۷ء میں ہمارا وطن عزیز غاصب اور ظالم حکومت سے سیاسی طور پر آزاد ہو گیا اور ہمیں اس ملک میں آزادی کے ساتھ تعمیر، ترقی اور دستور سازی کا قانونی حق حاصل ہو گیا۔

ان حقائق سے یومِ آزادی کی اہمیت اور اس میں ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا رول اور کردار رہا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

ترانۂ آزادی:

اس لیے ہمارے عزیز دوست شاعر اسلام جناب مولانا قاری احسان محسن صاحب مدظلہٗ نے اپنے ترانۂ آزادی میں ان حقائق کو بہت خوش اسلوبی سے یوں بیان فرمایا:

ہم لوگ مسلمان ہیں بھارت کے وفادار......

آزادی کی آواز اٹھائی تھی ہم ہی نے
اور ریشمی تحریک چلائی تھی ہم ہی نے
باپو کی صدا اونچی اٹھائی تھی ہم ہی نے
اس ملک کی تقدیر جگائی تھی ہم ہی نے
سچ پوچھو تو بھارت کے ہم ہی لوگ ہیں معمار
ہم لوگ مسلمان ہیں بھارت کے وفادار
انگریزوں سے ہم لوگوں نے لڑ لڑ کے لڑائی
آزادئ بھارت کے لیے جان گنوائی
سینے پہ ہم ہی لوگوں نے گولی بھی تو کھائی
ہر معرکہ دیتا ہے گواہی میرے بھائی!
مت بھولو یہ واقعہ ہے ناقابل انکار
ہم لوگ مسلمان ہیں بھارت کے وفادار
صد پارۂ دامانِ وطن کس نے سیا ہے؟
تعمیرِ حسیں تاج محل کس نے دیا ہے؟
مینار قطب کا یہ بتا کس نے دیا ہے؟
یہ لال قلعہ ہم نے دیا ہم نے دیا ہے

شاہد ہیں ہمارے کہیں مسجد کہیں مینار | ہم لوگ مسلمان ہیں بھارت کے وفادار
ہم ہی شاہ ظفر ہیں، ہم ہی بابر، ہم ہی اکبر | ہم ہی شوکتؒ و محمودؒ، ہم ہی مدنیؒ و جوہرؒ
اشفاق ہم ہی ہیں، کہیں ٹیپو، کہیں حیدر | دشمن سے رہے بر سرپیکار سراسر
ہم لوگ ہیں معمارِ وطن قاتل غدار | ہم لوگ مسلمان ہیں بھارت کے وفادار
ہم لوگ مسلمان ہیں پابند شریعت | ہم اہل وطن سے نہیں رکھتے کدورت
اللہ کا پیغام ہے پیغامِ مسرت | اللہ نے بخشی ہے ہمیں حسن بصیرت
محسن ہیں ہم ہی ملک کی تاریخ کے شہکار | ہم لوگ مسلمان ہیں بھارت کے وفادار

وقت کے چند اہم تقاضے:

افسوس صد افسوس! ان تاریخی اور یقینی حقائق کو انگریزی سازش کے تحت انگریزی ذہنیت اور گندی سیاست کے حامل کچھ لوگ فراموش کردینا چاہتے ہیں، جنگِ آزادی کے سلسلہ میں علماء اور مسلمانوں کے قائدانہ کردار، کوششوں اور کارناموں کو مٹادینا چاہتے ہیں، اتنا ہی نہیں، بلکہ ستم بالائے ستم یہ کہ خود ملک کے تئیں مسلمانوں کی وفاداری پر شک کرکے انہیں بے وفا، غدار اور کرایہ دار ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں ان حالات میں وقت کا پہلا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہمیں اُن مسلمان مجاہدین ہند کی آزادیٔ ہند کے سلسلہ میں دی گئی قربانیوں کو یاد رکھنا چاہیے، ان کی بے مثال ولازوال قربانیوں اور کوششوں سے اپنوں اور بیگانوں کو باخبر اور واقف کرنا چاہیے، اس کے لیے اگر ہم اپنے مسلمان مجاہدین اور قائدین کے مجسمے حرام ہونے کی وجہ سے نصب نہیں کرسکتے تو کم از کم ان کے نام سے منسوب اِدارے اور کلاسس بنائیں، تاکہ ہماری آئندہ آنے والی نئی نسلیں اس حقیقت سے باخبر رہیں کہ ہم مسلمان بھی اس ملک کے اصل حصہ دار اور حقدار ہیں، کرایہ دار نہیں۔ ؎

نہیں منت کش تابِ شنیدن داستاں میری | خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

رہی بات ان ضمیر فروشوں اور ملک کے غداروں کی جو مسلمانوں کی وفاداری پر شک کرتے ہیں اور جنت نشاں ہندوستان کے پیارے چمن اور گلستاں کو سرسوں کا کھیت بناکر ہندوراشٹر ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان سے یہ عاجز تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے سوال کرنا چاہتا ہے کہ ہندوستان ہندوراشٹر کب اور کیسے بنا؟ کیوں کہ ہندو تو مرنے کے بعد ان کے عقیدہ کے مطابق جلادیے جاتے ہیں، اور ان کی راکھ مقدس گنگا وجمنا میں بہادی جاتی ہے، جو سمندر میں پہنچا دی جاتی ہے، اس کے بعد ہندو کہاں رہ گئے؟ جب کہ ہم ہندوستان کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے یہاں دفن کا طریقہ ہے، اس لیے ہم تو اگر جیتے جی ملک کی مٹی سے (بوقت ضرورت) تیمّم کرتے ہیں تو مرکے بھی اس ملک کی مٹی میں مل جاتے ہیں، ہم تو مرنے کے بعد بھی اپنے مادرِ وطن کی گود میں سوجاتے ہیں، اور وہ بھی کس شان سے؟ بقولِ شاعر:

زمین کی کوکھ میں بھی جاتے ہیں تو غسل کرکے | وطن کی مٹی کو بھی ناپاک ہم نہیں کرتے

اور

مذہب کے نام پر ظلم وستم ہم نہیں کرتے | وفا کی آڑ میں سیاست ہم نہیں کرتے

تاہم آج اگر بدقسمتی اور انگریزوں کی عیاری کی وجہ سے اس ملک پر گندی سیاست اور انگریزی ذہنیت کے حامل افراد کا غلبہ ہے تب بھی ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ وقت کے مطالبات اور تقاضوں کو سمجھیں، آج پھر ایک بار وقت ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے ایمان اور اعمال واخلاق میں قوت، آپس میں ایمانی اور انسانی اصولوں پر اخوّت اور دین کی دعوت کے ساتھ اسلامی سیاست کا شعور پیدا کریں، اور ان سب باتوں کے لیے طوفان کی طرح اٹھ کر بجلی کی طرح گر نہ جائیں بلکہ انفرادی اور اجتماعی طور پر جہدِ مسلسل کے لیے تیار اور بیدار ہوجائیں، یقیناً ہم اس وقت غفلت کی نیند سوئے تو ہیں لیکن مرے نہیں، سویا ہوا ہزار بار جگایا جاسکتا ہے، لیکن مرا ہوا ایک بار بھی زندہ نہیں کیا جاسکتا، سونا عیب تو نہیں، لیکن اس کی ایک حد ضرور ہے، لہٰذا اب ہم پھر پورے

احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ہمت کر کے خود بیدار ہو جائیں اور محبت سے دوسروں کو بھی بیدار کریں، یہی حقیقی آزادی کے لیے وقت کا تقاضا اور مطالبہ ہے، اگر ہم نے ایسا کیا تو بعید نہیں کہ ملک کی باگ ڈور آئندہ ہمارے ہاتھوں میں ہو، کیوں کہ وعدۂ الٰہی ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝﴾ (النور: ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا، اور ان کے دین کو استحکام بخشے گا جسے ان کے لیے اس نے پسند کیا ہے، اور ان کے اگلے خوف کو امن میں تبدیل فرمادے گا، (بس) وہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اور جو لوگ اس کے بعد بھی ناشکری کریں گے تو ایسے لوگ نافرمان ہوں گے۔'' (جن کے لیے کوئی وعدہ نہیں)۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حقائق سمجھا دے اور ہمارے ایمان، اعمال اور اخلاق میں قوت، آپس میں اُخوّت، دین کی دعوت اور اسلامی سیاست کی توفیق عطا فرما کر ہمیں اور ہماری قیامت تک آنے والی نسلوں کو حقیقی آزادی اور دارین کی کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔

۷/ ذوالحجہ/ ۱۴۳۷ھ، بروز: ہفتہ

مطابق: ۱۰/ستمبر/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

70

(۶)

قانونِ شریعت کی حقیقت، اہمیت اور ضرورت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ." (رواه البغويؒ في شرح السنة، مشكوٰة: ۳۰/ باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی تمام خواہشات (وعادات) اس شریعت کے تابع نہ ہو جائیں جس کو میں لے کر آیا ہوں۔''

جو لوگ محمد کے وفادار نہیں ہیں — اللہ کی رحمت کے وہ حقدار نہیں ہیں
حاصل ہے جنہیں عشق محمد کا خزانہ — کونین کی دولت کے وہ طلب گار نہیں ہیں

جن کو ہے محمد کے طریقوں سے عداوت — وہ ان کی غلامی کے سزاوار نہیں ہیں
جو دین ہمیں دے گئے سلطانِ مدینہ — ہم اس کے بدل دینے کو تیار نہیں ہیں
پیمانِ وفا ان سے نبھائیں گے ہمیشہ — مجرم ہیں، خطا کار ہیں، غدار نہیں ہیں
سوئی ہوئی قوموں کو جو آئے تھے جگانے — افسوس ہے افسوس، وہ بیدار نہیں ہیں
کس منہ سے محمد کے وہ بنتے ہیں فدائی؟ — اغیار کی رسموں سے جو بیزار نہیں ہیں

سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے کبھی دین وہ دانشؔ
اصحابِ نبی کے جو وفادار نہیں ہیں

(مولانا امام علی دانشؔ)

قانون کی اہمیت اور ضرورت:

اللہ رب العزت نے زمین کے سینے پر قسما قسم کے درختوں کو پیدا فرمایا، جو ہمیں جنگلات، باغات اور رہائش گاہوں میں نظر آتے ہیں، کہیں تو درختوں کے گھنے بَن ہیں، کہیں درختوں سے سجے ہوئے گلشن اور مکان ہیں، اگر جنگل اور گلشن کے درختوں کے درمیان غور کیا جائے تو ان میں بنیادی طور پر تہذیب وترتیب کا ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گلشن اور چمن میں مالی ہوا کرتا ہے، جب کہ جنگل اس سے خالی ہوتا ہے، اس لیے جنگل کے درخت تو بظاہر کیف ما اتفق اور بے ترتیب بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں، لیکن یہی درخت جب کسی آنگن اور گلشن کا حصہ بن جاتے ہیں تو وہاں ان کا مالی انہیں بڑی خوب صورتی کے ساتھ ترتیب دے کر سنوارتا اور سجاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جنگل اور گلشن کے درختوں کا جو حال ہے تہذیب اور ترتیب کے اعتبار سے تقریباً وہی حال انسانوں کا بھی ہے، جو کردار جنگل کو منگل اور کوچۂ ویران کو گلستان بنانے میں ایک مالی ادا کرتا ہے وہی کردار انسانی سماج کے جنگل کو منگل بنانے اور انسانی سماج کو مہذب بنانے میں قانون ادا کرتا ہے، قانون عموماً حکومت یا طاقت کے زور پر نافذ اور جاری کیا جاتا ہے، لیکن جب کسی بھی سماج میں قانون نافذ اور

جاری کر دیا جاتا ہے تو وہاں اس کی پابندی انسان کو بڑی حد تک مہذب بنا دیتی ہے، قانون کی پابندی سماج کو ظالم کے ظلم سے روک کر مظلوم کو اس کا حق دلواتی ہے، قانون کی پابندی سماج کے تمام طبقات کے ضروری حقوق اور اخلاقی حدود متعین کر دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جس سماج میں واقعی قانون کی حکمرانی اور پابندی ہوتی ہے وہ سماج انسانیت کا چمن اور گلشن بن جاتا ہے، اور جہاں قانون کی حکمرانی اور پابندی نہیں ہوتی وہاں انسانی سماج انسانوں کا جنگل بن جاتا ہے، اس سماج میں خود انسانوں کو انسانوں سے جتنا نقصان پہنچتا ہے جنگل کے درندوں سے بھی اتنا نقصان نہیں پہنچتا، قانون کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ہر زمانہ کے انسانی سماج میں اس کی ضرورت مسلم رہی ہے۔

قانونِ شریعت کی عظمت:

البتہ یہ قانون بنیادی طور پر دو طرح کے رہے ہیں: ایک انسانی قانون، اور دوسرا ربانی قانون، انسانی قانون سے مراد وہ قوانین ہیں جنہیں شخصی، سماجی، تنظیمی، سیاسی اور ملکی ضرورت، حکمت اور مصلحت کے تحت کسی دانشور یا کسی جماعت نے مل کر اپنی دانائی اور سمجھ داری سے بنائے ہیں، جو ضرورت کے مطابق تبدیل بھی ہو سکتے ہوں۔ لیکن ربانی قانون سے مراد وہ قوانین ہیں جنہیں خالق ارض وسماوات اور مالک کائنات نے کائنات کے نتائج و اثرات اور پوری انسانیت کے جذبات، احساسات، خواہشات اور ضروریات، نیز ان کے نفع ونقصان کو مدنظر رکھ کر بنائے ہیں، یہ ربانی قانون ہمیں کلام اللہ، سنت رسول اللہ، اجماعِ امت اور قیاس کے ذریعہ پہنچا، اور اسی کو قانونِ شریعت بھی کہا جاتا ہے، جس کے متعلق ارشادِ باری ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا﴾ (المائدة : ٤٨)

”تم میں سے ہر ایک (امت) کے لیے ہم نے ایک (الگ) شریعت (قانون) اور طریقہ مقرر کیا ہے۔“

اسی قانونِ الٰہی کی آخری اور تکمیلی و عالمی شکل شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ ظاہر ہے کہ ربانی قانون یعنی قانونِ شریعت کو جو عظمت حاصل ہے وہ انسانی قانون کو ہرگز حاصل نہیں، بلکہ اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل اس کے احکام اور قوانین شریعت ہے۔

قانونِ شریعت کی پہلی خصوصیت اس کی کاملیت ہے۔

انسانی قانون کے بالمقابل ربانی اور شرعی قانون کو بنیادی طور پر چند امتیازات اور خصوصیات حاصل ہیں، مثلاً قانونِ شریعت کی پہلی خصوصیت اس کی کاملیت ہے، کسی بھی قانون کے قیام و دوام اور استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ہر زمانہ کے ہر سماج کے تمام احوال کی رہبری موجود ہو، چنانچہ قانونِ شریعت کی یہی شان ہے کہ اس میں ہر زمانہ کے ہر سماج کے تمام انسانوں کے احوال کی کامل اور مکمل رہبری موجود ہے، قانونِ شریعت کی اسی کاملیت کا اعلان قرآنِ پاک نے یوں فرمایا:

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ (المائدۃ : ۳)

’’آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین (اور شریعت کا قانون) مکمل کر دیا، اور میں نے اپنی نعمت (بہ شکل دین) تم پر مکمل کر دی۔‘‘

قانونِ شریعت سے ناواقفیت کوتاہی ہے، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ کونسا زمانہ اور کونسا موقع ایسا ہے جس میں شریعت نے انسانی سماج کی رہبری نہ کی ہو؟ خواہ ان احوال کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات سے، اخلاقیات سے ہو یا معاملات سے، سیاست سے ہو یا حکومت سے، تندرستی سے ہو یا بیماری سے، خوشی سے ہو یا غمی سے، انفرادی، عائلی (پرسنل) زندگی سے ہو یا سماجی و اجتماعی سے، غرض انسانی زندگی کے جتنے بھی احوال ہیں قانونِ شریعت میں تمام احوال کی کامل اور مکمل رہبری موجود تھی، ہے، اور قیامت تک رہے گی، کیوں کہ شریعت مطہرہ نے ایسے قواعد و مقاصد کی رہبری بھی کی ہے جن کی روشنی میں عہدِ نبوت سے لے کر قیامِ قیامت تک کے جتنے زمانے ہیں ان تمام زمانوں کے انسانوں کے مسائل کا حل مل سکتا ہے،

قانونِ شریعت کی اسی خصوصیت کی وجہ سے جس طرح وہ چودہ سو سال پہلے قابل عمل تھا آج بھی اسی طرح قابل عمل ہے، لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ اب حالات بدل گئے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ اور اس کے حالات نہیں، بلکہ اسباب و وسائل بدلے ہیں، اور اسباب و وسائل کے بدلنے سے قانونِ شریعت میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں۔ ؎

ہے قولِ محمد قولِ خدا، فرمان نہ بدلا جائے گا — بدلے گا زمانہ لاکھ، مگر قرآن نہ بدلا جائے گا

قانونِ شریعت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی:

روایتوں میں ہے کہ مشرکین مکہ نے رحمت عالم ﷺ سے قرآنِ کریم اور اس کے احکام و قوانین میں تبدیلی کا مطالبہ کیا تھا، اس لیے کہ ؎

ہو شرک و بدعت پر جن کا گزارا — انہیں کیسے ہوگی شریعت گوارا؟

چنانچہ مشہور تابعی حضرت قتادہؒ سے منقول ہے کہ مشرکین مکہ کے پانچ افراد (۱) عبد اللہ بن امیہ (۲) ولید بن مغیرہ (۳) بکر بن حفص (۴) عمرو بن عبید اللہ بن ابی قیس اور (۵) عاص بن عامر بن ہشام نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ آپ ہم سے ایمان کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہمارا بھی آپ سے ایک مطالبہ ہے، وہ یہ کہ

﴿ اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَا اَوْ بَدِّلْهُ ط﴾ (یونس : ۱۵)

یہ نہیں، کوئی اور قرآن (اور قانون) لائیے، (جس میں ہماری خواہشاتِ نفسانی کی گنجائش نکل آئے) یا پھر اس میں تبدیلی کر دیجیے۔

رب العالمین نے ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ج اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ج﴾ (یونس : ۱۵)

محبوبم! کہہ دیجیے کہ میرے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ تمہاری تجویز کے مطابق

قرآن اوراس کے قانون میں تبدیلی کردوں، کیوں کہ میں قانون ساز نہیں، مبلغ ہوں، اوروحیِ الٰہی کا تابع ہوں۔ آپ ﷺ نے تبدیلیٔ قانون کے مطالبہ کو ٹھکراتے ہوئے صاف فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن اوراس کے قانون میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

(معالم التنزیل:۲/ ۳۴۷، مستفاداز: انوارالبیان:۲/۶۲۴)

تعصب کے تقاضوں سے رفاقت کرنہیں سکتے تیری ناپاک کوشش کی حمایت کرنہیں سکتے
ہم اپنی جان تک دے سکتے ہیں وطن کے لیے مگرشریعت کے اصولوں سے بغاوت کرنہیں سکتے

ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا بھی ایک واقعہ منقول ہے کہ جس وقت آپؒ فتوحات سے فارغ ہوچکے تو کسی وزیر نے تبدیلیٔ قانون کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ حضرت! یہ عیسائی قوم بڑی سخت ہے، نرمی کے قابل نہیں، لہٰذا ان کے لیے کوئی سخت قانون بنایا جائے، اس موقع پر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے فرمایا کہ ”ہمارے پاس قانونِ شریعت موجود ہے، اور وہی سب کے لیے کافی ہے، قانونِ شریعت کے ہوتے ہوئے کسی نئے قانون کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، رہی بات سلطنت کے استحکام کی، تو ہمارا مطلوب و مقصود سلطنت اور منفعت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اگر قانونِ شریعت جاری کرنے سے سلطنت چلی جائے تو اپنی بلا سے، مگر اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا تو مل جائے گی، سلطنت اور منفعت قانونِ شریعت سے اہم نہیں ہے۔

تجھے مبارک ہو حکمرانی، مخالفت بھی ہم نہ کریں گے
لیکن شریعت پہ ہاتھ ڈالا تو تم رہوگے نہ ہم رہیں گے

قانونِ شریعت کی دوسری خصوصیت ’فطرت سے مناسبت‘

قانونِ شریعت کی دوسری خصوصیت اس کی فطرت سے مناسبت ہے، فطرت سے

73

بغاوت ہمیشہ انسان کے لیے نقصان کا سبب بنتی ہے، اس لیے کسی بھی قانون کی افادیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ فطرت کے مطابق ہو، اور قانونِ شریعت کا یہی خاصہ ہے کہ وہ عین فطرت کے مطابق ہے، غالبًا اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے قانونِ شریعت کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:

﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (الروم: ۳۰)

”اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اُس فطرت پر چلو جس پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ (شریعت) میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“

فطرت کے متعلق علماءِ مفسرین سے مختلف اقوال منقول ہیں: ان میں سے ایک قول دین (وشریعت) ہے۔ (انوارالبیان: ۵/ ۳۱۷)

فطرت سے مراد شریعت اس لیے بھی ہے کہ قانونِ شریعت میں ہر جگہ انسانی فطرت وطبیعت کی رعایت کی گئی ہے، اس کی کئی مثالیں ہیں، من جملہ ان میں جرائم کی روک تھام کے لیے سزاؤں کا نفاذ بھی ہے، کیوں کہ فطری طور پر بعض انسانی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ کتنی ہی محبت کی زبان استعمال کرلیں اور نصیحت و ہمدردی کے ساتھ دل کے بند دروازوں کو دستک دیں، لیکن جب تک ایسے لوگوں کو مناسب اور سخت سزا نہ دیں وہ جرائم سے باز نہیں آسکتے، ایسے ہی لوگوں کے لیے مناسب اور سخت قانون بھی ایک مہذب سماج کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت مطہرہ نے اسلامی حکومت کی عدالت میں ثبوتِ جرم کے بعد سخت اور مناسب سزائیں بھی رکھی ہیں، جن کا اصل مقصد سماج کو جرائم سے پاک کرنا اور مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے مجرمانہ حوصلوں کو پست کرنا ہے، جو عین فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ تو ایک اجمالی مثال ہے، ورنہ شریعت اسلامی کے کسی بھی حکم کو حقیقت پسندی

کے ساتھ دیکھ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ قانونِ شریعت میں قانونِ فطرت کی مطابقت اور مناسبت غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے۔ برخلاف خود ساختہ انسانی قوانین کے، کہ ان میں فطرت سے بغاوت جگہ جگہ نمایاں ہے۔

قانونِ شریعت کی تیسری خصوصیت
اس کا عدل واعتدال ہے:

علاوہ ازیں قانونِ شریعت کی تیسری خصوصیت اس کا عدل واعتدال ہے، عدل و اعتدال کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کی ذمہ داری اس کی صلاحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے، جیسے ملک کا دفاع، قیامِ امن وامان اور اس طرح کی ذمہ داریاں مردوں سے متعلق ہوں، کیوں کہ وہی ان امور کی صلاحیت رکھتے ہیں، جب کہ گھریلو امور اور بچوں کی پرورش عورتوں سے متعلق ہوں، کیوں کہ وہی ان کاموں کو بہترین طریقہ پر انجام دے سکتی ہیں، چنانچہ قانونِ شریعت بھی یہی ہے، قانونِ شریعت میں انسانی حقوق کے اعتبار سے تو مرد وزن کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے، کیوں کہ مرد وزن دونوں ہی انسانی سماج کے دو لازمی جزو ہیں، لہٰذا حقوق میں دونوں برابر ہوں گے، جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرة : ۲۲۸)

جیسے مردوں کے کچھ حقوق متعین ہیں، ویسے عورتوں کے بھی کچھ حقوق متعین ہیں، لیکن چوں کہ دونوں کی صلاحیتیں اور نوعیتیں مختلف ہیں اس لیے ذمہ داریاں بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوں گی، کسبِ معاش وغیرہ کی ذمہ داری تو مردوں پر ہوگی، جب کہ امورِ خانہ داری اور تربیت اولاد وغیرہ کی ذمہ داری عورتوں پر ہوگی، واقعہ یہ ہے کہ قانونِ شریعت نے سماجی زندگی کا یہ نہایت ہی زریں اصول بیان کر دیا، اس کے علاوہ بھی شرعی قوانین کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ ربانی اور شرعی قانون میں جو

عدل واعتدال ہے ایسا عدل واعتدال گذشتہ، موجودہ اور آئندہ زمانہ کے کسی انسانی قانون میں نظر نہیں آسکتا۔

قانونِ شریعت سبھی کے لیے رحمت ہے
کسی کے لیے زحمت نہیں:

اسی بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ انسانی قانون کے مقابلہ میں ربانی اور شرعی قانون سبھی کے لیے رحمت ہے، کسی کے لیے بھی زحمت نہیں ہے، اس کی ایک آسان مثال طلاق ہے، وہ اس طرح کہ نکاح کا بنیادی مقصد الفت ومحبت ہے، اگر خدانخواستہ یہ فوت ہو جائے اور زوجین میں نفرت پیدا ہو جائے تو اس وقت جدائی کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنے کے بعد طلاق ایک ناخوش گوار ضرورت بن جاتی ہے، لیکن حکم یہ ہے کہ بوقت ضرورت طلاق یا خلع کی نوبت آئے تو مناسب وقت میں دو گواہوں کے روبرو صرف ایک ہی طلاق دی جائے، اسی سے میاں بیوی کے درمیان مطلوبہ علیحدگی ہو جائے گی، اس میں عدت کے درمیان رجوع کا حق باقی رہتا ہے، ورنہ عدت کے بعد دونوں کو اپنی زندگی خوش گوار بنانے کے لیے دوسرے نکاح کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر دونوں نے کوئی اور نکاح نہیں کیا، اور اب پہلے ہی کی طرح دونوں میاں بیوی بن کر ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ایک طلاق کے باوجود دونوں کے لیے دوبارہ نکاح کرنے کی گنجائش موجود ہے، اور بوقت ضرورت طلاق کا یہی شرعی اور صحیح طریقہ ہے۔ لیکن اگر کسی نے طلاق کا غیر شرعی اور حرام طریقہ اختیار کرتے ہوئے تین طلاق دے دی، تو یہ اس کا اپنا قصور ہے، شرعاً اس کی سزا یہ ہے کہ دونوں میں اب دائمی جدائی ہو جاتی ہے، اس لیے ''ایک طلاق میں جلدی نہیں، اور تین طلاق کبھی نہیں'' پر عمل ہونا چاہیے، کیوں کہ بوقت ضرورت ایک طلاق سماج کی ناخوش گوار ضرورت ہی نہیں بلکہ بعض اوقات رحمت ثابت ہوتی ہے، جب کہ تین طلاق زحمت و

لعنت ہے۔

الغرض قانونِ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ جب کلام اللہ، سنت رسول اللہ، اجماعِ امت اور قیاس سے قانونِ شریعت کا ثبوت مل جائے تو اسے فوراً قبول کر لینا چاہیے، خواہ اس میں کوئی حکمت و مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے، کیوں کہ دنیوی اعتبار سے بھی کبھی کسی قانون کے قبول کرنے کے لیے ثبوت ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے، سمجھ میں آنا ضروری نہیں سمجھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ آج بھی انسانی قانون میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں، مگر پھر بھی ان پر عمل کیا جاتا ہے، یہی معاملہ ربانی قانون کے ساتھ بھی ہونا چاہیے، جب دلائل شرعیہ سے شرعی قانون کا ثبوت مل جائے تو بہر حال اسے قبول کر لیا جائے، ان شاء اللہ اس سے ایمان میں کمال پیدا ہوگا، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں واضح کیا گیا، اس کے برخلاف قانونِ شریعت کے ثبوت کے باوجود اسے قبول نہ کرنا اور اس پر عمل کرنے کو حکمت و مصلحت کے معلوم ہونے پر موقوف رکھنا یہ زبردست غلطی اور تقاضائے عبدیت کے خلاف ہے۔

مسلم پرسنل لا کی حقیقت واہمیت:

اور یاد رکھو! اللہ رب العزت نے ہمیں کلام اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جو قانونِ شریعت عطا فرمایا ہے اس کے مختلف شعبے ہیں، ان میں ایک اہم شعبہ اس قانون کا ہے جو انسانی سماج اور معاشرہ سے متعلق ہے، جو خاندانی نظام کی بنیاد ہے، اور جو سماجی تعلقات کے اصول بتاتا ہے، جن میں خاندان کے مختلف افراد کے حقوق اور اُن کی ذمہ داریوں کو متعین کیا گیا ہے، ان ہی قوانین کو عرب علماء ''قوانینِ احوالِ شخصیہ'' اور اُردو میں ''عائلی قوانین'' جب کہ انگریزی میں ''پرسنل لا'' (PERSONAL LAW) کہتے ہیں، مسلم پرسنل لا قانونِ شریعت کا بنیادی حصہ ہے، ان شرعی قوانین کو ختم کر کے یکساں سول کوڈ کے ذریعہ ملک کے تمام شہریوں کے لیے ایک ہی معاشرتی قانون نافذ کرنا یہ دستورِ ہند کی دفعہ ۲۵ کے خلاف ہونے کے ساتھ مفکر ملت حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے بقول قرآنِ

کریم کی تقریباً چالیس آیتوں اور سینکڑوں احادیث مبارکہ پر عمل کرنے سے جبراً و ظلماً محروم کرنا ہے، جو سچے مسلمان کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے۔

عاجز کا پیغام موجودہ حکومتِ ہند کے نام:

یہ عاجز ملک کی موجودہ حکومت کو یہ صاف صاف پیغام دینا چاہتا ہے کہ حکومت بدل سکتی اور مٹ بھی سکتی ہے، شریعت نہیں، شریعت کو کوئی مٹا سکا ہے نہ شریعت پر عمل کرنے والوں کو، یاد رکھئے! جب ہماری کشتی ڈوب جائے گی تو پوری دنیا کا جنازہ اُٹھ جائے گا، اور یہ بھی جان لیجیے کہ قانونِ شریعت پر عمل کرنا اس ملک میں مسلمانوں کا قانونی حق ہے، مسلمانوں کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا، مسلمانوں کو یکساں سول کوڈ کے ذریعہ پریشان کرنے کے بجائے انہیں جان و مال کا تحفظ دیا جائے، ورنہ ملکی آزادی کی جنگ ہم نے اگر پہلے لڑی ہے تو ملّی آزادی کی جنگ آج بھی لڑ سکتے ہیں، ملک کو اس وقت یکساں سول کوڈ سے زیادہ قیامِ امن کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ملک کی ترقی و خوش حالی ممکن نہیں، اور قیامِ امن کے لیے تمام اقوام اور ان کے افراد کو ان کے حقوق دینا لازم اور ضروری ہے، اگر قوموں کو ان کے حقوق سے محروم کیا گیا تو امن کی فضا قائم نہیں رہ سکتی۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حقائق سمجھا دے اور اولاً ہمیں قانونِ شریعت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، ثانیاً حکومت کو بھی شریعت میں مداخلت سے بچنے کی توفیق دے، ورنہ ایسی حکومت کو نیست و نابود فرما دے۔

یوم عرفہ/ ۷/ ۱۴۳۷ھ/ بروز پیر

مطابق: ۱۲/ ستمبر/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۷)

دینی وعصری علوم کا امتزاج وقت کی اہم ضرورت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "الْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِيْمِ، فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا."

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ، مشکوٰۃ: ۳٤/ کتاب العلم / الفصل الثانی)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حکمت ودانائی (علومِ نافعہ) حکیم (مومن) کا (گوہر مطلوب اور) گم شدہ سامان ہے، لہٰذا (یہ علم وحکمت اسے) جہاں (اور جس کے پاس) ملے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔“

دینی علوم زندگی کا مقصد ہیں تو عصری علوم زندگی کی ضرورت:

اللہ رب العزت نے علم وحکمت میں ایسی زبردست تاثیر وطاقت رکھی ہے کہ علم خواہ دینی ہو یا عصری، علم ادیان کا ہو یا ابدان کا، بہر حال صاحب علم کو فائدہ دیتا ہے، اور بات یہ ہے کہ دینی علوم سے دینی اور اخروی اعتبار سے فائدہ ہوتا ہے تو عصری و دنیوی علوم سے دنیا کے اعتبار سے فائدہ ہوتا ہے۔ دینی علوم سے مراد کتاب وسنت اور فقہِ اسلامی کا علم ہے، جس کا بنیادی مقصد اللہ رب العالمین کی پہچان اور اس کی رضا ہے، قرآن وحدیث میں حصولِ علم کے جتنے بھی فضائل ہیں ان سے مراد بلاشبہ یہی دینی علم ہے، جب کہ عصری و دنیوی علوم عام طور پر وہ سمجھے جاتے ہیں جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں، جن کا بنیادی مقصد اچھی ڈگری یا نوکری حاصل کرنا ہوتا ہے، تا کہ دنیوی خوش حالی نصیب ہو، واقعہ یہ ہے کہ خلوص اور حسن نیت کے ساتھ شرعی حدود میں رہتے ہوئے عصری و دنیوی علوم کے ذریعہ اس مقصد کا حصول کوئی غلط بات نہیں ہے، اس لیے کہ قرآنِ کریم میں رب العالمین نے ہمیں ایک ایسی دعا سکھائی جس میں دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی اور خوش حالی مانگی گئی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۝﴾ (البقرة: ۲۰۱)

”پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور بہتری عطا فرما اور آخرت میں بھی ہمیں بھلائی اور بہتری عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔“

گویا حق تعالیٰ خود چاہتے ہیں کہ ہم اس سے دنیا کی بہتری بھی مانگیں اور اس کے حصول کے لیے خلوص کے ساتھ شرعی حدود میں رہتے ہوئے کوشش کریں، لہٰذا خلوص کے ساتھ شرعی حدود میں رہتے ہوئے عصری علوم کے ذریعہ اچھی ڈگری یا نوکری اور خوش حالی کا

حصول جائز بلکہ کسی حدتک ضروری بھی ہے، نیز دینی علوم اگر زندگی کا مقصد ہیں تو عصری علوم بھی زندگی کی ضرورت ہیں، شریعت میں بنیادی طور پر دونوں علوم کو اہمیت حاصل ہے، خواہ وہ دینی ہوں یا عصری۔

شریعت میں دینی وعصری علوم کی تقسیم نہیں ہے:

حقیقت تو یہ ہے کہ شریعت مطہرہ میں دینی وعصری علوم کے عنوان سے کوئی تقسیم ہے ہی نہیں، خیرالقرون میں بھی علم کی اگر کوئی تقسیم تھی تو وہ علمِ نافع اور غیر نافع کی، نہ کہ دینی و عصری علوم کی، یہی وجہ ہے کہ اگر آپ مسلمانوں کے صدیوں پر محیط نظامِ تعلیم پر غور کریں گے تو اس میں پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرہویں صدی ہجری تک دینی وعصری علوم کی کوئی تقسیم اور مدرسہ واسکول کی کوئی تفریق نہیں ملے گی۔

صورتِ حال یہ تھی کہ جہاں بھی مدارس یا جامعات تھے وہاں بیک وقت دینی و عصری تعلیم دی جاتی تھی، اس سلسلہ میں اسلامی تاریخ میں تین جامعات بڑے مشہور ہیں:
(۱) جامعۃ القرویین، جو تیسری صدی ہجری میں مراکش (Morroco) کے ایک شہر فارس میں قائم ہوا، دوسرے تیونس کا جامعہ زیتونیہ ہے اور تیسرے مصر کا جامعۃ الازہر ہے۔

اس لیے کہ دینی علوم (مراد قرآن وحدیث اور فقہِ اسلامی) کو سمجھنے کے لیے عصری علوم کی بھی کسی حد تک ضرورت پڑتی ہے، مثلاً میراث وفرائض کو سمجھنے کے لیے علمِ حساب و ریاضی کی ضرورت پڑتی ہے، نماز، سحر وافطار وغیرہ کے اوقات کی واقفیت کے لیے علمِ نجوم، فلکیات وہیئت کی ضرورت پڑتی ہے، نیز حدیث میں ذکر کردہ مقامات بصیرت کے ساتھ سمجھنے کے لیے جغرافیہ کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح قرآنِ کریم کے نزول اور اس کے پس منظر اور اسلام اور مسلمانوں کی صحیح تاریخ سے آگاہی کے لیے تاریخ کی ضرورت پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور وفکر کر کے اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے سائنسی علوم کی ضرورت پڑتی ہے، علاوہ ازیں چوں کہ علاج ومعالجہ سنت ہے، تو اس کے لیے علم الابدان،

طب اور میڈیکل کی ضرورت پڑتی ہے۔

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم اور اس کی برکات:

ان حقائق کے پیشِ نظر سابقہ ادوار میں قائم ہمارے مدارس وجامعات میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی بھی بیک وقت تعلیم دی جاتی تھی، ان میں جہاں تک دین کی وہ تعلیم جو فرضِ عین ہے وہ بلا امتیاز ہر مسلمان کو دی جاتی تھی، اس کے بعد جس کو علم دین میں اختصاص حاصل کرنا ہوتا تو اس کے لیے مستقل مواقع میسر ہوتے تھے، اور جو عصری علوم میں اختصاص حاصل کرنا چاہتا اس کے لیے بھی ان ہی جامعات میں مستقل مواقع دستیاب تھے، دینی علوم میں اختصاص حاصل کرنے والے کو بھی اس وقت تک باکمال عالم نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ وہ تمام ضروری عصری علوم میں مہارت و دسترس حاصل نہ کرلے، ان تینوں اسلامی جامعات و یونیورسٹیوں میں دینی وعصری علوم ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان سے بڑے بڑے علماء بھی مستفیض ہوئے، بڑے بڑے سائنس داں بھی اور فقہاء وصلحاء بھی، لیکن عصری علوم کے ماہرین نے چوں کہ دینی ماحول میں ان علوم کو حاصل کیا تھا اس لیے دینی علوم کے ماہرین اور عصری علوم کے ماہرین کے مابین بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، ان کا حلیہ، ان کا طرزِ تکلم، ان کی تہذیب وتمدن اور ان کا طرزِ زندگی سب یکساں ہوتا تھا، سبھی دینی رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے، مثلاً ایک طرف جامعۃ القرویین کے تعلیم یافتہ میں حدیث وسنت کے مشہور امام قاضی عیاضؒ، ابن خلدونؒ اور ابن رُشدؒ وغیرہ ہیں، تو دوسری طرف اُسی جامعہ کے خوشہ چینوں میں مشہور اسلامی سائنس داں فارابی، ابوریحان اور البیرونی وغیرہ ہیں، بظاہر ان سب میں کوئی فرق نہ تھا، اگر وہ نماز اور دین کے پابند تھے تو یہ بھی نماز اور دین کے پابند تھے، اگر وہ دینی علوم کے ماہر تھے تو یہ بھی کم از کم دین کے ضروری علم سے باخبر تھے۔ جیسے علامہ ابن باجہؒ کا یہ حال تھا کہ وہ اسلامی علوم میں ایک مقام کے حامل اور قرآن کے حافظ تھے، تو ساتھ ہی علم فلسفہ، علم ہیئت، علم ریاضی اور علم طب میں بھی آپ کو

بڑی مہارت تھی، ان فنون میں آپ کی کتابیں بہت اعلیٰ درجہ کی مانی گئی ہیں۔ ابن رُشدؒ بڑے پایہ کے فقیہ ہیں، آپ کی کتاب ''بدایۃ المجتہد'' فقہ میں ایک گراں قدر تالیف ہے، اسی کے ساتھ ساتھ فن طب میں بھی آپ کا اعلیٰ درجہ و مرتبہ ہے اور ایک درجن کے قریب آپ کی کتابیں طب کے موضوع پر بھی ہیں۔ اسی طرح امام فخر الدین رازیؒ بڑے پایہ کے مفسر اور اصولی بھی تھے اور اپنے زمانہ کے مانے ہوئے فلسفی بھی۔ علامہ سیف الدین آمدیؒ کی کتاب ''الاحکام فی اصول الاحکام'' جہاں اصولِ فقہ میں نہایت اہم کتاب تسلیم کی گئی ہے وہیں ان کی کتاب ''الباہر فی علوم الاوائل'' اور ''کتاب الحقائق'' فلسفہ وحکمت کی بڑی بلند پایہ تصنیفات ہیں، متقدمین میں اکثر علوم طبعیہ وعصریہ کے ماہرین علومِ شرعیہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ (مستفاد از: چند اہم علمی وفکری خطبات: ۲۷۸، مؤلفہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہٗ)

دار العلوم دیو بند کا قیام:

ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کے نظامِ تعلیم اور اس کی برکات کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، یہاں تک کہ برصغیر پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا، تو انہوں نے دینی وعصری علوم میں تقسیم کرنے کے لیے لارڈ میکالے کے ذریعہ ایک ایسا نظامِ تعلیم تیار کرایا کہ بقول اسی کے ''لوگ اس نظامِ تعلیم کو پڑھ کر رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں گے؛ لیکن فکر وعمل کے اعتبار سے انگریز ہوں گے۔'' اسی کے بعد دینی وعصری علوم کے اِدارے بھی تقسیم ہو گئے۔

ان نامساعد حالات میں مجبوراً ہمارے اکابر نے دینی وشرعی علوم کے تحفظ اور شرعی و دینی تعلیم وتربیت کے لیے ۱۸۶۶ء میں دار العلوم دیو بند کی بنیاد رکھی اور ایک معتدل نظامِ تعلیم وتربیت مرتب فرمایا، اس کا مقصد تو اگرچہ دین وشریعت کی تعلیم وتربیت، دینی وشرعی علوم کا تحفظ اور اس کی ترویج واشاعت ہی تھا، لیکن اس نظامِ تعلیم میں عصری علوم وفنون کی طرف بھی بقدرِ ضرورت توجہ دی گئی، مثلاً فلسفہ، حکمت، نجوم، ہیئت، فلکیات اور ریاضی کی اہم

کتابوں کو بھی شامل نصاب کیا گیا۔

خالص عصری نظامِ تعلیم کے نقصانات:

اس کے بالمقابل دینی وعصری علوم کی تقسیم کے لیے لارڈ میکالے نے جو خالص عصری نظامِ تعلیم رائج کیا اس میں دینی وشرعی علوم کو سرے سے خارج کر دیا، اس کا **پہلا نقصان** یہ ہوا کہ علم دو خانوں میں تقسیم ہوگیا، ایک دینی علوم، دوسرا عصری علوم، علوم وفنون کی اس تقسیم نے ایک طرف عملی طور پر حضراتِ علماء، اربابِ مدارس اور اہل مساجد وخوانق کو مسجد، مدرسہ اور خانقاہ تک محدود ومحبوس کر دیا، تو دوسری طرف اربابِ اسکول وکالج کو مدارس، مساجد اور خانقاہوں سے بڑی حد تک دور کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ علماء وارباب مدارس کو عصری علوم سے کوئی خاص مناسبت نہ رہی اور اربابِ اسکول وکالج کا شرعی علوم سے کوئی خاص واسطہ نہ رہا اور رفتہ رفتہ ان دونوں طبقوں میں بھی اس قدر دوریاں پیدا ہوگئیں کہ کہیں کہیں تو دونوں ایک دوسرے کے حریف نظر آنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر اربابِ مدارس کو عصری علوم سے کوئی مناسبت نہ رہی اور نہ اربابِ اسکول وکالج کا شرعی علوم سے کوئی تعلق رہا، حتیٰ کہ بعض علماء کا حال دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کے لیے انگریزی میں ایک فارم پر کرنا بھی مشکل ہوتا ہے، جب کہ دوسری طرف عصری علوم کے ماہرین کو دین وشریعت کے ضروری اور بنیادی مسائل بھی معلوم نہیں ہوتے، گویا وہ اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں:

﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۝﴾ (الروم: ۷)

یعنی وہ دنیوی زندگی کے صرف ظاہری رُخ (اور علم) کو جانتے ہیں، اور آخرت کے بارے میں ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس سے بالکل غافل ہیں۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس سلسلے میں چوک دونوں طرف سے ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال ملک وملت کے حق میں انتہائی مضر ہے۔

خالص عصری نظامِ تعلیم کا **دوسرا نقصان** یہ ہوا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جداگانہ تعلیمی نظام کو ختم کر دیا گیا اور مخلوط تعلیم یعنی ''Co education'' کو رائج کیا گیا، حالاں کہ یہ مزاجِ شریعت کے خلاف ہونے کے ساتھ تعلیمی نفسیات سے بھی ناواقفیت کی علامت ہے، کیوں کہ تعلیم و تعلم کے وقت استاذ اور طالب علم کا ذہن مکمل طور پر ان مضامین کی طرف مرتکز و متوجہ ہونا ضروری ہے جو اس وقت ان کے سمجھنے اور سمجھانے کا موضوع ہے، درسگاہ کے ماحول میں کوئی ایسی چیز نہ ہونی چاہیے جو توجہ کو بانٹنے والی ہو، سبق کی حیثیت ایک زنجیرِ مسلسل کی ہے، اگر بیچ سے ایک کڑی بھی ضائع ہو جائے تو پورا سبق متاثر ہوتا ہے، اور یہ فطری بات ہے کہ ایک ہی ماحول اور جگہ میں لڑکے اور لڑکیوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے کشش کا باعث ہے، اس سے ذہن منتشر اور متاثر ہوتا ہے اور توجہ تعلیم کی طرف کم ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو ساری توجہ پیار محبت کی طرف ہو جاتی ہے، جس کے بعد تعلیمی فوائد و مقاصد تو کا حصول تو کجا بعض افراد شرم و حیا اور عفت و پاکدامنی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، جو بہت بڑا دینی و سماجی نقصان ہے۔

تیسرا نقصان یہ ہوا کہ خالص عصری نظامِ تعلیم میں چوں کہ ساری توجہ تعلیم کی طرف ہوتی ہے، تربیت و اخلاق کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، اس لیے عموماً خالص عصری نظامِ تعلیم کے تحت تیار ہونے والوں کا اخلاقی معیار بہت گرا ہوا ہوتا ہے، یہ اُسی کا اثر ہے کہ اکثر و بیشتر ایسے ہی تعلیم یافتہ لوگ غیر تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ جرائم میں مبتلا ہوتے ہیں۔

خالص عصری نظامِ تعلیم کا **چوتھا نقصان** یہ ہوا کہ پہلے عصری علوم کی تحصیل کا مقصد بھی نہایت اعلیٰ و نیک تھا، اچھا انسان بن کر قوم و ملت کی اچھی طرح خدمت کرنا اس کا بنیادی مقصد تھا، ذاتی اور معاشی فوائد کا حصول دوسرے درجہ کی چیز تھی، آج صورتِ حال یہ ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد ذاتی و معاشی فوائد کا حصول ہے، ملک و ملت کی خدمت کا تصوّر تقریباً ختم ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے آج خالص عصری تعلیم ایک نفع بخش تجارت بن گئی اور تعلیم حاصل

کرنے کے بعد ہر شخص معاشی و ذاتی فوائد حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے، نہ اُسے **ملک و ملت** کی فکر ہوتی ہے اور نہ مخلوق کے ساتھ کوئی خاص ہمدردی، اِلا ماشاء اللہ۔ حالاں کہ رحمت عالم ﷺ نے اس صورتِ حال سے اللہ رب العالمین کی پناہ مانگی ہے، چنانچہ فرمایا:

(اَللّٰھُمَّ) "لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا أَکْبَرَ ھَمِّنَا وَ لَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا، وَ لَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَا یَرْحَمُنَا." (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۲۱۹/ باب جامع الدعاء)

اے اللہ! دنیا کو ہمارے لیے اِتنا بڑا فکر و اندیشہ نہ بنا کہ ہر وقت سارا دھیان دُنیا ہی کی طرف رہے اور نہ ہمارے علم کو اس کا مطمحِ نظر بنا اور نہ ہم پر ایسے کو مسلط فرما جو ہم پر رحم نہ کرے۔

ہمارے تعلیمی مسائل کا حل:

صاحبو! اس وقت کا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ خالص عصری نظامِ تعلیم کے ان نقصانات کے باوجود ہماری قوم کے اکثر افراد کا رُجحان اور قوم کے تقریباً ۹۷٪ (ستانوے فی صد) بچوں کا رُجحان ان ہی اِداروں کی طرف ہے، دینی اِداروں کی جانب رجحان تقریباً ۳٪ (تین فی صد) ہی ہے، پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ خالص عصری نظامِ تعلیم کے اِداروں سے تو ہم کسی اچھی تبدیلی کی اُمید نہیں رکھتے۔

اس لیے ہمارے تعلیمی مسائل کا **پہلا حل** یہ ہے کہ اربابِ مدارس ہی کو اپنے اسلاف کے جاری کردہ نظامِ تعلیم کو رائج کرنے کی ضرورت ہے، عصری علوم کوئی شجرۂ ممنوعہ تو ہے نہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عصری علوم بھی اگر ملاوٹ سے پاک ہوں تو وہ منزل من اللہ ہی ہیں، اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم و فنون کی طرف بھی توجہ دی جائے اور کم از کم فلسفہ و منطق کی پرانی کتابوں کے بجائے زمانہ سے ہم آہنگ فلسفہ و منطق کو داخل کیا جائے اور ساتھ ہی ریاضی و انگریزی کو بھی اتنی مقدار میں شامل کیا جائے جو

کتاب وسنت کی فہمائش اور اس کی دعوت میں معین ومددگار رہو۔

ہمارے تعلیمی مسائل کا **دوسرا** بہت بڑا اور بہت ضروری واہم حل یہ ہے کہ مسلم اسکول کے بجائے خالص اسلامی اسکولس وکالجز قائم کیے جائیں، جن کا بنیادی مقصد خالص دینی ماحول میں عصری تعلیم دینا ہو، تاکہ ہمارے بچے احساسِ کم تری میں مبتلا نہ ہوں اور خالص اسلامی ماحول میں عصری علوم حاصل کر کے وہ سب کچھ یا بہت کچھ بنیں، لیکن پہلے مسلمان ہوں اور اکبرالٰہ آبادیؒ کے اس شعر کے مصداق ہوں:

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں کھیلو جائز ہے غباروں میں اُڑو، چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کی رہے یاد اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

عصری تعلیمی اِداروں کو دینی ماحول میں کس طرح چلایا جائے؟

اب سوال یہ ہے کہ ہم اپنے عصری تعلیمی اداروں کو دینی ماحول میں کس طرح چلائیں؟ جواب یہ ہے کہ ہم اپنے عصری تعلیمی اداروں میں شرعی واسلامی تہذیب وتمدن کو فروغ دیں، جس کے لیے درجِ ذیل امور کی پابندی کرائی جائے:

۱- اسکول کا ڈریس اور یونیفارم شرعی دائرے میں رہتے ہوئے ایسا طے کیا جائے جس سے صاف معلوم ہو کہ یہ کسی اسلامی اسکول وکالج کا اسٹوڈنٹ ہے، مثلاً بچوں اور ان کے ٹیچرس کے لیے ٹوپی اور بچیوں اور ان کی میڈمس کے لیے حجاب وغیرہ لازم ہو۔

۲- اسکول وکالج کے نصاب میں بھی اسلامی تہذیب کا خاص خیال رکھا جائے، دینی تعلیم کا ایک درجہ لازمی رکھا جائے، اگر سرکاری نصاب کی کتابیں اسکول وکالج میں شامل کرنا ضروری ہو اور ان میں کوئی بات یا مضمون غیر اسلامی وغیر شرعی ہو تو استاذ انہیں اس طرح پڑھائیں جس سے بچوں کے دل میں اس غیر اسلامی وغیر شرعی بات اور تہذیب کی

وقعت پیدا نہ ہو سکے اور ان مضامین کا غیر اسلامی وغیر شرعی ہونا انہیں معلوم ہو جائے۔

۳- اسکول کی دُعائیہ پریڈ میں قرآنِ کریم کی چند مشہور سورتیں مع ترجمہ، نیز اسلامی دعائیں اور نظمیں ضرور شامل کی جائیں۔

۴- اسکول وکالج کے اوقات میں نماز کا باقاعدہ نظم کیا جائے اور بچوں کو نماز کا عادی بنانے کی فکر اور ماحول بنایا جائے۔

۵- ان تمام امور کو بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے اسکول وکالج کے لیے دین دار اور فکرمند اساتذہ کا انتخاب کیا جائے، نیز وقتاً فوقتاً اسکول وکالج میں اہل اللہ اور علماء کی آمد ورفت کا ماحول بھی بنایا جائے، تاکہ ان کی نصائح سے بچوں کے دلوں میں دین اور اہل دین کی عظمت پیدا ہو سکے اور وہ یہ حقیقت جان سکیں کہ تعلیم تجارت نہیں؛ عبادت ہے، بشرطیکہ محض ذاتی ومعاشی فوائد کے علاوہ خلوص اور حسن نیت کے ساتھ شرعی حدود میں رہتے ہوئے عصری علوم حاصل کیے جائیں، اس صورت میں پھر یہ عصری علوم کا حصول بھی علومِ نافعہ اور دین ہی کا حصہ ہوگا اور باعث اجر وثواب ہوگا۔ (مستفاد از: انعام الباری: ۲/۲۹)

لیکن اگر نیت درست نہیں ہے، تو عصری علوم تو عصری ودنیوی ہی ٹھہرے، وہ علوم جو دینی ہیں اور قرآن وحدیث میں جن کے بڑے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں اگر ان کے حصول میں بھی نیت درست نہ ہو تو ان کا سیکھنا بھی پھر دنیا بن جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذریعہ ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا يُبْتَغیٰ بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ لَا يَتَعَلَّمُهٗ إِلَّا لِيُصِيْبَ بِهٖ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا، لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، يَعْنِیْ رِيْحَهَا." (رواه أبوداود و أحمد و ابن ماجه، مشکوٰة: ۳٤)

وہ علم جس سے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی وخوشنودی مطلوب ہوتی ہے (مراد

کتاب وسنت کا علم ہے) اگر اس کو کوئی شخص دنیا کی دولت کمانے کے لیے حاصل کرے تو وہ قیامت کے دِن (دخولِ جنت سے پہلے میدانِ محشر میں) جنت کی خوشبو سے بھی محروم ہوگا۔

ایک بزرگ حضرت ابو حازمؒ فرماتے ہیں کہ حقیقی عالم وہ ہے جس میں تین خصلتیں پائی جائیں: (۱) "لَا یَحْقِرُ مَنْ دُوْنَهٗ فِی الْعِلْمِ" جو لوگ علم میں اس سے کم درجہ کے ہوں انہیں حقیر نہ سمجھے۔ (۲) "وَ لَا یَحْسُدُ مَنْ فَوْقَهٗ." جو شخص علم میں اس سے اونچا مقام رکھتا ہو اس سے حسد نہ کرے۔ (۳) "وَ لَا یَأْخُذُ عَلیٰ عِلْمِهٖ دُنْیَا" اپنے علم وعمل سے دنیا کا طالب نہ بنے۔

خلاصہ :

اللہ رب العزت نے علم میں بڑی زبردست تاثیر اور طاقت رکھی ہے، اس لیے قرآن وحدیث میں تعلیم کی بہت زیادہ ترغیب دی گئی؛ کیوں کہ علم بہرحال صاحب علم کو فائدہ دیتا ہے، البتہ دینی علوم (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی وخوشنودی کے لیے حاصل کیے جائیں تو ان) کا نفع دیگر علوم کے مقابلہ میں دنیوی واُخروی اعتبار سے بہت زیادہ ہے، لیکن عصری و دنیوی علوم بھی اگر خلوص اور حسن نیت کے ساتھ شرعی حدود میں رہتے ہوئے حاصل کیے جائیں اور ان سے ہمیں اور ملک وملت کو نفع ہو رہا ہو تو پھر بلاشبہ وہ بھی علومِ نافعہ ہیں۔

ارشادِ باری: ﴿ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ﴾ (البقرۃ: ۳۱) میں حضرت آدم علیہ السلام کو جو علم عطا کیا گیا ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد دنیوی علم ہے، کیوں کہ اس میں یہ بتلایا گیا تھا کہ دنیا میں کس طرح رہو؟ وغیرہ۔ (مستفاد از: فیض الباری: ۱/۱۶۲)

لہٰذا وقت کی ضرورت یہ ہے کہ اہل مدارس اپنے نصاب میں بقدرِ ضرورت عصری علوم کو شامل کریں، (بعض دنیوی وعصری علوم بھی فرضِ کفایہ لغیرہ کا درجہ رکھتے ہیں، جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے)۔ نیز اسلامی اسکولس وکالجز قائم کیے جائیں،

جہاں ہمارے طلبہ دینی ماحول میں عصری علوم حاصل کر کے پہلے سچے اور پکے مسلمان ہوں، بعد میں سب کچھ یا بہت کچھ ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حقائق سمجھا دے اور علومِ نافعہ عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

۲۳/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۸ھ

مطابق: ۱۹/ مئی/ ۲۰۱۷ء، قبل الجمعہ

واردحال: گولڈن پلازا، اندرا گاندھی اسٹریٹ، دارالسلام، تنزانیہ، افریقہ،

بہ خانۂ حاجی اسحاق محمد سونارا حفظہ اللہ

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا اَنْتَ اَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ كَمَا اَنْتَ اَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا اَنْتَ اَهْلُهٗ، فَاِنَّكَ اَنْتَ اَهْلُ التَّقْوٰی وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۸)
تعلیم خواتین کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ سَلَّمَ: ”اَلنَّاسُ مَعَادِنُ کَمَعَادِنِ الذَّھَبِ وَ الۡفِضَّۃِ، خِیَارُھُمۡ فِی الۡجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُھُمۡ فِی الۡإِسۡلَامِ إِذَا فَقُھُوۡا.“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۳۲ / کتاب العلم)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان بھی سونے اور چاندی کی کانوں کے مانند کانیں ہیں، جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں بہتر تھے وہ زمانۂ اسلام میں بھی بہتر ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ دین کی سمجھ حاصل کر لیں۔“ (اور ظاہر ہے کہ دین کی سمجھ علم دین کے بغیر حاصل نہ ہوگی، لہٰذا علم دین حاصل کرو)

مرد وزن کو حصولِ علم کی ترغیب:

اللہ رب العزت نے کائنات کو عظمت وفضیلت اور زینت عطا کرنے کے لیے انسان کو پیدا فرمایا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ إِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ إِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡأَرۡضِ خَلِیۡفَۃً﴾ (البقرۃ: ۳۰)

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡ اٰدَمَ﴾ (بنی إسرائیل: ۷۰)

لیکن خود انسان کو عظمت، فضیلت اور زینت عطا کرنے کے لیے علم عطا فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡأَسۡمَآءَ کُلَّھَا﴾ (البقرۃ: ۳۱)

مادّی وظاہری اعتبار سے جیسے سونے اور چاندی کا زیور انسان کی عظمت وزینت کا سبب ہے تو روحانی وحقیقی اعتبار سے علم بھی انسان کے لیے ایک بہترین زیور ہے، جو اس کی عظمت اور زینت کا ذریعہ ہے، اور جس طرح سونے اور چاندی کی قیمتی کانیں ہوتی ہیں اسی طرح انسان بھی سونے اور چاندی کی کانوں کے مانند نہایت ہی قیمتی شئ ہے، حدیث بالا میں اسی کو فرمایا کہ ”اَلنَّاسُ مَعَادِنُ کَمَعَادِنِ الذَّھَبِ وَ الۡفِضَّۃِ“ پھر کانوں سے نکلنے والے سونے اور چاندی کو مختلف مراحل سے گزار کر کسی نئی نویلی دولہن کے لیے قیمتی سے قیمتی زیور بنایا جاسکتا ہے، اس کے بغیر عام لوگوں کی نگاہوں میں اس کی کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی، تو ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے کسی بھی بچے کو تعلیم وتربیت کے مختلف مراحل سے گزار کر اس کی عظمت، فضیلت اور زینت کو دوبالا کیا جاسکتا ہے، اس کے بغیر انسان کی بھی کوئی خاص قدر وقیمت اور عظمت نہیں ہوتی، کیوں کہ جب انسان پیدا ہوا تھا تو جاہل مطلق تھا:

﴿وَ اللّٰہُ أَخۡرَجَکُمۡ مِنۡ بُطُوۡنِ أُمَّھٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا﴾ (النحل: ۷۸)

انسان کو عظمت وفضیلت تعلیم وتربیت ہی سے حاصل ہوگی، غالبًا اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ارشاد ہوا کہ

” خِیَارُھُمۡ فِی الۡجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُھُمۡ فِی الۡإِسۡلَامِ إِذَا فَقُھُوۡا.“

اس ارشاد کا منشا مرد وزن کو تحصیل علم کی ترغیب دینا ہے (واللہ اعلم) کہ جب علم کے بغیر انسان کی کوئی خاص قدر وقیمت اور عظمت نہیں، تو ضروری ہے کہ ہر انسان حصولِ علم کی فکر

کرے، خواہ وہ امیر ہو یا فقیر، عامی ہو یا نامی، شہری ہو یا دیہاتی، حتیٰ کہ مرد ہو یا عورت۔

تعلیم خواتین کی ضرورت اور وجوہات:

چوں کہ اولادِ آدم ہونے میں مرد وعورت دونوں کی حیثیت برابر ہے، مرد کائنات کی ابتدا ہے تو عورت اس کا تکملہ، دونوں ہی انسانیت کے ضروری اجزاء ہیں، سماج کی تعمیر وترقی میں مردوں کی طرح عورتوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے، اس لیے زیورِ علم سے آراستہ ہونا بھی تمام مردوں اور عورتوں کے لیے ضروری ہے، بلکہ بعض وجوہات سے دیکھا جائے تو مردوں کے مقابلہ میں تعلیم خواتین کی اہمیت کچھ زیادہ نظر آتی ہے۔

جس کی **پہلی وجہ** یہ ہے کہ دینی احکام کے جس طرح مرد مکلّف ہیں اسی طرح عورتیں بھی ہیں، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ احکام شرعیہ پر عمل کرنا علم کے بغیر ممکن نہیں، تو احکام پر عمل کرنے کے لیے مردوں اور عورتوں دونوں کو علم حاصل کرنا ضروری ہوا، اسی کو ایک جگہ فرمایا:

﴿ فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (النحل: ۴۳)

اور حدیث پاک میں فرمایا:

" طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ. " (رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ: ۳۴)

دین کا اتنا علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وزن پر ضروری ہے جس سے وہ اپنے رب کو پہچان سکیں، عقائد درست کرلیں، احکام پر عمل پیرا ہو سکیں اور عبادات صحیح طور پر ادا کرسکیں، اب دین کا یہ ضروری علم مرد تو مدارس میں علماءِ کرام سے حاصل کرسکتے ہیں، جب کہ خواتین کے لیے اجنبیت اور اہتمام پردہ کے سبب یہ اتنا آسان نہیں، کیوں کہ پڑھانے والا مرد حضرت حسن بصریؒ اور پڑھنے والی عورت رابعہ بصریہؒ کی طرح ہو، اور بیت اللہ جیسے مقدس مقام پر کلام اللہ جیسی عظیم کتاب پڑھائی جائے تب بھی اجنبیت کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہونے

کا اندیشہ ہے، رہی بات محرم کی، تو ہر عورت کا اپنے محرم مردوں کے واسطہ سے بھی علماءِ کرام سے علم حاصل کرنا اتنا آسان نہیں، اس لیے کہ ضروری نہیں کہ ہر عورت کو ہر وقت محرم مرد میسر ہو، پھر بعض مسائل ایسے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ایک عورت دوسری عورت سے یا اپنے شوہر ہی سے دریافت کرسکتی ہے، لہٰذا ان صورتوں میں ضروری ہے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی عالمات ہوں اور ان کی دینی وعلمی ضرورت کے لیے ہر ہر بستی میں مقامی سطح پر مدرسۃ البنات کا انتظام ہو، جہاں وہ مکمل پردہ کے اہتمام کے ساتھ صبح سے شام تک آمد ورفت رکھیں اور معلمات ہی ان کو تعلیم دیں، اس طرح خواتین علم حاصل کر کے اپنے آپ کو زیورِ علم سے آراستہ کرسکتی ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عورت صرف جزءِ انسانیت ہی نہیں؛ بلکہ نصف انسانیت ہے، اور سماج کی تعمیر وترقی میں اس کا بنیادی رول اور اہم کردار ہوتا ہے، گھر کا سارا داخلی نظام بھی عورت ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، پھر تعلیم وتربیت کے لیے مدرسہ وخانقاہ تو بعد میں ہیں، ہر بچہ کی پہلی تعلیم وتربیت کی جگہ ماں کی آغوش ہوا کرتی ہے، اب اگر ماں ناخواندہ اور حصولِ علم سے بے زار اور خالی ہوگی تو آج کا بچہ کل کا بُرا تو بن سکتا ہے؛ لیکن بڑا نہیں بن سکتا، اور نہ ہی اس طرح ایک تعلیم یافتہ گھرانہ اور معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہماری خواتین زیورِ علم سے اپنے آپ کو مزین کریں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عورت فطرۃً ناقص العقلِ والدینِ ہے، اس لیے اگر تعلیم کا اہتمام نہ کیا جائے تو اس کے عقل ودین میں مزید نقص پیدا ہوسکتا ہے، لیکن اگر وہ تعلیم حاصل کرلے تو بعض اوقات ایسی تعلیم یافتہ خواتین اچھے اچھے مردوں کو عقل وفہم میں پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔

ایک واقعہ:

منقول ہے کہ عبداللہ بن طاہر مامون رشید کے خاص مصاحب تھے، ایک مرتبہ

خلیفہ مامون رشید عبداللہ بن طاہر سے کسی بات پر سخت ناراض ہو گئے اور ایک خفیہ مجلس میں کچھ لوگوں سے مشورہ کر کے ان کے قتل کا منصوبہ بنا ڈالا، اتفاق سے اس مجلس میں عبداللہ بن طاہر کا ایک خیر خواہ موجود تھا، اس نے فوراً عبداللہ بن طاہر کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے نہایت سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے ایک رُقعہ لکھا، جس پر صرف یہ عبارت تھی: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. يٰمُوْسٰى ......" یہ رُقعہ جب عبداللہ بن طاہر کے پاس پہنچا تو وہ سخت حیران ہوا، دیر تک خط کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا، اس کی ایک باندی برابر میں کھڑی تھی جو تعلیم یافتہ اور سمجھ دار تھی، وہ سمجھ گئی اور کہنے لگی: حضرت! لکھنے والے نے آیت کریمہ: ﴿يٰمُوْسٰى اِنَّ الْمَلَاَ يَأْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ﴾ (القصص: ۲۰) کی طرف اشارہ کر کے آپ کو آگاہ کیا ہے کہ خلیفہ نے تمہارے قتل کا مشورہ کیا ہے، لہٰذا اپنی حفاظت کی تدبیر کر لو، عبداللہ بن طاہر اس وقت مامون کے دربار میں جانے کی تیاری کر رہا تھا، مگر جب باندی نے خط کا مطلب سمجھایا تو اس نے اِرادہ ملتوی کر دیا، اور اس طرح ایک تعلیم یافتہ باندی کی سمجھ داری اور توجہ دِلانے پر اس کی جان بچ گئی۔ (حیاۃ الحیوان: ۱/ ۱۲۶، از: "تراشے"/صفحہ: ۲۰)

علاوہ ازیں **چوتھی وجہ** وجہ یہ ہے کہ عورت بفرمانِ نبوی "خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا" (مسلم، مشكوٰة: ۲۶۷) ہے، کائنات میں قدرت کا ایک انمول عطیہ ہے، جس کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے ویسے بھی جاذبیت اور کشش رکھی ہے، اب اگر وہ زیورِ علم سے آراستہ ہو جائے تو پھر سونے پہ سہاگہ ہوگا، اس کی عظمت وشخصیت میں چار چاند لگ جائیں گے، ایسی خواتین بعض اوقات وہ کارہائے نمایاں انجام دیتی ہیں جن کے لیے ایک انجمن کی ضرورت درکار ہوتی ہے، اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ تعلیم یافتہ عورت تنہا اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک گلشن اور ایک نور کا مینار ہوتی ہے، جس سے سماج کی عورتوں کے علاوہ بیٹے، بھائی، شوہر اور نہ جانے کتنے ہی مرد روشنی حاصل کر سکتے ہیں، امام ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سچ بولنے کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ ان تمام وجوہ کے پیشِ نظر تعلیم خواتین

کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

حضور ﷺ کا تعلیم خواتین کی ترغیب دینا:

شاید اسی لیے معلم اعظم رحمت عالم ﷺ نے مردوں کی طرح خواتین کو بھی تعلیم کی ترغیب اور تاکید فرمائی، اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ ہفتہ میں ایک دِن ایک مخصوص جگہ ان کی تعلیم کے لیے متعین اور مقرر فرمائی، جہاں وہ جمع ہوتیں اور آپ ﷺ ان کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ (صحیحین) اور باوجودیکہ عورتوں کے لیے ایسے مقام پر جانا شریعت میں عمومی طور پر پسند نہیں کیا جاتا جہاں لوگوں کا اجتماع ہو، مگر عہد رسالت میں عیدین کے موقع پر رحمت عالم ﷺ نے خواتین کو عیدگاہ میں جمع ہونے کا حکم دیا تھا، تاکہ وہ بھی آپ ﷺ کی تعلیمات سے آگاہ ہو سکیں۔ (صحیحین)

ایک واقعہ:

حتیٰ کہ ایک موقع پر تو آپ ﷺ نے ایک مفلس صحابی کا نکاح ایک خاتون سے محض اس شرط پر فرمایا کہ وہ صحابی نکاح کے بعد اپنی بیوی کو قرآنِ کریم کی تعلیم سے مالا مال کریں گے، واقعہ اس طرح پیش آیا کہ ایک خاتون خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگیں: "اِنِّيْ وَهَبْتُ نَفْسِيْ لَكَ" "میں نے اپنی ذات آپ کو بخش دی"، یہ حضور ﷺ کی خصوصیت تھی کہ اگر کوئی مومنہ عورت اپنی ذات کو حضور ﷺ پر ہبہ اور فدا کر دے اور حضور ﷺ اس سے نکاح کرنا چاہیں تو آپ ﷺ کا نکاح اس سے بغیر مہر کے بھی ہو سکتا ہے، مگر یہ حکم دیگر مومنین کے لیے نہیں ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ﴾ (الأحزاب: ۵۰)

الغرض جس وقت اس خاتون نے اپنے آپ کو بغیر مہر کے حضور ﷺ سے نکاح

کے لیے پیش کیا تو حضور ﷺ نے خاموشی اختیار فرمالی، وہ خاتون دیر تک منتظر رہیں، جب حضور ﷺ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو مجلس میں سے ایک صحابی نے عرض کیا: " یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ! زَوِّجْنِیْھَا إِنْ لَمْ تَکُنْ لَكَ فِیْھَا حَاجَةٌ"، "حضور! اگر فی الحال آپ کو نکاح کی ضرورت نہ ہو تو میرے ساتھ ان کا نکاح کرادیجیے"، آپ ﷺ نے فرمایا: "هَلْ عِنْدَكَ مِنْ شَيْءٍ تُصْدِقُهَا؟" "تمہارے پاس مہر میں دینے کے لیے کچھ ہے؟" اس مفلس مگر مخلص صحابی نے عرض کیا کہ "میرے پاس تو اس تہبند کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں"، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جاؤ! کوئی چیز تلاش کر کے لے آؤ، اگر چہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو"، انہوں نے گھر جا کر خوب تلاش کیا، مگر کچھ نہ پایا، تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ " هَلْ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ شَيْءٌ؟" "کیا تمہارے پاس قرآنِ پاک کی تعلیم ہے؟"، "تمہیں کچھ قرآن یاد ہے؟ انہوں نے کہا: "جی ہاں، فلاں فلاں سورت یاد ہے" تب آپ ﷺ نے فرمایا: "زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۲۷۷) "جاؤ پھر ہم نے اسی کے عوض تمہارا نکاح اس خاتون سے کر دیا کہ تم انہیں قرآن کی تعلیم دینا۔" (اس روایت کی وضاحت میں علماءِ احناف فرماتے ہیں کہ یہ ان ہی صحابی کی خصوصیت تھی)۔

تعلیم خواتین کے لیے حضور ﷺ کی فکر اور اس کا اثر:

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ کو تعلیم خواتین کی کس قدر فکر تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے عام خواتین کے علاوہ ان کی باندیوں اور خادماؤں تک کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ فرمایا:

" وَ رَجُلٌ کَانَتْ عِنْدَهٗ أَمَةٌ یَطَأُهَا، فَأَدَّبَهَا، فَأَحْسَنَ تَأْدِیْبَهَا، وَ عَلَّمَهَا، فَأَحْسَنَ تَعْلِیْمَهَا، ثُمَّ أَعْتَقَهَا، فَتَزَوَّجَهَا، فَلَهٗ أَجْرَانِ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۱۲)

جو شخص اپنی باندی کی اچھی تربیت کرے اور اسے اچھی تعلیم دے، پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح بھی کرلے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ ایک اجر تو اس لیے ہے کہ اس

نے باندی کو غلامی سے آزادی عطا کی، دوسرا اجر اس لیے کہ اس نے ایک آزاد کردہ سے شادی کی اور تعلیم دے کر اسے پستی سے بلندی پر پہنچا دیا اور اسے عزت سے نوازا۔ غور کیجیے کہ جب باندی کو تعلیم دینے کی اس قدر فضیلت واہمیت ہے تو بیٹی کو تعلیم دینے کی اہمیت و فضیلت کس قدر ہوگی؟ حضور ﷺ کی اس ترغیب کا اثر یہ ہوا کہ عہدِ رسالت میں حضرات صحابہؓ کی طرح صحابیات میں بھی حصولِ علم کا جذبۂ صادقہ بیدار ہوگیا اور انہوں نے بھی مختلف علوم وفنون میں رسوخ اور عبور حاصل کیا۔

حضرت عائشہؓ اور دیگر خواتین اسلام کا علمی مقام:

چنانچہ ازواجِ مطہرات میں عفیفۂ کائنات ام المومنین والمومنات سیدہ عائشہؓ کا علمی مقام یہ تھا کہ حضرات صحابہؓ کو بعض اوقات کسی اہم مسئلہ میں اشکال ہوتا تو حضرت عائشہؓ کی طرف رجوع فرماتے، حضرت عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو قرآن کے فرائض، حرام وحلال، فقہ، اشعار اور اہل عرب کی تاریخ و انساب میں حضرت عائشہؓ سے زیادہ علم رکھتا ہو۔" علم تفسیر میں جن صحابہؓ کو ید طولیٰ حاصل تھا ان میں ایک اہم نام سیدہ عائشہؓ کا بھی ہے۔ علم حدیث میں مہارت کا حال یہ تھا کہ علماءِ محققین کے یہاں وہ لوگ مکثرین کہلاتے ہیں جن سے ایک ہزار سے زیادہ احادیث مروی ہیں، علامہ سخاویؒ کی تحقیق کے مطابق حضرت عائشہؓ سے (۲۲۱۰) احادیث مروی ہیں، اور مکثرین میں حضرت ابو ہریرہؓ کے بعد ان ہی کا نام ہے، گویا آپ خواتین امت کے لیے سیدۃ المعلمات ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے علاوہ بھی بہت سی صحابیات، تابعیات اور خواتین اسلام وہ ہیں جنہوں نے مختلف علوم وفنون میں علمی مقام حاصل فرما کر زبردست دینی خدمات انجام دیں۔ تحفۃ الفقہاء کے مصنف شیخ علاء الدین حنفیؒ کی صاحبزادی فاطمہ علم فقہ میں اس قدر ماہر تھیں کہ کہا جاتا ہے کہ جب تک کسی فتویٰ پر ان کے دستخط نہ ہوتے تب تک اس فتویٰ کو معتبر نہیں مانا جاتا تھا۔

حضرت فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی نے فرمایا کہ ”عمر رضا کحالہ جیسے صاحب نظر فاضل نے خواتین اسلام وعرب کی جو موسوعہ تیار کی ہے وہ چوبیس سو سے زیادہ فاضل وممتاز خواتین کے ذکر سے مزین ہے، یہ سب کچھ اسی نبی اُمی ﷺ کا فیض ہے جس نے عرب کی جہالت کی سرزمین پر علم کا صور پھونکا اور علم ونظر کو ایسی جاویدانی بخشی کہ انسانیت کا کوئی طبقہ اس کے فیض عام سے محروم نہیں رہا۔ (دینی وعصری درسگاہیں، تعلیمی مسائل: ۶۰)

ضرورت ہے کہ آج بھی خواتین کی دینی وعصری تعلیم کے لیے مخصوص اِدارے (مدارس، اسکول اور کالج) قائم کیے جائیں، جہاں ہماری خواتین علم وفن کے میدان میں شرعی دائرہ میں رہتے ہوئے آگے آئیں اور حضور ﷺ کے فیض عام سے مستفیض ہو کر سماج کو مستفیض کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام کو علم دین کی تحصیل کا شوق وذوق عطا فرمائے۔ آمین۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا اَنْتَ اَھْلُہٗ، فَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا اَنْتَ اَھْلُہٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا اَنْتَ اَھْلُہٗ، فَاِنَّکَ اَنْتَ اَھْلُ التَّقْوٰی وَ اَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ
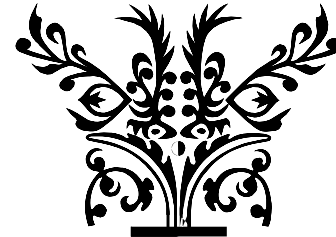
(۹)

اسلام میں عورت کا مقام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ”اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَیْرًا، فَاِنَّھُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ، وَ اِنَّ اَعْوَجَ شَیْءٍ فِی الضِّلَعِ اَعْلَاہُ، فَاِنْ ذَھَبْتَ تُقِیْمُہٗ کَسَرْتَہٗ، وَ اِنْ تَرَکْتَہٗ لَمْ یَزَلْ اَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ.“ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۱۸۰/ باب عشرۃ النساء و ما لکل واحد من الحقوق)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عورتوں کے بارے میں بھلائی کی وصیت قبول کرو، (کہ تم ہمیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک ہی کا معاملہ کرنا) اس لیے کہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں، اور سب سے زیادہ ٹیڑھی پسلی اوپر والی ہے، (مطلب یہ ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام جو تمام عورتوں کی اصل ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی اوپر والی پسلی سے پیدا فرمایا، جو تمام پسلیوں میں سب سے ٹیڑھی ہوتی ہے، اور پسلی کا حال یہ ہے کہ) اگر تم پسلی کو سیدھا کرنے کا ارادہ کروگے تو پسلی توڑ دوگے، لیکن تم اگر پسلی کو اپنے حال پر چھوڑ دو تو ٹیڑھی ہی رہے گی، (عورتوں کا بھی یہی حال ہے، ان کے اعمال واخلاق میں کجی اور ٹیڑھا پن خلقی اور پیدائشی

لحاظ سے پایا جاتا ہے، اگر کوئی اس کی مکمل اصلاح چاہے تو یہ مشکل ہے، لہٰذا عورتوں سے اس ٹیڑھے پن کے ساتھ فائدہ اٹھایا جائے، جب تک گناہ لازم نہ آئے) پس عورتوں کے معاملہ میں خیر خواہی کی وصیت قبول کرو۔'' (مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو، ان کے ٹیڑھے پن پر صبر کرو اور یہ توقع مت رکھو کہ وہ ہر کام تمہاری مرضی کے مطابق کریں گی، حضور ﷺ نے یہ بات عورتوں کی ہمدردی میں ارشاد فرمائی)۔

عورت اسلام سے قبل:

اللہ رب العزت نے عورت کو جو عظمت شان عطا فرمائی اسے سمجھنے کے لیے اسلام سے قبل کے حالات کو جاننا ضروری ہے، یہ حقیقت تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اسلام سے قبل دنیا کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ تھے، ہر طرح کی برائیاں اور زیادتیاں عام تھیں، پھر عورت مرد کے مقابلہ میں ویسے بھی فطرتاً اور قدرتاً کمزور ہے، اس لیے صرف عرب ہی میں نہیں؛ بلکہ ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تمام ہی علاقوں میں سب سے زیادہ مظلوم اور ستم رسیدہ عورت ہی تھی، اور چوں کہ تورات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کا ذریعہ حضرت حوا علیہا السلام ہی بنی تھیں، اس لیے یہودی اور عیسائی مذہب میں عورت کو گناہ کا دروازہ تصوّر کیا جاتا تھا، جب کہ قرآن نے اس لغزش میں حضرت آدم وحوا علیہما السلام دونوں کو ذمہ دار قرار دیا، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو زیادہ ذمہ دار قرار دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ﴾ (طٰهٰ: ۱۲۱)

ترجمہ: ''اور آدم نے (بھول کر) اپنے رب کے حکم کے خلاف کیا اور وہ پھسل گئے۔

عربوں کے یہاں بھی عورت کو نحوست اور بدبختی کی علامت سمجھا جاتا تھا، اگر کسی کے یہاں بچی کی ولادت ہوتی تو اس کا باپ معاشرہ کا سامنا کرنے سے کتراتا اور منہ چھپانے کے لیے محفوظ جگہ تلاش کرتا، اس سے جان چھڑانے کے لیے بے رحم باپ ننھی منی

معصوم بچی کو منوں من مٹی کے نیچے دبا دیتا، قرآن نے اس کا نقشہ کھینچا ہے:

﴿ وَ إِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ط أَيُمْسِكُهٗ عَلٰی هُوْنٍ أَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ط أَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ ﴾ (النحل: ۵۸-۵۹)

ترجمہ: ''اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کی پیدائش) کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے، اس خوشخبری کو برا سمجھ کر لوگوں سے چھپا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے کہ) ذلت برداشت کر کے اسے اپنے پاس رہنے دے یا اسے زمین میں گاڑ دے، دیکھو انہوں نے کتنی بری بات طے کر رکھی ہے۔''

جاہل سماج میں بیٹیوں کے ساتھ اس ظالمانہ سلوک کی وجہ سے خود ماؤں کا حال یہ تھا کہ ممتا کی پیکر جس نے اپنی بچی کو نو مہینے تک پیٹ میں رکھا تھا بیٹی کو خونِ جگر کا دودھ بنا کر پلایا تھا، وہ خود بھی بچی کی پیدائش پر اپنے نصیبے پر روتی تھی اور دودھ پلانے سے ڈرتی تھی کہ کہیں اس کا شوہر معاشرہ کے رسم ورواج کی وجہ سے اسے تکلیف نہ دے۔ اُس دور میں عورتوں کو معمولی عوض پر گروی رکھنا بھی عام بات تھی، کیوں کہ شوہروں کو عورتوں پر ہر طرح کا اختیار اور حق ہوتا، خواہ اسے کسی قرض وغیرہ کے عوض گروی رکھے، یا ذریعۂ آمدنی بنائے، یا بیچ دے، چنانچہ روم وایران میں عورتوں کو باندیاں بنا کر ہر طرح کے ظلم وستم کے پہاڑ ان پر ڈھائے جاتے تھے اور ان کو پیشہ ورانہ زنا پر مجبور کیا جاتا تھا، قرآن پاک نے عورت کو آمدنی کا ذریعہ بنانے سے منع فرما دیا:

﴿ وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَی الْبِغَآءِ ﴾ (النور: ۳۳)

ترجمہ: ''اور اپنی باندیوں کو (دنیوی زندگی کا ساز وسامان حاصل کرنے کے لیے) بدکاری پر مجبور نہ کرو۔''

عورت اسلام کے سایہ میں :

ایسے سنگین حالات میں اسلام ہی نے سب سے پہلے عورت کے ساتھ غم گساری اور ہمدردی کی اور اس کو سماج میں عظمت وعزت اور وقار کا مقام عطا کرنے کے لیے چند حقائق کی طرف انسانیت کو متوجہ فرمایا، جن میں سے ایک یہ کہ دنیا میں بسنے والے تمام ہی انسان حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی مشترکہ اولاد ہیں، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ﴾ (النساء : ۱)

ترجمہ: ’’اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی نے اس کی بیوی پیدا کی، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیے۔‘‘

دوسری حقیقت یہ بیان فرمائی کہ کسی کا مرد یا عورت ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی پر موقوف ہے، وہ جسے چاہے مرد بنائے اور جسے چاہے عورت بنائے، جسے چاہے بیٹے دے اور جسے چاہے بیٹیاں، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿ لِلّٰهِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ط یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّکُوْرَ○ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُکْرَانًا وَّ اِنَاثًا ج وَ یَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ط اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ○﴾ (الشوریٰ : ۴۹-۵۰)

ترجمہ: ’’سارے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ جس کو چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، یا پھر ان کو ملا جلا کر لڑکے بھی دیتا ہے اور لڑکیاں بھی، اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے، وہ علم کا بھی مالک ہے قدرت کا بھی مالک۔‘‘

اور جب کسی کا مرد یا عورت ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی پر موقوف ہے تو شرافت اور

فضیلت کا معیار بھی مرد یا عورت ہونا نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کا معیار تقویٰ اور پرہیزگاری ہے، اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا گیا:

﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ○﴾ (الحجرات : ۱۳)

ترجمہ: ’’اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کرسکو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم سب میں عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، یقین رکھو کہ اللہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز سے باخبر ہے۔‘‘

قرآن نے ایک اصولی اور قانونی بات بیان فرمادی کہ نیک اعمال کی بنیاد پر دونوں ہی عنداللہ عزت کے مستحق ہیں، اس میں مرد وعورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اسی کو ایک جگہ یوں ارشاد فرمایا:

﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ج بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ ﴾ (آل عمران : ۱۹۵)

ترجمہ: ’’چنانچہ ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب آپس میں ایک دوسرے سے ہو۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ مرد کے لیے عورت کا وجود ضروری ہے، تو عورت کے لیے مرد کا وجود ضروری ہے، عورتوں کے بغیر مردوں کی دنیا نامکمل ہے، تو مردوں کے بغیر عورتوں کی دنیا بھی ناقص ہے، نسلِ انسانی کی بقا کے لیے جس طرح مرد کا وجود ضروری ہے اسی طرح عورت کا وجود بھی ضروری ہے، لہٰذا دونوں ایک دوسرے کو ضروری سمجھتے ہوئے نیکی اور پرہیزگاری کا اہتمام کرو، تاکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت کے حقدار بن جاؤ۔

عورت کے ساتھ حسن سلوک کا حکم:

اسلام نے عورت کو جو عزت وعظمت کا مقام عطا فرمایا ہے اسے یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک طویل سورت مستقل عورتوں کے متعلق احکام بیان کرنے کے لیے ''سورۃ النساء'' کے نام سے قرآن میں نازل ہوئی، جس میں خصوصی طور پر عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا:

﴿ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (النساء : ۱۹)

اور مذکورہ حدیث میں بھی اسی کا حکم آیا ہے کہ عورت جس حیثیت میں بھی ہو بیٹی ہو، بہن ہو، بیوی ہو یا ماں، بہر حال اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو، کبھی بدسلوکی سے پیش نہ آؤ، چنانچہ حدیث پاک میں عورت کو دنیا کی بہترین متاع قرار دیا گیا:

''الدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ، وَ خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ.'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ:۲۶۷)

اس کا بھی تقاضا ہے کہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اس کی قدر و منزلت آدمی کے دل میں ہو۔

بیٹی کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت:

عاجز کے خیالِ ناقص کے مطابق نیک عورت رب العالمین کے خزانوں کا ایک بہترین عطیہ ہے، اس لیے ہر حیثیت سے اس کے ساتھ اسلام نے حسن سلوک کا حکم دیا ہے:

چنانچہ بیٹی کی حیثیت سے عورت کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دیتے ہوئے سب سے پہلے اس کی پیدائش اور اچھی پرورش پر جنت کی بشارت سنائی گئی:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: '' مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَ هُوَ هٰكَذَا، وَ ضَمَّ أَصَابِعَهُ.''

(مسلم، ترمذی، مشکوٰۃ : ۴۲۱/ باب الشفقة و الرحمة على الخلق)

ترجمہ: ''جس شخص کی دو بیٹیاں ہوں (اور بعض روایات میں ایک کا بھی ذکر ہے) پھر وہ ان کی (تعلیم وتربیت کے ذریعہ) اچھی پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں (اور ان کا نکاح کرا دیا جائے) تو وہ قیامت میں میرے ساتھ اسی طرح ہوگا جیسے یہ دونوں (شہادت اور بیچ والی) انگلیاں۔'' یعنی قیامت کے دن میں اور وہ ایک ساتھ ہوں گے اور ساتھ ہی جنت میں داخل ہوں گے۔

یہ بشارت بیٹوں کی پیدائش اور ان کی عمدہ پرورش پر نہیں دی گئی، وجہ یہ ہے کہ بیٹیوں کی پیدائش پر عامۃً لوگ غمزدہ اور افسردہ ہو جایا کرتے تھے، اور آج بھی بدقسمتی سے بے دینی اور جہالت والے سماج میں یہی ہوتا ہے، قرآنِ کریم نے اس سوچ کی مذمت بیان فرمائی ہے:

﴿ وَ إِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ۝﴾ (الزخرف : ۱۷)

ترجمہ: ''اور ان میں سے کسی کو جب اُس کی (بیٹی کی ولادت کی) خوش خبری دی جاتی ہے جو اس نے رحمٰن کی طرف منسوب کر رکھی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔''

حدیث پاک میں بیٹی کی پیدائش کے بعد اس کی اچھی پرورش کی فضیلت بیان فرمائی گئی، ایک حدیث پاک میں محض ایک بیٹی کی پیدائش اور حسن پرورش کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: '' مَنْ كَانَتْ لَهٗ أُنْثٰى، فَلَمْ يَئِدْهَا، وَ لَمْ يُهِنْهَا، وَ لَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهٗ عَلَيْهَا، -يَعْنِي الذُّكُوْرَ- أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ.''

(رواہ أبو داود، مشکوٰۃ: ۴۲۳)

ترجمہ: ''جس شخص کی بیٹی ہو، پھر اس نے اپنی بیٹی کو زندہ دفن نہیں کر دیا، (یا دورِ

حاضر میں حمل کے دوران جنس معلوم ہوجانے پر حمل نہیں گرا دیا) اور نہ اسے ذلیل کیا، اور نہ ہی اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح اور فوقیت دی، (تو بیٹی کے ساتھ کیے جانے والے اس حسن سلوک پر) اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔''

روایات میں آتا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک عورت اپنی دو بیٹوں کو لے کر آئیں اور سوال کرنے لگیں، اتفاق سے اس وقت حضرت عائشہؓ کے پاس دینے کے لیے کھجور کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، لہٰذا آپؓ نے کھجور اسے دے دیں، اس بے سہارا عورت نے وہ کھجور اپنی بیٹیوں کو کھلا دیں اور خود بھوکی رہیں، اس منظر کو دیکھ کر سیدہ عائشہؓ کو بڑا تعجب ہوا، حضور ﷺ کے تشریف لانے پر یہ واقعہ بیان کیا، تب حضور ﷺ نے فرمایا:

"مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ، فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ، كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ." (متفق عليه، مشكوٰة : ۴۲۱)

ترجمہ: ''جو شخص بیٹیوں کے ذریعہ آزمایا جائے اور وہ ہمیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے تو وہ (بیٹیاں) اس کے لیے آگ سے آڑ بن جائیں گی۔''

ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ملتا ہے کہ ایک شخص کے یہاں صرف بیٹیاں تھیں، اس لیے جب کبھی اس کی بیوی اُمید سے ہوتی تو وہ سوچتا کہ شاید اس مرتبہ بیٹا ہوگا، مگر ہر مرتبہ بیٹی ہی پیدا ہوتی، اس طرح اس کے یہاں یکے بعد دیگرے چھ بیٹیاں پیدا ہوئیں، جب ساتویں مرتبہ بیوی اُمید سے تھی تب شیطان کے بہکاوے میں آکر اس نے ارادہ کرلیا کہ اب کی بار اگر بیٹی پیدا ہوئی تو میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا، حق تعالیٰ اسے اس کی اس حرکت پر متنبہ کرنا چاہتے تھے، اس لیے اس نے اسی رات ایک بھیانک خواب دیکھا کہ قیامت برپا ہوچکی ہے، اور اس کے نامۂ اعمال میں گناہ بہت ہیں، جس کی وجہ سے اس کے جہنم میں جانے کا فیصلہ ہوگیا، جب فرشتے اسے جہنم کے پہلے دروازے پر لے کر گئے تو کیا

دیکھتا ہے کہ وہاں اس کی پہلی بیٹی کھڑی ہے جو اسے جہنم میں جانے سے روک رہی ہے، فرشتے اسے دوسرے دروازے پر لے کر گئے، تو ہاں دوسری بیٹی آڑ بنی کھڑی ہے، اسی طرح فرشتے اسے جس دروازے پر لے کر گئے وہاں کوئی نہ کوئی بیٹی رکاوٹ بن گئی، مگر جہنم کے تو سات دروازے ہیں، اس لیے چھ بیٹیوں والے باپ کے لیے ساتواں دروازہ باقی اور خالی تھا، لہٰذا فرشتے اسے لے کر ساتویں دروازے پر گئے، اس شخص پر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور انتہائی پریشانی کے عالم میں اس کی آنکھ کھل گئی، فوراً سمجھ گیا کہ یہ صرف خواب نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تنبیہ بھی ہے، چنانچہ اس نے توبہ کی اور دعا کرنے لگا: "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا السَّابِعَةَ." اے اللہ! مجھے اب کی بار ساتویں بھی بیٹی ہی عطا کرنا۔

(سنہری کرنیں:۲۴، از: بکھرے موتی:۶/۷۸)

بیٹی کے ساتھ حسن سلوک کا مطلب:

صاحبو! اس سے معلوم ہوا کہ بیٹا اگر اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے تو بیٹی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا دروازہ، اس کی مغفرت کا ذریعہ اور دوزخ سے حفاظت کے لیے ڈھال ہے، اس لیے اسے معمولی اور حقیر نہ سمجھو، اس کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرو، اس کی اچھی تعلیم و تربیت کی فکر کرو، کسی بھی معاملہ میں بیٹیوں کے ساتھ کم درجہ کا سلوک نہ کرو، اور جب تک بیٹی کی شادی نہیں ہوجاتی وہاں تک بیٹی کی تمام ضروریات کا انتظام کرو، کیوں کہ شرعاً باپ کے ذمہ بیٹی کے اخراجات اس وقت تک واجب ہیں جب تک اس کی شادی نہ ہوجائے اور وہ سسرال نہ چلی جائے۔ (عالمگیری:۱/۵۶۳)

جب بیٹی کے لیے رشتہ کے انتخاب کا موقع آئے تو بیٹی کی مرضی کا شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے پورا لحاظ رکھیں، خواہ مخواہ اس پر اپنی پسند نہ تھوپ دیں، اس موقع پر ایک بات بطورِ خاص یاد رکھیں کہ بیٹی کو نکاح کے بعد قرآنِ کریم کے تحفہ کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے قرآنی تعلیمات بھی دے کر رخصت کریں، تاکہ اس کی شادی خانہ آبادی کا

ذریعہ بن سکے، اس کے بعد خدانخواستہ اگر بیٹی کو طلاق ہوگئی، یا بیوہ ہوکر لوٹ آئی، تو اس کی مکمل کفالت کا انتظام کرو، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍؓ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "أَ لَا أَدُلُّكُمْ عَلیٰ أَفْضَلِ الصَّدَقَةِ؟ ابْنَتُكَ مَرْدُوْدَةٌ إِلَيْكَ، لَيْسَ لَهَا كَاسِبٌ غَيْرُكَ." (رواہ ابن ماجه، مشکوٰۃ:۴۲۵)

ترجمہ: ''حضور ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ کیا میں تمہیں بہترین صدقہ نہ بتاؤں؟ وہ یہ کہ تمہاری بیٹی جو تمہاری طرف لوٹا دی گئی (طلاق ہونے یا بیوہ ہونے کی صورت میں) اور اس کا تمہارے سوا کوئی (بیٹا وغیرہ) کمانے والا بھی نہ ہو۔'' (تو اس کی کفالت پر جو کچھ تم خرچ کروگے وہ سب سے افضل ترین اور بہترین صدقہ ہے)۔ ان ساری باتوں کی رعایت بیٹی کے ساتھ حسن سلوک میں داخل ہے۔

بہن کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت:

عورت کی دوسری حیثیت بہن ہونے کی ہے، تو آپ ﷺ نے بہن کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِیْ سَعِيْدِ ِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ كَانَتْ لَهٗ ثَلَاثُ أَخَوَاتٍ، أَوِ ابْنَتَانِ، أَوْ أُخْتَانِ، فَأَحْسَنَ صُحْبَتَهُنَّ، وَ اتَّقَى اللّٰهَ فِيْهِنَّ، فَلَهُ الْجَنَّةُ." (ترمذی: ۱۳/۲)

ترجمہ: ''جس شخص کی تین بہنیں ہوں، یا دو بیٹیاں، یا دو بہنیں ہوں، اور اس نے ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا، ان کے حقوق کی ادائیگی اور حسن سلوک میں کمی وکوتاہی کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا، تو اس عمل کی وجہ سے اس کے لیے جنت واجب ہوجاتی ہے۔''

اور بہن کے ساتھ حسن سلوک کا مطلب یہ ہے کہ ایک بھائی ہونے کی حیثیت سے اپنی بہن کی عزت، اس کی راحت اور چاہت کا شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے پورا

خیال رکھے، بوقت ضرورت اس کی کفالت کا پورا انتظام کرے، اور وراثت میں جو اس کا شرعی حق ہے اسے پورا پورا ادا کردے، بھائی جب اپنی بہن کے ساتھ اس طرح حسن سلوک کا معاملہ کرے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے دل میں اپنے بھائی کی بے غرض محبت ڈال دے گا۔

ایک دلچسپ واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ حجاج بن یوسف کے دربار میں ایک عجیب وغریب مقدمہ آیا، جس میں تین مردوں کے متعلق قتل کا حکم سنادیا گیا، قتل سے پہلے ایک عورت آئی، جس کے یہ تینوں قریبی تھے، ان میں ایک تو اس کا حقیقی بیٹا تھا، دوسرا شوہر اور تیسرا بھائی، عورت ان تینوں کے متعلق رحم کی بھیک مانگنے لگی، تو حجاج نے کہا کہ تیرے درخواست کرنے پر ان میں سے کسی ایک کو معافی اور رہائی دی جاسکتی ہے، لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرلے، اس پر وہ عورت سوچنے لگی کہ شوہر تو دوسرا بھی مل جائے گا، بچے اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن والدین کا چوں کہ انتقال ہوچکا ہے اس لیے اتنی محبت کرنے والا بھائی دنیا میں اب اور کوئی نہیں مل سکتا، یہ سوچ کر اس عورت نے اپنے بھائی کے متعلق فیصلہ سنادیا کہ میرے بھائی کو معافی دے دی جائے، حجاج بن یوسف کو عورت کا یہ حسن انتخاب بہت ہی پسند آیا، اس نے کہا کہ تیرے اس حسن انتخاب پر ہم تینوں کو معافی دیتے ہیں۔

(اصلاحی واقعات: ۱۳۴، از: بکھرے موتی: ۱۹۲/۵)

بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت:

عورت کی تیسری حیثیت بیوی ہونے کی ہے، عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو اگر خاص قوت عطا فرمائی ہے تو عورت کو خاص کشش عطا فرمائی ہے، اس لیے یہ حقیقت ہے کہ عورت کے بغیر مرد اور نسوانیت کے بغیر انسانیت ناقص ہے۔ لہٰذا عورت کے ساتھ بیوی ہونے کی حیثیت سے حسن سلوک کی طرف متوجہ کرتے ہوئے سب سے پہلے تو یہ

حکم سنایا کہ

﴿ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (البقرة : ۲۲۸)

’’جیسے تمہارے کچھ حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔‘‘

جب تک تم انہیں ادا نہیں کروگے ان کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہوسکتا، لہٰذا ان کے ساتھ حسن سلوک کا سب سے پہلا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے حقوق ادا کرو، اس کے بعد جہاں تک ان سے حسن سلوک کی بات ہے تو قرآنِ کریم میں اس کی خاص ترغیب دی گئی:

﴿ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ج فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْئًا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا۝ ﴾ (النساء : ۱۹۱)

’’اگر تمہیں ان میں کوئی خامی نظر آئے تو یہ سمجھ کر نظر انداز کردو کہ اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لیے کوئی بڑی خیر بھی پیدا کرسکتا ہے۔ اس لیے تم ان کے ساتھ بہرحال حسن سلوک ہی کا معاملہ کرو۔‘‘ اس کے بغیر تمہارے ایمان و اخلاق میں کمال پیدا ہی نہیں ہوسکتا، ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَ خِیَارُكُمْ خِیَارُكُمْ لِنِسَاءِ هِمْ." (رواه الترمذی، مشکوٰۃ:۲۸۲)

ترجمہ: ’’رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کامل اور مکمل مومن وہ ہے جس کے اخلاق اعلیٰ اور عمدہ ہوں، اور تم میں سب سے عمدہ اخلاق والا وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہو۔‘‘

غور کیجیے! حدیث بالا میں حضور ﷺ نے بیوی کے ساتھ حسن سلوک کو کسی بھی مرد کے بہترین ہونے کا معیار قرار دیا ہے، اور جب کسی بھی مرد کے بہترین ہونے کا دارومدار بیوی کے ساتھ حسن سلوک پر ہے تو یہ بات صاف ہوگئی کہ اس کے بغیر کوئی آدمی بہترین بن ہی نہیں سکتا، اور بیوی کے ساتھ حسن سلوک کا مطلب جیسا کہ عرض کیا گیا یہ ہے کہ اس کے

تمام حقوق پورے اہتمام کے ساتھ ادا کیے جائیں، اور اگر مرد کے حقوق کی ادائیگی میں اس سے کمی اور کوتاہی ہوجائے تو حتی الامکان اسے معاف کیا جائے (جب تک کہ کوئی گناہ اور خلافِ شرع بات درپیش نہ ہو) اگر خدانہ کرے وہ تمہارے ساتھ بدزبانی اور بداخلاقی سے بھی پیش آئے، یا تمہاری مرضی اور منشا کے خلاف کوئی کام کرے تو بھی صبر وعفو سے کام لیں۔ (جب تک گناہ لازم نہ آئے)

اس بارے میں ایک حدیث پاک سے ہدایت ملتی ہے جس میں فرمایا گیا:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ:" جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ:" یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! كَمْ نَعْفُوْ عَنِ الْخَادِمِ؟" فَسَكَتَ، ثُمَّ أَعَادَ عَلَيْهِ الْكَلَامَ، فَصَمَتَ، فَلَمَّا كَانَتِ الثَّالِثَةُ، قَالَ:" اُعْفُوْا عَنْهُ كُلَّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّةً."

(ترمذی، أبو داود، مشکوٰۃ: ۲۹۲)

ترجمہ: ’’ایک شخص نے خدمت اقدس میں آکر سوال کیا کہ ’’ہم اپنے خدام کی کوتاہیاں کتنی مرتبہ معاف کریں؟‘‘ آپ ﷺ (انتظارِ وحی) میں خاموش رہے، سائل نے پھر یہی بات دہرائی، مگر اس بار بھی آپ ﷺ خاموش رہے، جب تیسری مرتبہ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اس کو روزانہ (کم از کم) ستر مرتبہ معاف کرو۔‘‘ (یہ بہتر ہے انتقام اور سزا سے)۔

غور کیجیے! جب غلام اور باندی کو روزانہ ستر مرتبہ معاف کیا جاسکتا ہے تو بیوی کو تو بدرجۂ اولیٰ معاف کیا جاسکتا ہے۔

صاحبو! یہ بھی ایک طرح کا مجاہدہ اور رحمت الٰہی کا ذریعہ ہے، چنانچہ منقول ہے کہ ایک شخص نے کسی دن اپنی بیوی سے اپنی پسند کا کھانا بنوایا، اتفاق سے وہ بدمزہ ہوگیا، جس کی وجہ سے شوہر کو بڑا غصہ آیا، لیکن اس نے اپنی بیوی کو اللہ تعالیٰ کی بندی سمجھ کر معاف کردیا، تو مرنے کے بعد اسے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا بندہ سمجھ کر معاف کردیا۔

ماں کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت:

عورت کی چوتھی اور سب سے اہم و افضل حیثیت ماں ہونے کی ہے، قرآن و حدیث میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد سب سے بڑا حق جن کا بتایا گیا اور سب سے زیادہ حسن سلوک کا جن کو مستحق قرار دیا گیا وہ والدین ہیں:

﴿ وَ قَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّا إِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (بنی إسرائیل:۲۳)

ترجمہ: ''اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو۔''

حتیٰ کہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے والدین کے حقوق سے متعلق سوال کیا تو ارشاد فرمایا: "هُمَا جَنَّتُكَ وَ نَارُكَ" (رواہ ابن ماجہ، مشکوٰۃ:٤٢١) وہ دونوں تمہاری جنت بھی ہیں اور دوزخ بھی۔

مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا تمہارے لیے دخولِ جنت کا باعث ہوگا اور بد سلوکی تمہیں جہنمی بنا دے گی، پھر والدین میں بھی ماں کا مقام اور درجہ بہت زیادہ ہے، اس لیے ماں حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے، حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ ہمارے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "أُمُّكَ" ''آپ کی والدہ'' سائل نے تین مرتبہ اپنا سوال دہرایا اور آپ ﷺ ہر بار یہی فرماتے رہے کہ "أُمُّكَ" ''آپ کی والدہ'' چوتھی دفعہ "أَبُوكَ" ارشاد فرما کر باپ کا ذکر کیا۔ (ابوداود، مشکوٰۃ:۴۱۸)

اس سلسلہ میں خود حضور ﷺ کا عمل بھی یہی تھا، چنانچہ حنین کے موقع پر جب حضور ﷺ کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہؓ خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں تو آپ ﷺ ان کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے، اپنی چادر بچھائی جس پر آپ بیٹھیں اور آپ ﷺ ان کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی اور حسن سلوک سے پیش آئے۔ (حاشیہ:۵/مشکوٰۃ:۴۲۰)

والدین میں سے ہر ایک حسن سلوک کے حقدار ہیں، لیکن چوں کہ باپ کے مقابلہ میں ماں نے زیادہ مشقت برداشت کی ہے؛ اس لیے وہ زیادہ حسن سلوک کی حقدار ہے، قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسٰنًا، حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا، وَّ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ (الأحقاف:۱۵)

ترجمہ: ''اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے (خصوصاً ماں کے ساتھ، کیوں کہ) اس کی ماں نے بڑی مشقت (اور شفقت) سے اسے (پیٹ میں) اٹھائے رکھا (جس کی کم از کم مدت جس میں زندہ بچے کی پیدائش ممکن ہے چھ مہینے ہے) اور بڑی مشقت سے اسے جنا، اور اس کو اٹھائے رکھنے اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہوتی ہے۔''

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حمل کی کم از کم مدت چھ مہینے اور دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال یعنی چوبیس مہینے، اس طرح تیس مہینے کی مدت بنتی ہے، جس میں ماں اپنی اولاد کے لیے بڑی مشقتیں برداشت کرتی ہے۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

علامہ شہاب الدین احمد قلیوبی شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص اپنی ماں کو کندھے پر اٹھائے بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا، ایک بزرگ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ یہ میری ماں ہیں، میں ان کو سات برس سے اسی طرح اٹھائے ہوئے ہوں، کیا میں نے اس کا حق ادا کر دیا؟ فرمایا: اگر تم ہزار برس بھی اس طرح اس کی خدمت کرتے رہو تب بھی اس ایک رات کے برابر نہیں ہوسکتا جس میں تمہاری ماں نے رات میں جاگ کر تمہیں سینے سے لگا کر اپنے خونِ جگر کا دودھ پلایا اور تمہیں سلایا۔ (قلیوبی:۱۲۱، جواہر پارے:۱۵۵، از: ماں کی عظمت:۱۴۵)

لہٰذا اے لوگو! جس ماں نے تمہیں اپنے پیٹ میں جگہ دی تم بھی اسے اپنے دل میں جگہ دو، اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو، مطلب یہ ہے کہ ان سے محبت کرو، تمام جائز امور میں ان کی اطاعت کرو، جب تک کہ وہ کسی خلافِ شرع امر اور گناہ کا حکم نہ دے، اور اسی کے ساتھ پوری خوش دلی کے ساتھ ان کی خدمت کرو، ان کی ہر جائز خواہش وفرمائش پوری کرو، یہ چیز حصولِ جنت کا سبب ہے۔

ایک حدیث پاک میں وارد ہے کہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوکر جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کرنے لگے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تمہاری والدہ زندہ ہے؟ عرض کیا: جی ہاں، فرمایا کہ پھر تو اسی کے پاس رہو، اس کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو،" فَالْزَمْهَا؛ فَإِنَّ الجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلِهَا." (رواه أحمد والنسائی، و البیهقی فی شعب الإیمان، مشکوٰة: ۴۲۱/ باب البر و الصلة/ الفصل الثالث)

یعنی اپنی والدہ ہی کے پاس رہو اور اس کی خدمت کرتے رہو، کیوں کہ اس کے قدموں کے پاس جنت ہے۔ اس سے ماں کے مقام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی نے:

ماں سے بڑھ کر کوئی نام کیا ہوگا؟ اُس نام کا ہم سے احترام کیا ہوگا؟
جس کے پیروں کے نیچے جنت ہے اس کے سر کا مقام کیا ہوگا؟

کسی نے حدیث پاک (مسلم، مشکوٰۃ: ۴۱۸) کی کیا خوب ترجمانی کی کہ ؎

اِک دِن نبی نے حلقۂ اصحاب میں یہ لفظ
دہرائے تین بار کہ "ناک اس کی کٹ گئی"
اصحاب پوچھتے ہیں کہ وہ بد بخت کون ہے؟
توقیر جس کی آپ کی نظروں میں گھٹ گئی

اِرشاد یوں ہوا کہ وہ اولادِ ناخلف
گھر جس کے جنت آئی اور پلٹ گئی
ماں باپ کا بڑھاپے میں جس کو نہ ہو خیال
اس ناسعید اولاد کی قسمت پلٹ گئی

علامہ اسماعیل چشتی رحمۃ اللہ علیہ ایک حکایت نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت ابواسحاقؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: حضرت! میں نے رات کو خواب دیکھا کہ آپ کی داڑھی مبارک میں جواہر و یاقوت ہیں، آپ نے فرمایا: تیرا خواب سچا ہے، کیوں کہ میں نے کل اپنی ماں کے قدموں کو بوسہ دیا تھا۔ (تفسیر روح البیان: ۲/ ۱۵، از: ماں کی عظمت: ۱۱۵)

خلاصہ:

ان وضاحتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے عورت کو ہر حیثیت سے کس قدر اونچا مرتبہ و مقام عطا فرمایا ہے، اس کا تقاضہ یہی ہے کہ خواتین اسلام دین اسلام پر فدا اور قربان ہوجائیں اور اس کے ہر حکم کو اپنی عملی زندگی میں جگہ دیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری خواتین خانہ کو خصوصا اور جملہ خواتین مسلمہ کو عموما ام المومنین حضرت عائشہ اور جگر گوشۂ رسول ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کا مکمل نمونہ بنا دے۔ آمین یارب العالمین۔

۲۹/ شوال المکرّم/ ۱۴۳۵ھ/ بروز: سنیچر
مطابق: ۱۵/ اگست/ ۲۰۱۵ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۱۰)

نکاح کی خصوصیات وبرکات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذَا تَزَوَّجَ الۡعَبۡدُ فَقَدِ اسۡتَكۡمَلَ نِصۡفَ الدِّيۡنِ، فَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ فِيۡ النِّصۡفِ الۡبَاقِيۡ."

(رواه ابن ماجه، مشكوٰة / كتاب النكاح / الفصل الثالث)

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب بندہ نے نکاح کرلیا تو اس نے اپنا آدھا ایمان مکمل کرلیا، اب بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے بقیہ آدھے ایمان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔''

نکاح ایک سماجی ضرورت اور شرعی عبادت:

اللہ رب العزت نے اس دنیا میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے بندوں کو شریعت عطا فرمائی، اس کی ایک زبردست خصوصیت یہ ہے کہ شریعت دنیا کو بھی دین بنا دیتی ہے، شریعت نے ہمیں یہ بتایا کہ دین اور دنیا کوئی علاحدہ چیزیں نہیں؛ بلکہ ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں، اس لیے کہ جب دنیوی امور کی ادائیگی مرضیاتِ ربانی اور احکامِ شرعیہ

کے مطابق ہوتی ہے تو وہ دنیا نہیں؛ دین ہے، اس کے برخلاف -العیاذ باللہ العظیم- اگر دینی اعمال کی ادائیگی میں ریاکاری اور خواہشاتِ نفسانی شامل ہوجائیں تو وہ دین نہیں؛ دنیا ہے، اس لیے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ دنیا چھوڑ دو؛ بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ اپنی دنیا کو دین بنالو، اور یہ ہر ایک کے لیے آسان ہے، بس ایک کام کرلو کہ اپنے تمام امور میں مرضیاتِ ربانی اور احکامِ شرعیہ کا خیال رکھو، پھر ان شاء اللہ دنیا کا ہر عمل دین بن جائے گا۔ اس کی ایک بہترین مثال نکاح ہے، یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ نکاح سماجی ضرورت ہے، لیکن اگر اسی ضرورت کو حسن نیت اور احکام شریعت کی رعایت کرتے ہوئے پورا کیا جائے تو یہ سماجی ضرورت دینی و شرعی عبادت بن جاتی ہے، اور عبادت بھی ایسی جس کی کئی خصوصیات وبرکات ہیں۔

نکاح جنتی عبادت:

منجملہ ان میں پہلی خصوصیت یہ ہے کہ نکاح نبیوں اور رسولوں کی وہ عبادت ہے جو جنت سے شروع ہوکر جنت میں جانے تک باقی رہے گی، اس لیے کہ سب سے پہلا نکاح انسانِ اوّل سیدنا آدم علیہ السلام کا جنت میں ہوا، اور ان کی اولاد میں تمام اہل ایمان کا جنت میں جانے کے بعد بھی نکاح ہوگا، ارشادِ باری ہے:

﴿وَ زَوَّجۡنٰهُمۡ بِحُوۡرٍ عِيۡنٍ﴾ (الدخان: ٥٤)

''ہم ان جنتیوں کا نکاح جنت میں بھی کرائیں گے بڑی بڑی (خوب صورت) آنکھوں والی حوروں کے ساتھ۔''

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ نکاح جنتی عبادت ہے اور جنتیوں کی بھی عبادت ہے، نکاح کے بغیر زندگی میں ہی نہیں؛ جنت میں بھی لطف نہیں، غالباً اس لیے نکاح جنت سے شروع ہوکر جنت تک باقی رہنے والی جنتی عبادت ہے۔ جنتی عبادت تو اس لیے ہے کہ علامہ شامیؒ کے بقول یہ جنت سے شروع ہوکر جنت تک باقی رہے گی:

"لَيۡسَ لَنَا عِبَادَةٌ شُرِعَتۡ مِنۡ عَهۡدِ اٰدَمَ إِلَى الۡآنَ ثُمَّ تَسۡتَمِرُّ فِيۡ الۡجَنَّةِ إِلَّا

النِّكَاحَ وَ الإِيْمَانَ." (ردالمحتار / كتاب النكاح)

اور جنتیوں کی عبادت اس اعتبار سے ہے کہ نکاح سے متعلق میاں بیوی کو شریعت نے جنتی ہدایات دی ہیں، ان پر عمل کرنے والا جوڑا جنتی ہے، حق تعالیٰ انہیں روزِ محشر ایک دوسرے کے ساتھ جنت میں داخل فرمائیں گے، جس کا تذکرہ قرآنِ کریم میں موجود ہے:

﴿ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَ لَآ أَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ○ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَ أَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ○﴾ (الزخرف: ٦٨-٧٠)

''اے میرے بندو! آج تم پر نہ کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ تم غمگین ہوگے، میرے وہ بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے اور مسلمان یعنی تابع فرمان رہے تھے، تم بھی اور تمہاری بیویاں بھی خوشی خوشی مہکتے چہروں کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔''

پھر وہاں جنتی حوروں سے بھی ان کا نکاح کرایا جائے گا اور دنیوی بیویوں کو ان کی ملکہ بنایا جائے گا۔ الغرض نکاح عبادت ہے، بشرطیکہ نیک نیتی سے نکاح کیا جائے اور اس کے بعد عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو نبھایا جائے تو یہ نکاح اور اس کے بعد کی مشغولیت نفلی اعمال وعبادات کی مشغولیت سے بہتر ہے، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" إِنَّ الاِشْتِغَالَ بِهٖ مَعَ أَدَاءِ الْفَرْضِ وَ السُّنَنِ أَفْضَلُ مِنَ التَّخَلِّيْ لِنَوَافِلِ الْعِبَادَاتِ." (بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع: ٢٢٩/٢)

یعنی نکاح اور اس کے بعد کی ذمہ داریوں کی مشغولیت فرائض وسنن کی ادائیگی کے ساتھ اس خلوت اور تنہائی سے بہتر ہے جو نفلی اعمال وعبادات کے لیے اختیار کی جائے۔

معلوم ہوا کہ ایمانی، اخلاقی اور روحانی ترقی معاشرتی ذمہ داریوں سے راہِ فرار اختیار کرنے میں نہیں؛ بلکہ اُن کو نبھانے میں ہے۔

نکاح تکمیلِ ایمان کا ذریعہ:

ہمارے فقہاء نے یہ بات مذکورہ حدیث شریف کی روشنی میں بیان فرمائی ہے جو خادمِ رسول ﷺ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''نکاح ایمان کی تکمیل اور حفاظت کا ذریعہ ہے۔''...... " إِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الدِّيْنِ."

نکاح والی عبادت کی دوسری اور تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے تکمیلِ دین کا ذریعہ قرار دیا گیا، گویا نکاح کے بغیر نہ ایمان مکمل ہوسکتا ہے نہ محفوظ، اس لیے کہ اللہ رب العالمین نے ہر انسان کی فطرت وطبیعت میں شہوت تو رکھی ہی ہے، اس کی تکمیل کا حلال اور پاکیزہ ذریعہ صرف نکاح ہے، جب کہ حرام اور ناجائز راستہ ''سفاح'' یعنی زنا ہے۔ اگر تکمیل شہوت کا یہ حلال راستہ موجود نہ ہوتا تو حرام طریقہ سے تکمیل شہوت ایمان کی خرابی و بربادی کا ذریعہ بن جاتی۔ اس لیے قرآنِ کریم نے اعلان فرمایا:

﴿ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَّ سَآءَ سَبِيْلًا○﴾ (بنى إسرائيل: ٣٢)

تکمیلِ شہوت کا جو حرام طریقہ زنا ہے وہ ایمان کے لیے بڑا خطرناک ہے، اس لیے اس کے قریب بھی مت جاؤ، یہ ایسا خطرناک راستہ ہے جس کی منزل کوئی نہیں۔ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص زنا کرتا ہے تو اتنی دیر وہ کمالِ ایمانی سے محروم ہو جاتا ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ." (رواه البخاري، مشكوٰة المصابيح: ١٧)

زنا سے کمالِ ایمان اور نورِ ایمان ختم ہو جاتا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا بے انتہا کرم و احسان ہے کہ بندہ جب اس کبیرہ گناہ سے توبہ کر لیتا ہے تو وہ معاف فرما دیتا ہے۔

تکمیل شہوت کا جائز ذریعہ:

اگر تکمیل شہوت کا حلال اور پاکیزہ طریقہ نکاح اختیار کیا جاتا ہے تو یہ تکمیل ایمان کے ساتھ تکمیل شہوت کا وہ جائز طریقہ بھی ہے جس پر اللہ رب العالمین بندے کو صدقہ کا اجر عطا فرماتے ہیں، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً، وَ كُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً، وَ كُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً، وَ كُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً، وَ أَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَ نَهْيٌ عَنْ مُنْكَرٍ صَدَقَةٌ، وَ فِيْ بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، قَالُوْا: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيَأْتِيْ أَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَ يَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا أَجْرٌ؟" قَالَ: "أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِيْ حَرَامٍ، أَكَانَ عَلَيْهِ فِيْهَا وِزْرٌ؟ فَكَذٰلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ أَجْرٌ."
(رواه مسلم، مشکوٰۃ: ۱۶۸)

"ہر تسبیح، ہر تکبیر، ہر تحمید اور ہر تہلیل پر صدقہ کا ثواب ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی صدقہ ہے، حتیٰ کہ بیوی سے صحبت کرنا بھی صدقہ ہے، صحابہ کرامؓ کو تعجب ہوا تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر بندہ حرام طریقے سے تکمیل شہوت کرتا تو گنہگار ہوتا یا نہیں؟ لہٰذا حلال طریقے سے تکمیل شہوت پر وہ اجر کا حقدار ہے۔"

اس لیے حدیث پاک میں حکم دیا گیا:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهٗ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَ أَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهٗ لَهٗ وِجَاءٌ." (متفق علیه، مشکوٰۃ: ۲۶۷)

"اے جوانوں کی جماعت! تم میں سے جو بھی نکاح (اور اس کے موجبات و لوازمات، مراد: مہر، نان ونفقہ اور جسمانی حقوق وغیرہ کی ادائیگی) کی طاقت واستطاعت رکھتا ہے اُسے ضرور نکاح کرنا چاہیے، کیوں کہ نکاح نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت کا ذریعہ ہے،

اور جو شخص اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ روزہ کا اہتمام کرے، اس لیے کہ روزہ اس کی شہوت کو توڑ دے گا۔"

جس کی نگاہ و شرمگاہ محفوظ اس کا ایمان محفوظ، اس کے برخلاف جس کی نگاہ اور شرمگاہ محفوظ نہیں اس کے ایمان کی بھی کوئی گارنٹی نہیں۔ بہرکیف نکاح کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ نکاح تکمیل ایمان کے علاوہ تکمیل شہوت کا جائز ذریعہ ہے، اور تکمیل شہوت کے بعد نگاہ اور شرمگاہ عموماً اس لیے بھی محفوظ ہو جاتی ہے کہ اہل تقویٰ عموماً جس سے نکاح کرتے ہیں اسی پر نگاہ رکھتے ہیں، ان کی نگاہِ شہوت عموماً غیر محرم پر نہیں ہوتی۔

نکاح محبت کا ذریعہ:

علاوہ ازیں نکاح کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ نکاح محبت واُلفت کا ذریعہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ نکاح کے ذریعہ ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ عموماً خون کے رشتوں میں بھی وہ محبت نہیں ہوتی، اسی کو ایک حدیث میں بیان فرمایا گیا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَمْ تَرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلَ النِّكَاحِ." (رواه ابن ماجه، مشکوٰۃ: ۲۶۸)

کسی قرابت کے تعلق کے بغیر اور اجنبیت کے باوجود نکاح ہوتے ہی میاں بیوی میں ایک مثالی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے میاں بیوی کے اس تعلق کو اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی فرمایا:

﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا إِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ﴾ (الروم: ۲۱)

نکاح نہ صرف میاں بیوی کے مابین محبت واُلفت کا ذریعہ ہے؛ بلکہ اس کے ذریعہ دو گھرانوں اور خاندانوں حتیٰ کہ قوموں میں محبت پیدا ہوتی ہے، اس لیے نکاح وہ پسندیدہ اور

مبارک عمل ہے کہ تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام نے اسے اختیار فرمایا، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ﴾ (الرعد:۳۸)

”محبوبم! آپ سے قبل بھی بہت سے انبیاء ورُسل علیہم السلام تشریف لائے، جن کی بیویاں بھی تھیں اور بچے بھی۔“

تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام محبت کے اس پاکیزہ بندھن سے منسلک ہوئے، ہمارے آقا ﷺ نے بھی گیارہ نکاح کیے اور ان سے ایسی محبت پھیلی کہ نفرتیں ختم ہوگئیں۔

نکاح حصولِ اولاد کا جائز ذریعہ:

نکاح کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ نکاح حصولِ اولاد کا جائز سبب و ذریعہ ہے، ویسے اولاد تو اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں عطا کرتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ إِنَاثاً وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ○ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ إِنَاثًا وَّ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ﴾ (الشوریٰ: ۴۹)

وہ جسے چاہے بیٹیاں عطا کرے اور جسے چاہے بیٹے عطا کرے، یا دونوں ملا کر دے اور جسے چاہے بے اولاد رکھے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے حصولِ اولاد کا حلال اور جائز سبب نکاح کو بنایا ہے، اس لیے حدیث میں وارد ہے:

عَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ، فَإِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِّكُمُ الْأُمَمَ.“ (رواه أبوداود، مشكوٰة: ۲۶۷)

نکاح اُس عورت سے کرو جو اپنے شوہروں سے محبت کرنے والی اور اولاد جننے والی ہو، کیوں کہ میں (روزِ قیامت) دوسری امتوں کے مقابلہ میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔

سوال یہ ہے کہ کونسی عورت بچہ جننے والی ہے اور کونسی نہیں؟ یہ کیسے معلوم ہوگا؟ تو علماءِ

محدثین نے اس کے جواب میں فرمایا ہے کہ من جانب اللہ اقرباء کے طبعی اثرات ایک دوسرے میں ضرور سرایت کیے ہوئے ہوتے ہیں، اقرباء عادات وخوبیوں میں بھی ایک دوسرے کے مانند ہوتے ہیں، اس لیے کسی عورت میں یہ صفات معلوم کرنے کا ظاہری طریقہ یہ ہے کہ اس عورت کے خاندان کی عورتوں کو دیکھ لیا جائے، اگر خاندانی عورتیں صاحب اولاد ہیں تو وہ عورت بھی ان شاء اللہ صاحب اولاد ہوگی۔

اور صاحبو! جیسے اقرباء کے طبعی اثرات ایک دوسرے میں سرایت کرتے ہیں اسی طرح دینی اثرات بھی ایک دوسرے میں سرایت کرتے ہیں، لہٰذا دین داری کا بہت لحاظ رکھنا چاہیے۔ بہرحال نکاح کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نکاح حصولِ اولاد کا حلال، پاکیزہ اور جائز ذریعہ ہے۔

نکاح نصرتِ الٰہی کا ذریعہ:

نکاح کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ نکاح نصرتِ الٰہی کا ذریعہ ہے، بشرطیکہ نکاح نیک نیتی کے ساتھ کیا جائے، جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ”ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَوْنُهُمْ، اَلْمُكَاتَبُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْأَدَاءَ، وَ النَّاكِحُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْعَفَافَ، وَ الْمُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.“ (رواه الترمذي، مشكوٰة: ۲۶۷)

”تین قسم کے لوگوں کی مدد کرنا اللہ رب العالمین پر (اس وعدے کے مطابق جو اس نے از راہِ شفقت فرما رکھا ہے) ضروری ہے: (۱) مکاتب (یعنی وہ غلام یا باندی جس کا مالک اس سے آزادی کا بدلہ طے کرلے، کہ جب تم مجھے اتنا کما کر دے دو تو تم آزاد ہو۔ ایسے غلام یا باندی اپنے ذمہ کا قرض ادا کرنے کی نیت رکھتے ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی، نیز ہر اس شخص کی جو قرض ادا کرنے کی نیت کے ساتھ جدوجہد کرتا ہو ضرور مدد کرتے ہیں۔ (۲) نکاح کرنے والا (خواہ مرد ہو یا عورت) جو نکاح کے ذریعہ زنا سے بچنا چاہتا ہو اور اپنی عزت وعصمت کی

حفاظت کی نیت سے نکاح کرنا چاہتا ہو، تو ایسے لوگوں کی اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرتے ہیں۔
(۳) مجاہد فی سبیل اللہ۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے مجاہد فی سبیل اللہ نصرتِ الٰہی کا حقدار ہوتا ہے ایسے ہی نیک نیتی سے نکاح کرنے والا بھی نصرتِ الٰہی کا حقدار ہوتا ہے، اور یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت بہت بڑی طاقت ہے، اس کے ہوتے ہوئے کوئی ہم پر غالب نہیں آ سکتا:

﴿ إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ﴾ (آل عمران : ۱۶۰)

غالباً نکاح کی ان ہی خصوصیات اور فضائل و برکات کے پیشِ نظر ابن حجرؒ کے بقول تقریباً سو روایتوں میں اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ (مظاہر حق جدید)

چوں کہ نکاح سماجی ضرورت ہونے کے ساتھ شرعی عبادت بھی ہے، حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام کی سنت بھی ہے، ایمان کی تکمیل وحفاظت نیز عفت وعزت اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وغیرہ کا ذریعہ بھی ہے، اس لیے شریعت کا منشا یہ ہے کہ نکاح کیا جائے اور رشتۂ نکاح کو قائم ودائم رکھا جائے۔

نکاح کے رشتہ کو مستحکم اور مضبوط بنانے کی شرعی ہدایات:

رشتۂ نکاح کو مستحکم اور مضبوط بنانے کے لیے شریعت نے چند بنیادی ہدایات دی ہیں، جن میں سے دو کا تعلق نکاح سے قبل ہے اور دو کا نکاح کے بعد سے۔

(۱)...... اس سلسلہ میں پہلی ہدایت کفاءت کی ہے، یعنی کفو میں نکاح کرنا، مطلب یہ ہے کہ جن دو خاندانوں کے درمیان رشتۂ نکاح طے ہو ان میں جہاں تک ممکن ہو برابری کو پیشِ نظر رکھا جائے، تا کہ آپس میں مماثلت، اپنائیت، اُنسیت اور نبھاؤ کے امکانات زیادہ سے زیادہ ہوں۔ اس کے برخلاف اگر بے جوڑ نکاح ہو تو عموماً اس میں استحکام اور دوام کے امکانات کم ہوتے ہیں، لہٰذا شریعت نے نکاح کے باب میں کفو کی رعایت کا حکم دیا ہے۔

(۲)...... دوسری ہدایت یہ ہے کہ کفو میں بھی دین داری والے رشتہ کو ترجیح دی جائے، صرف حسن و جمال اور مال پر نظر رکھنے کے بجائے اخلاق واعمال پر نظر رکھی جائے، کیوں کہ یہی اصل کمال ہے۔ بقولِ شاعر:

حسن صورت چند روزہ، حسن سیرت مستقل
اُس سے خوش ہوتی ہیں آنکھیں، اِس سے خوش ہوتا ہے دِل

اس سلسلہ میں ایک نکتہ سمجھنے کے قابل ہے، اور وہ یہ ہے کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمیؒ جو حساب کے بانی سمجھے جاتے ہیں، انہوں نے انسان کے متعلق انوکھا حساب کیا ہے کہ کسی انسان کے پاس صرف دین داری اور خوش اخلاقی ہو تو اُسے ایک نمبر دو: (۰۱) اگر ساتھ میں خوب صورتی بھی ہو تو دائیں طرف صفر بڑھا دو: (۱۰) اگر اس کے ساتھ مال و دولت بھی ہو تو ایک صفر اور لگا دو: (۱۰۰) پھر اگر حسب ونسب بھی عمدہ اور اعلیٰ ہو تو ایک صفر اور بڑھا دو: (۱۰۰۰) لیکن اگر یہ سب ہو اور دین داری وخوش اخلاقی نہ ہو تو اس میں سے ایک کے عدد کو ہٹا دو، اب صرف صفر (۰۰۰) رہ جائیں گے، بالکل اسی طرح دین داری وخوش اخلاقی کے بغیر کچھ نہیں۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ میاں بیوی کا ایک بن کر رہنا موقوف ہے ان کے نیک بن کے رہنے پر، اگر میاں بیوی ایک اور نیک ہوں تو یہ دنیا ان کے لیے جنت سے کم نہیں، اس لیے حدیث میں بطورِ خاص دین داری کی بنیاد پر نکاح کرنے کا حکم ہے۔

(۳)...... تیسری ہدایت یہ ہے کہ رشتۂ نکاح کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں۔ حکم ربانی ہے:

﴿ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (البقرة : ۲۲۸)

اب شوہر کے ذمہ بیوی کے جو حقوق ہیں ان میں مہر، مکان اور طعام ولباس کے ساتھ دینی ودنیوی ضروریات کا انتظام کرنا بھی ہے، جب کہ بیوی کے ذمہ شوہر کے جو حقوق

ہیں، ان میں اپنی عصمت وعزت کی حفاظت کے ساتھ تمام جائز امور جن کا شوہر کو حق حاصل ہے ان میں شوہر کی اطاعت کرنا ہے، حقوق کے باب میں حکم یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی فکر کریں، اگر ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کمی وکوتاہی ہو جائے تو جہاں تک ممکن ہو چشم پوشی ودرگذر سے کام لیا جائے۔

(۴)...... چوتھی ہدایت یہ ہے کہ اداءِ حقوق کے ساتھ دونوں آپس میں حسن سلوک کا معاملہ کریں، حسن سلوک سے جب پرایوں کو اپنا بنایا جاسکتا ہے تو اپنوں کو بدرجۂ اولیٰ قریب کیا جاسکتا ہے، شرط یہ ہے کہ حسن سلوک کی ابتدا ہم خود کریں، دوسرے سے ابتدا کی توقع رکھے بغیر ہم خود ابتدا کریں، ان شاء اللہ اس سے بہت بڑی خیر وجود میں آئے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ نکاح کے خواہش مند حضرات ان شرعی ہدایات پر عمل کرلیں تو نہ صرف یہ کہ انہیں نکاح کی برکات اور فضائل حاصل ہوں گے؛ بلکہ ان کے درمیان افتراق اور طلاق کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حق تعالیٰ ہم سب کے اور بالخصوص برادرِ نسبتی عزیزم ابوسفیان کے ہونے والے نکاح کو ان تمام برکات وفضائل کا جامع بنائے اور اس سلسلہ کی تمام شرعی ہدایات پر ہمیں اور زوجین کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

۱۷/صفر المظفر / ۱۴۳۸ھ (قبل الجمعہ)

مطابق: ۱۸/نومبر/ ۲۰۱۶ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَصَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَإِنَّکَ أَنْتَ أَھْلُ التَّقْوٰی وَ أَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ

(۱۱)

نکاحِ ثانی کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: ’’ ثَلَاثَۃٌ حَقٌّ عَلیٰ اللّٰہِ عَوْنُھُمْ، اَلْمُکَاتَبُ الَّذِیْ یُرِیْدُ الْأَدَاءَ، وَ النَّاکِحُ الَّذِیْ یُرِیْدُ الْعَفَافَ، وَ الْمُجَاھِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ.‘‘ (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجہ، مشکوٰۃ المصابیح: ۲۶۷/ کتاب النکاح /الفصل الأول)

ترجمہ: ’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’تین شخص ایسے ہیں جن کی مدد کا وعدہ رب العالمین نے (از راہِ شفقت) اپنے ذمہ لازم فرمالیا ہے: (۱) وہ مکاتب (جس غلام یا باندی کو اس کا آقا کہے کہ اگر تو مجھے اتنی رقم دے دے تو تو آزاد ہے، اب اگر غلام یا باندی اسے منظور کرلے تو وہ غلام رہتے ہوئے اپنے آقا کی خدمت سے آزاد ہے، وہ آزادی سے شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے کما سکتا ہے، پھر جب بھی مقررہ پوری رقم آقا کو دے دے تو وہ غلامی سے مکمل آزاد ہوجائے گا) جو اپنا بدلِ کتابت (اپنے ذمہ کا قرض) ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ (۲) وہ نکاح کرنے والا جو عفت اور پاکدامنی (اس نکاح کے ذریعہ حرام کاری سے بچنے) کا ارادہ رکھتا ہے۔ (۳) وہ شخص جو

اللہ کے راستہ میں جہاد کرے۔''

نکاح حصولِ تقویٰ کا ذریعہ:

اللہ رب العزت کے احکام میں بنیادی حکم تقویٰ ہے، قرآنِ کریم نے سب سے زیادہ زور اسی پر دیا ہے، کیوں کہ تقویٰ کے بعد گناہوں سے تحفظ، پاکدامنی اور پرہیزگاری نصیب ہوتی ہے، اس لیے اس کا حصول بہت ہی زیادہ ضروری ہے، اور حصولِ تقویٰ کا ایک بہتر ذریعہ نکاح ہے، غالبًا اسی کی طرف توجہ دلانے کے لیے حضور اکرم ﷺ نے خطبۂ نکاح کے موقع پر جن تین آیات کا انتخاب فرمایا ان میں تقویٰ کا تذکرہ ہے۔

(ترمذی، مشکوٰۃ: ۲۷۲ / باب إعلان النکاح و الخطبة والشرط)

نکاح حصولِ تقویٰ کا ذریعہ اس اعتبار سے ہے کہ نکاح کے بعد نفس کی خواہش پوری کرنے کا حلال اور پاکیزہ انتظام ہوجاتا ہے، انسان ذہنی، قلبی اور جسمانی طور پر پرسکون ہوجاتا ہے، اس لیے عموماً نکاح کے بعد ایک شریف اور سنجیدہ انسان کے لیے نفس، نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت آسان ہوجاتی ہے، وہ بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے اور یوں اس کے لیے حصولِ تقویٰ آسان ہوجاتا ہے، جو نکاح کا ایک بہت بڑا فائدہ ہے، اس کے برخلاف جو لوگ بے نکاح رہ کر تجرّد والی زندگی بسر کرتے ہیں، عموماً ان کو نفس، نگاہ اور شرمگاہ پر قابو حاصل نہیں ہوتا، اور وہ بہت سے گناہوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بلا کسی عذرِ شرعی کے بے نکاحی اور تجرّد والی زندگی (Celibacy) بسر کرنا اسلام میں پسندیدہ طریقہ نہیں، خود حضور ﷺ نے بھی اپنے لیے تجرّد کی زندگی کو پسند نہیں فرمایا، اسی لیے حضرت خدیجہؓ سے نکاح فرمایا، پھر ان کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے حضرت سودہؓ وغیرہ سے نکاح فرمالیا، اور آپ ﷺ چاہتے تھے کہ امت بھی اسی طریقہ کو اختیار کرے۔

ترکِ دنیا و نکاح مذموم ہونے کے متعلق ایک واقعہ:

چنانچہ حدیث پاک میں ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی، حضرت

عثمان بن مظعون اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کی عدم موجودگی میں ازواجِ مطہرات کے پاس آئے اور حضور ﷺ کی شب و روز کی عبادات کے سلسلہ میں دریافت کیا، (اب یہ واقعہ یا تو پردہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے، یا اگر بعد کا ہے تو ان میں سے حضرت علیؓ نے دریافت کیا ہے، جن سے گھر کے ایک فرد اور داماد ہونے کی وجہ سے پردہ نہ تھا، یا پھر پس پردہ سوال کیا، بہرکیف) ازواجِ مطہرات نے حضور ﷺ کے معمولات سے انہیں مطلع کردیا، ان حضرات کا خیال یہ تھا کہ آپ ﷺ ہمہ وقت عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے ہوں گے اور تارک الدنیا ہوکر محض آخرت ہی آپ کا مطمحِ نظر ہوگی، اس لیے ان حضرات نے اپنے زعم و خیال کے مطابق اس عبادت کو آپ ﷺ کی ذات کے پیشِ نظر کم تصوّر کیا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ''أَیْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ؟'' حضور ﷺ کے مقابل ہمارا کیا مقام ہے؟ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف فرمادیے ہیں، اور جب آپ ﷺ معصوم ہیں تو آپ ﷺ کو اتنی بھی زیادہ عبادت کی ضرورت نہیں، ہم تو آپ ﷺ کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں، لہٰذا ہمیں تو آپ ﷺ کے بالمقابل بہت زیادہ عبادت کرنی چاہیے، اسی احساس کے پیشِ نظر ان حضرات نے آپس میں یہ عہد و پیمان کیا کہ ہم ان اعمال پر مداومت کے ساتھ عمل پیرا رہیں گے، چنانچہ ان میں سے ایک صحابی نے یہ عہد کیا کہ میں پوری زندگی رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے تمام عمر روزے اور تیسرے نے عورتوں سے کنارہ کش رہنے اور کبھی نکاح نہ کرنے کا عہد کیا، حضور ﷺ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ درست نہیں ہے اور فرمایا:

'' وَ اللّٰہِ إِنِّیْ لَأَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَ أَتْقَاکُمْ لَہٗ، لٰکِنِّیْ أَصُوْمُ وَ أُفْطِرُ، وَ أُصَلِّیْ وَ أَرْقُدُ، وَ أَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ.''

(متفق علیه، مشکوٰۃ: ۲۷ / باب الاعتصام بالکتاب والسنة / الفصل الأول)

ترجمہ: ''(مجھے دیکھئے! کہ) خشیتِ الٰہی کا داعیہ بھی مجھ میں تم سے زیادہ ہے،

نیز تقویٰ و پرہیزگاری میں بھی تم سے بڑھا ہوا ہوں، اس کے باوجود ایسا نہیں کرتا کہ مسلسل روزے ہی رکھتا چلا جاؤں، یا رات بھر نماز ہی ادا کرتا رہوں، یا عورتوں سے مکمل کنارہ کش ہو کر تارک النکاح والدنیا ہو جاؤں، بلکہ میں وہ سارے ہی کام کرتا ہوں جو اچھائیوں کے قبیل سے ہیں، اور جن کو بجالانے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملی ہے، یہی میرا طریقہ ہے، اور جو بھی میرے طریقہ سے اعراض وانحراف کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

نکاح کا حکم:

کتبِ فقہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی کو شہوت کا غلبہ ہو اور اُسے غالب گمان ہو کہ اگر نکاح نہ کیا تو وہ حدودِ شریعت پر قائم نہ رہ سکے گا، نفس اور نظر کی حفاظت نہ کر سکے گا، نیز اس کے پاس نکاح کے اسباب وسائل بھی موجود ہوں، تو ایسے شخص پر نکاح کرنا واجب ہے، اور اگر اعتدال کی حالت ہو، یعنی نہ جذبات میں تلاطم ہو اور نہ بالکل سرد مہری ہو، اور ساتھ ہی حقوقِ واجبہ کی ادائیگی پر بھی قدرت ہو، تو ایسی (نارمل) حالت میں نکاح کرنا سنت مؤکدہ ہے، بلکہ احناف کے نزدیک نکاح میں اشتغال نوافل سے بڑھ کر ہے، (جیسا کہ علامہ کاسانیؒ نے ''بدائع الصنائع'' میں اور علامہ ابن نجیم مصریؒ نے ''البحر الرائق'' میں اسے مدلل ذکر فرمایا ہے۔ (البحر الرائق: ۳/۸۰)

ہمارے یہاں نکاح چوں کہ صرف ایک سماجی ضرورت ہی نہیں؛ بلکہ شرعی عبادت بھی ہے اور اس میں قُربت (وہ عمل جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو) کا پہلو بھی ہے، اس لیے ترکِ نکاح کے بجائے فرائض اور واجبات کی ادائیگی کے ساتھ نکاح کرنا افضل عمل ہے، جس کی متعدد وجوہ ہیں، مثلاً:

(۱) تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام نے نکاح کیے اور خود حضور ﷺ نے نکاح پر مواظبت فرمائی، بلکہ متعدد نکاح فرمائے، اگر ترکِ نکاح اور گوشہ نشینی افضل عمل ہوتا تو آپ ﷺ نکاح نہ فرماتے۔

(۲) نکاح انبیاء ورُسل کی سنت ہے، جو بالاجماع نوافل پر مقدّم ہے، نیز (بلا شرعی عذر کے) اس سنت کے ترک پر وعید ہے، جب کہ ترکِ نفل پر کوئی وعید نہیں۔

(۳) نکاح ایسے بہت سے مختلف امور کے ادا کرنے کا ذریعہ ہے جن میں سے ہر ایک نفل سے افضل ہے، مثلاً نفس، نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت، عورت (جو اپنی ضرورت پورا کرنے سے عاجز ہے اس) کی کفالت وغیرہ، ان وجوہ کی بنیاد پر ہم احناف کے یہاں نکاح کرنا نفلی عبادات میں مشغول ہونے سے افضل ہے۔

نکاح کرانے کا حکم:

پھر اس پر بھی غور کیا جائے کہ نیک نیتی سے نکاح کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ نصرت کا وعدہ فرماتے ہیں، جس کا تذکرہ حدیث پاک میں فرمایا گیا، اس وعدۂ الٰہی کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ نکاح سے جو ہر عفت کی حفاظت کے علاوہ مال میں بھی برکت نصیب ہوتی ہے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿إِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ط﴾ (النور: ۳۲)

پھر چوں کہ عام طور سے اپنے نکاح کی کوشش خود نہیں کی جاتی، اور خاص کر عورتیں اور ان میں بھی کنواری لڑکیاں (مہذب اور سنجیدہ سماج میں) اپنے نکاح کی بات خود چلانے سے شرماتی ہیں، اور یہ حیا کسی قدر بہتر بھی ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے اولیاء یعنی گھر اور خاندان کے ذمہ داران کو بطورِ خاص حکم دیا کہ جو بے نکاح ہیں ان کے نکاح کی فکر کرو اور مناسب رشتہ تلاش کر کے ان کے نکاح کراؤ، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ط اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۝﴾ (النور: ۳۲)

''اور تم میں سے جن (مرد یا عورتوں) کا اس وقت نکاح نہ ہو ان کا بھی نکاح کراؤ اور تمہارے غلاموں اور باندیوں میں سے جو نکاح کے قابل ہوں ان کا بھی، اگر وہ تنگ دست ہوں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں بے نیاز کر دے گا۔''

آیت کریمہ میں جولفظ ”أَيَـامیٰ“ وارد ہوا ہے وہ ”أَيِّمٌ“ کی جمع ہے، اور عربی زبان میں ”أَيِّم“ بے نکاح کو کہتے ہیں، تو آیت کریمہ میں ان لوگوں کا نکاح کردینے کا حکم فرمایا گیا ہے جو بے نکاح ہیں، اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ اب تک جن کا نکاح ہوا ہی نہیں ان کا نکاح کراؤ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ نکاح ہوکر ٹوٹ گیا، یا میاں بیوی میں سے کسی بھی ایک کی وفات ہوگئی، اور اس طرح وہ بے نکاح ہوگئے، تو اب دوبارہ ان کا نکاح کرادو!

نکاحِ ثانی کی طرف توجہ ضروری ہے:

جس طرح کنوارے لڑکے اور لڑکی کا نکاح ایک سماجی اور شرعی ضرورت ہے، اسی طرح ایک مرتبہ نکاح ہونے کے بعد کسی وجہ سے بے نکاح ہوجانے والے مرد وعورت کا نکاحِ ثانی بھی ضروری ہے، بلکہ ایک حد تک زیادہ ضروری ہے، اس لیے کہ جو کنوارے ہیں وہ جنسی تعلقات کی لذت سے نا آشنا اور مرد وزن کے پرلطف تعلقات سے ناواقف ہیں وہ (مہذب اور سنجیدہ سماج میں) فطری حجاب اور شرم وحیا کے باعث زنا کی طرف قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کرسکتے، اس کے برخلاف ایک مرتبہ نکاح ہوجانے کی وجہ سے جو مرد وزن جنسی تعلق سے لطف اندوز ہوچکے ہیں اب طلاق یا وفات کے بعد بے نکاح رہنے سے ان کے لیے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اور دامن عفت کے داغدار ہونے کا زیادہ اور قوی اندیشہ ہے، جیسا کہ یورپ اور افریقہ وغیرہ ممالک میں اور خود ہمارے ملک میں بھی اسقاطِ حمل کے اعداد وشمار اور ان میں بیوہ یا مطلقہ عورتوں کا تناسب اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔

لہٰذا نکاحِ اوّل کی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ نکاحِ ثانی کی طرف توجہ دینا ضروری ہے، حتیٰ کہ فقہاء نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات نکاحِ اوّل کی طرح نکاحِ ثانی بھی فرض اور ضروری ہوجاتا ہے، مثلاً مرد یا عورت جوان ہے، قرائن وانداز ہ سے طبیعت میں تقاضا معلوم ہوتا ہے اور نکاحِ ثانی نہ کرنے کی صورت میں فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، یا عورت کا نکاحِ ثانی نہ ہونے کی صورت میں نان ونفقہ کی تنگی اور اِفلاس کی وجہ سے آبرو کے ضائع ہونے کا احتمال ہے، تو بلا شبہ ایسی صورت میں نکاحِ اوّل کی طرح نکاحِ ثانی بھی فرض

اور ضروری ہے؛ بلکہ بعض علماء کے بقول ایسے مرد وعورت کے لیے ضرورۃً نکاحِ ثانی محض دو شرعی گواہوں کی موجودگی میں خفیہ طور پر کرلینا بھی جائز ہے، جب کہ اعلانِ نکاح میں جاہل رشتہ داروں سے فساد وفتنہ کا واقعی خطرہ ہو۔ (مستفاداز: اسلامی شادی: ۳۴۷)

البتہ اگر کوئی بیوہ بہت نیک، متقیہ، عفیفہ اور صاحب اولاد ہے، معاشی تنگی بھی نہیں اور قرائن وانداز ہ سے نکاحِ ثانی سے استغنا معلوم ہوتا ہو تو ایسی صورت میں نکاحِ ثانی فرض نہیں، ایسی عورت کو آسمان میں شہیدہ کا خطاب دیا جاتا ہے۔

منقول ہے کہ عظیم آباد میں ایک عورت عین جوانی کی حالت میں بیوہ ہوگئی، مگر نہایت نیک، متقیہ اور عفیفہ تھی، اس لیے اپنے علاقہ میں سیکڑوں عورتوں کی معتمد تھی، بیوگی کی حالت میں اس نے ساری زندگی گزار دی، بڑھاپے میں اس نے اپنی معتقد عورتوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ ”بتاؤ! میں نے زندگی کیسی گزاری؟“ سب نے کہا کہ ”عفت وپاکدامنی اور پرہیزگاری والی،“ کہنے لگی: ”اب میری بات سنو! جب میں رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت ومناجات میں مشغول ہوتی اور اس وقت کسی اجنبی مرد کی آواز میرے کان میں پڑتی تو دل چاہتا کہ کسی طرح اس کے پاس چلی جاؤں، لیکن خوفِ خدا اور شرم وحیا کی وجہ سے رُکی رہتی، شروع سے اب تک میں نے اپنے نفس اور شیطان سے کس طرح مقابلہ کیا یہ تو میرا رب ہی جانتا ہے، بس، میری تم سب کو آخری وصیت یہ ہے کہ ”کبھی کسی جوان بیوہ کو بے نکاح مت رکھنا۔“ (مستفاداز: مثالی دولہن: ۲۴۲)

جس زمانہ میں نکاحِ ثانی کو معیوب اور مذموم سمجھا جاتا تھا ہمارے اکابر حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما اللہ نے اس کی طرف توجہ دلانے کے لیے باقاعدہ نکاحِ بیوگاں اور تجرّد کی قبیح رسم کو مٹانے کی باضابطہ مہم شروع فرمائی تھی۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک نصیحت آموز واقعہ یہ ہے کہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب

نانوتویؒ نے دیوبند میں عقد بیوگاں (بیواؤں کے ساتھ نکاح) کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ایک تقریر فرمائی، تو مجمع میں سے ایک شخص نے یہ اعتراض کر دیا کہ آپ کی ہمشیر تو خود بیوہ ہیں، لہٰذا پہلے ان ہی کا نکاحِ ثانی کرا دیجیے، (حالانکہ حضرت کی ہمشیر بیوہ ضرور تھیں مگر اس قدر عمر رسیدہ کہ پلکیں بھی سفید ہو گئی تھیں) مگر حضرت کے جذبۂ اصلاح کا پر صداقت ولولہ دیکھئے کہ جلسہ گاہ سے فوراً مکان پر تشریف لائے اور ہمشیر محترمہ مسماۃ امینہ کے پاؤں میں اپنی دستار مبارک رکھ کر فرمایا: ''آج ایک سنت کو زندہ کرنا آپ کے ہاتھوں میں ہے'' پھر عقد ثانی کی طرف توجہ دلائی، تو بوڑھی ہمشیر نے بھی احیاءِ سنت اور ترویج شریعت کے لحاظ میں نکاحِ ثانی کا ارادہ کیا اور شیخ نیاز احمد سے نکاح کر لیا، اللہ تعالیٰ کی قدرت اور نکاحِ ثانی کی برکت اس طرح ظاہر ہوئی کہ اس قدر سن رسیدہ ہونے کے باوجود نکاحِ ثانی کے بعد اولاد ہوئی۔

(علماءِ حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ۱/ ۴۶، سوانح قاسمی: ۲/ ۱۴، حاشیہ از: گیلانی)

یاد رکھو! والدین کی خدمت کی ایک اچھی شکل یہ بھی ہے کہ اگر وہ بے نکاح ہو جائیں اور ان کو نکاحِ ثانی کی ضرورت ہو تو اولاد خود اس کا انتظام کر دے اور اپنے سوتیلے ماں باپ کے اِخراجات کو برداشت کرے، جیسا کہ علامہ حصکفیؒ نے اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

(الدر مع الرد: ۵/ ۳۴۴)

عاجز کے خیالِ ناقص میں احیاءِ سنت اور ترویج شریعت کے علاوہ جوہر عفت کی حفاظت کے لیے آج بھی نکاحِ ثانی کی تحریک کی تجدید ضروری ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں اس طرف توجہ دینے دِلانے کی توفیق عطا فرما کر ہمیں اپنی رضا کے لیے ہر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

۲/ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۷ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۱۲/ فروری/ ۲۰۱۶ء، بزم صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۱۲)

شریعت میں تعدّدِ ازواج (چند بیویوں) کی اجازت اور اس کی حکمت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "إِذَا كَانَتْ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ، فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ شِقُّهٗ سَاقِطٌ." (رواه الترمذی و أبوداود والنسائی و ابن ماجه، مشکوٰة: ۲۷۹ / باب القسم)

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کی دو (یا چند) بیویاں ہوں، اور وہ ان کے مابین (قانونِ شریعت کے مطابق) عدل وانصاف نہ کرتا ہو، تو وہ قیامت کے دِن اس حالت میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ گرا ہوا ہوگا۔'' (اس کے جسم کا ایک پہلو فالج زدہ شخص کی طرح جھکا ہوا ہوگا، گویا دنیا میں ایک بیوی کی طرف میلان کی تصویر محشر میں اس طرح مجسم ہو کر اہلِ محشر کے سامنے نمایاں ہوگی)۔ العیاذ باللہ العظیم۔

تعددِ ازواج (چند بیویوں) کے لیے شرعی شرائط:

اللہ تعالیٰ نے شریعت مطہرہ کی صورت میں جو قانون ہمیں عطا فرمایا وہ ہمہ گیر نہایت جامع اور وسیع ہے، اس میں انسانی سماج کے تمام طبقات کی فطری، معاشرتی، اخلاقی اور ہر اعتبار سے رعایت کی گئی ہے، جس کی ایک بہترین مثال شریعت میں تعدّدِ ازواج (چند بیویوں) کی اجازت ہے، لیکن اس کے متعلق عام طور پر ناواقف حلقوں میں یہ سمجھا جاتا ہے یا انہیں باور کرایا جاتا ہے کہ شریعت میں تعدّدِ ازواج کی اجازت بلا کسی شرط وقید کے ہے، حالاں کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلامی قانون کا معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ شریعت میں تعدّدِ ازواج کی صرف اجازت ہی ہے، کوئی فرض یا واجب نہیں ہے، اور وہ بھی چند شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ ہے، مطلق نہیں ہے، ورنہ تو اسلام سے پہلے حال یہ تھا کہ ایک شخص بیک وقت دس دس، بیس بیس عورتوں کو نکاح میں رکھتا تھا، اسلام نے خاص حکمت کے تحت اس کی زیادہ سے زیادہ حد چار تک مقرر فرمادی، اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مرد تمام بیویوں کے ساتھ جملہ ظاہری امور اور معاملات میں برابری کا سلوک کرے، ایسا نہ ہو کہ ایک کا گھر بسانے کے لیے دوسری کا اُجاڑ دے، یا ایک کا دِل خوش کرنے کے لیے دوسری کا دِل توڑ دے، اگر اس طرح بے انصافی کا اندیشہ ہو تو پھر ایک ہی پر اکتفا کا حکم ہے، ایسی صورت میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کو منع فرمایا گیا ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۝﴾ (النساء: ۳)

ترجمہ: ’’لیکن اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ تم (ان چند بیویوں) کے درمیان انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، یا ان کنیزوں پر جو تمہاری ملکیت میں ہیں، اس طریقے میں زیادہ امکان ہے کہ تم بے انصافی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔‘‘

لطیفہ:

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ منقول ہے کہ ایک بزرگ نے اپنی مجلس میں ایک مرتبہ فرمایا کہ ’’شادی تو کم از کم دو عورتوں سے ہی کرنی چاہیے! کیوں کہ یہی درحقیقت مطلوب بھی ہے۔‘‘ اس پر کسی نے کہا کہ حضرت! وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ”نَحْنُ مِنَ الْمُوَحِّدِيْنَ.“ ہم تو موحّد ہیں نا! اس لیے ایک ہی پر اکتفا کیے ہوئے ہیں، یہ سن کر بزرگ نے برجستہ فرمایا: ”لَا، بَلْ أَنْتُمْ مِنَ الْمُخَوَّفِيْنَ.“ دراصل تم ڈرپوک ہو، اسی لیے تم نے ایک نکاح پر اکتفا کیا ہے، دلیل حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۝﴾ (النساء: ۳)

تعدّدِ ازواج کی اجازت عیاشی نہیں ہے بلکہ ذمہ داریوں میں اضافہ ہے:

الغرض اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ مردوں کے لیے شرعی پابندیوں کے ساتھ چند بیویوں کی اجازت یہ کوئی عیاشی کا راستہ نہیں ہے، بلکہ ان کی ذمہ داریوں میں ایک زبردست اضافہ ہے، اس لیے کہ اگر کوئی شخص ایک ہی شادی کرتا ہے تو اس پر ایک ہی عورت اور اس کے بچوں کی ذمہ داری ہوتی ہے، لیکن اگر ایک سے زائد شادیاں کرتا ہے تو اس پر ایک سے زائد عورتوں اور بچوں کی ذمہ داری آجاتی ہے، اس لیے یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے کہ جسے عیاشی کرنی ہوگی وہ دو، تین اور چار شادیاں تو درکنار ایک بھی شادی کرنا پسند نہیں کرے گا، عیاشی کا راستہ شادی کے راستے سے بالکل ہی الگ ہے، جسے عیاشی کرنی ہو بظاہر اس کے لیے یہی زیادہ آسان ہے کہ جب جب اس کے اندر شہوت کی آگ بھڑکے تو وہ کسی کلب یا فائیو سٹار ہوٹل کا رُخ کرے، کسی زانیہ سے اپنا منہ

کالا کرے، اپنی جوانی کو ضائع کرے اور پھر مزے سے آزاد گھومے، نہ اسے کسی کے خرچ اور نان ونفقہ کی فکر ہے، نہ بچوں کی پرورش وتربیت کرنی ہے، نہ کسی کے حقوق ادا کرنے ہیں وغیرہ، اس کے برعکس جو شخص شادی کرتا ہے وہ تو پہلے ہی دن سے اپنے گلے میں ذمہ داریوں کا ایک بھاری تھیلا ڈال لیتا ہے، جس کو نبھانا اتنا آسان نہیں، اور جب ایک بیوی اور اس کے بچوں کی ذمہ داریوں کو نبھانا اتنا آسان نہیں تو چند بیویوں اور بچوں کی ذمہ داریوں کو نبھانا تو اور بھی مشکل کام ہے، لہٰذا اگر اس وادیٔ پرخار میں قدم رکھنا ہو تو ہزار مرتبہ سوچنا، بلا سوچے سمجھے کود مت پڑنا، ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

چند بیویوں کے درمیان
عملی سلوک میں برابری نہ کرنے پر وعید:

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے تعدّدِ ازواج کی پابندیاں اور اصولی ہدایات بیان کرنے کے علاوہ انسان کی کمزوری کے پیشِ نظر صاف طور پر فرما دیا:

﴿وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ (النساء: ۱۲۹)

ترجمہ: ’’یعنی تم اگر چاہو تب بھی تمام بیویوں کے درمیان مکمل (دلی طور پر) برابری رکھنا تمہارے بس میں نہیں، تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی طرف ڈھل جاؤ اور دوسری کو (ایسی حالت میں) چھوڑ دو کہ گویا وہ ہوا میں لٹک رہی ہو۔‘‘

یہ بہت ہی نازک معاملہ ہے، لیکن چوں کہ دلی تعلق اور لگاؤ میں برابری ممکن نہیں، اس لیے اس پر مواخذہ بھی نہیں، البتہ چند بیویوں کے درمیان عملی سلوک میں برابری ضروری ہے، اس میں اگر کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا تو یہ مواخذہ کا سبب ہے، مذکورہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا:

’’إِذَا كَانَتْ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ، فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ شِقُّهُ سَاقِطٌ.‘‘

مطلب یہ ہے کہ چند بیویوں کے مابین عدل وانصاف نہ کرنے والا قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کا ایک حصہ جھکا ہوا اور فالج زدہ کی طرح لٹکا ہوا ہوگا اور اس کی ذلت کا تماشا ہر کوئی دیکھ رہا ہوگا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

تعدّدِ ازواج کی اجازت
رحمت ہے، نہ کہ زحمت:

ان حقائق کے پیشِ نظر اگر کوئی باہمت و باکردار مردِ مجاہد شرعی پابندیوں کی رعایت کے ساتھ چند بیویاں رکھنا چاہتا ہے تو اخلاقی، سماجی اور معاشرتی ضرورت وحکمت کے تحت شرعاً وعقلاً اس کی اجازت ہے، عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ شرعاً چند پابندیوں کے ساتھ چند بیویوں کی اجازت کئی اعتبار سے انسانیت کے لیے رحمت ہے، نہ کہ زحمت۔

(۱) مثلاً ایک تو اس اعتبار سے کہ اس میں جوہرِ عفت وعصمت کی حفاظت ہے، وہ اس طرح کہ تندرست اور خوشحال مردوں کی جنسی خواہش کی تکمیل عموماً ایک ہی بیوی سے ہو جانا ضروری نہیں، ایامِ مخصوصہ اور استقرارِ حمل کے بعد ولادت بلکہ مدتِ رضاعت تک عموماً عورت کی بے رغبتی کے باعث صحت مند مردوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس قسم کے لوگ بہت جلد جنسی بے راہ روی اور زنا کاری کا شکار ہو جاتے ہیں، یا ہو سکتے ہیں، ان کی عزت وعفت کی حفاظت کا جائز راستہ چند بیویوں کی اجازت ہے۔

(۲) کبھی کسی خاص وجہ یا نااتفاقی کے سبب سے ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ شادی شدہ مرد کو کسی غیر منکوحہ، مطلقہ یا بیوہ سے تعلقِ خاطر (دلی اور جذباتی تعلق ولگاؤ) پیدا ہو جاتا ہے، اور دوسری جانب سے بھی اس کا مثبت ردِعمل ہوتا ہے، اب اگر اس تقاضہ کی تکمیل جائز طریقہ سے نہیں کی جاتی تو بعید نہیں کہ حرام اور ناجائز طریقہ سے یہ خواہش پوری

کی جائے، اور ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل کا حلال راستہ چند بیویوں کی اجازت ہے۔

(۳) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں میاں بیوی کے ساتھ رہنے کے باوجود عورت سے کوئی اولاد نہیں ہوتی، جب کہ اولاد کی خواہش ایک فطری چیز ہے جو مرد کے اندر بھی پائی جاتی ہے، عورت کے اندر بھی، اولاد کے بغیر گھر ایسا ہی ہے جیسے بغیر پھول کا باغ، ایسی صورت میں مرد نکاحِ ثانی کر کے (دوسری بیوی لا کر) گھر کی رونق میں اضافہ کر سکتا ہے، اور اولاد کے لیے ترستے ہوئے دونوں میاں بیوی اس دوسری بیوی کی اولاد سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں، اب اگر چند بیویوں کی گنجائش نہ ہوتو اس ویران گھر میں بہار کیسے آ سکتی ہے؟ چند بیویوں کی اجازت نہ دینے کی صورت میں دو ہی حالتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اسی بے کیفی اور بے رونقی کے ساتھ پوری زندگی گزار دی جائے، یا پھر اس گھر کو اُجاڑ کر نیا گھر بسایا جائے، تو کیا کوئی بھی ہوش مند عورت اپنا بسا بسایا گھر اُجاڑنے کے لیے تیار ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، لہٰذا ایسی صورت میں دوسری بیوی کی اجازت ہی عافیت والا راستہ ہو سکتا ہے۔

(۴) اسی سے ملتی جلتی حالت وہ ہوتی ہے جس میں عورت -العیاذ باللہ- کسی مضر یا مہلک بیماری میں مبتلا ہو اور اپنے شوہر کی جنسی طلب پوری کرنے سے عاجز ہو، یا پھر وہ بہت کمزور ہو، سال کے اکثر دِن بیمار رہتی ہو اور عام حالات میں شوہر کو خوش آمدید نہ کہہ سکتی ہو، تو کیا ان صورتوں میں وہ یہ پسند کرے گی کہ دونوں کی زندگی اسی طرح بے کیفی کے ساتھ گزرتی رہے؟ اور شوہر گھر میں رہے تو جھنجھلایا ہوا، باہر جائے تو جھنجھلایا ہوا، نہ وہ کسی سے سیدھے منہ بات کر پائے، نہ کسی سے خندہ پیشانی سے مل سکے، کیوں کہ اس طرح کے حالات میں عموماً جھنجھلاہٹ کی یہی کیفیت ہوا کرتی ہے، کیا کوئی غیرت مند عورت یہ پسند کرے گی کہ ایسے حالات میں اس کا شوہر چھپ چھپ کر آبرو باختہ اور بازاری عورتوں سے ناجائز تعلقات قائم کرے؟ اور محبت کی ساری گرمیاں باہر بانٹ کر گھر میں آئے اور جرم کا احساس لیے ہوئے سرد مہری کے ساتھ پوری زندگی گزار دے؟ یا پھر کیا وہ یہ پسند کرے گی کہ بیماری یا

کمزوری کی حالت میں شوہر اسے طلاق دے کر اس سے اپنا دامن چھڑا لے؟ اور اپنی پسند کے مطابق دوسری کے ساتھ اپنا گھر بسا لے؟ اور اس طرح اس کا شوہر اسے کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ دے؟ جب کہ وہ اس کی محبت وغم خواری اور مدد کی زیادہ محتاج ہے، ظاہر ہے کہ ان صورتوں میں عافیت وعقلمندی اسی میں ہے کہ پہلی بیوی اسی گھر میں جس طرح رہتی تھی رہے، اور اس کا شوہر نکاحِ ثانی کرے، ایک اور بیوی لے آئے جو اس کی جنسی ضرورت بھی پوری کرے اور گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں پہلی بیوی کی مدد کرے، تا کہ گھر میں صاف ستھرا خوشی کا اور پاکیزہ ماحول رہے، دونوں بیویاں بھی گھر میں عزت وآرام سے رہیں اور ان کا شوہر بھی اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن رہے، اور وہ اپنی جنسی تسکین کے لیے اس بات پر مجبور نہ ہو کہ اپنا دامن حرام کاری سے آلودہ کرے۔

(۵) یہ بات بھی ہمارے سامنے رہے کہ شرعی پابندی کے ساتھ چند بیویوں کو رکھنے کا قانونِ رحمت ایسا بابرکت ہے کہ اس کے سایہ میں بیواؤں اور طلاق شدہ عورتوں کو پناہ مل سکتی ہے، آج ہمارے ملک اور سماج میں کتنی بیوائیں اور مطلقہ عورتیں ہیں جو کس مپرسی کی زندگی گزار رہی ہیں، خواہ وہ ہندو سماج کی ہوں یا مسلم سماج کی، ہر ایک کی حالت انتہائی رحم کے قابل ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنی ہی عورتیں ہیں جو نہایت ذلت اور رسوائی کے ساتھ خون کے گھونٹ پی پی کر یا یوں کہیے کہ غم کی آگ میں سلگ سلگ کر زندگی گزارتی ہیں، اور کتنی ہی عورتیں ہیں جو حالات سے مجبور ہو کر خودکشی یا خودسوزی یا بدکاری پر اتر آتی ہیں، جس کی خبریں آئے دِن اخبارات میں آتی رہتی ہیں، جب کہ اس طرح کے کتنے ہی حادثات تو ایسے ہوتے ہیں جن کی دنیا کو خبر نہیں ہو پاتی، دنیا آج تک بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کے جنسی مسائل حل نہ کر سکی، وہ آج تک ان کے لیے کوئی باعزت شکل دریافت نہ کر سکی، لیکن الحمد للہ ان کے مسائل کا حل شرعی پابندیوں کے ساتھ چند بیویوں کی شکل میں اسلام نے پیش کر دیا ہے، لہٰذا ان کے لیے اگر کوئی باعزت راستہ ہے تو یہی ہے۔

(۶) پھر اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ عام طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کی شرحِ پیدائش (Rate of birth) میں تو کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا؛ لیکن شرحِ اموات (Rate of death) میں مردوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ اکثر حادثات میں مردوں کی موت زیادہ ہوتی ہے، پھر اگر جیلوں میں طویل مدت کے قیدیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی عام طور پر مردوں ہی کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، کیوں کہ طویل قید بڑے جرائم پر ہوتی ہے، اور اپنی نفسیاتی کمزوری کی بنا پر مجرم ذہن کی عورتیں بھی عموماً اپنے اندر بڑے جرائم کا حوصلہ نہیں پاتیں، ان اسباب کی بنا پر عام طور سے ایک مرد کے مقابلہ میں ایک سے زیادہ عورتوں کا تناسب پایا جاتا ہے، اس پس منظر میں اگر ایک مرد کو چند بیویوں کی اجازت نہ دی جائے تو ان عورتوں کا کیا بنے گا جنہیں کوئی شوہر میسر نہیں ہے؟ کیا خواتین کی ایک بڑی تعداد کو یوں ہی بے نکاح اور بے سہارا چھوڑ دیا جائے گا؟ تاکہ بالآخر وہ جنسی تسکین کا ناجائز راستہ اختیار کر کے خود بھی رسوا ہوں اور اپنے خاندان، سماج اور مذہب کو بھی رسوا کریں، ان عورتوں کی عزت وعصمت کو داغ دار ہونے سے بچانے کی اس سے بڑھ کر اور بہتر صورت کیا ہوسکتی ہے کہ جو لوگ ایک سے زائد عورتوں کی ذمہ داری نبھانے کی طاقت اور خواہش رکھتے ہوں وہ باہمت مردِ مجاہد آگے بڑھیں اور دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کریں، جیسا کہ نبوی اور مدنی سماج میں ہوتا تھا، اس موقع پر عورتوں کو بھی یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جب عورتوں کی شرحِ آبادی مجموعی طور پر مردوں سے زیادہ ہے تو وہ بحیثیت عورت اپنی ان بہنوں کے لیے قانونی طور پر رشتۂ نکاح میں منسلک ہونا پسند کریں گی یا یہ بات کہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف مردوں کی غیر قانونی بیویاں بنتی رہیں؟ اور ان حقوق وفوائد سے محروم رہیں جو ایک بیوی کو اپنے شوہر سے حاصل ہونے چاہئیں؟ اس لیے حقیقت یہی ہے کہ شرعی پابندیوں کے ساتھ چند بیویوں کی اجازت فطری، سماجی، معاشرتی، اخلاقی وعمرانی ضرورت ہے، اور بے شمار سماجی وخاندانی مسائل کا کامیاب اور فطری حل ہے، اور اپنے نتائج کے اعتبار سے خود عورتوں کے لیے بعض حالات میں باعثِ رحمت ہے، نہ کہ زحمت۔

تعدّدِ ازواج کی دشواریاں اور ان کا حل:

یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں شرعی پابندیوں کے ساتھ چند بیویوں کی اجازت کی حکمت، مصلحت اور ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن عملی طور پر اس کو اپنانا آسان نہیں، اس میں کچھ خطرات اور دشواریاں بھی ہیں، جو اس نظامِ فطرت کو اپنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، تو یاد رکھو کہ بلاشبہ اس میں کچھ خطرات ضرور ہیں؛ لیکن وہ ایسے نہیں ہیں کہ جن پر قابو نہ پایا جاسکتا ہو اور ان کا کوئی مناسب حل نہ ہو۔

(۱) اس سلسلہ کی سب سے بڑی رُکاوٹ جو بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے پہلی بیوی کی دل آزاری ہوتی ہے، پہلی بیوی دوسری کے لیے کبھی راضی نہیں ہوسکتی، اور پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری کو لانا یہ پہلی بیوی پر ظلم وزیادتی ہے، اس لیے کہ ’’پہلی پھول، دوسری دھول‘‘۔ حالاں کہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، جیسا کہ اب تک کے حقائق سے واضح ہوگیا، تاہم بہتر یہی ہے کہ اس پر عمل کرنے سے پہلے اپنی پہلی بیوی سے مشورہ کرلیا جائے، اسے پوری طرح آئندہ کے خدشات وخطرات کے بارے میں مطمئن کر کے اعتماد میں لیا جائے، جلد بازی سے کام نہ لیا جائے، ضرورت ہو تو خاندان کے دوسرے باوقار لوگوں کو بھی اس کام کے لیے ہم خیال کر کے مطمئن کیا جائے، خدانخواستہ ان ساری کوششوں کے باوجود بھی اگر بیوی راضی نہ ہو اور علیحدگی کے لیے تیار ہو جائے تو اس صورتِ حال میں شوہر کو چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پر پوری سنجیدگی کے ساتھ نظر ثانی کرلے، تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر یہ غور کرلے کہ اس کی مصلحت کس صورت میں ہے؟ نکاحِ ثانی کرنے میں یا موجودہ حالات پر صبر کرنے میں؟ پھر اچھی طرح غور وفکر کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نکاحِ ثانی واقعی اس کی شدید ضرورت اور مصلحت ہے تو اس وقت بلاشبہ شرعاً اس کو اجازت ہے، پھر اگر پہلی بیوی راضی ہو جاتی ہے تو ہر طرح سے اس کی دلجوئی اور حقوق کی مکمل ادائیگی ضروری ہے، لیکن اگر وہ ایسی صورت میں ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں ہے تو شریعت کی رو

سے اسے ساتھ رہنے پر مجبور کرنے کا شوہر کو کوئی حق نہیں ہے، پہلی بیوی کے مطالبہ کے مطابق اس کو نہایت عزت واحترام سے رخصت کر دے اور اس کے جو حقوق ہوتے ہیں پورے پورے ادا کر دے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شوہر اگر باکردار اور انصاف پسند ہے تو کوئی بھی سمجھدار بیوی ایسے شوہر کو چھوڑنا پسند نہیں کرے گی، وہ ہر صورت میں اسی کے سایۂ الفت و محبت میں جینا اور مرنا چاہے گی، اور اس کی خوشی میں اپنی خوشی محسوس کرے گی۔

(۲) اس سلسلہ کی دوسری دشواری یہ بیان کی جاتی ہے کہ اگر کسی شخص کی ایک سے زائد بیویاں ہوں اور ہر ایک سے اولاد ہو تو تمام بیویوں کے بچوں میں ہم آہنگی نہیں ہو سکتی، وہ آپس میں ایک دوسرے کے حریف اور ایک دوسرے کے مخالف ہوں گے، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ بات کہنے کو تو کہہ دی جاتی ہے؛ لیکن اس کی کوئی خاص بنیاد نہیں ہے، سچی بات یہ ہے کہ بچوں کی اچھی تربیت نہ ہو، اچھے جذبات اور پاکیزہ خیالات پر ان کی اٹھان نہ ہو تو ایک ہی ماں کے بچوں میں بھی خون خرابہ کی نوبت آجاتی ہے، اس کے واقعات سماج میں اتنے زیادہ ہیں کہ اسے ثابت کرنے یا مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، اس کے برعکس اگر گھر کا ماحول ایمانی ونورانی ہو، بچوں کی تعلیم وتربیت کا صاف ستھرا اور پاکیزہ نظام ہو، نیز گھر کے بڑوں میں بھی باہم الفت، محبت اور ایثار ہو، تمام کے ساتھ انصاف واخلاق کا معاملہ ہو تو ایسے گھرانے میں کئی ماؤں کی چھاتیوں سے دودھ پینے والے بھائی بہن آپس میں شیر وشکر ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے جان تک دے دیتے ہیں، لہٰذا اس کے لیے گھر کے ماحول کو سازگار اور خوشگوار بنانے کی ضرورت ہے، یہی اس کا صحیح حل ہے۔

(۳) اس راہ کی سب سے بڑی دشواری ماحول کی خرابی ہے، ظاہر ہے کہ اس کو دور کرنے کے لیے اس سلسلہ میں شریعت کی جو ہدایات اور حکمتیں ہیں انہیں سماج کے سامنے تحریری اور تقریری شکل میں واضح طور پر پیش کرنا ہوگا، نیز جو لوگ ایک سے زائد نکاح کو معیوب اور ناجائز سمجھتے ہیں انہیں اپنی اس جہالت وضلالت پر ہلاکت سے ڈرنا چاہیے، ارشادِ

باری ہے:

﴿ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ۝﴾ (محمد:۹)

ترجمہ: ’’ان کی یہ (ہلاکت) اس لیے ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکام سے ناخوش ہوئے تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔‘‘

ایک سے زائد نکاح کی من جانب اللہ اجازت سے ناراض ہونے والے سوچ لیں کہ کہیں اس عمل سے ان کے تمام اعمال ضائع نہ ہو جائیں۔ علامہ شامیؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ’’جو شخص کسی کو نکاحِ ثانی پر ملامت کرے اور نکاحِ ثانی (یا متعدد نکاح) کو برا سمجھے تو وہ کافر ہے۔‘‘ (یا اس کے کفر کا اندیشہ ہے)۔ (شامی:۴/۱۴۱)

بعض علماء نے فرمایا کہ: ﴿ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ﴾ (النساء:۳) سے **معلوم** ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں **اصل حکم** تو ایک سے زائد نکاح کا ہی ہے، ایک پر اکتفاء کا حکم بحالت مجبوری ہے، جس کی دلیل حضور ﷺ، اکثر صحابہؓ اور صلحاء کا عمل ہے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی شان کے منشا کو سمجھا اور ایک سے زائد نکاح کیے، اور ان حقائق پر پوری طرح عمل کر کے اس کا عملی ثبوت بھی پیش کیا، آج ضرورت ہے ان حقائق کو سماج کے سامنے لانے کی، ان شاء اللہ رفتہ رفتہ اس سے سماج کا بگڑا ہوا ذہن درست ہو جائے گا۔

حق تعالیٰ ہمارے سماج کو نبوی سماج کا نمونہ بنا دے۔ آمین۔

۱۸/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۷ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۲۴/ جون/ ۲۰۱۶ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۱۳)

قبولیتِ رمضان کی کسوٹی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "كَمۡ مِنۡ صَائِمٍ لَيۡسَ لَهٗ مِنۡ صِيَامِهٖ إِلَّا الظَّمَأُ، وَ كَمۡ مِنۡ قَائِمٍ لَيۡسَ لَهٗ مِنۡ قِيَامِهٖ إِلَّا السَّهَرُ."

(رواه الدارمی، مشکوٰۃ : ۱۷۷ / باب تنزیه الصوم / الفصل الثانی)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے روزے دار ایسے ہیں کہ ان کو روزے سے سوائے پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور بہت سے قیام کرنے والے ایسے ہیں کہ ان کو قیام سے سوائے بے خوابی (جاگنے) کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“ (مطلب یہ ہے کہ ان کا فرض اگرچہ ساقط ہوجاتا ہے، لیکن اجر وثواب نہیں ملتا)

قبولیتِ اعمال کی چار علامات:

اللہ رب العزت کے احکام پر عمل کی توفیق کا ملنا بڑی سعادت کی بات ہے، لیکن اس سے بڑی سعادت یہ ہے کہ جو عمل کیا ہے اسے اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت حاصل ہو

جائے، اب کس عمل کو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت ملی اور کس عمل کو نہیں؟ اسے جاننے اور پہچاننے کا کیا طریقہ ہے؟ تو ہمارے علماء نے کتاب وسنت کی روشنی میں قبولیتِ اعمال کی چار مختلف علامات بیان فرمائی ہیں:

پہلی علامت یہ ہے کہ وہ عمل شریعت اور سنت کے مطابق کیا جائے، یہ قبولیت عمل کی ظاہری کسوٹی ہے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ وہ عمل اخلاصِ نیت کے ساتھ کیا جائے، یہ قبولیت عمل کی باطنی کسوٹی ہے۔

تیسری علامت یہ ہے کہ اس عمل کے وقت انسان کو کیفیتِ احسان حاصل ہو جائے، جس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ "أَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ" یعنی بندہ اس تصور کے ساتھ عبادت وعمل کو انجام دے کہ میں اللہ کے سامنے ہوں، لیکن اگر کیفیت احسان کا یہ اعلیٰ اور نبیوں والا درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم اتنا یقین تو ضرور ہونا چاہیے کہ "فَإِنۡ لَمۡ تَكُنۡ تَرَاهُ، فَإِنَّهٗ يَرَاكَ" (متفق علیه، مشکوٰۃ: ۱۱) اللہ تعالیٰ اس کی عبادت اور عمل کو خوب اچھی طرح دیکھ رہا ہے، یہ ولیوں والا درجہ ہے، اس یقین اور تصور کے ساتھ جو عمل کیا جاتا ہے اس کی کیفیت و لذّت کچھ اور ہی ہوتی ہے، وہ عمل ضرور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتا ہے۔

چوتھی علامت یہ ہے کہ اس عمل پر مداومت اور استقامت حاصل ہو جائے، تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عمل کی مقبولیت کی علامت ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنۡ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهَا قَالَتۡ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَحَبُّ الۡأَعۡمَالِ إِلَی اللّٰهِ أَدۡوَمُهَا، وَ إِنۡ قَلَّ." (متفق علیه، مشکوٰۃ: ۱۱۰ / باب القصد فی العمل)

ترجمہ: ”اللہ رب العزت کے یہاں سب سے محبوب اور مقبول عمل وہ ہے جو پابندی کے ساتھ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔“

خلاصہ یہ ہے کہ کسی بھی عمل کو اخلاصِ نیت، اتباعِ سنت اور احسانی کیفیت کے ساتھ ادا کرنے کے بعد دوبارہ اس عمل کی توفیق مل جائے تو یہ اس کے عنداللہ قبولیت کی علامت ہے، اور یہ قبولیتِ اعمال کی بہت بنیادی کسوٹی ہے، اس سے دیگر اعمال کی قبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رمضانی مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ:

اسی لیے اعمالِ رمضان کی قبولیت کے متعلق ہمارے بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اگر یہ دیکھنا ہو کہ کسی کی رمضان المبارک کی عبادات و اعمال قبول ہوئے یا نہیں؟ تو اس کے رمضان کے بعد والے اعمال دیکھ لو، اگر رمضان کے بعد بھی نیک اعمال و احکام پر اس کی پابندی و استقامت اسی طرح باقی ہے جیسے ماہِ رمضان میں تھی تو سمجھ لو کہ اللہ رب العزت نے اس کے رمضان کے اعمال قبول فرمالیے، جس کی وجہ سے اسے ان اعمال و احکام کو تسلسل کے ساتھ باقی رکھنے کی توفیق عطا فرمائی، اگر اس کا رمضان میں مسجد میں آنا، عبادت کرنا اور احکام پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آتا تو رمضان کے بعد اسے مسجد میں آنے، عبادت کرنے اور احکام پر عمل کرنے کی توفیق نہ دیتا، اس کے برخلاف اگر رمضان کے بعد کسی کے احکام پر عمل کرنے میں یک لخت فرق آجائے کہ پہلے مسجد سے آتا نہیں تھا، اب جاتا نہیں ہے، اور جن فرض عبادات کا اہتمام پہلے کرتا تھا، اب اس میں فرق آگیا، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی رمضان والی عبادات و اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول نہیں ہیں، ایسے لوگ رمضانی مسلمان ہیں، رحمانی نہیں، ان کا شمار ایسے لوگوں میں ہے جن کے متعلق مذکورہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ إِلَّا الظَّمَأُ، وَ كَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ قِيَامِهٖ إِلَّا السَّهَرُ."

(رواه الدارمي، مشكوٰة : ۱۷۷ / باب تنزيه الصوم / الفصل الثاني)

ترجمہ: "کتنے ہی ایسے روزہ دار ہیں جن کے نصیب میں سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ اجر نہیں، اور کتنے ہی رات میں (تراویح و تہجد میں) قیام کرنے والے ہیں جن کے نصیب میں سوائے رات کو جاگنے کے کچھ اجر و ثواب نہیں ہے۔" العیاذ باللہ العظیم۔

کیوں کہ ان کا صیام و قیام اور دیگر اعمال اخلاصِ نیت یا اتباعِ سنت و شریعت اور احسانی کیفیت سے خالی ہیں۔

اہتمامِ اعمال کے متعلق حضور ﷺ کی نصیحت:

علاوہ ازیں اس طرح کے لوگ عموماً صرف رمضان ہی میں عبادات و اعمال کا اہتمام کرتے ہیں اور رمضان کے بعد اسے ترک کر دیتے ہیں، تو یہ عمل میں استقامت کا نہ ہونا بھی اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو اور اس کے احکام کو رمضان ہی میں پہچانا اور ان کے دلوں میں رمضان کی عظمت ہے، رحمٰن کی نہیں، اس لیے ان کی عبادتیں رمضان تک محدود ہوتی ہیں، ان رمضانی مسلمانوں کے متعلق سخت اندیشہ و خطرہ ہے کہ ان کا رمضان قبول نہ ہوا ہو، کیوں کہ قبولیت رمضان کی بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ اعمال کا اہتمام و تسلسل رمضان کے بعد بھی جاری رہے، اور اگر ایسا نہیں تو عدمِ قبولیت کا سخت اندیشہ ہے، اور عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے متعلق ایک موقع پر رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کو اہتمامِ اعمال کی ترغیب دیتے ہوئے یہ نصیحت فرمائی تھی:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَا عَبْدَاللّٰهِ! لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ، كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ، فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ." (متفق عليه، مشكوٰة : ۱۰۹)

ترجمہ: "اے عبداللہ! تم فلاں کی طرح نہ ہو جانا کہ وہ رات کا قیام کرتا تھا، مگر پھر اس نے ترک کر دیا۔" (اس کا اہتمام چھوڑ دیا)۔

کیوں کہ یہ بات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ صرف رمضان میں احکام پر عمل کرتے ہیں، اور اس کے بعد نماز، جماعت، تلاوت اور عبادات کا رمضان کی طرح اہتمام نہیں کرتے؛ بلکہ رمضان کے بعد نوافل تو دور کی بات ہے فرائض تک کا خیال نہیں کرتے تو ان کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، یہ رمضانی مسلمان ہیں جو صرف رمضان ہی میں بندگی کرتے ہیں، اگر رحمانی مسلمان ہوتے تو ﴿وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝﴾ (الحجر:۹۹) کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے رمضان کے بعد بھی بندگی کا تسلسل موت تک جاری رہتا، اس کے لیے تین چیزوں کا اہتمام والتزام ضروری ہے: (۱) ہدایت والے اعمال و احکام پر استقامت کے لیے دعا کی جائے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝﴾ (آل عمران:۸)

ترجمہ: ”اے ہمارے رب! تو نے ہمیں جو ہدایت عطا فرمائی ہے اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی پیدا نہ ہونے دے اور خاص اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما، بے شک تیری اور صرف تیری ذات وہ ہے جو بخشش کی خوگر ہے۔“

(۲) فرائض کا اہتمام کیا جائے، اس سے دیگر نوافل اور نیکیوں کی توفیق ہوگی۔ لیکن ان دونوں اعمال کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے تیسرا عمل: (۳) صحبت صالحین کا التزام کیا جائے۔ ان شاء اللہ، ان تین چیزوں کی برکت سے رمضان کے بعد بھی عبادات کا تسلسل باقی رہے گا۔

عبادالرحمٰن کی پہچان:

واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ رحمانی مسلمان ہیں یعنی جن کے دلوں میں صرف رمضان ہی کی نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تمام احکام کی عظمت ہے تو رمضان کے بعد بھی ان کے معمولات میں کوئی خاص فرق نہیں آتا، بلکہ وہ اپنی استقامت سے یہ ثابت

کرتے ہیں کہ رمضان ختم ہوا ہے، رحمانی مسلمان ختم نہیں ہوا، قرآنِ پاک نے عبادالرحمٰن کی جو پہچان بیان فرمائی اس میں ایک یہ بھی ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ۝﴾ (الفرقان: ٦٤)

ترجمہ: ”وہ اس طرح رات گزارتے ہیں کہ اپنے رب کی عبادت میں لگے رہتے ہیں، کبھی سجدے میں تو کبھی قیام میں۔“ (اور کبھی دعامیں)۔

یعنی ان کا ذوقِ عبادت انہیں دِن رات زیادہ آرام نہیں کرنے دیتا، اور ان کی اطاعت وعبادت وقتی اور رمضانی نہیں، دائمی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہی اطاعت و عبادت پسند ہے جو استقامت اور مداومت کے ساتھ ہو۔

تین بہترین سوال:

منقول ہے کہ ایک مرتبہ رئیس المفسرین سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے تین سوال کیے، پہلا یہ کہ سب سے بہترین دِن کونسا ہے؟ دوسرا یہ کہ سب سے بہترین مہینہ کونسا ہے؟ اور تیسرا یہ کہ سب سے بہترین عمل کونسا ہے؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ بہترین دِن جمعہ کا ہے، بہترین مہینہ رمضان کا ہے، اور بہترین عمل پانچوں نمازوں کو ان کے اوقات میں پڑھنا ہے۔ حضرت علیؓ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو فرمایا کہ اگر مشرق سے لے کر مغرب تک کے علماء، فقہاء اور عقلاء سے پوچھا جاتا تو ایسا جواب نہ دے سکتے جو حضرت ابن عباسؓ نے دیا، البتہ میں اتنی بات ضرور کہتا ہوں کہ میرے نزدیک بہترین دِن وہ ہے جس دِن کلمہ کی حالت میں موت آجائے، اور بہترین مہینہ وہ ہے جس میں گنہگار اپنے سارے گناہوں سے سچی پکی توبہ کرلے، اور بہترین عمل وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت حاصل ہوجائے۔ (مستفاد از: ”کتابوں کی لائبریری میں“/ص:۱۳۷)

اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ عمل قبول ہوتا ہے جس میں اخلاصِ نیت، اتباعِ سنت، احسانی کیفیت اور استقامت ہو، اور جو عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں

قبول ہو جائے تو نجاتِ دارین کے لیے ان شاء اللہ ایسا ایک عمل بھی کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری بندگیوں اور زندگیوں کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمادے۔آمین یارب العالمین۔

۷/شوال المکرّم/۱۴۳۵ھ/قبل الجمعہ

مطابق:۲۴/ جولائی/۲۰۱۵ء(بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَإِنَّکَ أَنْتَ أَھْلُ التَّقْوٰی وَ أَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ

(۱۴)

صاحبِ کوثر صلی اللہ علیہ وسلم
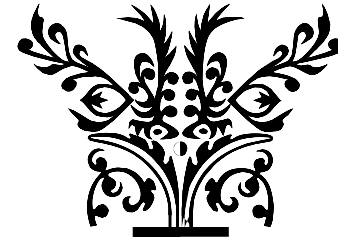
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:" بَیْنَا أَنَا أَسِیْرُ فِی الْجَنَّۃِ، إِذَا أَنَا بِنَھْرٍ حَافَتَاہُ قِبَابُ الدُّرِّ الْمُجَوَّفِ، قُلْتُ:" مَا ھٰذَا یَا جِبْرِیْلُ؟" قَالَ:" ھٰذَا الْکَوْثَرُ الَّذِیْ أَعْطَاکَ رَبُّکَ، فَإِذَا طِیْنُہٗ مِسْکٌ أَذْفَرُ."

(رواہ البخاری، مشکوٰۃ:۴۸۷ / باب الحوض و الشفاعۃ / الفصل الأول)

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ (شب معراج کے موقع پر جس وقت) میں سیر کر رہا تھا تو اچانک میری نظر ایک نہر پر پڑی، جس کے دونوں کناروں پر کھوکھلے موتیوں کے گنبد تھے، میں نے اس کے متعلق جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ کوثر ہے، جو رب العالمین نے آپ کو عطا فرمائی ہے، میں نے دیکھا کہ اس کی مٹی خالص مشک کی تھی۔''

نعتِ پاک

رحمت نے پکارا خود پڑھ کر — إِنَّـآ أَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ○
پھر کیوں نہ پڑھیں ہم بھی اکثر — إِنَّـآ أَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ○
مہمان کیا خود اللہ نے اُنہیں — کیا کیا نہ دیا اللہ نے اُنہیں
رحمت کا لقب، سدرہ کا سفر — إِنَّـآ أَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ○
قرآن میں رب نے محمد کا — بڑا ذکر کیا، سبحان اللہ
تعریف نبی کی بالاتر — إِنَّـآ أَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ○
ہے نامِ محمد قرآن میں — مومن کی اذاں میں، ایماں میں
ہے یہی اس کو رب کا اثر — إِنَّـآ أَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ○
کیا حور و ملک جن و بشر — دیتے ہیں سلامی روضے پر
پڑھتے ہیں سبھی شام و سحر — إِنَّـآ أَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ○
یہ بزمِ نبی کی تنویریں — سب "الکوثر" کی تفسیریں
عثمانؓ و علیؓ، بو بکرؓ و عمرؓ — إِنَّـآ أَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ○
کیوں دیکھیں نہ شافع محشر کو — کیوں چاہیں نہ ساقی کوثر کو
ہے آیت قرآں پیش نظر — إِنَّـآ أَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ○
جنہیں رب نے بنایا جی بھر کر — جنہیں خیر کثیر عطا کر کے
کر ڈالا زمانے کو ششدر — إِنَّـآ أَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ○

114

نعت پاک

زلفِ سرکار سے جب چہرہ نکلتا ہوگا — پھر بھلا کیسے کوئی چاند کو تکتا ہوگا؟
اے حلیمہ! یہ بتا تو نے تو دیکھا ہوگا — کیسے تجھ سے میرا محبوب لپٹا ہوگا؟
قابل رشک ہے صدیق! وہ تیرا آنسو — غار میں آپ ﷺ کے رُخ پر جو ٹپکتا ہوگا
کتنی خوش بخت ہیں وہ گلیاں یارو! — جب بن ٹھن کے میرا محبوب نکلتا ہوگا
جب کبھی آپ ﷺ اندھیرے میں نکلتے ہوں گے — شب تاریک میں خورشید بھی چمکتا ہوگا
مجھ کو معلوم ہے طیبہ سے جدائی کا اثر — کہ شام کو شمس بھی روتے ہوئے ڈھلتا ہوگا

تمہید:

اللہ رب العزت نے اپنی تمام مخلوق میں سب سے بڑا مرتبہ ومقام حضرت انسان کو عطا فرمایا ہے، یہ حقیقت ہے کہ دنیا کا انسان انسانی صفات اختیار کر کے صحیح معنیٰ میں انسان بن جائے تو پھر اس سے بہتر کوئی مخلوق نہیں ہوسکتی، حق تعالیٰ نے بطورِ نمونہ ہمارے آقا ﷺ کو انسانِ کامل بنانے کے لیے آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات میں تمام انسانی کمالات کو کامل اور مکمل طور پر جمع فرما دیا، اس لیے بھی آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سب سے افضل اور ساری مخلوق کے محبوب ہیں، حتیٰ کہ ابتداءً جہلاءِ عرب بھی آپ ﷺ کے ساتھ بہت ہی زیادہ محبت اور عزت کا معاملہ کرتے تھے، آپ ﷺ کے کمالات کے معترف تھے، آپ ﷺ کو الصادق الامین کہتے تھے، اپنے نزاع اور جھگڑوں کا متفق علیہ فیصل تسلیم کرتے تھے، تو یہ آپ ﷺ کے انسانی کمالات، اعلیٰ اوصاف اور اخلاق کی وجہ سے تھا، لیکن اعلانِ نبوت کے بعد جوں ہی ہمارے آقا ﷺ نے توحید و رسالت کی دعوت دی، قیامت و آخرت کا تصوّر دیا اور کفر و شرک کی مکمل تردید فرمائی، تو شقی اور بدبخت لوگ آپ ﷺ کے تمام کمالات کو ایک دم نظر انداز کر کے مخالفت پر اُتر آئے۔ نبوت سے پہلے

آپ ﷺ کے انسانی کمالات، اعلیٰ اوصاف اور عمدہ اخلاق وصفات کی وجہ سے جو مرتبہ و مقام آپ ﷺ کا جہلاءِ عرب کے یہاں تھا جہالت اور ضد کی وجہ سے وہ ختم ہوگیا، رفتہ رفتہ جہلاءِ عرب کی جہالت، ضد اور شقاوت میں اضافہ ہوتا گیا، آپ ﷺ کی مخالفت وعداوت بڑھتی گئی، آپ ﷺ کو حزن وغم اور تکلیف والم پہنچانے کا کوئی موقع چھوڑا نہ جاتا، من جملہ ان میں ایک موقع وہ تھا جب آپ ﷺ کی اولادِ نرینہ یکے بعد دیگرے فوت ہوگئی۔

آقا ﷺ کی اولاد:

اس موقع پر حصولِ برکت کے لیے ہمارے آقا ﷺ کی اولاد سے متعلق تشریح کی جاتی ہے۔ آقا ﷺ کی اولاد میں فرزندانِ نرینہ تین اور دخترانِ طاہرہ چار ہیں، ان میں صرف حضرت ابراہیمؓ سیدہ ماریہ قبطیہؓ کے بطن مبارک سے ۴/ ذوالحجہ ۸ھ کو مدینہ طیبہ میں پیدا ہوئے، اس وقت حضور ﷺ کی عمر مبارک تقریباً ۶۰ سال تھی، حضرت ابراہیمؓ سولہ مہینے کی عمر میں ماہِ ربیع الاول ۱۰ھ میں انتقال فرماگئے، آپؓ حضور ﷺ کی آخری اولاد ہیں۔ (فضائل اعمال:۱۴۴)

اور ان کے علاوہ تمام اولاد سیدہ خدیجہؓ سے مکہ مکرّمہ میں پیدا ہوئی، جن میں سب سے پہلے حضرت قاسمؓ ہیں، جو دو سال کی عمر میں وفات پا گئے، آپؓ ہی کے نام پر ہمارے آقا ﷺ کی کنیت ''ابوالقاسم'' ہے۔

احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ کوئی شخص اپنے لیے حضور ﷺ کے نام اور کنیت کو جمع کر کے ''ابوالقاسم محمد'' نہ کہلائے۔ بعض علماء نے اس نہی کو زمانۂ نبوی کے ساتھ مختص قرار دیا ہے۔ (رحمۃ للعالمین:۲/۱۱۳)

حضرت قاسمؓ کے بعد سیدہ زینبؓ، جو حضرت قاسمؓ سے چھوٹی اور آقا ﷺ کی دیگر اولاد میں سب سے بڑی ہیں، نکاح کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں، جب سیدہ زینبؓ پیدا

ہوئیں تو اس وقت آقا ﷺ کی عمر مبارک ۳۰ سال تھی، سیدہ زینبؓ اپنی والدہ کے ساتھ ہی اسلام میں داخل ہوگئی تھیں، ان کا نکاح خالہ زاد بھائی حضرت ابوالعاصؓ بن ربیع سے ہوا، جو بعد میں مسلمان ہوئے، سیدہ زینبؓ نے ذوالحجہ ۱۲ھ کو مدینہ میں وفات پائی، سیدہ زینبؓ سے ایک فرزند ''علیؓ'' اور ایک دختر ''اُمامہ'' نامی پیدا ہوئے تھے، علیؓ کی وفات ۸ھ کو مدینہ طیبہ میں ہوئی، سیدہ زینبؓ کے بعد ان سے چھوٹی سیدہ رُقیہؓ ہیں، جو حضور ﷺ کی ۳۳ سال کی عمر مبارک میں پیدا ہوئیں، ان کا نکاح مکہ مکرّمہ ہی میں سیدنا عثمان بن عفانؓ سے ہوا تھا، اس وقت یہ بات مکہ بھر میں مشہور تھی:

''أَحْسَنُ زَوْجَيْنِ رَاٰهُمَا إِنْسَانُ ... رُقَيَّةُ وَ زَوْجُهَا عُثْمَانُ''

کسی بھی انسان نے اگر سب سے اچھا کوئی جوڑا دیکھا ہے تو وہ سیدہ رُقیہؓ اور ان کے شوہر سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ ہیں۔ حضرت لوط اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کی ہے، ان سے ایک فرزند عبداللہ پیدا ہوئے، جو چھ سال کی عمر میں انتقال فرماگئے، سیدہ رُقیہؓ کو ۲ھ میں چیچک نکلی، حضورِ اکرم ﷺ جس وقت جنگ بدر کے لیے تشریف لے جارہے تھے اس وقت سیدہ رُقیہؓ صاحب فراش تھیں، حضور ﷺ نے ان کی تیمارداری کے لیے سیدنا عثمان غنی اور حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو مدینہ طیبہ میں چھوڑا تھا، بالآخر اسی مرض میں ۲ھ بعمر اکیس (۲۱) سال ان کی وفات ہوئی، ان کے شوہر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہٗ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہٗ کی شہادت کے بعد ۲۴ھ میں امیر المومنین ہوئے، اور مصر وغیرہ کے نومسلم باغی قبائل کے ہاتھوں ۱۷/ ذوالحجہ ۳۵ھ یوم جمعہ کو اپنے ہی گھر مدینہ طیبہ میں بعمر ۷۸ سال شہید ہوئے۔
(ایضا:۲/۱۲۵)

سیدہ رُقیہؓ کے بعد ان سے چھوٹی سیدہ اُم کلثومؓ ہیں، سیدہ رُقیہؓ کی وفات کے بعد سیدہ اُمِ کلثومؓ کا نکاح بھی ۳ھ میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ سے ہوا، اسی لیے آپؓ کو ''ذوالنورین'' کا خطاب ملا، سیدہ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، ماہِ شعبان

۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (ایضا:۲/ ۱۲۸)

آقا ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحب زادی سیدہ فاطمہؓ ہیں، نبوت کے ایک سال بعد جب آقا ﷺ کی عمر مبارک اکتالیس (۴۱) سال تھی تب پیدا ہوئیں، ان کا نکاح سیدنا علی رضی اللہ عنہ، کے ساتھ ماہِ محرم یا صفر یا رجب یا رمضان ۲ھ میں غزوۂ بدر کے بعد اُحد سے پہلے ہوا، نکاح کے سات ماہ اور پندرہ دِن بعد رُخصتی ہوئی، نکاح کے وقت سیدہ فاطمہؓ کی عمر پندرہ سال اور پانچ ماہ تھی، اور حضرت علیؓ کی عمر اکیس سال اور پانچ ماہ تھی، حضور ﷺ کو صاحب زادیوں میں سب سے زیادہ محبت ان ہی سے تھی، جب آپ ﷺ سفر میں تشریف لے جاتے تو سب سے اخیر میں ان سے رُخصت ہوتے، اور جب سفر سے واپس آتے تو مسجد میں جا کر دو رکعات نماز پڑھنے کے بعد سب سے پہلے ان ہی سے ملتے، پھر اپنے گھر رونق افروز ہوتے۔ حضرت فاطمہؓ جب حضور ﷺ کے گھر تشریف لاتیں تو آپ ﷺ خود آگے بڑھتے، پیشانی کو بوسہ دیتے، مرحبا فرماتے، اور جب حضور ﷺ حضرت فاطمہؓ کے گھر ملنے جاتے تو وہ بھی اسی طرح ملا کرتی تھیں، حضرت فاطمہؓ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حضور ﷺ کی اولاد کا سلسلہ ان ہی سے چلتا رہا اور ان شاء اللہ قیامت تک چلتا رہے گا، حضرت فاطمہؓ کی کل چھ اولاد ہوئی، جن میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، سب سے اوّل حضرت حسنؓ، جو نکاح کے دوسرے سال پیدا ہوئے، حضرت حسنؓ کے پندرہ لڑکے اور آٹھ لڑکیاں تھیں اور حضرت حسینؓ کے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔

(فضائل اعمال:۱۴۷)

پھر حضرت حسینؓ اور تیسرے حضرت محسنؓ، جن کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا۔

بیٹیوں میں حضرت اُم کلثومؓ جن کا نکاح حضرت عمرؓ سے چالیس ہزار درہم مہر کے عوض ہوا ان سے ایک بیٹا زید اور بیٹی رُقیہؓ پیدا ہوئے، حضرت عمرؓ کے بعد ان کا نکاحِ ثانی عون بن جعفر طیار سے ہوا، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی

محمد بن جعفر سے ہوا، ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جو بچپن میں انتقال کر گئیں، ان کے انتقال کے بعد ان کے تیسرے بھائی عبداللہ بن جعفر سے نکاح ہوا، ان سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی، ان ہی کے نکاح میں ام کلثوم کا انتقال ہوا۔

سیدہ فاطمہؓ کی دوسری بیٹی حضرت زینب ہیں، جن کا نکاح عبداللہ بن جعفر سے ہوا، دو صاحب زادے عدی اور عون پیدا ہوئے، یہ میدانِ کربلا میں اپنے بھائی حضرت حسینؓ کے ہمراہ تھیں۔

سیدہ فاطمہؓ کی تیسری بیٹی رُقیہ تھیں، جن کا بچپن میں انتقال ہوگیا۔

حضور ﷺ کے وصال کے چھ ماہ بعد سیدہ فاطمہؓ بیمار ہوئیں، پھر بروزِ منگل/۳/ رمضان المبارک ۱۱ھ کو تقریباً بیس یا اکیس سال کی عمر میں انتقال ہوا، نمازِ جنازہ حضرت عباسؓ یا حضرت علیؓ نے پڑھائی اور بقیع میں مدفون ہوئیں، حضرت علیؓ نے ان کی زندگی میں کوئی نکاح نہیں کیا، ان کے وِصال کے بعد ان کی بھانجی حضرت اُمامہ سے نکاح کیا۔

(مستفاد از: رحمۃ للعالمین:۲/ ۱۲۹، فضائل اعمال:۱۴۷)

سورۃ الکوثر کا شانِ نزول:

الغرض! آقا ﷺ کی اولاد میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں، ان میں سب سے بڑے حضرت قاسمؓ، ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ، ان ہی کا لقب ''طاہر وطیب'' بھی ہے، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ کے بقول ان کا لقب ''طیب'' حضور ﷺ کی جانب سے تھا اور ''طاہر'' سیدہ خدیجہؓ کی جانب سے تھا، مکہ مکرّمہ میں نبوت کے بعد پیدا ہوئے۔ (رحمۃ للعالمین:۲/۱۱۳)

پھر علی الترتیب تین صاحب زادیاں اور اخیر میں حضرت ابراہیمؓ ہیں، جن تمام کا اجمالی تذکرہ گزر چکا، ان میں پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوگیا، پھر حضرت عبداللہؓ نے بھی

بچپن ہی میں وفات پائی، تو ایک کے بعد دوسرے بیٹے کی وفات سے فطری طور پر آپ ﷺ حزین و غمگین ہوئے، اب اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں اور قصبہ کے لوگوں کی طرف سے تعزیت اور اظہارِ ہمدردی کے بجائے خوشیاں منائی جانے لگیں، طعنے دیے جانے لگے، آپ ﷺ کا حقیقی چچا ابولہب -جس کا گھر حضور ﷺ کے گھر سے متصل تھا- دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور خوش خبری کے انداز میں کہنے لگا: "بُتِرَ مُحَمَّدٌ اللَّيْلَةَ" آج رات محمد لاولد ہوگئے، یا ان کی جڑ کٹ گئی۔ (العیاذ باللّٰہ العظیم)

(انوار القرآن: ۱۲/ ۷۳۹، از مولانا محمد نعیم دیوبندیؒ)

مشرکین مکہ کے سرداروں میں عاص بن وائل سہمی بھی اس واقعہ کے بعد جب آپ ﷺ کا تذکرہ ہوتا تو کہا کرتا تھا:

" إِنَّ مُحَمَّدًا أَبْتَرُ، لَا ابْنَ لَهُ يَقُوْمُ مَقَامَهُ بَعْدَهُ، فَإِذَا مَاتَ انْقَطَعَ ذِكْرُهُ."

اجی محمد کا ذکر چھوڑو، وہ تو ابتر ہیں، ان کی کوئی نرینہ اولاد تو ہے نہیں، اس لیے موت کے بعد ان کا نام و نشان مٹ جائے گا، مرجائیں گے تو کوئی نام لیوا بھی نہ ہوگا، یہ وہ دل شکن حالات تھے جن میں سورۂ کوثر نازل ہوئی۔

(مستفاد از: انوار البیان: ۵/ ۷۰۱، انوار القرآن: ۱۲/ ۷۳۹، گلدستۂ تفاسیر: ۷/ ۲۴)

﴿إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝﴾

حق تعالیٰ نے تعزیت اور اظہارِ ہمدردی بلکہ اس غمی کے بعد خوش خبری سنانے کے لیے رحمت عالم ﷺ پر ایک مختصر سورت نازل فرمائی، جس کی پہلی ہی آیت میں وہ بشارت سنائی جس سے بڑی بشارت دنیا کے کسی انسان کو کسی نے کبھی نہیں سنائی، فرمایا: ﴿إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝﴾ محبوبم! یہ آپ کو طعنہ دیتے ہیں نا، آپ غم زدہ مت ہوئیے، آپ کے رب کی تسلی کافی ہے، یہ نرینہ اولاد کی نعمت سے محرومی کی بات کرتے ہیں، تو آپ کے رب نے اس کے عوض دارین کی سب سے بڑی نعمت یعنی کوثر آپ کو عطا فرمائی، "کوثر" ایک جامع اور وسیع

المعنیٰ لفظ ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کے صحیح، حقیقی اور متعین مفہوم کو بیان کرنے سے دنیا کی تمام زبانیں عاجز ہیں، کیوں کہ لغوی اعتبار سے "کوثر" کے معنیٰ بہتی چیز کے ہیں، اور یہ لفظ "کثرت" سے مشتق ہے، اس لیے حضرت ابن عباسؓ کے بقول "کوثر" کا مطلب "خیر کثیر" ہے، یعنی وہ بہت زیادہ بھلائی اور بہتری جو اللہ رب العزت نے خصوصیت سے آپ ﷺ کو عطا فرمائی ہے، اسی کا ایک حصہ "نہر کوثر" بھی ہے، جس کا تذکرہ مذکورہ حدیث میں ہے۔ (مستفاد از: تفسیر عزیزی: ۶۲۰، گلدستۂ تفاسیر: ۷/ ۲۷۰، انوار البیان: ۵/ ۶۹۸)

بقولِ عاشق رسول ﷺ:

ذات ہے ان کی سب سے مطہر ﴿إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝﴾
اللہ، اللہ، شانِ معظم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

"خیر کثیر" کی تفسیر:

اب سوال یہ ہے کہ ﴿إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝﴾ میں جس خیر کثیر کے عطا فرمانے کا ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے؟ علماءِ مفسرین نے "خیر کثیر" کی تفسیر میں مختلف نعمتوں کو بیان کیا ہے، "البحر المحیط" میں چھبیس اقوال "خیر کثیر" کے معنیٰ کے متعلق ذکر کیے گئے ہیں، اور اخیر میں اس کو ترجیح دی گئی ہے کہ اس میں ہر طرح کی دینی، دنیوی اور اُخروی نعمتیں داخل ہیں۔ (گلدستۂ تفاسیر: ۷/ ۲۷۰)

جہاں تک دینی اور دنیوی نعمتوں کی بات ہے تو ان میں (۱) عطاءِ نبوت بہت بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ساری انسانیت کے لیے نبی بنا کر اعلان کرادیا:

﴿ قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (الأعراف: ١٥٨)

کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

(۲) پھر کتابِ ہدایت، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ﴾ (النساء : ۱۱۳)

اوراللہ نے آپ پر کتاب وحکمت نازل فرمائی۔

(۳) پھر علم، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ﴾

اورآپ کوان باتوں کا علم دیا جوآپ جانتے نہیں تھے۔

(۴) ربِ کریم کا فضل عظیم:

﴿ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ ﴾

آپ پر اللہ کا فضل ہمیشہ سے رہا ہے۔ اور یہ آپ ﷺ پر ربِ کریم کا فضل عظیم نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ کی حقیقی اور صلبی اولادِ نرینہ میں بیٹے قاسمؓ، عبداللہؓ اور ابراہیمؓ کو تو بچپن ہی میں لے لیا، مگر روحانی اولاد تا قیامت امتِ مسلمہ کی شکل میں اتنی کثرت سے عطا فرمادی کہ دیگر تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام کو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ملا۔ پھر یہ تو دینی ودنیوی عظیم نعمتوں کا محض اجمالی تذکرہ ہے، جن کی بشارت سورۂ کوثر میں دی گئی۔

رہی بات اُخروی نعمتوں کی، تو ان میں (۵) مقامِ محمود آپ ﷺ کو عطا ہوا ہے، قیامت کے دِن رب العالمین کے عرش کی دائیں جانب رحمۃ للعالمین ﷺ کے لیے وہ خاص مقام ہے جسے مقامِ محمود کہا جاتا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ عَسٰٓى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ (الإسراء : ۹۷)

اُمید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائے۔ آپ ﷺ کے اس مقام پر تمام اگلے پچھلے رشک کریں گے۔ (مشکوٰۃ، ازمظاہرِ حق جدید: ۵/۱۶۹)

(۶) شفاعتِ کبریٰ: سب سے پہلی شفاعت جو ساری انسانیت کے لیے آپ ﷺ فرمائیں گے، اس کے بعد ہی حساب کتاب شروع ہوگا، یہ مقام بھی آپ ﷺ کے علاوہ کسی کو نہیں ملا۔ بخاری شریف کی روایت ہے:

عَنْ آدَمَ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَقُوْلُ: "إِنَّ النَّاسَ يَصِيْرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ جُثًا، كُلُّ أُمَّةٍ تَتْبَعُ نَبِيَّهَا، يَقُوْلُوْنَ: "يَا فُلَانُ اشْفَعْ"، حَتّٰى تَنْتَهِيَ الشَّفَاعَةُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَذٰلِكَ يَوْمَ يَبْعَثُهُ اللّٰهُ الْمَقَامَ الْمَحْمُوْدَ."

(صحيح البخاری/كتاب التفسير/سورة بنی إسرائيل)

''حضرت آدم بن علیؒ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''قیامت کے دِن لوگ گھٹنوں کے بل ہوں گے، ہر قوم اپنے نبی کو تلاش کر رہی ہوگی، لوگ کہہ رہے ہوں گے ''اے فلاں! ہماری شفاعت کر دو'' یہاں تک کہ شفاعت کا معاملہ نبیٔ پاک ﷺ تک پہنچے گا، چنانچہ یہی حق تعالیٰ کی طرف سے نبیٔ اکرم ﷺ کو مقامِ محمود پر فائز کرنے کا دِن ہوگا۔''

(۷) لواءِ حمد: قیامت میں حمدِ باری کا پرچم آپ ﷺ کے دستِ اقدس میں ہوگا، ترمذی شریف کی روایت ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَنَا أَوَّلُ النَّاسِ خُرُوْجًا إِذَا بُعِثُوْا، وَ أَنَا خَطِيْبُهُمْ إِذَا وَفَدُوْا، وَ أَنَا مُبَشِّرُهُمْ إِذَا أَيِسُوْا، لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَئِذٍ بِيَدِيْ، وَ أَنَا أَكْرَمُ وُلْدِ آدَمَ عَلٰى رَبِّيْ، وَ لَا فَخْرَ." (الترمذی / أبواب المناقب عن رسول اللّٰه ﷺ)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ ''جب لوگ قبروں سے اُٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلے قبر سے نکلنے والا میں ہوں، اور میں ان سے مخاطب ہوں گا جب وہ میرے پاس آئیں گے، اور میں ان کو بشارت سناؤں گا جب وہ مایوس ہو جائیں گے، لواءِ حمد اس دِن میرے ہاتھوں میں ہوگا، اور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ معزز ہوں، اس میں کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔''

(۸) اسی طرح ان نعمتوں میں نہرِ کوثر یا حوضِ کوثر بھی شامل ہیں۔

نہرِ کوثر یا حوضِ کوثر:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝﴾ ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا۔ یعنی خیر کثیر سے نوازا، جس میں نہرِ کوثر یا حوضِ کوثر بھی داخل ہے، احادیث طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہرِ کوثر جنت میں ہے، اور حوضِ کوثر میدانِ محشر میں، نہرِ کوثر کا پانی حوضِ کوثر میں لانے کے لیے دو بڑے نالے جاری کیے جائیں گے، جن میں ایک سونے کا اور دوسرا چاندی کا ہوگا، دونوں سے آبِ کوثر آتا رہے گا اور اہلِ ایمان سیراب ہوتے رہیں گے۔

روایتوں میں ہے کہ قیامت کے دِن جب لوگ اپنی اپنی قبروں سے اُٹھائے جائیں گے تو ان کو نہایت شدت سے پیاس لگی ہوگی، اس وقت بعض خوش نصیب لوگوں کو تو حوضِ کوثر کا پانی قبر سے اٹھتے ہی مل جائے گا، اور بعض کو گناہوں کے سبب دیر سے ملے گا، یہاں تک کہ بعض کو پل صراط سے گزرنے کے بعد ملے گا، اور جو باقی رہ جائیں گے ان کو دوزخ سے خلاصی ملنے کے بعد دخولِ جنت سے پہلے پلایا جائے گا۔ (عمدۃ الفقہ: ۱/۵۴)

جو بندہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کے دستِ اقدس سے آبِ کوثر پی لے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا، پیاس ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی، اس کے بعد جنت کے دیگر مشروبات بطورِ لذت پئیں گے، جیسے جنت کے ماکولات بطورِ نعمت کھائیں گے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کی تکمیل دنیا میں ممکن نہیں، مرنے کے بعد ہی ہوسکتی ہے: (۱) نیند (۲) بھوک (۳) پیاس۔ دنیا میں بندہ کتنا ہی سولے، مگر نیند ختم نہ ہوگی، اس کی تکمیل مرنے کے بعد قبر ہی میں ہوگی، اس لیے جنت میں نیند نہیں ہے۔ اسی طرح دنیا میں بندہ کتنا ہی کھالے، مگر بھوک ختم نہیں ہوسکتی، قیامت کے دِن رب العالمین کی پہلی دعوتِ استقبالیہ کھاتے ہی بھوک ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔ نیز دنیا میں بندہ کتنا ہی پانی پی لے، مگر پیاس ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہوسکتی، البتہ قیامت کے دِن حضور پاک ﷺ کے دستِ مبارک سے کوثر پینے کے بعد پیاس ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔

حضورِ اکرم ﷺ کو قیامت کے دِن تین جگہوں پر تلاش کیا جائے گا: (۱) پل صراط (۲) میزانِ عدل (۳) حوضِ کوثر۔ (ترمذی، مشکوٰۃ: ۴۹۳)

آبِ کوثر مشک سے زیادہ خوشبودار، دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ حوضِ کوثر پر امتِ محمدیہ مسلمہ کی پہچان آثارِ وضو سے ہوگی، حوضِ کوثر سے سیراب ہونے والوں کی تعداد آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہوگی، سب سے پہلے اس پر فقراءِ مہاجرین تشریف لائیں گے، جن کے بال پراگندہ (بکھرے ہوئے) کپڑے میلے کچیلے، اور جو مالدار حسین وجمیل عورتوں سے نکاح نہ کرسکتے تھے اور نہ ان کے لیے بادشاہوں اور حاکموں کے دروازے کھولے جاتے تھے، (یعنی بظاہر دنیوی حیثیت سے بے حیثیت تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں انہیں بڑی مقبولیت حاصل تھی) اس لیے قیامت میں سب سے پہلے آبِ کوثر سے یہی حضرات سیراب کیے جائیں گے، اس موقع پر مرتدین (دینِ حق سے منحرف اور پھر جانے والے) منافقین (بظاہر مسلمان اور بباطن کافر) اور مبتدعین (دینِ اسلام میں نئی نئی باتیں ایجاد کرنے والے، سنت کے بجائے بدعت کو رائج کرنے والے) محروم کردیے جائیں گے،

(العیاذ باللّٰہ العظیم، اللّٰھم اسقنا من حوضہ، آمین)

(مستفاد از: مشکوٰۃ: ۴۸۷/ باب الحوض والشفاعۃ)

یہ ہے خیر کثیر کا ایک حصہ، جس کو خیر کثیر کی تفسیر میں بیان کیا گیا، قرآن کی جامعیت پر قربان ہوجائیں کہ ایک چھوٹی سی سورت کی پہلی آیت میں اتنی عظیم الشان نعمتہائے دارین کو بیان فرمادیا، چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝﴾ ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا۔ دارین کی نعمتوں سے مالا مال کردیا۔

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝﴾

محبوبم! جب آپ کے رب نے آپ کو خیر کثیر عطا فرمائی، دارین کی عظیم الشان نعمتوں سے مالا مال فرمایا، تو اب اس کا شکرانہ بھی ادا کیجیے اور رب العالمین کی نعمتوں کا شکر ادا

کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھئے اور قربانی کیجیے، کیوں
کہ بدنی عبادتوں میں نماز افضل ترین اور بہترین عبادت ہے، جس میں شکر کی تمام قسمیں
(شکرِ لسانی، شکرِ جنانی (قلبی) اور شکرِ ارکانی) موجود ہے، اس میں نمازی بندہ سراپا شکر اور یادِ
مولیٰ میں مشغول ہوتا ہے، جب کہ مالی عبادتوں میں رضاءِ الٰہی کے خاطر قربانی کرنا وہ عظیم
عبادت ہے جو بت پرستی کے خلاف ایک جہاد ہے، خصوصاً عصرِ حاضر میں گائے کی قربانی۔
لفظ ''نحر'' عربی زبان میں اونٹوں کو ذبح کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، چوں کہ عرب میں
اونٹ سب سے قیمتی مال سمجھا جاتا تھا، اس لیے خصوصیت کے ساتھ یہ لفظ استعمال کیا گیا،
ورنہ گائے اور بکری وغیرہ کی قربانی بھی اس میں داخل ہے، اس لیے کہ ان کی قربانی بھی
احادیث طیبہ میں ثابت ہے، حق تعالیٰ نے آیت کریمہ میں آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے
ذریعہ ساری امت کو حکم فرمایا کہ مشرکین بتوں کے نام پر قربانی کرتے ہیں، بلی چڑھاتے
ہیں، آپ اپنے رب کے نام پر اس کی رضا کے لیے قربانی کیجیے، رضاءِ الٰہی کی خاطر قربانی کرنا
اللہ تعالیٰ کے نزدیک مالی عبادات میں بہت پسندیدہ عمل ہے، جس طرح جسمانی عبادتوں
میں نماز پسندیدہ عمل ہے، اسی لیے نماز اور قربانی کا حکم ایک ساتھ دیا گیا، ایک اور مقام پر بھی
نماز کے ساتھ قربانی کا ذکر فرمایا ہے:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (الأنعام: ۱۶۲)

اس سے ثابت ہوا کہ شکرِ الٰہی کا بہترین طریقہ نماز اور اس کے ساتھ قربانی، صدقہ و
خیرات ہے، اس لیے کہ حق تعالیٰ نے ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۝﴾ میں ان ہی باتوں کا حکم
فرمایا ہے۔ اور حضرت عکرمہؒ، عطاءؒ اور قتادہؒ کے بقول ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۝﴾ سے مراد
عید کی نماز اور عید کی قربانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عید الاضحیٰ کی نماز پڑھئے اور قربانی کیجیے۔
(گلدستۂ تفاسیر: ۷/۲۳)

﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ۝﴾

حضور ﷺ کی اولادِ نرینہ میں حضرت قاسمؓ کے بعد حضرت عبداللہؓ کا بھی انتقال
ہو گیا، اس موقع پر دشمنوں نے آپ ﷺ کو مقطوع النسل ہونے کا طعنہ دیا کہ محمد کی نرینہ
اولاد تو اب رہی نہیں، لہٰذا محمد کے دنیا سے جانے کے بعد ان کا نام ونشان مٹ جائے گا۔
(نعوذ باللہ) اس وقت رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو اولاً اظہارِ ہمدردی کے لیے
دارین کی عظیم الشان نعمتوں کی خوش خبری سنائی، پھر ان نعمتوں کے شکر کا طریقہ بتایا اور اخیر
میں دشمنانِ دین کے طعنوں کے جواب میں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ۝﴾
محبوبم! آپ سے بغض وعداوت رکھنے والے آپ کے بے نام ونشان ہونے کی بات کرتے
ہیں نا! تو انہیں ہمارا یہ فیصلہ بھی سنا دو کہ بلا شبہ جو تمہارا دشمن ہے وہی بے نام ونشان ہے،
تمہارے دشمن کا نام ونشان تو مٹ جائے گا، لیکن تمہاری شان اور امت مسلمہ کی شکل میں
روحانی اولاد ہمیشہ باقی رہے گی۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کی شان اور نام ونشان تا ابد
باقی رکھنے کا یوں انتظام فرمایا کہ جن لوگوں نے آپ ﷺ سے دشمنی رکھی اور گستاخی کی، آج
ان کا کوئی نام لیوا نہیں، ان کا نام ونشان ختم ہو گیا، حتیٰ کہ آپ ﷺ کے دشمنوں کے یہاں اللہ
تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دوستوں اور جاں نثاروں کو پیدا فرما دیا، مثلاً عاص بن وائل سہمی، جو
ہمیشہ آپ ﷺ کو طعنہ دیا کرتا کہ ''إِنَّ مُحَمَّدًا أَبْتَرُ'' کہ محمد تو ابتر ہیں، لاولد ہیں، ان کی
کوئی نرینہ اولاد نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے دو بیٹوں کو دولتِ ایمان سے نواز دیا، جس کی وجہ
سے خود اُسی کا رشتہ اپنے اُن دونوں بیٹوں سے کٹ گیا اور اس کی صلبی اولاد حضور ﷺ کی
روحانی اولاد میں داخل ہو گئی۔ (مستفاد از: گلدستۂ تفاسیر: ۷/۲۴)

اللہ رب العالمین نے امت مسلمہ کی شکل میں آپ ﷺ کی روحانی اولاد کو ساری
دنیا کے چپہ چپہ میں پیدا فرما دیا، جو آپ ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر اور دنیا کے ہر

خطبہ سے آپ ﷺ پر درود وسلام کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام ملا دیا، جس کی وجہ سے عہدِ نبوت سے آج تک اور آج سے لے کر تا قیامت اذان واقامت میں، خطبہ ونماز میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام بھی بلند ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ ہے ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝﴾ اور ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝﴾ کا صحیح مفہوم۔

سچ ہی کہا ہے:

سارا جہاں ہے روشن اُن سے — رَب کی اطاعت اُن کے دم سے
سب سے اعلیٰ، سب سے معظم — صلّی اللّٰہُ علیہ وسلّم
جانِ طریقت، دولت عرفاں — روحِ شریعت، عزتِ ایماں
شوکت انساں، عظمت آدم — صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں آپ ﷺ سے کامل اور مکمل عشق ووابستگی عطا فرما کر دارین کی نعمتوں سے ہمیں بھی مالا مال فرمائے۔ آمین۔

۳۰/ ربیع الاول/ ۱۴۳۸ھ (قبل الجمعہ)

مطابق: ۳۰/ دسمبر/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

121

(۱۵)

قرآنِ کریم کے حقوق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ:" سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:" أَلَا إِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ"، قُلْتُ:" مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!"، قَالَ:" كِتَابُ اللّٰهِ، فِيْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ، وَ خَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ، وَ حُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ، وَ هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ، مَنْ تَرَكَهٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ، وَ مَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ أَضَلَّهُ اللّٰهُ، وَ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ، وَ هُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ، وَ هُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ، وَ هُوَ الَّذِيْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ، وَ لَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ، وَ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ، وَ لَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ، وَ لَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ، هُوَ الَّذِيْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ إِذَا سَمِعَتْهُ، حَتّٰى قَالُوْا: ﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِيْ إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهٖ﴾ مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ، وَ مَنْ عَمِلَ بِهٖ أُجِرَ، وَ مَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ، وَ مَنْ دَعَا إِلَيْهِ هُدِيَ إِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ." (رواه الترمذی والدارمی، مشکوٰة:۱۸۶/ کتاب فضائل القرآن/ الفصل الثانی)

ترجمہ: ''حضرت علی مرتضیٰؓ سے روایت ہے کہ میں نے رحمت عالم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگاہ ہوجاؤ! ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے، (یعنی لوگوں میں بکثرت

اختلاف ہوں گے اور نئی نئی باتیں ایجاد ہوں گی) میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس فتنہ سے نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کتاب اللہ (سے مکمل وابستگی) اس میں تم سے پہلی امتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اطلاعات ہیں، (مطلب یہ ہے کہ قیامت وآخرت کے احوال، یا ایمان، اعمال اور اخلاق کے جو دنیوی واخروی نتائج و ثمرات مستقبل میں سامنے آنے والے ہیں قرآنِ کریم میں ان سب کی بھی آگاہی دی گئی ہے) اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآنِ کریم میں ان کا حل، حکم اور فیصلہ موجود ہے، (حق و باطل، صحیح و غلط اور حرام وحلال کے بارے میں) وہ قولِ فیصل ہے، وہ فضول بات اور مذاق گوئی نہیں ہے، اسی کو قرآن نے بیان فرمایا:

﴿ إِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴾ (الطارق:۱۳-۱۴)

ترجمہ: ''یہ قرآن ایک فیصلہ کن بات ہے اور یہ کوئی مذاق نہیں۔''

جو کوئی جابر، متکبر اور سرکش اُسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اسے توڑ دے گا، (اپنی رحمت سے جدا اور دور کردے گا) جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَ مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى ﴾ (طٰهٰ: ۱۲۴)

''ترجمہ: جو میری نصیحت (قرآن) سے منہ موڑے گا تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی، اور قیامت کے دِن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔''

اور جو کوئی قرآنِ کریم کے بغیر ہدایت تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دیں گے، قرآن ہی حبل اللہ المتین یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق کا مضبوط سہارا اور ذریعہ ہے، اسی لیے فرمایا گیا:

﴿ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: ''اللہ کی رسی کو تم سب مل کر ایک ساتھ مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں

پھوٹ نہ ڈالو۔''

وہ محکم (باحکمت) نصیحت نامہ ہے، اور وہی صراطِ مستقیم ہے، وہی وہ حق مبین ہے جس کے اتباع سے خیالات (اور خواہشات) کجی (ٹیڑھے پن سے) محفوظ رہتے ہیں، اور زبانیں اس کے ساتھ نہیں ملتیں (یعنی جس طرح اگلی کتابوں میں زبانوں کی راہ سے تحریف ہوئی اس طرح قرآنِ پاک میں کوئی تحریف نہیں ہوسکتی۔ (معارف الحدیث: ۵/۷۷) یا دوسری عبارت اس کی عمدہ وضاحت کی وجہ سے اس کے مانند نہیں ہوسکتی، یا یہ مراد ہے کہ قرآن مومنوں کی زبان پر دشوار نہیں۔ (مظاہر حق: ۲/۴۴۵) اور اس سے علماء کبھی سیر نہیں ہوں گے، (یعنی قرآنِ پاک میں تدبر کا عمل اور اس کے حقائق و معارف کی تلاش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا) اور قرآن کبھی کثرتِ مزاولت سے پرانا نہیں ہوگا، (یعنی جس طرح دنیا کی دیگر کتابوں کا حال ہے کہ بار بار پڑھنے کے بعد اُکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، قرآنِ کریم کا معاملہ ایسا نہیں) اور اس کے عجائب واسرار (یعنی قرآنِ کریم کے دقیق ولطیف حقائق ومعارف) کبھی ختم نہیں ہوں گے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ لَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○﴾ (لقمان: ۲۷)

ترجمہ: ''اور زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہیں ان کے علاوہ سات سمندر مل کر روشنائی بن جائیں، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی صفات لکھیں تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی، اس کا کلام تمام نہیں ہوگا، یقیناً وہ زبردست اور حکمت والا ہے۔''

قرآن کی شان یہ ہے کہ جب جناتوں نے اسے سنا تو بے اختیار بول پڑے:

﴿ إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ○ يَّهْدِيْ إِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَ لَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ○﴾ (الجن: ۱-۲)

ترجمہ: ''ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا

ہے، اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔"

جس نے قرآن کے مطابق بات کہی اس نے سچی بات کہی، (یا جو قرآن کے مطابق بات کرے گا اس کی تصدیق کی جائے گی) جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوگا، اور جس نے قرآن کے مطابق فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا، اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت نصیب ہوگی۔ (یہ قرآنِ کریم کی عظمت و فضیلت کے بارے میں نہایت جامع حدیث ہے)

حقوقِ قرآن کی اہمیت:

اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کو دنیوی واخروی فتنوں اور مصیبتوں سے نجات دلانے اور دارین میں اپنی رضا و رحمت سے نوازنے کے لیے قرآنِ کریم جیسا عظیم الشان انعام عطا فرمایا، اس انعام کا حق اور شکر، یہ ہے کہ ہم اس سے مکمل وابستگی پیدا کریں، اگر اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کامل اور مکمل وابستگی اختیار کرلیں تو ہر اعتبار سے فتنوں سے نجات پا کر اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت کے مستحق بن جائیں، جیسا کہ حدیث بالا میں اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے، اس امت کا اوّل طبقہ قرآنِ کریم سے وابستہ ہوکر صلاح و فلاح کا حقدار بنا، تو آخری طبقہ بھی اس سے وابستہ ہوکر صلاح وفلاح کا حقدار بنے گا، لیکن قرآنِ کریم سے وابستگی اس کے حقوق کی ادائیگی کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے قرآنِ کریم سے مکمل وابستگی کے لیے اس کے حقوق کی ادائیگی نہایت ضروری ہے، ایک حدیث پاک میں حقوقِ قرآن کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

عَنْ عُبَیْدَۃَ الْمُلَیْکِی رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "یَا أَھْلَ الْقُرْآنِ! لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ، وَ اتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَ النَّھَارِ، وَ أَفْشُوْہُ وَ تَغَنَّوْہُ وَ تَدَبَّرُوْا فِیْهِ، لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ، وَ لَا تُعَجِّلُوْا ثَوَابَهٗ، فَإِنَّ لَهٗ ثَوَابًا." (رواہ البیھقی

فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ: ۱۹۲)

ترجمہ: "اے اہل ایمان! اللہ تعالیٰ نے تمہیں قرآن عطا فرمایا ہے، لہٰذا تم اس پر تکیہ اور بھروسہ کرکے نہ بیٹھ جانا (کہ ہمارے پاس قرآن ہے، اور ہم اہل ایمان ہیں، قرآنِ عظیم الشان کا شکر، یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے، اس کے بغیر صلاح و فلاح ممکن ہی نہیں ہے، قرآنِ کریم کے حقوق میں سے یہ ہے کہ) اس کی دِن رات تلاوت کی جائے جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے، اور قرآنِ کریم کو پھیلاؤ اور خوش آوازی سے پڑھو! اس میں غور وفکر کرو! تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ، اور اس کا ثواب حاصل کرنے میں جلدی نہ کرو! (یعنی دنیا میں اس کا عوض طلب نہ کرو!) اس لیے کہ آخرت میں اس پر اجر عظیم ہے۔"

اس روایت میں اجمالی طور پر قرآنِ کریم کے حقوق کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔

پہلا حق: ایمان بالقرآن:

اس کے علاوہ کتاب وسنت میں بیان کیے گئے قرآنِ کریم کے حقوق میں سب سے پہلا حق جس پر دیگر تمام حقوق کی ادائیگی موقوف ہے وہ ایمان بالقرآن ہے، یعنی قرآن پر ایمان لانا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ﴾ (النساء: ۱۳۶)

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری ہے۔"

دیکھیے! یہاں اہل ایمان کو قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا، حالانکہ یہاں اہل ایمان سے ایمان بالقرآن کا مطالبہ بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن پر مکمل ایمان کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ایمان واعمال میں کمال پیدا نہیں ہوسکتا، اور اس

کے لیے اقرار باللسان کے علاوہ تصدیق قلبی بھی ضروری ہے، مطلب یہ ہے کہ صرف زبان سے اس بات کا اقرار کرنا ہی کافی نہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، جو ہماری ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ دل سے پختہ یقین کرنا بھی ضروری ہے، تب جا کر ایمان بالقرآن مکمل ہوگا، آج ایمان بالقرآن کا پہلا درجہ تو ہمیں حاصل ہے کہ قرآن کے کلام اللہ اور کلامِ ہدایت ہونے کا اقرار تو ہم کرتے ہیں، مگر دل میں اس کا مکمل یقین نہیں ہے، اس لیے ہمارا عمل قرآن کے خلاف ہے، ہم قرآن کو مانتے ہیں؛ لیکن قرآن کی نہیں مانتے، اور یہ اس لیے کہ اس کی ہدایات پر ہمیں کامیابی کا مکمل یقین نہیں ہے، ہماری اس کیفیت کو قرآنِ پاک نے ایک مقام پر یوں بیان فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ أُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ﴾ (الشوریٰ: ۱۴)

ترجمہ: ''اور ان لوگوں کے بعد جن کو کتاب کا وارث بنایا گیا ہے وہ اس کے بارے میں بڑے شک میں مبتلا ہیں۔''

اگر قرآنِ کریم کے کلام اللہ اور کلامِ ہدایت ہونے کا یقین واقعۃً ہمارے دل میں ہوتا تو ہمارا عمل اس کے خلاف ہرگز نہ ہوتا، اس لیے کہ جس چیز کا یقین ہوتا ہے اس کے خلاف عمل نہیں کیا جاتا، مثلاً آگ کے جلانے، پانی کے ڈُبانے اور چاقو کے کاٹنے کا یقین ہے تو کوئی بھی اس کے خلاف عمل نہیں کرتا، اسی طرح قرآنِ پاک کے کلامِ ہدایت ہونے کا مکمل یقین حاصل ہو جانے کے بعد اس کے خلاف عمل نہیں ہو سکتا، لہٰذا ایمان بالقرآن کے حق کو ادا کرنے کے لیے قرآن کو کلام اللہ اور کلامِ ہدایت ماننے کے ساتھ ساتھ قرآن کی ہدایت کو ماننا اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، یقیناً اس ایک حق کو ادا کرنے سے بھی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آسکتی ہے اور ہمیں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسرا حق: تلاوتِ قرآن:

چوں کہ قرآنِ پاک کتابِ ہدایت ہونے کے ساتھ کتابِ تلاوت بھی ہے، اس

لیے حق تعالیٰ نے اس کی تلاوت وقراءت کا حکم دیا، یہاں یہ نکتہ سمجھ لینا مفید ہوگا کہ قراءت کا لفظ ہر چیز پڑھنے کے لیے عام ہے، جب کہ تلاوت کا لفظ صرف آسمانی کتاب پڑھنے کے لیے خاص ہے، اور قرآن کو پڑھنے کے لیے اصل قرآنی اصطلاح ''تلاوت'' ہی ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ اتْلُ مَآ أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا﴾ (الكهف: ۲۷)

ترجمہ: ''اور آپ پر آپ کے پروردگار کی جانب سے جو وحی بھیجی گئی ہے اس کی تلاوت کیا کیجیے! کوئی نہیں ہے جو اس کے کلام کو بدل سکے، اور اسے چھوڑ کر آپ کو ہرگز کوئی پناہ کی جگہ نہیں مل سکتی۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اُتْلُ مَآ أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ (العنكبوت: ۴۵)

ترجمہ: ''جو کتاب آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجی گئی ہے اس کی تلاوت کیا کیجیے۔''

حدیث پاک میں بھی فرمایا:

''وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ.''

ترجمہ: ''دن رات قرآنِ کریم کی ایسی تلاوت کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔''

حق تلاوت یہ ہے کہ تجوید کے ساتھ پڑھے، علامہ جزریؒ فرماتے ہیں:

وَ الْأَخْذُ بِالتَّجْوِيْدِ حَتْمٌ لَازِمٌ　　مَنْ لَّمْ يُجَوِّدِ الْقُرْآنَ آثِمٌ

ترجمہ: ''علمِ تجوید حاصل کرنا ضروری ہے، بغیر تجوید کے قرآن پڑھنے والا گنہگار ہوگا۔''

لِأَنَّهٗ بِهِ الْإِلٰهُ أَنْزَلَا　　وَ هٰكَذَا مِنْهُ إِلَيْنَا وَصَلَا

ترجمہ: ''اس لیے کہ تجوید ہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اُسے نازل کیا ہے، اور ہم

تک اسی طرح تجوید کے ساتھ پہنچا ہے۔'' (المقدمۃ الجزریۃ/صفحہ:۸)

حق تلاوت میں یہ بھی ہے کہ مسلسل پڑھے، جس کا کم از کم نصاب روزانہ ایک پارہ اور زیادہ سے زیادہ نصاب روزانہ دس پارے تلاوت کرنا ہے، لیکن معتدل نصاب روزانہ ایک منزل ہے، اکثر صحابہؓ وعلماء کا اس پر عمل تھا، کم از کم رمضان المبارک میں اس پر عمل کر لے۔

اسی کے ساتھ اچھی آواز میں پڑھنے کی کوشش کرے، حدیث میں ہے: ''حَسِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ.'' (سنن الدارمی، مشکوٰۃ: ۱۹۱)

حق تلاوت میں یہ بھی ہے کہ ظاہری و باطنی آداب کی رعایت کے ساتھ تلاوت کرے، ظاہری آداب میں وضو ضرور کرے، قبلہ رُخ بیٹھے، تعوّذ وتسمیہ پڑھے، وغیرہ۔ اور باطنی آداب میں یہ ہے کہ حضورِ قلبی کے ساتھ تلاوت کرے، حق تلاوت یہ بھی ہے کہ اس کے مضامین میں تدبر اور غور وفکر کرے، پھر اس پر عمل کرے۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تلاوت کا حکم اس لیے ہے کہ یہ قرآنِ کریم کا حق ہے، اور اس حق کو کما حقہ وہی ادا کرتا ہے جس کا دل نورِ ایمان سے منور ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۲۱)

ترجمہ: ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، تو وہی لوگ درحقیقت قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔''

اس سے ثابت ہوا کہ اہل ایمان کی پہچان یہی ہے کہ وہ ایک مرتبہ قرآن پڑھ کر سلسلۂ تلاوت ختم نہیں کر دیتے؛ بلکہ اپنی ساری زندگی قرآن کے مطابق گزار کر ختم کر دیتے ہیں۔

صاحبو! اگر ہم قرآنِ کریم کو رمضانِ کریم میں ایک مرتبہ پڑھ کر ختم کرنے کے بجائے ساری زندگی اس کی تعلیمات اور ہدایات پر عمل کر کے ختم کریں تو کامیابی ہمارا مقدر

بن جائے گی، اگر قرآن پاک کی تلاوت آدابِ ظاہری (جیسے باوضو، قبلہ رُخ ہو کر تعوّذ سے تلاوت کی ابتدا کرنا) وباطنی (جیسے دل میں کلام اور صاحبِ کلام کی عظمت کا دھیان کرنا اور نہایت خشوع وخضوع اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی نیت سے تلاوت کرنا) کے علاوہ تجوید کی رعایت کے ساتھ کی جائے تو یہ نفلی عبادتوں میں نہایت اہم عبادت کے ساتھ حصولِ برکت، اللہ تعالیٰ کی قربت اور ایمان کی تازگی اور زیادتی کا بہترین ذریعہ ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾ (الأنفال: ۲-۳-۴)

ترجمہ: ''مومن تو وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور جب ان کے سامنے قرآنِ کریم کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں ترقی اور تازگی پیدا ہوتی ہے، اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں سے (فی سبیل اللہ) خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں مومن ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں، مغفرت ہے اور باعزت رزق ہے۔''

تیسرا حق: تدبر اور تذکر بالقرآن:

ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کی تلاوت کے یہ فضائل کما حقہ اسی وقت حاصل ہوں گے جب تلاوت کے ساتھ تدبر (غور وفکر) اور تذکر (سمجھ سے) کام لیا جائے، یہ قرآنِ کریم کا تیسرا بنیادی حق ہے، اس حق کو قرآنِ پاک نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (ص:۲۹)

ترجمہ: ''یہ ایک بابرکت کتاب ہے، جو ہم نے تم پر اس لیے اتاری ہے کہ (اہل ایمان) اس کی آیتوں پر غور وفکر کریں اور تاکہ سمجھ دار لوگ نصیحت حاصل کریں۔''

حدیث پاک میں اس حق کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: '' وَ تَدَبَّرُوْا فِيْهِ '' اس (کے قصوں اور نصیحتوں) میں غور وفکر کرو۔

اور واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے قصص ونصائح میں غور وفکر سے کام لینا اور اُنہیں سمجھنا ہر سچے پکے مسلمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسان فرمادیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ ﴾ (القمر: ۲۲،۲۷،۳۲،۴۰)

ترجمہ: ''اور ہم نے قرآن کو غور وفکر اور سمجھنے کے لیے آسان بنادیا ہے، اب کیا کوئی ہے جو (اس میں بیان کردہ قصوں اور نصیحتوں میں غور وفکر اور سمجھ سے کام لے کر) نصیحت حاصل کرے؟''

حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ایسا کریں گے وہ فلاح پائیں گے۔

ہمارے مرشد شیخ الزمان حضرت مولانا محمد قمر الزمان مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ''سب سے زیادہ تقرب قرآن مجید کی تلاوت ہی سے حاصل ہوتا ہے، اور تصوّف کی سب سے اچھی اور بڑی کتاب قرآن مجید ہے اور اس کی بہترین شرح احادیث نبویہ ہیں، اور فرمایا کہ قرآنِ کریم کی حقیقی تلاوت کرو، رسمی نہیں۔''

چوتھا حق: عمل بالقرآن:

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم میں تدبر وتذکر (غور وفکر) کرنا اس وقت مفید ہوگا جب عمل بھی کیا جائے، کیوں کہ نزولِ قرآن کا اصل مقصد تو ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' ہے، اور یہ مقصد اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب لوگ اسے واقعتاً اپنی زندگیوں کا لائحۂ عمل بنائیں اور قرآن کے مطابق عمل کریں، اس لیے قرآنِ کریم کا چوتھا حق اس کے احکام ونصائح

پر عمل کرنا ہے، اس حق کو یوں بیان فرمایا گیا:

﴿ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: ''اللہ کی رسّی مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔''

صاحبو! اگر مسلمان قرآن کی انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنا (اس کے احکام و نصائح پر عمل کرنا) شروع کردیں تو یقیناً راہ یاب ہوجائیں گے، ورنہ گمراہ ہوجائیں گے، جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَ مَا يُضِلُّ بِهٖ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾ (البقرة: ۲۶)

ترجمہ: ''(اس طرح) اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی مثالوں (اس کے احکام اور نصیحتوں) سے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے، (مگر) وہ گمراہ ان ہی کو کرتا ہے جو نافرمان (ضدی اور ہٹ دھرم) ہیں۔'' (ورنہ طالبِ حق کو تو ہدایت دی جاتی ہے، قرنِ اوّل کے مسلمان عمل بالقرآن کی وجہ سے فلاح سے ہم کنار ہوئے تھے، جب کہ دورِ حاضر کے مسلمان ترکِ قرآن کی وجہ سے خسران ونقصان سے دوچار ہوگئے)۔

علامہ اقبالؒ کے بقول:

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہوکر   اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

ضرورت ہے قرآنِ پاک کو رہبر بنانے کی، تاکہ کامیابی وترقی اور رضاءِ الٰہی ہمارا مقدر بن جائے۔ رزقنا اللّٰه بمنّه و كرمه...... آمين.

پانچواں حق: تعلیم وتبلیغ قرآن:

اسی کے ساتھ قرآن کے پیغام کو اپنی استطاعت کی حد تک عام کرنا بھی اہل ایمان کی ذمہ داری ہے، قرآنِ کریم کا پانچواں حق تعلیم اور تبلیغ قرآن ہے، دین اسلام کی دعوت اور

پیغامِ اسلام کا سب سے کارگر طریقہ اور ذریعہ یہ ہے کہ داعی اپنے مدعو کو قرآن کی تعلیم اور احکام ونصائح سے روشناس کرے، قرآنِ پاک میں اسی کا حکم فرمایا گیا:

﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ○﴾ (ق: ۴۵)

ترجمہ: ''قرآن کے ذریعہ ہر اس شخص کو نصیحت کرتے رہو جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔''

جس کے دل میں کچھ بھی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کا خوف ہوگا اسے تذکر بالقرآن سے ضرور نفع ہوگا، اور اگر مدعو کو نفع نہ بھی ہوا تو داعی کو تو یقیناً نفع ہوگا، جس کی طرف مذکورہ حدیث میں اشارہ فرمایا گیا کہ " وَ مَنْ دَعَا إِلَيْهِ هُدِيَ إِلىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ." (ترمذی) کہ داعیٔ قرآن کو صراطِ مستقیم کی توفیق سے مالامال کیا جائے گا۔

اگر داعی اپنی دعوت میں مخلص ہو تو پھر مدعو کو بھی ضرور نفع ہوتا ہے۔ منقول ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ ایک مرتبہ بعد نمازِ عشاء دہلی کی ''موتی'' نامی مشہور طوائف کے مکان پر گئے اور دستک دی، خادمہ نے پوچھا: ''کون ہو؟'' فرمایا: ''فقیر ہوں'' سن کر خادمہ نے موتی کو اطلاع دی تو اس نے بطورِ بھیک کچھ پیسہ دینا چاہا، حضرتؒ نے فرمایا: ''میری عادت ہے کہ بغیر صدا سنائے کچھ لیتا نہیں ہوں، پہلے میری صدا سن لو''، موتی نے آپؒ کی صدا سننے کے لیے گھر کے صحن میں بلوایا، آپؒ نے صحن میں رومال بچھا کر اپنے مخصوص انداز میں سورۂ والتین کی تلاوت فرمائی، پھر اس کی تشریح بھی فرمادی، جس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں موجود تمام طوائف تائب ہوگئیں۔ (حکایاتِ اولیاء/صفحہ:۶۹)

حاصل یہ کہ قرآنِ کریم کے حقوق کی ادائیگی میں اس کے پیغام کو عام کرنا بھی کامیابی اور رضاءِ الٰہی کا سبب ہے۔

حقوقِ قرآن کی ادائیگی میں کوتاہی پر وعید:

اس کے برخلاف خدانخواستہ اگر قرآنِ کریم کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی برتی

گئی تو پھر ناکامی میں کوئی شک بھی نہیں، اس لیے کہ قیامت کے دن رحمۃ للعالمین ﷺ جہاں رب العالمین کی بارگاہ میں گنہگاروں کو بخشوانے کے لیے شفاعت فرمائیں گے وہاں قرآن کے حقوق میں کوتاہی کرنے والے مجرمین کی شکایت بھی فرمائیں گے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا○﴾ (الفرقان: ۳۰)

ترجمہ: ''اور رسول کہیں گے: ''یارب! میری قوم اس قرآن کو بالکل چھوڑ بیٹھی تھی۔''

اگرچہ سیاق وسباق کی روشنی میں یہاں قوم سے مراد کفار ہیں، لیکن یہ مسلمانوں کے لیے بھی ڈرنے کا مقام ہے کہ اگر مسلمان ہونے کے باوجود انہوں نے قرآنِ کریم کے حقوق کی طرف توجہ نہ دی اور قرآنِ کریم کے احکام ونصائح اور ہدایت کو پس پشت ڈال دیا، تو یہ بھی ہجرانِ قرآن اور ترکِ قرآن کے سنگین جرم کے مصداق بن سکتے ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَ اجْعَلْهُ لَنَا إِمَامًا وَ نُوْرًا وَ هُدًى وَ رَحْمَةً، اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نُسِّيْنَا وَ عَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا، وَ ارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ اللَّيْلِ وَ آنَاءَ النَّهَارِ، وَ اجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ. آمين.

ترجمہ: ''اے اللہ! ہم پر قرآن کی بدولت رحم فرما، اور اسے ہمارے لیے پیشوا، نور، ہدایت اور رحمت بنادے، اے اللہ! اس میں سے جو کچھ ہم بھولے ہوئے ہیں وہ ہمیں یاد کرادے، اور جو کچھ ہم نہیں جانتے ہمیں سکھادے، اور ہمیں اس کی تلاوت کی توفیق عطا فرما راتوں کو بھی اور دن کے حصوں میں بھی، اور اسے ہمارے حق میں دلیل بنادے۔'' آمین۔

۱۵/ جمادی الثانیہ/ ۱۴۳۷ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۲۵/ مارچ/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۱۶)

عدل وانصاف کی اہمیت وضرورت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِاللّٰہِ بۡنِ عَمۡرِوبۡنِ الۡعَاصِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "إِنَّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَ مِنۡ نُوۡرٍ عَنۡ یَمِیۡنِ الرَّحۡمٰنِ، وَ کِلۡتَا یَدَیۡهِ یَمِیۡنٌ، اَلَّذِیۡنَ یَعۡدِلُوۡنَ فِیۡ حُکۡمِهِمۡ وَ اَهۡلِیۡهِمۡ وَ مَا وُلُّوۡا." (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۳۲۱)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انصاف کرنے والے قیامت کے دن رحمٰن کی دائیں جانب نور کے منبروں پر ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ وہ لوگ ہوں گے جو فیصلہ میں (خواہ وہ اپنے نفس سے متعلق ہو یا اپنے رب سے متعلق ہو) اور اپنے اہل وعیال نیز جن چیزوں کا انہیں ذمہ دار بنایا گیا ہے ان میں انصاف کرنے والے ہیں۔''

عدل کے بغیر امن ممکن نہیں:

اللہ جل شانہ نے حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کو بنیادی طور پر تین چیزیں دے کر دنیا میں مبعوث فرمایا: (۱) بینات (کھلی ہوئی نشانیاں) (۲) کتاب (مراد وحی) (۳) میزان

جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ﴾ (الحدید: ۲۵)

ترجمہ: ''حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری اور ترازو بھی۔''

کھلی ہوئی نشانیاں تو اس لیے عطا فرمائیں کہ لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ کوئی عام انسان نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور ان کی تعلیمات وہدایات سو فی صد برحق ہیں، اور کتاب سے مراد وحی ہے، جو من جانب اللہ لوگوں کی ہدایت کے لیے پیغمبروں پر نازل ہوئی تھی، اور میزان کہتے ہیں ترازو یعنی عدل وانصاف کے آلہ کو، جس کے ذریعہ صحیح طور پر ناپ تول ہوتا ہے، یہاں اس سے مراد حق وباطل کو جاننے کا وہ معیار ہے جو ترازو کی طرح تول کر یہ بتادے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ترازو پیدا کی ہے، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مطابق انصاف سے کام لینے کا حکم دیا۔

(آسان ترجمۂ قرآن: ۳/۱۶۸)

ان تینوں (ارسال الرسل، انزال الکتب والمیزان) کا اصل مقصد کیا ہے؟ تو فرمایا: ﴿لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ﴾ ''تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں۔'' کیوں کہ قیامِ عدل کے بغیر قیامِ امن ممکن نہیں، امن وہیں ہوگا جہاں عدل ہوگا، اور جہاں عدل نہیں ہوگا وہاں امن بھی نہیں ہوگا، چنانچہ روایات میں وارد ہے کہ خیبر کے یہودیوں سے یہ طے ہوا تھا کہ وہ مسلمانوں کی زمین میں کاشت کریں گے، اور جو کچھ پیدا ہوگا اس میں دونوں فریق آدھا آدھا بانٹ لیں گے، کچھ عرصہ کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے نمائندہ کی حیثیت سے جب غلہ کی وصولی کے لیے گئے تو انہوں نے محنت کرنے والوں سے کہا کہ یا تو تم خود تقسیم کردو، یا کہو تو میں کردوں؟ انہوں نے کہا کہ آپ خود ہی تقسیم کردیجیے، تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے پیداوار کے دو الگ الگ حصے کردیے، پھر

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے جو چاہو لے لو، آپ کے انصاف کو دیکھ کر یہودی پکار اٹھے: "وَ بِہٖ قَامَتِ السَّمَاءُ وَ الْأَرْضُ." (بیهقی) "اسی انصاف کی وجہ سے زمین وآسمان (اور ان میں امن وامان) قائم ہیں۔" یہ حقیقت ہے کہ جب عدل نہ ہوگا تو سارا سسٹم اور نظام درہم برہم ہوجائے گا۔

عدل کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر حق تعالیٰ نے حکم فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ (النحل: ۹۰)

ترجمہ: "بے شک اللہ انصاف کا حکم کرتا ہے۔"

لہٰذا اپنے رب کے ساتھ، اپنے نفس کے ساتھ اور سب کے ساتھ تمام حالات اور معاملات میں عدل کا اہتمام کرو، اس کے بغیر امن وامان اور صلاح وفلاح ممکن نہیں۔

عدل کی حقیقت اور اس کا تقاضا:

جب عدل کی اس قدر اہمیت ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عدل کی حقیقت کیا ہے اور عدل کسے کہتے ہیں؟ تو عدل کے معنیٰ ہیں (ہر حال میں) برابری اور انصاف کرنا، یعنی جس کا جو حق ہے اسے برابر ادا کرنا عدل کہلاتا ہے، اس اعتبار سے غور کیا جائے تو اس کے مفہوم میں کافی وسعت پائی جاتی ہے، اس کا تعلق اپنے رب سے بھی ہے، اپنے نفس سے بھی ہے اور سب لوگوں سے بھی ہے، تفصیل یہ ہے کہ جب اس کی نسبت اپنے رب کی طرف ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت پر کامل ایمان لائے، اور اس کی ذات و مخصوص صفات میں کسی کو شریک نہ کرے، اگر ایک بندہ اسی طرح زندگی گزارے تو یہی عادلانہ زندگی ہے، جس کے پرامن ہونے کی بشارت قرآنِ پاک میں دی گئی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ (الأنعام: ۸۲)

ترجمہ: "جو لوگ اللہ کی ربوبیت (والوہیت) پر ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کے ساتھ کسی ظلم (شرک) کا شائبہ بھی آنے نہیں دیا، تو امن اور چین تو بس ان ہی کا حق ہے، اور وہی ہیں جو صحیح راستے (اللہ کی رضا) پر پہنچ چکے ہیں۔"

اس کے برخلاف جو بندہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت پر ایمان نہیں رکھتا، یا ربوبیت پر تو ایمان رکھتا ہے، مگر الوہیت پر مکمل ایمان نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں شرک کرتا ہے، تو چوں کہ شرک ظلمِ عظیم ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (لقمان: ۱۳)

اس لیے شرک والی زندگی عادلانہ نہیں؛ بلکہ ظالمانہ زندگی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب عدل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا حق اور تقاضا یہ ہے کہ اس پر کامل ایمان لایا جائے اور اس کے ساتھ شرک نہ کیا جائے، اور جب عدل کی نسبت اپنے نفس کی طرف ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ خود کو جسمانی وروحانی اور دنیوی واُخروی ہر اعتبار سے ہلاکت اور اس کے اسباب سے بچایا جائے، قرآنِ پاک نے اسے یوں بیان فرمایا:

﴿وَ لَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرة: ۱۹۵)

ترجمہ: "اور اپنے آپ کو خود ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

لیکن عدل کی نسبت جب سب (یعنی عام لوگوں) کی طرف ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کا جو حق تمہارے ذمہ ہے اسے ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ ادا کرو، اسی طرح نہ کسی کی بے جا حمایت کرو نہ بے جا مخالفت، عدل کا تقاضا یہ ہے کہ حق ہی کی بنیاد پر حمایت کی جائے اور حق ہی کی بنیاد پر مخالفت بھی کی جائے، اسی بات کا حکم دیتے ہوئے قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

﴿وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَنْ لَا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (المائدة: ۸)

ترجمہ: ''کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، انصاف سے کام لو، یہی طریقہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔''

اس آیت کریمہ میں عدل کو تقویٰ سے زیادہ قریب بتا کر واضح کر دیا کہ عدل کے تقاضوں کو وہی لوگ کما حقہ پورا کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں تقویٰ اور خوفِ خدا ہو۔

صاحبو! آج عموماً لوگوں کے دلوں میں تقویٰ اور خوفِ خدا کے بجائے عداوتیں بھری ہوئی ہیں، اسی لیے ہماری عدالتیں بھی بھری ہوئی ہیں۔

حکام کو عدل کا حکم:

چوں کہ عام لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے مختلف قسم کے اختلافات و خصومات میں عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ کرنے اور مجرمین کو تعزیر و سزا دینے کی اصل ذمہ داری اربابِ اقتدار اور حکمرانوں کی ہے، اس لیے خاص طور پر انہیں عدل و انصاف کی تاکید کی گئی، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ إِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ط إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ط إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۝﴾ (النساء: ۵۸)

ترجمہ: ''اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، یقین جانو! اللہ تعالیٰ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے، بے شک اللہ ہر بات کو سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔''

خود حضورِ اکرم ﷺ کو بھی یہ ہدایت دی گئی کہ اگر کبھی فریقین کے درمیان فیصلہ کی نوبت آئے تو عدل و انصاف کا خاص خیال رکھا جائے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ إِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ط إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝﴾ (المائدة: ۴۲)

ترجمہ: ''اور اگر فیصلہ کرنا ہو تو انصاف سے فیصلہ کرو، (جیسا کہ آپ نے اب

تک انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا ہے) یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

حضور پاک ﷺ کی پوری سیرت اس بات کی گواہ ہے کہ آپ ﷺ نے زندگی کے ہر موڑ پر عدل و انصاف کا دامن پوری مضبوطی سے تھامے رکھا، کبھی کسی بھی موقع پر بے جا طرف داری کو برداشت نہیں فرمایا۔

ایک واقعہ:

چنانچہ صحیح راویات میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک واقعہ منقول ہے کہ بنو مخزوم جو قریش ہی کی ایک شاخ تھے، ان کی ایک عورت چوری کے جرم میں پکڑی گئی تھی، اور اس کے بارے میں چوری کی سزا کے طور پر ہاتھ کاٹے جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا، اس عورت کے خاندان والوں نے حضور ﷺ کے ایک چہیتے صحابی حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سفارشی بنا کر خدمت اقدس میں بھیجا اور اس عورت سے حد ساقط کرنے اور سزا ختم کرنے کی درخواست کی، یہ سن کر حضور ﷺ سخت ناراض ہو گئے اور نہایت جلال کے عالم میں ارشاد فرمایا: "أَتَشْفَعُ فِيْ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ؟" کیا تم اللہ تعالیٰ کی فرض کردہ حدود میں سے ایک کے بارے میں سفارش کرنے آئے ہو؟ پھر آپ ﷺ نے حضرات صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

" أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِيْنَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ، وَ إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ، وَ أَيْمُ اللّٰهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا." (مسلم: ٦٤٢، مشكوٰة: ٣١٤)

ترجمہ: ''اے لوگو! تم سے پہلی قوموں کو اسی بات نے ہلاکت میں ڈالا کہ ان میں سے اگر کوئی معزز شخص چوری کرتا ہوا پکڑا جاتا تو اُسے ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا، لیکن اگر کوئی کمزور چوری میں پکڑا جاتا تو اس پر حد جاری کی جاتی، اللہ کی قسم! اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کا بھی میں ہاتھ کاٹ دیتا۔''

آپ ﷺ نے صاف بتا دیا کہ قانون سب کے لیے برابر ہوگا، عدل وانصاف کے پیمانے سب کے لیے یکساں ہوں گے۔

عدل وانصاف کی فضیلت:

جو لوگ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں کتاب وسنت میں ان کے لیے بڑی فضیلتیں اور بشارتیں وارد ہوئی ہیں، قرآن ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی محبت کا اعلان کرتا ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝﴾ (المائدة : ٤٢)

ترجمہ: ''یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک (ضعیف) روایت مروی ہے، جس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

'' يَوْمٌ مِنْ إِمَامٍ عَادِلٍ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً. '' (الطبرانی، الترغيب)

ترجمہ: ''عادل بادشاہ کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔''

اور مذکورہ حدیث میں فرمایا: '' إِنَّ الْمُقْسِطِيْنَ .. الخ'' عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والے قیامت میں عرشِ الٰہی کے زیرِ سایہ نور کے منبروں پر اللہ تعالیٰ کی داہنی جانب بٹھائے جائیں گے۔ آج دنیا کے شاہی درباروں میں بھی کسی کی کرسی کا تختِ شاہی کی داہنی جانب ہونا اس کے خاص الخاص مرتبہ کی علامت سمجھا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ قیامت میں عدل وانصاف کرنے والوں کا خاص اکرام کیا جائے گا۔

ایک دوسری حدیث میں وارد ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: '' أَتَدْرُوْنَ مَنِ السَّابِقُوْنَ إِلٰى ظِلِّ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟'' قَالُوْا: ''اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ''، قَالَ:

''اَلَّذِيْنَ إِذَا أُعْطُوا الْحَقَّ قَبِلُوْهُ، وَ إِذَا سُئِلُوْهُ بَذَلُوْهُ، وَ حَكَمُوْا لِلنَّاسِ كَحُكْمِهِمْ لِأَنْفُسِهِمْ. '' (مسند أحمد، مشكوٰة : ٣٢٢)

ترجمہ: ''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ قیامت میں عرشِ الٰہی کے زیرِ سایہ کن لوگوں کو سبقت نصیب ہوگی؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: ''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں''، آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ تین قسم کے لوگ ہیں: (۱) جب اُن کے سامنے حق پیش کیا جاتا ہے تو وہ اُسے قبول کرتے ہیں۔ (۲) جب ان سے ان کے حق کا سوال کیا جاتا ہے تو وہ اُسے خرچ کر دیتے ہیں۔ (۳) لوگوں پر وہی حکم اور فیصلہ لاگو کرتے ہیں جو اپنی ذات پر کرتے ہیں۔''

حدیث کے آخری الفاظ ہیں: '' اَلَّذِيْنَ يَعْدِلُوْنَ فِيْ حُكْمِهِمْ وَ مَا وُلُّوْا. '' جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کی تمام فضیلتیں اور بشارتیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو اپنے عدالتی اور حکومتی فیصلوں میں بھی عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں، اور اپنے اہل وعیال اور اہلِ حقوق کے ساتھ بھی ان کا رویہ اور معاملہ عادلانہ اور منصفانہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عدل وانصاف کا حکم اور اس پر فضیلت وبشارت کا تعلق صرف اربابِ حکومت اور حکام ہی سے نہیں؛ بلکہ ہر شخص اپنے دائرۂ عمل میں اس کا مکلف ہے۔

حصولِ انصاف کے لیے تین کام:

اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حصولِ انصاف کے لیے محض کانفرنس اور اجلاس منعقد کر کے مطمئن ہو جانا کافی نہیں ہے، بلکہ حصولِ انصاف کے لیے تین کام کرنے ہوں گے: (۱) اپنی زندگی اور دائرۂ عمل میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا، جب ہم خود اپنے دائرۂ عمل میں عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کریں گے تو ضرور ہمارے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کیا جائے گا، یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کریں، اس کے باوجود ہمارے ساتھ ناانصافی ہو، آج اگر حالات پر امن نہیں، ظلم وزیادتی عام ہے، تو یہ صرف حکومتوں کی وجہ سے نہیں، حکومتیں بدلنے سے حالات نہیں بدلتے؛ بلکہ حالات بدلنے

سے حکومتیں بدلتی ہیں، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّىْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِّمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ (الأنعام : ١٢٩)

ترجمہ: ”اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے کیے ہوئے اعمال کی وجہ سے ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔“

اس لیے اگر ہم ظالم ہوں گے تو ہمارے حکام بھی ظالم ہوں گے، ایک حدیث پاک میں ارشاد ہے:

”كَمَا تَكُوْنُوْنَ كَذٰلِكَ يُؤَمَّرُ عَلَيْكُمْ.“ (بيهقى : ٢٣/٦، مشكوٰة:٣٢٣)

ترجمہ: ”جیسے تم ہوگے ویسے تم پر حاکم بنائے جائیں گے۔“

لہٰذا ہمیں سب سے پہلے اپنے کردار کو بدلنا ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ حالات کو ضرور بدلے گا، اسی کو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اگر ہم اپنے دائرۂ عمل میں عدل وانصاف قائم کریں گے تو ہمارے ساتھ بھی عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے گا، یہ وعدہ ہے اور حصولِ انصاف کے لیے پہلا کام یہی ہے۔

(۲) دوسرا کام یہ ہے کہ اگر حکومتیں اپنے ظالمانہ طرزِ عمل کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حکومتیں عدل وانصاف ہی کی بنیاد پر چلتی بھی ہیں اور ٹکتی بھی ہیں، ظلم وزیادتی کے ساتھ حکومتیں قائم نہ رہیں اور نہ رہ سکتی ہیں۔ ظالم حکومت میں ہماری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے حصولِ انصاف کی اجتماعی کوشش کریں اور ملک کے حکام کو یہ پیغام سنائیں کہ قیامِ امن کے لیے عدل قائم کیا جائے، ورنہ:

ملک لٹ جائے گا، یہ آثار نظر آتے ہیں — اب سیاست میں اکثر مکار نظر آتے ہیں
ملک کی آزادی میں لٹادی ہم نے جانیں — آج بے حیاؤں کو ہم ہی غدار نظر آتے ہیں

(۳) اس کے باوجود بھی اگر حکومت اپنا ظالمانہ رویہ نہ بدلے تو پھر ظالموں کو ان کی اوقات بتانے اور فتنہ وفساد مٹانے کے لیے کتاب وسنت میں امیر کی سرکردگی میں مقدس جہاد

132

کے فریضہ کو ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝﴾ (النساء : ٧٥-٧٦)

ترجمہ: ”اور (اے مسلمانو!) تمہارے پاس کیا جواز ہے کہ اللہ کے راستے میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے خاطر نہ لڑو جو یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لائیے جس کے باشندے ظلم کر رہے ہیں، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حامی پیدا کر دیجیے، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی مددگار کھڑا کر دیجیے، جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، اور جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے وہ طاغوت (شیطان) کے راستے میں لڑتے ہیں، لہٰذا (اے مسلمانو!) تم شیطان کے دوستوں (ظالموں) سے لڑو، (یاد رکھو کہ ظالم اور) شیطان کی چالیں درحقیقت کمزور ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی جہاد کا اصل مقصد محض خونریزی نہیں؛ بلکہ ظلم کا خاتمہ اور امن وامان کا قیام ہے، لہٰذا اگر حکومت اپنے ظالمانہ رویہ سے باز نہ آئے تو پھر حصولِ انصاف کا تیسرا کام یہ ہے کہ قانونی لڑائی لڑی جائے اور جو لوگ قانون کے دائرہ میں رہ کر حصولِ انصاف کی کوشش کر رہے ہیں ان کا حتی الامکان تعاون کیا جائے۔

حق تعالیٰ ہم کو حقائق سمجھا دے اور سارے عالم میں بالخصوص ہمارے ملک میں امن وامان قائم فرمادے۔ آمین۔

۱۶/ جمادیٰ الاولیٰ/ ۱۴۳۷ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۲۶/فروری/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا اَنْتَ اَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا اَنْتَ اَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا اَنْتَ اَهْلُهٗ، فَاِنَّكَ اَنْتَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۱۷)

حقوق العباد کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَتُؤَدُّنَّ الۡحُقُوۡقَ إِلٰى أَهۡلِهَا یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ، حَتّٰى یُقَادَ لِلشَّاةِ الۡجَلۡحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الۡقَرۡنَاءِ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٣٥ / باب الظلم)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن اہل حقوق کے حقوق ضرور دلوائے جائیں گے، یہاں تک کہ سینگ والی بکری سے بغیر سینگ والی بکری کو بدلہ دلایا جائے گا۔“

شریعت کے ایک حصہ کا تعلق حقوق اللہ سے اور دوسرے کا تعلق حقوق العباد سے ہے:

اللہ رب العزت نے اپنے محبوب اور آخری رسول جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو انسانوں کی صلاح وفلاح کے لیے جن ہدایات، احکامات اور تعلیمات کے ساتھ مبعوث فرمایا

انہیں بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، جس میں آپ ﷺ نے بتایا کہ بندوں پر ان کے رب کے کیا حقوق ہیں؟ ان حقوق کو کس طرح ادا کرنا ہے؟ اور ان کی ادائیگی پر کیا کیا انعامات کے وعدے ہیں؟ وغیرہ۔

(۲) دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ بندوں پر آپس میں ایک دوسرے کے کیا حقوق ہیں؟ اور ان حقوق کی کیا اہمیت ہے؟ گویا احکامِ شریعت کے دو حصے ہیں، ایک حصہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، تو دوسرے حصہ کا تعلق حقوقِ العباد سے ہے، گویا احکامِ شریعت کے دو حصے ہیں، ایک حصہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، تو دوسرے حصے کا تعلق حقوق العباد سے ہے، بلکہ شریعت کے اکثر احکام وہ ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے، چنانچہ ایک امریکی نومسلم نے قرآنِ کریم سے ایسے سو (۱۰۰) احکام یکجا کیے ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے، ان کا مفہوم حسب ذیل ہے:

(۱) بدمزاج اور سخت دل مت بنو۔ (آل عمران:۱۵۹)

(۲) غصہ قابو میں رکھو۔ (آل عمران:۱۳۴)

(۳) سب کے ساتھ بھلائی کرو۔ (النساء:۳۶)

(۴) تکبر نہ کرو۔ (الاعراف:۱۳)

(۵) دوسروں کی غلطیاں معاف کردیا کرو۔ (الاعراف:۱۹۹)

(۶) لوگوں کے ساتھ آہستہ بولا کرو۔ (طٰہٰ:۴۴)

(۷) اپنی آواز نیچی رکھا کرو۔ (لقمان:۱۹)

(۸) دوسروں کا مذاق نہ اُڑاؤ۔ (الحجرات:۱۱)

(۹) والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ان کے ساتھ ادب سے بات کرو۔ (الاسراء:۲۳)

(۱۰) والدین کی توہین ہو ایسا کوئی لفظ منہ سے مت نکالو۔ (الاسراء:۲۳)

(۱۱) کسی کے کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے اِجازت لو۔(النور:۵۸)
(۱۲) آپس میں قرض کا معاملہ کروتو اسے لکھ لیا کرو۔(البقرۃ:۲۸۲)
(۱۳) آباواجداد گمراہ ہوں تو ان کی تقلید نہ کرو۔(البقرۃ:۱۷۰)
(۱۴) اگر مقروض تنگ دست ہو تو خوشحالی میسر ہونے تک اسے مہلت دو۔(البقرۃ:۲۸۰)
(۱۵) سود نہ کھاؤ۔(البقرۃ:۲۷۵)
(۱٦) رِشوت نہ لو۔(البقرۃ:۱۸۸)
(۱۷) وعدہ نہ توڑو۔(البقرۃ:۱۷۷)
(۱۸) آپس میں اعتماد قائم رکھو۔(البقرۃ:۲۸۳)
(۱۹) سچ میں جھوٹ مت ملاؤ۔(البقرۃ:۴۲)
(۲۰) لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرو۔(النساء:۵۸)
(۲۱) انصاف پر مضبوطی سے جمے رہو۔(النساء:۱۳۵)
(۲۲) وراثت میں مردوں اور عورتوں دونوں کا حق ہے۔(النساء:۷)
(۲۳) وراثت میں وارثین کے حصے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر ہیں۔(النساء:۷)
(۲۴) یتیموں کا مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔(النساء:۱۰)
(۲۵) یتیموں کے ساتھ خیر خواہی کرو۔(البقرۃ:۲۲۰)
(۲٦) دوسروں کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔(النساء:۲۹)
(۲۷) لوگوں کے درمیان جھگڑا ہو تو صلح کراؤ۔(الحجرات:۹)
(۲۸) بدگمانی سے بچو۔(الحجرات:۱۲)
(۲۹) غیبت نہ کرو۔(البقرۃ:۲۸۳)
(۳۰) جاسوسی نہ کرو اور چغلی بھی مت کرو۔(الحجرات:۱۲)
(۳۱) اللہ تعالیٰ نے جو مال تمہیں دیا ہے اس میں سے خیرات کیا کرو۔(الحدید:۷)
(۳۲) غرباء کو کھانا کھلایا کرو۔(الماعون:۳)

(۳۳) ضرورت مندوں کو تلاش کر کے ان کی مدد کیا کرو۔(البقرۃ:۲۷۳)
(۳۴) بخل اور فضول خرچی سے بچو۔(الاسراء:۲۹)
(۳۵) اپنی خیرات لوگوں کو دِکھا کر اور احسان جتلا کر برباد نہ کرو۔(البقرۃ:۲٦۴)
(۳٦) مہمانوں کی خاطر داری کیا کرو۔(الذاریات:۲٦)
(۳۷) نیکی پہلے خود کرو، پھر دوسروں کو تلقین کرو۔(البقرۃ:۴۴)
(۳۸) زمین پر برائی نہ پھیلایا کرو۔(البقرۃ:٦۰)
(۳۹) لوگوں کو مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے مت روکو۔(البقرۃ:۱۱۴)
(۴۰) صرف اُن کے ساتھ لڑو جو تمہارے ساتھ لڑیں۔(البقرۃ:۱۹۰)
(۴۱) جنگ کے آداب کا خیال رکھو۔(البقرۃ:۱۹۱)
(۴۲) جنگ کے دوران پشت نہ دِکھاؤ۔(الانفال:۱۵)
(۴۳) دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔(البقرۃ:۲۵٦)
(۴۴) تمام انبیاء پر ایمان رکھو۔(البقرۃ:۲۸۵)
(۴۵) حیض کے دنوں میں مباشرت نہ کرو۔(البقرۃ:۲۲۲)
(۴٦) بچوں کو دو سال تک ماں کا دودھ پلاؤ۔(البقرۃ:۲۳۳)
(۴۷) زنا کے قریب ہرگز نہ جاؤ۔(الاسراء:۳۲)
(۴۸) تمہارے امیر کی اطاعت کرو۔(البقرۃ:۲۴۷)
(۴۹) کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ مت ڈالو۔(البقرۃ:۲۸٦)
(۵۰) سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسّی کو تھام لو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو۔(آل عمران:۱۰۳)
(۵۱) کائنات کی تخلیق اور عجائب میں گہرائی سے غور وفکر کرو۔(آل عمران:۱۹۱)
(۵۲) مرد اور خواتین اپنے اعمال کا برابر صلہ پائیں گے۔(آل عمران:۱۹۵)
(۵۳) محرم عورتوں سے نکاح مت کرو۔(النساء:۲۳)
(۵۴) مرد خاندان کے سربراہ ہیں۔(النساء:۳۴)

(۵۵) بخیل نہ بنو اور بخیلی کا حکم بھی مت دو۔ (النساء: ۳۷)

(۵۶) حسد نہ کرو۔ (النساء: ۵۴)

(۵۷) ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ (النساء: ۹۲)

(۵۸) خیانت کرنے والوں کے حمایتی مت بنو۔ (النساء: ۱۰۵)

(۵۹) گناہ اور ظلم وزیادتی میں کسی کا تعاون نہ کرو۔ (المائدۃ: ۲)

(۶۰) نیکی اور پرہیزگاری میں آپسی تعاون کرو۔ (المائدۃ: ۲)

(۶۱) ہمیشہ اکثریت سچائی کا معیار نہیں ہوتی۔ (الانعام: ۱۱۶)

(۶۲) انصاف پر مبنی گواہی دینے والے بن جاؤ اور انصاف کرو۔ (المائدۃ: ۸)

(۶۳) جرائم کی سزا دے کر مثال قائم کرو۔ (المائدۃ: ۳۸)

(۶۴) لوگوں کو گناہ کی بات کہنے اور حرام مال کھانے سے روکو۔ (المائدۃ: ۶۳)

(۶۵) مردہ جانور، خون اور سوّر کا گوشت حرام ہیں۔ (المائدۃ: ۳)

(۶۶) شراب اور دیگر منشیات سے پرہیز کرو۔ (المائدۃ: ۹۰)

(۶۷) جوا نہ کھیلو۔ (المائدۃ: ۹۰)

(۶۸) معبودانِ باطلہ کو گالی نہ دو، کہ کفار اللہ تعالیٰ کو گالی دیں۔ (الانعام: ۱۰۸)

(۶۹) ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ (الانعام: ۱۵۲)

(۷۰) کھاؤ اور پیو، لیکن حد تجاوزی نہ کرو۔ (الاعراف: ۳۱)

(۷۱) نماز کے وقت اچھے کپڑے پہنو۔ (الاعراف: ۳۱)

(۷۲) اگر کوئی غیر مسلم تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو اور اس کی حفاظت کرو۔ (التوبۃ: ۶)

(۷۳) طہارت قائم رکھو۔ (التوبۃ: ۱۰۸)

(۷۴) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی بھی مایوس مت ہو جاؤ۔ (یوسف: ۸۷)

(۷۵) نادانی میں ہوئی غلطیاں توبہ واصلاح کے بعد اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔ (النحل: ۱۱۹)

(۷۶) لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بلاؤ۔ (النحل: ۱۲۵)

(۷۷) کوئی شخص کسی کے گناہوں کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ (الاسراء: ۱۵)

(۷۸) غربت کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ (الاسراء: ۳۱)

(۷۹) اس بات کی پیروی مت کرو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ (الاسراء: ۳۶)

(۸۰) بیہودہ باتوں سے کنارہ کش رہو۔ (المؤمنون: ۳)

(۸۱) اجازت اور سلام کے بغیر کسی کے گھر میں داخل مت ہو جاؤ۔ (النور: ۲۷)

(۸۲) اللہ تعالیٰ اپنی ذات پر یقین رکھنے والوں کی حفاظت کرتا ہے۔ (النور: ۵۵)

(۸۳) زمین پر عاجزی کے ساتھ چلو۔ (الفرقان: ۶۳)

(۸۴) دنیا میں اپنی ذمہ داری کو مت بھولو۔ (القصص: ۷۷)

(۸۵) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ (القصص: ۸۸)

(۸۶) ہم جنس پرستی سے بچو۔ (العنکبوت: ۲۹)

(۸۷) اچھے کاموں کی نصیحت کرو اور برے کاموں سے روکو۔ (لقمان: ۱۷)

(۸۸) زمین میں اترا کر نہ چلو۔ (لقمان: ۱۸)

(۸۹) عورتیں اپنی زینت کی نمائش نہ کریں۔ (الاحزاب: ۳۳)

(۹۰) اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ تمام گناہ معاف فرمادے گا۔ (الزمر: ۵۳)

(۹۱) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہو جاؤ۔ (الزمر: ۵۳)

(۹۲) برائی کو اچھائی کے ذریعہ ختم کرو۔ (فصلت: ۳۴)

(۹۳) فیصلے باہمی مشورہ سے کیا کرو۔ (الشوریٰ: ۳۸)

(۹۴) تم میں عند اللہ زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ (الحجرات: ۱۳)

(۹۵) دین اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ (الحدید: ۲۷)

(۹۶) اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور علم والوں کے درجات بلند فرمائے گا۔ (المجادلۃ: ۱۱)

(۹۷) غیر مسلموں کے ساتھ مہربانی اور اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔ (الممتحنۃ: ۸)

(۹۸) خود کو لالچ سے بچاؤ۔ (التغابن: ۱۶)

(۹۹) اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو، وہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔(المزمل:۲۰)

(۱۰۰) سوال کرنے والے کومت جھڑکو۔(الضحیٰ:۱۰)

اس سے حقوق العباد کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے حقوق میں فضل
اور بندوں کے حقوق میں عدل کا معاملہ فرماتے ہیں:

لہٰذا جس طرح حقوق اللہ کی ادائیگی لازم اور ضروری ہے اسی طرح حقوق العباد کی ادائیگی بھی لازم اور ضروری ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ﴾ (بنی إسرائیل : ۲۶)

ترجمہ: ’’اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین کو اور مسافر کو۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں اور دیگر لوگوں کے جو مالی، جسمانی واخلاقی حقوق تمہارے ذمہ ہیں ان کو ادا کرنے کی فکر کرو۔

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام کچھ زیادہ ہی ضروری ہے، اس کی **پہلی وجہ** تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ تو بے نیاز ہیں، دیگر ساری مخلوق ان کی محتاج ہے، اگر ہم نے ان کے حقوق ادا نہ کیے تو اس میں ہمارا تو نقصان ہے، لیکن حق تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بہت ہی وسیع رحمت اور فضل وعفو والے ہیں، اس لیے وہ اپنے حقوق کی ادائیگی میں بندوں کی جانب سے ہونے والی کمی وکوتاہی میں اکثر فضل وعفو ہی سے کام لیا کرتے ہیں، اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کے بندے چوں کہ آپس میں بہت سے امور وحقوق میں ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں، اگر بندوں کے حقوق ادا نہ کیے جائیں تو ان کا نقصان ہوگا، اس لیے اللہ تعالیٰ حقوق العباد میں ہونے والی کمی وکوتاہی اور حق تلفی میں عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں، اور صاحبو! ہماری نجات اللہ تعالیٰ کے فضل میں ہے، عدل

میں نہیں، اگر ہمارے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ ہوا تو ہماری ہلاکت یقینی ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اور جب حق تعالیٰ حقوق العباد میں عدل وانصاف کا معاملہ فرماتے ہیں تو نجات کا راستہ یہی ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے۔

حقوق العباد ادا کرنے سے محبت
اور نہ ادا کرنے سے نفرت پیدا ہوتی ہے:

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حقوق کی ادائیگی سے محبت اور ادائیگیٔ حقوق میں کوتاہی سے نفرت وعداوت بڑھتی ہے، یہ حقیقت ہے کہ ایک شخص بظاہر اللہ تعالیٰ کا نافرمان، مجرم اور گنہگار ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر وہ اپنے گھر والوں، رشتہ داروں اور دیگر لوگوں کے واجب الذمہ حقوق کو اہتمام سے ادا کرتا ہے تو لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت وعزت اور عظمت پیدا ہو جاتی ہے، اس کے برخلاف دوسرا شخص بظاہر دیندار ہے، مگر وہ اپنے واجب الذمہ حقوق کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی کرتا ہے تو لوگوں کے دلوں میں ظاہری عبادت کے باوجود نہ اس کی محبت ہوتی ہے، نہ عزت اور نہ عظمت، بلکہ بسا اوقات اس سے لوگوں کو نفرت اور وحشت پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے بھی حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔

حقوق العباد میں کوتاہی پر دنیوی مواخذہ:

تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے حقوق میں ہونے والی کمی اور کوتاہی پر تو فوراً مواخذہ نہیں فرماتے، لیکن حقوق العباد میں ہونے والی کمی اور کوتاہی پر مواخذہ فرماتے ہیں، اور یہ مواخذہ کبھی تو آخرت سے قبل دنیا میں بھی فرما لیتے ہیں، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ﴾ (هود:۱۱۷)

ترجمہ: ''اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں پر ظلم کر کے ان کو تباہ کر دے، جب کہ ان کے باشندے صحیح روش پر چل رہے ہوں۔''

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرات مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی قوم کو محض مشرک اور کافر ہونے کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتے جو حقوق العباد کو ادا کرتی ہو اور اپنے آپسی معاملات درست رکھتی ہو۔ صاحب مدارکؒ اور امام رازیؒ نے اس آیت کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

اور قاضی بیضاویؒ کے بقول حضرات فقہاء نے اسی آیت کریمہ سے یہ قاعدہ مستنبط کیا ہے کہ حقوق کے ٹکراؤ کے وقت حقوق اللہ سے حقوق العباد مقدم ہوں گے۔ (مستفاد از: ''حکایتوں کا گلدستہ'' / ص: ۹۹، مولفہ: مولانا اسلم صاحب شیخوپوریؒ)

اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ ایک طرف بھوک لگی ہوئی ہے، کھانا بھی موجود ہے، اور دوسری طرف نماز کا وقت ہو رہا ہے، تو حکم یہ ہے کہ آدمی پہلے جلدی سے کھانا کھالے اور پھر آرام سے نماز پڑھے۔ یا مثلاً ایک آدمی کسی جگہ نماز میں مشغول ہے، اور قریب ہی میں ایک نابینا شخص کنویں میں گرنے کے قریب ہے، تو حکم یہ ہے کہ آدمی نماز توڑ دے اور نابینا کو بچالے، کیوں کہ نماز تو بعد میں بھی پڑھی جا سکتی ہے، اور حقوق اللہ تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے معاف بھی فرما دیں گے، مگر حقوق العباد بغیر معافی و تلافی کے معاف نہیں ہوں گے، لہٰذا دانائی اسی میں ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے۔

حقوق العباد میں کوتاہی پر اُخروی مواخذہ:

حکم ہے کہ اگر حقوق العباد میں کمی و کوتاہی ہوگئی ہو تو آج دنیوی زندگی میں صاحب حق کا حق ادا کیا جائے، یا پھر صاحب حق سے معافی صافی کر لی جائے، اگر خدانخواستہ ہم نے اس کا اہتمام نہ کیا تو ممکن ہے دنیوی مواخذہ سے تو کسی طرح بچ جائیں، مگر اُخروی مواخذہ سے نہیں بچ سکتے، کیوں کہ وہاں تو حقوق العباد کی عدالت میں عدل و انصاف سے کام لیا

جائے گا، تمام اہل حقوق کو ان کے حقوق دلوائے جائیں گے، یہاں تک کہ غیر مکلّف مخلوق کا بھی حق دلوایا جائے گا، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں ہے، حقوق العباد میں ہونے والی کمی و کوتاہی پر جو مواخذہ ہوگا اس میں یا تو حساب چکانا پڑے گا، جو یقیناً بہت ہی زیادہ مہنگا ہوگا، ورنہ عذاب بھگتنا پڑے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

حقوق ضائع کرنے والا قیامت کے دِن سب سے مفلس ہوگا:

اسی لیے حدیث پاک میں فرمایا گیا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ كَانَتْ لَهُ مَظْلَمَةٌ لِأَخِيهِ مِنْ عِرْضِهِ أَوْ شَيْءٍ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ، قَبْلَ أَنْ لَا يَكُوْنَ دِيْنَارٌ وَ لَا دِرْهَمٌ، إِنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلَمَتِهِ، وَ إِنْ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهِ، فَحُمِلَ عَلَيْهِ." (رواه البخاري، مشكوٰة: ٤٣٥)

ترجمہ: ''جس کسی نے اپنے کسی بھائی کے ساتھ ظلم و زیادتی، آبروریزی یا کسی اور معاملہ میں حق تلفی کی ہو تو آخرت سے قبل آج ہی معافی تلافی کے ذریعہ اپنا معاملہ صاف کر لے، (کیوں کہ دنیا میں مال کا چلن ہے اور آخرت میں اعمال کا چلن ہے) وہاں مال اور درہم و دینار نہ ہوں گے، اگر حقوق العباد میں کمی و کوتاہی یا حق تلفی کرنے والے کے پاس اعمالِ صالحہ ہوں گے تو اس کے ظلم کے بقدر مظلوم کو دلا دیے جائیں گے، اور اگر اعمالِ صالحہ نہ ہوں گے تو پھر مظلوم کے کچھ گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔'' اور اس طرح مواخذہ فرما کر عدل و انصاف کا تقاضا پورا کیا جائے گا، لیکن اس کا اثر یہ ہوگا کہ حق تلفی کرنے والے کی نیکیاں لے کر جن کا حق تلف کیا گیا تھا ان کو دے دی جائیں گی، یہ بھی ممکن ہے کہ ایک حق تلفی پر کئی کئی عبادتیں، نمازیں اور نیکیاں ضائع ہو جائیں، اور اگر نیکیاں نہ ہوں گی تو حق تلفی کرنے والے

نے جن کے حقوق کو ضائع کیا تھا ان کے گناہ اتنی مقدار میں حقوق ضائع کرنے والے پر ڈال دیے جائیں گے، اور دنیا میں حقوق ضائع کرنے کی وجہ سے اسے قیامت کے دِن وہ عذاب دیا جائے گا جس کا مظلوم مستحق تھا، اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ دنیا میں حقوق العباد کے سلسلہ میں غفلت اور کوتاہی برتنے والا قیامت کے دِن امت کا سب سے بڑا مفلس ہوگا۔ والعیاذ باللہ العظیم۔

جیسا کہ دوسری ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان اس سلسلہ میں موجود ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" أَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسُ؟" قَالُوْا:" الْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهٗ وَ لَا مَتَاعَ،" فَقَالَ:" إِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِیْ یَأْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِصَلٰوةٍ وَ صِیَامٍ وَ زَکٰوةٍ، وَ یَأْتِیْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا، وَ قَذَفَ هٰذَا، وَ أَکَلَ مَالَ هٰذَا، وَ سَفَكَ دَمَ هٰذَا، وَ ضَرَبَ هٰذَا، فَیُعْطٰی هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ، وَ هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ، فَإِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ أَنْ یُقْضٰی مَا عَلَیْهِ أُخِذَ مِنْ خَطَایَاهُمْ، فَطُرِحَتْ عَلَیْهِ، ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ." (مسلم، مشکوٰۃ:۴۳۵)

ترجمہ: ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بتاؤ، مفلس کون ہے؟“ صحابہؓ نے عرض کیا: ”جس کے پاس مال و درہم نہ ہو وہ مفلس ہے،“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میری امت کا اصل مفلس تو وہ ہے جو قیامت میں نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا، مگر اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا، تو اس کی نیکیاں مظلوم کو دے دی جائیں گی، پھر بھی اگر لوگوں کے حقوق باقی رہ جائیں گے تو مظلوموں کی غلطیاں اس ظالم پر ڈال دی جائیں گی، پھر اسے حقوق العباد میں ہونے والی کوتاہیوں کے سبب عذابِ جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔“

138

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا ایک واقعہ:

غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اس سلسلہ میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے، چنانچہ منقول ہے کہ امیر المومنین فی الحدیث حضرت عبداللہ بن مبارک ایک مرتبہ شام کے سفر پر گئے ہوئے تھے، اس دوران آپ نے کسی سے ایک قلم مستعار (استعمال کے لیے) لیا اور پھر اتفاق سے واپس کرنا بھول گئے، حتیٰ کہ ایران کے ایک شہر مرو تک پہنچ گئے تب وہ قلم یاد آیا، تو محض ایک قلم لوٹانے کے لیے دوبارہ شام کا سفر کیا اور قلم اس کے مالک کو لوٹایا۔
(تاریخ بغداد: ۱۰/ ۱۶۷، از: ”کتابوں کی درسگاہ میں“/ص: ۴۷)

اداءِ حقوق کے سلسلے میں حضرت فضیل بن عیاضؒ کا واقعہ:

ہمارے حضرت شیخ الزمان نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کا واقعہ نقل فرمایا، آپؒ مشائخ چشتیہ کے مقتدا ہیں، مگر ابتدا میں آپؒ کا حال بڑا عجیب تھا، ٹاٹ کا لباس اور اونی ٹوپی پہنے گلے میں تسبیح ڈال کر صحرا بہ صحرا لوٹ مار کرتے تھے، ڈاکوؤں کے سردار تھے، ساتھ ہی بہت ہی بامروّت و باہمت بھی تھے، جس قافلہ میں کوئی عورت ہوتی یا جس کے پاس تھوڑا مال ہوتا اُسے نہ لوٹتے، جس کو لوٹتے اس کا نام، پتہ اور واقعہ کی تاریخ وغیرہ لکھ لیا کرتے، لوٹے ہوئے مال میں سے اپنی پسند کا خود رکھتے، باقی رفقاء میں تقسیم کردیتے، نماز کا بڑا اہتمام تھا، رُفقاء میں سے جو نماز نہ پڑھتا اُسے خارج از جماعت کردیتے۔

جب اللہ تعالیٰ کا ان پر فضل ہوا اور ان کی توبہ کا وقت آیا تو ایسا ہوا کہ آپؒ نے ایک قافلہ پر حملہ کیا اور ان کی تمام املاک پر قبضہ کرلیا، اتفاق سے اس قافلہ میں ایک شخص تھا، جو بڑے اطمینان سے تلاوتِ قرآن میں مشغول تھا، فضیل بن عیاضؒ جب اس کے پاس پہنچے تو وہ یہ آیت تلاوت کررہا تھا:

﴿أَلَمْ یَأْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ﴾ (الحدید:۱۶)

یعنی ’’کیا اہلِ ایمان کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب ذکر اللہ سے خوف زدہ ہو جائیں۔‘‘ اس آیت کا حضرت فضیل بن عیاضؒ کے دل پر ایسا اثر ہوا جیسے کسی نے تیر مار دیا ہو، فوراً آپ پکار اٹھے: ’’بَلٰی یَا رَبِّ! قَدْ آنَ.‘‘ ’’جی ہاں، میرے رب! اب وہ وقت آ گیا۔‘‘ اس کے بعد آپؒ زار و قطار روئے، سچی توبہ کی اور لوٹا ہوا مال قافلہ والوں کو واپس لوٹا دیا، اس کے بعد آپؒ نے ادائیگیٔ حقوق کے اِرادے سے اپنا معمول بنا لیا کہ جو چیز جس سے چھینی تھی وہ اسے واپس کرتے، اخیر میں نیشاپور کے ایک یہودی سے چھینے ہوئے چالیس ہزار دینار باقی رہ گئے، جس کی ادائیگی سے آپؒ قاصر ہو گئے، تو اس کے پاس آ کر آپؒ معافی مانگنے لگے، اس نے معاف کرنے سے انکار کر دیا، تو آپؒ اس کی رقم ادا کرنے کی غرض سے اس کے ملازم ہو گئے، کچھ وقت کے بعد یہودی نے کہا کہ میں نے یہ عہد کیا تھا کہ جب تک تم میرا مال واپس نہیں کرو گے میں معاف نہیں کروں گا، لہٰذا اس وقت میرے تکیہ کے نیچے اشرفیوں کی تھیلی رکھی ہوئی ہے وہ تم لے لو، پھر دوبارہ مجھے دے دو، تاکہ میری قسم کا کفارہ ہو جائے، چنانچہ آپؒ نے ایسا ہی کیا، یہودی نے تھیلی کو قبضہ میں لے کر اچھی طرح دیکھا، پھر کہا کہ پہلے آپ مجھے مسلمان کیجیے، تب ہی معافی ہو سکتی ہے، کیوں کہ میں نے توراۃ میں پڑھا تھا کہ امتِ محمدیہ میں جو شخص صدقِ دل سے توبہ کرے گا وہ اگر خاک پر بھی ہاتھ ڈالے گا تو اللہ تعالیٰ اسے سونا بنا دے گا، لیکن مجھے اس پر یقین نہیں تھا، آج جب کہ میری وہ تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی تھیلی مٹی سے بھری ہوئی تھی جب آپ نے اسے ہاتھ لگایا تو اللہ تعالیٰ نے واقعۃً اس کو سونا بنا دیا، تو مجھے اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سچائی کا یقین ہو گیا اور میرے کفر کا تانبا ایمان کے زرِ خالص سے بدل گیا۔

ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ سے متاثر ہو کر اس یہودی کے ساتھ مزید ستر آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے:

گر رُخِ توبہ گریہ تر گردد　　خاک اندر کفِ تو زر گردد

’’اگر تیرا چہرہ تیرے آنسوؤں سے تر ہو جائے تو مٹی تیری مٹھی میں سونا ہو جائے۔‘‘

(مستفاد از: ’’تذکرۃ الاولیاء‘‘/صفحہ:۵۴، ’’جامع الحقوق‘‘/صفحہ:۴۴)

شریعت نے حقوق کی وصولی کے بجائے ادائیگی کی فکر دلائی:

افسوس کہ آج اپنے حقوق کی وصولی کی تو ہر کسی کو فکر ہے، لیکن اپنے واجب الذمہ حقوق کی ادائیگی کی فکر کم لوگوں کو ہے، حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ جب بندہ واجب الذمہ حقوق ادا کرنے کی فکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسانی بھی پیدا کر دیتا ہے، پھر شریعت نے حقوق کی وصول یابی کے بجائے واجب الذمہ حقوق کی ادائیگی کی فکر دلائی ہے اور ایک زمانہ میں اسی پر لوگوں کا عمل تھا۔

حقوق کی ادائیگی کے متعلق ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک واقعہ حدیث پاک میں منقول ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمتِ عالم ﷺ نے بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شخص نے کسی سے زمین کا ایک قطعہ (پلاٹ) خریدا، خریدار کو زمین میں سونے سے بھرا ہوا ایک گھڑا ملا، تو وہ شخص فوراً اس گھڑے کو لے کر زمین بیچنے والے کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ جناب! یہ آپ کی امانت ہے، کیوں کہ میں نے آپ سے زمین خریدی ہے، سونے سے بھرا ہوا یہ گھڑا نہیں، لہٰذا اس پر میرا کوئی حق نہیں، یہ آپ کا حق ہے، اس پر زمین دار نے کہا: بھائی! جب میں نے آپ کو زمین بیچ دی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے وہ بھی آپ کا ہو گیا، اس لیے یہ آپ ہی کا حق ہے، میرا نہیں، عجیب بات یہ پیش آئی کہ دونوں ایک دوسرے کا حق بتا کر ادا کرنا چاہتے تھے، وصول کرنے کے لیے کوئی راضی نہ ہوا، بالآخر دونوں حضرت داود علیہ السلام کے پاس فیصلہ کے لیے گئے، تو آپ نے کوئی فیصلہ سنانے سے پہلے عرض کیا: کیا تم دونوں کی کوئی اولاد ہے؟ ایک نے کہا: جی حضرت! میرا ایک جوان لڑکا ہے، دعا کیجیے

کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی مناسب رشتہ عطا فرما دے، دوسرے نے کہا: حضرت! میری بھی ایک جوان کنواری لڑکی ہے، اس کے حق میں بھی بہترین رشتہ کی دعا کر دیجیے، حضرت نے فرمایا کہ دعا کے ساتھ دوا بھی بتا دیتا ہوں کہ

" أَنْكِحُوا الغُلَامَ الجَارِيَةَ، وَ أَنْفِقُوا عَلَيْهِمَا مِنْهُ وَ تَصَدَّقُوا."

(متفق عليه، مشكوٰة : ۲۵۰)

ترجمہ: ''ان دونوں کا نکاح کر دو اور ان پر یہ سونا خرچ کر دو، پھر بھی جو بچ جائے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کر دو۔''

حقوق کی ادائیگی واقعۃً آپسی محبت اور برکت کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام کو حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

۲۶/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۷ھ/ قبل الجمعہ
مطابق: ۳۰/ جون/ ۲۰۱۶ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
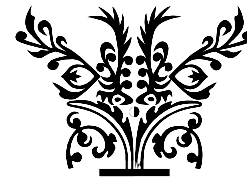
(۱۸)

جھگڑے کی مذمت اور صلح کی اہمیت وفضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَ الصَّدَقَةِ وَ الصَّلٰوةِ؟" قُلْنَا: بَلٰى، قَالَ: " إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وَ فَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ." (رواه أبو داود والترمذی، مشكوٰة : ٤٢٧/ باب ما ينهىٰ عنه من التهاجر و التقاطع و اتباع العورات)

ترجمہ: ''حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو روزہ، صدقہ اور نماز سے بھی افضل چیز نہ بتاؤں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: باہمی (خلش و رنجش کو دور کرنا اور) صلح کرانا، اور "فَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ" (یعنی آپس میں فتنہ وفساد پھیلانا اور تعلقات کا بگاڑ) مونڈ دینے والی چیز ہے۔'' (یعنی اعمال کے اجر وثواب اور حسن وکمال کو ختم کرنے والی چیز ہے)

تمہید:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک جیتا جاگتا، ہنستا بولتا اور چلتا پھرتا وجود عطا فرمایا ہے، نیز ہر ایک کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت اور ارادہ واختیار کی قوت سے بھی نوازا ہے، پتھر کی مورتوں کی طرح خاموش اور بے حس نہیں بنایا، پھر اسی کے ساتھ اپنی حکمت خاص کے تحت ہر انسان کی سوچ وفکر کے انداز میں بھی فرق رکھا ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر ایک کی سوچ وفکر دوسرے سے تقریباً مختلف ہوتی ہے، اب اگر خدانخواستہ سوچ وفکر کے اس اختلاف میں اخلاص واعتدال نہ ہو؛ بلکہ ضد، جہالت، بڑائی اور خودغرضی ہو، تو پھر یہی سوچ وفکر کا اختلاف آپسی بے جا جھگڑوں کا ذریعہ بن جاتا ہے، اور بالآخر یہ بے جا جھگڑا انسانی سماج کے افراد اور اقوام کے لیے دینی اور دنیوی اعتبار سے نحوست وہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔

پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مدظلہ العالی نے اپنے مواعظ میں ایک واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہوگیا، اس کے دو بیٹوں کے درمیان جائداد کی تقسیم میں ایک درخت کو لے کر جھگڑا ہوگیا، جو دونوں کی زمین کے درمیانی حصہ میں تھا، ایک نے کہا کہ یہ درخت میرا ہے، دوسرے نے کہا کہ میرا ہے، جب جھگڑا بڑھا تو مقدمہ کی نوبت آئی، اب دونوں نے اپنے اپنے وکیل روکے، اسی میں ایک طویل عرصہ گزر گیا اور مقدمہ کے خرچ میں ان کی جائداد تک بک گئی، بالآخر مقدمہ کا فیصلہ یہ آیا کہ ''درخت کو کاٹ کر دونوں کو آدھا آدھا دے دیا جائے۔'' (خطباتِ فقیر:۲۲/۱۸۶)

جھگڑے کی نحوست وممانعت اور حفاظت کی تدابیر:

اس لیے قرآن وحدیث میں بے جا جھگڑے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ (الأنفال : ٤٦)

ترجمہ: ''اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم (کمزور اور) بزدل ہوجاؤ گے، اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی، اور صبر سے کام لو، یقین رکھو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ آپسی جھگڑا کمزوری، بزدلی اور بربادی کا ذریعہ ہے، جیسا کہ احادیث مبارکہ سے بھی واضح ہوتا ہے، چنانچہ شب قدر کے متعلق حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ ہمیں شب قدر سے متعلق اطلاع دینے کی غرض سے نکلے، اس وقت دو شخص (جن میں ایک عبداللہ بن ابی حدردؓ اور دوسرے کعب بن مالکؓ تھے، یہ دونوں مطلقاً یا شب قدر کی تعیین کے متعلق) جھگڑ رہے تھے۔ (مستفاد از: مظاہر حق جدید:۲/۴۱۲) تو آپ ﷺ نے فرمایا: '' خَرَجْتُ لِأُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ، فَتَلَاحىٰ فُلَانٌ وَ فُلَانٌ، فَرُفِعَتْ. '' (رواه البخاري، مشكوٰة : ١٨٢) ''کہ میں تمہیں شب قدر کے متعلق اطلاع دینے کے لیے نکلا تھا، مگر فلاں اور فلاں کے جھگڑے کی نحوست سے شب قدر کی تعیین اٹھالی گئی۔'' تو اس سے بھی جھگڑے کی نحوست کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: '' تُفْتَحُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الِاثْنَيْنِ وَ يَوْمَ الْخَمِيْسِ، فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا، إِلَّا رَجُلًا كَانَتْ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ أَخِيْهِ شَحْنَاءُ، فَيُقَالُ: '' أَنْظِرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا. '' (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٢٧)

''ہر پیر اور جمعرات کو جنت کے دروازے (اس کے طبقات، درجات اور بالاخانے نزولِ رحمت کے لیے) کھول دیے جاتے ہیں، (مراد ان دِنوں مشرکوں کے علاوہ مومنوں کی بخشش کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں کثیر مقدار میں اترتی ہیں) جس کی وجہ سے بکثرت مومنوں کو معاف کیا جاتا ہے، یا ان کے درجات کو بلند کیا جاتا ہے) البتہ جن میں باہمی رنجش اور جھگڑا ہوتا ہے ان کی بخشش ملتوی کردی جاتی ہے، یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان

دونوں کو صلح کرنے تک چھوڑ دو۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ صلح کرتے ہیں تو انہیں معاف کر کے اللہ تعالیٰ کی عنایت ورحمت اور مغفرت سے نوازا جاتا ہے، ورنہ تو یہ جھگڑا ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی عنایت ورحمت اور مغفرت سے محرومی کا سبب بن جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ بے جا جھگڑوں سے شر کا دروازہ کھل جاتا ہے اور خیر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اس سے بندہ شر سے قریب اور خیر سے دور ہو جاتا ہے، اس لیے کسی بھی فرد یا قوم کی بربادی کی بڑی نشانی جھگڑا ہے اور جھگڑالو شخص دین دار نہیں ہوسکتا، کیوں کہ جیسے ایک ڈول پانی کو پیشاب کا ایک قطرہ خراب کر دیتا ہے اسی طرح نیک اعمال کے اجر وثواب اور حسن و کمال کو جھگڑا خراب کر دیتا ہے۔ غالباً ان ہی حقائق کو بتانے کے لیے مذکورہ حدیث میں جھگڑے کو ''حالقہ'' یعنی اعمال کے اجر وثواب اور حسن وکمال کو ختم کرنے والا فرمایا گیا۔

جھگڑوں سے حفاظت کا بہترین ذریعہ قرآن کے بیان کے مطابق صبر ہے، مطلب یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ناخوش گوار بات پیش آجائے تو اس کے ردِعمل میں انتقامی رویہ اختیار کرنے کے بجائے صبر کر کے برداشت کرلیا جائے، تاکہ بات آگے نہ پہنچے، ان شاء اللہ یہ عمل جنت میں محل کا ذریعہ بنے گا، حدیث پاک میں وارد ہے:

'' مَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَ هُوَ مُحِقٌّ، بُنِيَ لَهُ فِيْ وَسْطِ الْجَنَّةِ.'' (ترمذی، مشکوٰۃ:۴۱۲)

ترجمہ: ''جو شخص صاحب حق ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے (صبر وضبط سے کام لے) تو اس کے لیے جنت کے بیچ میں محل بنایا جائے گا۔''

ایک اور روایت میں ہے:

عَنْ أَبِيْ مَالِكِ نِ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:'' سِتُّ خِصَالٍ مِنَ الْخَيْرِ، جِهَادُ أَعْدَاءِ اللّٰهِ بِالسَّيْفِ، وَ الصَّوْمُ فِيْ يَوْمِ الصَّيْفِ، وَ حُسْنُ الصَّبْرِ عِنْدَ الْمُصِيْبَةِ، وَ تَرْكُ الْمِرَاءِ وَ أَنْتَ مُحِقٌّ، وَ تَبْكِيْرُ الصَّلٰوةِ فِيْ يَوْمِ الْغَيْمِ، وَ حُسْنُ

الْوُضُوْءِ فِيْ أَيَّامِ الشِّتَاءِ.'' (شعب الإيمان: ۲۵۰۰ / فضل الوضوء، کنز العمال)

''خیر و بھلائی کی چھ خصلتیں (نہایت اہم) ہیں: (۱) اللہ کے دشمنوں کے ساتھ تلوار (اسلحہ) کے ذریعہ جہاد کرنا (۲) گرمی میں روزہ رکھنا (۳) مصیبت میں اچھی طرح صبر کرنا (۴) حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا ترک کر دینا (۵) ابر آلود موسم میں نماز جلدی پڑھنا (۶) سردی کے ایام میں اچھی طرح وضوء کرنا۔''

ان خصلتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو صبر وضبط آسان ہو جائے گا۔ لیکن اگر معاملہ صبر سے بڑھ کر شکایت تک پہنچ جائے تو اس وقت قرآنی ہدایت کے مطابق صلح کی کوشش کی جائے۔

وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ :

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ (النساء: ۱۲۸)

ترجمہ: ''اور صلح بہت ہی اچھی چیز ہے۔'' صاحب روح المعانی علامہ آلوسی بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ ﴿وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ کا مطلب ہے: "وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ مِّنَ الْفُرْقَةِ وَ سُوْءِ الْعِشْرَةِ، أَوْ مِنَ الْخُصُوْمَةِ" ''یعنی صلح کرنا جدائی اور برے طریقے پر زندگی گزارنے سے بہتر ہے، یا یہ کہ صلح کرنا جھگڑا کرنے سے بہتر ہے۔'' (مستفاد از: تفسیر انوار البیان: ۱/۷۱۳)

کیوں کہ جھگڑا بزدلی اور کمزوری کا سبب ہے، جب کہ صلح بہادری اور قوتِ باہمی کا ذریعہ ہے، جھگڑا برے لوگوں کا برا طریقہ ہے، جب کہ صلح اچھے لوگوں کا اچھا طریقہ ہے، جھگڑا اللہ تعالیٰ کی عنایت، رحمت، مغفرت، اعمال کے اجر وثواب اور حسن وکمال سے محروم کرتا ہے، جب کہ صلح اللہ تعالیٰ کی عنایت، رحمت اور رضا کا ذریعہ ہے، اسی لیے فرمایا کہ ﴿وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ ''صلح ہی بہتر چیز ہے۔''

اگر کبھی کسی سے جھگڑا ہو بھی جائے تو صلح میں پہل کرنی چاہیے، حتیٰ کہ اگر صلح نہ کرنے کی قسم کھالی ہو تو اسے بھی توڑ دو، (قسم کا کفارہ ادا کردو دس مسکینوں کو کھانا کھلا کر، یا ان کو کپڑے پہنا کر، یا غلام آزاد کر کے) چنانچہ روح المعانی اور اسباب النزول (صفحہ:۷۲، مستفاداز: انوارالبیان: ۱/۳۱۹) میں مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی بہن اور بہنوئی کے درمیان کچھ ناراضگی ہوئی، جس کی وجہ سے خود انہوں نے بھی یہ قسم کھالی کہ اب ان کے پاس کبھی نہیں جائیں گے، نہ ان سے بات کریں گے اور نہ ہی ان دونوں میاں بیوی کے درمیان صلح کروائیں گے، وہ کہتے تھے کہ میں نے تو قسم کھا رکھی ہے، اب میں اس کے خلاف ورزی کیسے کروں؟ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ آئی، چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿ وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَ تَتَّقُوا وَ تُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ ط وَ اللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝﴾ (البقرة : ۲۲۴)

ترجمہ: ’’اور تم اپنی قسموں کو نیکی کرنے اور تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنے اور لوگوں کے درمیان صلح کرنے سے آڑ نہ بناؤ، اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔‘‘

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات سے بھی منع فرمادیا کہ کوئی شخص لوگوں کے درمیان صلح نہ کرانے کی قسم کھائے، کیوں؟ ﴿وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ ’’صلح ہی بہتر چیز ہے۔‘‘ لہٰذا صلح نہ کرانے کی قسم مت کھاؤ، بلکہ لوگوں کے درمیان حسب ضرورت مصالحت کنندہ کا رول ادا کرو، صلح کرانے کی کوشش کرو۔

صلح کرانا اللہ تعالیٰ کا حکم اور مسلمانوں کا اہم فریضہ ہے:

قرآنِ پاک وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم دو فریق (یا خاندان) کے درمیان ہونے والے جھگڑے میں مصالحت کے لیے مخلصانہ کوشش کروگے تو (اخروی فضائل کے ساتھ دنیوی

اعتبار سے بھی) اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور کامیابی سے ہم کنار فرمائیں گے، تمہاری مخلصانہ کوشش کے نتیجے میں جھگڑا ختم ہوجائے گا، جیسا کہ فرمایا:

﴿ إِنْ يُّرِيدَا إِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ﴾ (النساء : ۳۵)

ترجمہ: ’’اگر وہ دونوں (صلح و) اصلاح کرانا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں فریق (یا ان کے خاندان) کے درمیان اتفاق پیدا فرمادے گا۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ مصالحت کی مخلصانہ کوشش کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اور عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ خدانخواستہ اگر دو افراد یا دو فریق کے درمیان جھگڑا وفساد ہوجائے تو ان میں صلح کی مخلصانہ کوشش کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا حکم اور مسلمانوں کا اہم ملی فریضہ ہے، یہ سمجھنا کہ فلاں اور فلاں کا جھگڑا ہے، ہمیں اس میں پڑنے کی کیا ضرورت؟ تو یہ سوچ منافقانہ ہے، مومنانہ نہیں ہے، کیوں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝﴾ (الحجرات : ۱۰)

ترجمہ: ’’مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان میل ملاپ اور صلح کی کوشش کرو اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تمہارے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جائے۔‘‘

اللہ کے رسول ﷺ کی نگاہ میں صلح کی اہمیت:

خود رحمت عالم ﷺ صلح کا خوب اہتمام فرماتے تھے، اس کا اندازہ اس سے بخوبی ہوتا ہے کہ باوجود یہ کہ آپ ﷺ نماز باجماعت کا حد درجہ اہتمام فرماتے تھے، عین میدانِ جنگ میں بھی جہاں تک سخت حالات درپیش نہ ہوں آپ ﷺ کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی، حتیٰ کہ مرض الوفات میں جب کہ خود چلنے کی طاقت نہیں تھی تب بھی آپ ﷺ نے جماعت کا اہتمام فرمایا؛ لیکن قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں ایک جھگڑا سلجھانے اور مصالحت کے لیے آپ

ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ بنفسِ نفیس تشریف لے گئے، اوراس فریضۂ مصالحت میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ حضرت بلالؓ نے حضرت ابوبکرؓ کوامامت کے لیے آگے بڑھادیااورنمازشروع ہونے کے بعدرحمت عالم ﷺ تشریف لائے۔(بخاری شریف:۱/۳۷۰/کتاب الصلح)

اس واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایاجاسکتاہے کہ آپ ﷺ کی نگاہ میں مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کس قدراہمیت تھی؟

عہدِ رسالت میں صلح کاایک واقعہ:

علاوہ ازیں تفسیر درِ منثور (۲/۵۷) میں عہدِ رسالت میں پیش آمدہ صلح کا ایک واقعہ منقول ہے، جس سے صلح کی اہمیت کااندازہ کیاجاسکتاہے، واقعہ اس طرح ہے کہ شاس بن قیس ایک بوڑھا یہودی تھا، جو بہت سخت کافرتھا، یہ شخص مسلمانوں سے بہت زیادہ کینہ رکھتا تھا، اور بہت سخت حاسد بھی تھا، ایک مرتبہ اس کا صحابہؓ کی ایک جماعت پر گزرہوا، جن میں انصارِ مدینہ کے دومشہور خاندان اوس اورخزرج کے حضرات جمع تھے، حالاں کہ ان کے درمیان زمانۂ جاہلیت میں ہمیشہ لڑائیاں رہتی تھیں، اسلام ان کے لیے ابررحمت بن کرآیااور صدیوں سے جوآگ بجھائے نہ بجھتی تھی وہ لمحوں میں سرد ہوکررہ گئی اور دونوں قبیلے اخوتِ اسلامی کے رشتہ سے شیروشکر ہوکررہنے لگے، یہودیوں اورخصوصاً شاس بن قیس کوان قبائل کا اتحاداورآپسی محبت ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، اس نے ایک یہودی نوجوان کوحکم دیاکہ توجاکران کے پاس بیٹھ جااوران کوان کی پرانی لڑائیاں یاددلادےاوران کے سامنے بعض وہ اشعار پڑھ دے جو یومِ بعاث کے سلسلہ میں انہوں نے کہے تھے، (بعاث ایک زبردست جنگ ہوئی تھی، جس میں اوس کوخزرج پرغلبہ ہواتھا) اس نوجوان کی اس منحوس حرکت کانتیجہ یہ نکلاکہ دونوں خاندان کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوئے، ان کی جاہلی حمیت لوٹ آئی اور دونوں فریق میں لڑائی چھڑگئی، رحمت عالم ﷺ کوجیسے ہی اس کی اطلاع ملی آپ ﷺ مہاجرین کوساتھ لے کربہت تیزتیزتشریف لائے اور دونوں فریق کوشیطان کی اس وسوسہ اندازی سے باخبر کیا، اسی موقع پرسورۂ آلِ عمران کی یہ آیاتِ مبارکہ نازل ہوئیں جن میں ارشادفرمایاگیا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۝ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا ۪ وَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَ كُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ۝﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈروجیساکہ اس سے ڈرنے کاحق ہے، اورتم کواسلام ہی کی حالت میں موت آنی چاہیے، تم سب مل کراللہ کی رسّی کومضبوطی سے پکڑلو، اور آپس میں پھوٹ نہ پیداکرو، اوراپنے اوپراللہ کے اس انعام کویادکروکہ تم آپس میں دشمن تھے، پھراللہ نے تمہارے دلوں کوجوڑدیااورتم اللہ کے کرم سے بھائی بھائی بن گئے، نیزتم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پرتھے، تواللہ نے تم کواس سے نکالا، اللہ اسی طرح تم کواحکام بتاتے رہتے ہیں تاکہ تم ہدایت پرقائم رہو۔''

زبانِ مبارک سے ان آیتوں کاسنناہی تھاکہ دلوں کی کایاپلٹ گئی، لوگوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیےاورایک دوسرے سے گلے مل کرخوب روئے۔

(طبرانی:۴/۲۰، انوارالبیان:۱/۴۷۵)

اس سے ثابت ہواکہ آپس میں پھوٹ ڈالنااورجھگڑاکرانایہودیوں اوراللہ تعالیٰ کے باغیوں کاطریقہ ہے، جب کہ صلح کراناحضور ﷺ اورآپ کے سچے متبعین کاطریقہ ہے، جولوگ اس طریقے کواپناتے ہیں ان کے لیے بڑے فضائل واردہوئے ہیں، جیساکہ مذکورہ حدیث میں فرمایاگیاکہ ان کے لیے (نفلی) روزہ، صدقہ اورنمازوغیرہ سے زیادہ اجروثواب صلح کرانے کاہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں آپس میں مصالحت کی توفیق عطافرمائے۔آمین۔

یکم رمضان/۱۴۳۷ھ، بروز: منگل

مطابق: ۷/جون/۲۰۱۶ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا اَنْتَ اَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا اَنْتَ اَهْلُهٗ،
وَ افْعَلْ بِنَا مَا اَنْتَ اَهْلُهٗ، فَاِنَّكَ اَنْتَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۱۹)

گالی کی مذمت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ عَبۡدِاللّٰهِ بۡنِ مَسۡعُوۡدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "سِبَابُ الۡمُسۡلِمِ فُسُوۡقٌ، وَ قِتَالُهٗ كُفۡرٌ." (متفق عليه، مشكوٰة: ٤١١/ باب حفظ اللسان من الغيبة والشتم)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کسی مسلمان کو گالی دینا فسق ہے، اور اس کے ساتھ (اسلام کی وجہ سے یا اس کے قتل کو حلال سمجھ کر) قتال اور لڑائی کرنا کفر ہے۔'' (اور اگر یہ بات نہیں تو کسی دشمنی کی وجہ سے اس کے ساتھ قتال کرنے میں خوفِ کفر ہے۔ یہاں حقیقۃً قتال مراد لینا بھی ممکن ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ ''قتال'' سے مخاصمت (اور جھگڑا) مراد ہو)۔ (عمدۃ القاری)

گالی کی حقیقت:

اللہ رب العزت کی عطا کردہ عظیم الشان نعمت زبان کا بے ہودہ، غلیظ، غلط، فحش اور کسی بھی صورت میں ایسا ناجائز استعمال جو دوسرے کے لیے اذیت، تکلیف، تحقیر اور دل آزاری و دل شکنی کا سبب ہو گالی کہلاتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ گالی سن کر کسی بھی شریف اور

غیرت مند انسان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی اس تکلیف کا اظہار کر دیتا ہے، تو کوئی صبر کا کڑوا گھونٹ پی کر ہی رہ جاتا ہے، اور دل آزاری اور دل شکنی خواہ کسی بھی انسان کی ہو بہت بری بات ہے، یہی وجہ ہے کہ گالی جو دل آزاری کا ذریعہ ہے اسے قرآن و حدیث میں سنگین ترین جرم اور بدترین گناہ قرار دے کر روک دیا گیا۔

گالی کی ممانعت:

چنانچہ ابوداؤد شریف کی ایک روایت ہے:

عَنۡ زَيۡدِ بۡنِ خَالِدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا تَسُبُّوا الدِّيۡكَ، فَإِنَّهٗ يُوۡقِظُ لِلصَّلٰوةِ." (أبوداوٗد: ٦٩٦/٢ / كتاب الأدب / باب في الديك والبهائم، مشكوٰة: ٣٦١)

ترجمہ: ''رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مرغے کو گالی مت دیا کرو، اس لیے کہ وہ لوگوں کو صبح سویرے نماز کے لیے بیدار کرتا ہے۔''

بات یہ ہے کہ صبح سویرے مرغے کے چلانے سے کسی کی نیند میں خلل واقع ہو سکتا ہے، جس کی وجہ سے بعض لوگ اسے برا بھلا کہنے لگتے ہیں، تو حدیث پاک میں اس سے روکا گیا اور مرغے کو گالی دینے سے منع کیا گیا، غور کرنے کا مقام ہے کہ جب مرغے کو گالی دینے کی ممانعت وارد ہوئی تو انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اسے گالی دینے کی کیسے اجازت ہو سکتی ہے، اسی لیے شریعت میں صرف مسلمان ہی کو نہیں؛ بلکہ کسی بھی انسان کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے، حتیٰ کہ گالی کے جواب میں بھی گالی دینا جائز نہیں ہے، چنانچہ مشرکین اور دشمنانِ دین اپنی خصلتِ بد کے مطابق ہمارے آقا ﷺ اور حضراتِ صحابہؓ کو گالیاں دیا کرتے تھے، حضراتِ صحابہؓ کو بہت ناگوار گزرتا، خصوصاً انصار کے دو نوعمر لڑکوں میں حضرت معاذ اور معوّذ رضی اللہ عنہما کو پتہ چلا کہ ابوجہل ہمارے آقا ﷺ کو گالی دیتا ہے اور برا بھلا کہتا ہے، تو انہوں نے قسم کھالی، بقولِ شاعر:

قسم کھائی ہے مرجائیں گے یا ماریں گے ناری کو سنا ہے گالیاں دیتا ہے وہ محبوب باری کو

پھر انہیں کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے اُسے جہنم رسید فرمادیا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۳۵۱)

ایک مرتبہ بعض صحابہؓ نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ حضور! یہ دشمنانِ دین آپ کو اور ہمیں گالیاں دیتے ہیں، اگر اجازت ہو تو ہم بھی انہیں کچھ سنا دیا کریں، تو جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿ وَ قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ ط إِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ط إِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴾ (بنی إسرائیل: ۵۳)

ترجمہ: ''میرے (مومن) بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہا کریں جو بہترین ہو (یعنی گالی کے جواب میں بھی گالی نہ دیں، کیوں کہ یہ جھگڑے اور فساد کا ذریعہ ہے) شیطان تو لوگوں کے درمیان فساد ڈالنا چاہتا ہے، شیطان یقینی طور پر انسان کا کھلا دشمن ہے۔''
(اسباب نزول القرآن: ۱/۲۷۷)

حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ کی مجلس میں ایک شخص حضرت صدیق اکبرؓ کو گالی دینے لگا، مگر حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کے مطابق آپ نے صبر و تحمل اور وقار کا مظاہرہ فرمایا اور تبسم فرمایا، لیکن جب وہ بے حیا زیادہ گالیاں دینے لگا تو صدیق اکبرؓ نے ایک کا جواب دیا، حالانکہ ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (الشوریٰ: ۴۰) (کسی برائی کا بدلہ اُسی جیسی برائی ہے) کے تحت اس کی گنجائش تو تھی، مگر یہ بات ان کے مقامِ صدیقیت کے خلاف تھی، ان کے شایانِ شان وہ بات تھی جس کو قرآن نے اس طرح بیان فرمایا کہ:

﴿ وَ إِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوْا عَنْهُ ﴾ (القصص: ۵۵)

''جب وہ کوئی لغو اور بیہودہ بات سنتے ہیں تو اُسے ٹال جاتے ہیں۔''

خیر، جب صدیق اکبرؓ نے اس کی گالیوں کے جواب میں ایک گالی دے دی تو حضور ﷺ ناراض ہوئے اور اُٹھ گئے، جب صدیق اکبرؓ نے وجہ دریافت کی تو فرمایا:

''كَانَ مَعَكَ مَلَكٌ يَرُدُّ عَلَيْهِ، فَلَمَّا رَدَدْتَ عَلَيْهِ وَقَعَ الشَّيْطَانُ.''

(رواه أحمد، مشكوٰة: ۴۳۳)

''تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا، جو تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا، مگر جب تم نے خود جواب دینا شروع کر دیا تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آ گیا۔'' (اور شیطان کا تو کام ہی لڑائی پر آمادہ کرنا ہے، اس لیے مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں تم مظلوم سے ظالم نہ بن جاؤ، تو فوراً حضرت صدیق اکبرؓ اپنی اس حرکت سے تائب ہو گئے)۔

اس میں گالی کے جواب میں گالی دینے سے روک دیا گیا، کیوں کہ اس سے فساد ہی پیدا ہو سکتا ہے، فائدہ کبھی نہیں ہو سکتا، البتہ گالی کا جواب اگر خوش اخلاقی سے دیا جائے تو آخرت کے اجر و ثواب کے علاوہ کبھی کبھی نقد نفع و نتیجہ بھی سامنے آتا ہے۔

ایک واقعہ:

چنانچہ منقول ہے کہ عمران بن حطان ایک خارجی تھا جو حجاج بن یوسف کے مخالفین میں سے تھا، حجاج نے اسے گرفتار کر کے جلاد کو حکم دیا کہ ''بدکار عورت کے اس بیٹے کی گردن اُڑا دو۔'' عمران نے بڑے پروقار انداز میں سر اٹھا کر کہا: ''حجاج! تمہارے بڑوں نے تمہاری غلط تربیت کی ہے، موت کے بعد رہ کیا جاتا ہے؟ تم نے مجھے گالی دی، تو جواباً میں بھی اگر تمہیں گالی دوں تو مجھے اب کیا ڈر ہو سکتا ہے؟ لیکن گالی دینا بہادروں اور شریفوں کے شایانِ شان نہیں'' ع...... ''کبھی زہر بھی کرتا ہے کارِ تریاق'' حجاج کی گالی عمران کے لیے نجات کا باعث بنی، حجاج نے جب اس کا یہ جملہ سنا تو شرمندگی سے سر جھکا لیا، پھر اس سے کہا: ''کیا تمہارے ساتھ احسان کیا جا سکتا ہے؟'' عمران نے کہا: ''کیوں نہیں؟'' چنانچہ حجاج نے گھوڑا اور زادِ راہ دے کر اسے اپنے علاقہ کی طرف رخصت کیا، عمران وہاں پہنچا تو اس کے قبیلہ کے لوگوں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزادی دی ہے، حجاج نے نہیں، لہٰذا اب بھرپور تیاری کے ساتھ دوبارہ حجاج پر حملہ کرو۔'' جواب میں عمران نے کہا کہ ''حجاج نے مجھ پر احسان کیا ہے، میں اس کا

جواب نقصان سے نہیں دے سکتا۔''
(العفو والاعتذار لابی الحسن الرقام:۵۵۹،از:''کتابوں کی درسگاہ میں''/ص:۴۴)

گالی کی مذمت:

پھر یہ بات بھی ہے کہ گالی دینے والا ظالم ہوتا ہے اور جس کو گالی دی جاتی ہے وہ مظلوم ہوتا ہے، عجیب بات یہ ہے کہ گالی عموماً ان ماؤں اور بہنوں کی دی جاتی ہے جو گھر میں ہوتی ہیں، جن کا کوئی قصور بھی نہیں ہوتا، اور اکثر گالیاں عورتوں ہی کی توہین پر مبنی ہوتی ہیں، لہٰذا گالی دینے والا اپنے مخاطب کے علاوہ بے قصور خواتین پر بھی ظلم کرتا ہے، ایک حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ وَ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "اَلْمُسْتَبَّانِ مَا قَالَا فَعَلَی الْبَادِئِ، مَا لَمْ یَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ." (مسلم، مشکوٰۃ: ۴۱۱)

ترجمہ: ''گالی کی جتنی بھی مذمت اور وبال ہے وہ سب ابتدا کرنے والے (ظالم) پر ہے، جب تک کہ مظلوم زیادتی نہ کرے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ گالی دینے والا ظالم اور جس کو گالی دی جائے وہ مظلوم ہے، ایک مسلمان مظلوم تو ہو سکتا ہے، ظالم نہیں۔ صاحبو! علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ گالی دینا ایک سچے پکے مسلمان کے شایانِ شان نہیں، بلکہ منافق کی پہچان ہے، ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَیْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَ لَا بِاللَّعَّانِ وَ لَا الْفَاحِشِ وَ لَا الْبَذِیِّ." (رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ۴۱۳)

ترجمہ: ''(کامل) مومن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ طعنہ زنی کرے، لعنت کرے، فحش گفتگو کرے اور گالی بکے۔''

یہ عادتیں تو منافق میں ہوتی ہیں، چنانچہ حدیث پاک میں ارشاد فرمایا:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِیْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَ مَنْ كَانَتْ فِیْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِیْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ، حَتّٰی یَدَعَهَا، إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَ إِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَ إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ." (متفق علیه، مشکوٰۃ: ۱۷)

ترجمہ: ''جس شخص میں چار باتیں ہوں وہ خالص اور پکا (عملی اعتبار سے) منافق ہے، اور جس کے اندر ان میں سے ایک بات بھی ہو تو اس میں منافقت کی خصلت و عادت ہے، جب تک اسے چھوڑ نہ دے، اور وہ چار باتیں یہ ہیں: (۱) جب کبھی اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ (۲) جب کبھی بات کرے تو جھوٹ بولے۔ (۳) جب کبھی وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔ (۴) اور جب کبھی کسی سے جھگڑے تو گالی گلوچ کرے۔''

اس سے ثابت ہوا کہ کسی انسان کو گالی دینا سچے پکے مسلمان کے شایانِ شان ہرگز نہیں، بلکہ منافق کی پہچان ہے، مزید اس کی مذمت کو یوں سمجھئے کہ مذکورہ حدیث میں کسی مسلمان کو گالی دینا فسق قرار دیا گیا، عاجز کے خیالِ ناقص میں مسلمان کا تذکرہ اس لیے ہے کہ ایک مسلمان کا واسطہ اور سابقہ عموماً مسلمان ہی سے پڑتا ہے، ورنہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان کے علاوہ کو گالی دینا فسق نہیں۔ واللہ اعلم۔

اب یہ فسق کیا ہے؟ تو اس کے متعلق علماء نے فرمایا کہ یہ وہ کبیرہ گناہ اور عظیم جرم ہے جس کا درجہ کفر کے بعد اور عصیان سے پہلے ہے۔ (فتح الباری)

اس کی تائید ارشادِ باری سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرات صحابہؓ اور سچے پکے مسلمانوں کے متعلق فرمایا گیا:

﴿وَ كَرَّهَ إِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْیَانَ﴾ (الحجرات: ۷)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر کفر و فسق (کھلا گناہ) اور عصیان (نافرمانی) کی نفرت بٹھا دی ہے۔''

اور مذکورہ حدیث میں گالی کو فسق قرار دیا گیا، تو یہ اسی کا اثر ہے کہ مدنی معاشرے میں حضرات صحابہؓ کے یہاں گالی سے بہت ہی زیادہ نفرت کی جاتی تھی، اور الحمدللہ اسلامی معاشرے میں آج بھی گالی سے بہت شدید نفرت کی جاتی ہے۔

گالی کے عادی انجامِ بد سے ڈریں:

مگر افسوس صد افسوس! آج بے دین، غیر اسلامی اور جاہل معاشرے کا حال یہ ہے کہ گالی کا چلن دِن بدن عام ہوتا جا رہا ہے، بہت سے لوگ تو گالی غصہ کی حالت میں اپنے انجامِ بد سے بے خوف ہو کر آپے سے باہر ہو کر غصہ کے اظہار کے لیے بکتے ہیں، حالاں کہ غصہ کے اظہار کے لیے بھی گالی دینا جائز نہیں ہے، ایسے موقع پر عربی زبان میں ڈانٹ ڈپٹ کے لیے جو مہذب کلمات ملتے ہیں: "أَنفُکَ فِیْ التُّرَابِ" (تیری ناک خاک آلود ہو) یا "تَبکِیُ عَلَیْكَ أُمُّكَ" (تیری ماں تجھ پر روئے) یا پھر اُردو میں "تو بے وقوف ہے" "نالائق ہے" وغیرہ الفاظ ناگزیر حالات میں استعمال ہو سکتے ہیں، مگر فحش گالی کی قطعاً گنجائش نہیں۔

لیکن افسوس! کچھ لوگ تو ایسے بھی بد نصیب ہیں کہ جو گالی بولنے کے عادی ہیں، یہ لوگ صرف غصہ کی حالت ہی میں نہیں؛ بلکہ بغیر غصہ کے معمولی بات میں بھی اپنی منافقانہ عادت کی وجہ سے گالی بولتے ہیں، گالی ان کے منہ سے ایسے نکلتی ہے گویا ان کا تکیۂ کلام ہی گالی ہے، ایسے لوگ مسجد یا اعتکاف اور احرام کی حالت کی بھی پرواہ کیے بغیر گالی بول دیتے ہیں، ان کے لیے سخت خطرہ ہے کہ کہیں نزاع کے عالم میں زبان پر کلمہ کے بجائے گالی نہ آ جائے، ایسے لوگوں کو اپنے برے خاتمہ اور انجامِ بد سے بہت ہی زیادہ ڈرنا چاہیے۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِیْ الدَّرْدَاءَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" لَا یَکُوْنُ اللَّعَّانُوْنَ شُفَعَاءَ وَ لَا شُهَدَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ." (رواه مسلم/ باب النهي عن لعن الدوابّ وغيرها)

لعنت، ملامت (اور گالی گلوچ) کرنے والے قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ کی نظر میں

ایسے بے حیثیت ہوں گے کہ نہ تو ان کی کوئی سفارش سنی جائے گی اور نہ گواہی۔

اس لیے ضرورت ہے کہ قرآن وحدیث میں گالی کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اسے سوچیں اور اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

اللہ رب العزت ہم تمام کی گالی گلوچ سے حفاظت فرما کر ہمیں خاتمہ بالخیر نصیب فرمائے۔ آمین۔

۱۶/محرم الحرام/ ۱۴۳۷ھ
مطابق: ۳۰/ اکتوبر/ ۲۰۱۵ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
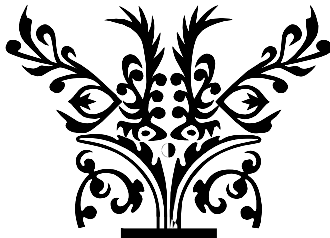
(۲۰)

ہنسی مذاق کی شرعی حدود وقیود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالُوۡا: "یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ ! إِنَّکَ تُدَاعِبُنَا ؟ قَالَ: " إِنِّی لَا أَقُوۡلُ إِلَّا حَقًّا." (رواہ الترمذی فی أبواب البر و الصلۃ / باب ما جاء فی المزاح ، مشکوٰۃ : ۴۱۶/ باب المزاح / الفصل الثانی)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے رحمت عالم ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! (آپ نے تو ہمیں مزاح سے منع فرمایا تھا، اس کے باوجود) آپ ہم سے مزاح فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں (مزاح میں بھی) حق بات ہی کہتا ہوں۔'' (ایسی کوئی بات نہیں کہتا جو خلافِ واقع ہو، یا غلط اور باطل ہو، اور ایسا مزاح یعنی ہنسی مذاق شرعی حدود وقیود میں رہتے ہوئے کیا جائے تو جائز ہے)

ہنسی مذاق انسانی فطرت ہے:

اللہ رب العزت نے انسان کی فطرت میں جہاں متانت، وقار اور سنجیدگی کا عنصر و جذبہ رکھا ہے وہیں کبھی کبھی ہنسی مذاق اور خوش طبعی کا جذبہ بھی رکھا ہے، ہنسی مذاق، تفریح اور

ظرافت بھی انسانی فطرت میں داخل ہے، اس لیے کسی انسان کا اس جذبہ سے بالکل ہی خالی ہونا بھی ایک طرح کا عیب اور نقص ہے، زندہ انسان کبھی بھی ﴿عَبُوۡسًا قَمۡطَرِیۡرًا﴾ (الدھر: ۱۰) کی تصویر نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی بھی زندہ دل انسان کی یہ پہچان ہی نہیں کہ وہ ہمیشہ ترش روئی اور ناراضگی کے ساتھ منہ بگاڑ کر ہی رہے، کبھی بھی خندہ پیشانی اور خوش طبعی سے پیش ہی نہ آئے، بلکہ زندہ دل انسان کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ خندہ پیشانی وخوش طبعی سے پیش آئے، حقیقت یہ ہے کہ روحانی خوشی اور قلبی شادمانی حاصل کرنے کے لیے شرعی حدود وقیود میں رہتے ہوئے خندہ پیشانی اور خوش طبعی بھی ضروری ہے، اس سے آپس میں انسیت، مسرت اور محبت بھی پیدا ہوتی ہے اور وحشت واجنبیت دور ہوتی ہے، جو اسلام میں محبوب اور مطلوب ہے۔

ہنسی مذاق کے متعلق حضور ﷺ کا معمول:

یہی وجہ ہے کہ رحمت عالم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپ ﷺ تمام لوگوں سے مسکرا کر خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے، ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنۡ عَبۡدِاللّٰہِ بۡنِ الحَارِثِ بۡنِ جَزۡءٍ قَالَ: " مَا رَأَیۡتُ أَحَدًا أَکۡثَرَ تَبَسُّمًا مِنۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ ﷺ." (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ / باب الضحک/ص:۴۰۶)

ترجمہ: ''حضور ﷺ سے بڑھ کر کوئی مسکرانے والا میں نے نہیں دیکھا'' اور جہاں تک تعلق ہے خوش طبعی اور ہنسی مذاق کا، تو حضور ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ اپنے رفقاء وازواج مطہرات کے ساتھ بعض اوقات خوش طبعی اور ہنسی مذاق بھی فرمایا کرتے تھے، لیکن مذکورہ حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی خوش طبعی، دل لگی اور ہنسی مذاق بھی نہایت لطیف وعجیب، مبنی برحقیقت اور حکیمانہ ہوا کرتی تھی، چنانچہ احادیث مبارکہ میں اس سلسلہ کے متعدد واقعات منقول ہیں:

(۱) جیسے ایک صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مجھے

سواری چاہیے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "إِنِّیْ حَامِلُكَ عَلیٰ وَلَدِ نَاقَةٍ." ہم تمہیں اونٹنی کا بچہ دے سکتے ہیں" وہ صاحب سمجھے کہ اونٹنی کے بچے سے مراد چھوٹا بچہ ہے، جو بظاہر سواری کے قابل نہیں ہوتا، اس لیے انہوں نے حیرانی کے ساتھ عرض کیا کہ حضور! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وَ هَلْ تَلِدُ الإِبِلَ إِلَّا النُّوْقُ؟" (رواه الترمذی و أبوداود، مشکوٰۃ:٤١٦) "کوئی بھی اونٹ کسی بھی اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے!"

(۲) اسی طرح ایک بوڑھی خاتون ایک مرتبہ حاضر خدمت ہوئیں اور عرض کیا کہ حضور! دعا فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرما دیں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ." کوئی بڑھیا جنت میں داخل نہ ہوگی، وہ روئیں اور گھبرا کر کہنے لگیں: ایسا کیوں؟ اس وقت آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أَمَا تَقْرَئِيْنَ الْقُرْآنَ ﴿إِنَّا أَنْشَأْنٰهُنَّ إِنْشَاءً فَجَعَلْنٰهُنَّ أَبْكَارًا﴾ (الواقعة: ٣٥-٣٦) کیا تم قرآنِ کریم میں یہ آیت نہیں پڑھتیں جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے، یعنی ہم نے ان کو کنواریاں بنایا۔ (مشکوٰۃ:۴۱۶)

مطلب یہ ہے کہ بوڑھی عورتیں (اور مرد) اپنے بڑھاپے کے وصف کے ساتھ جنت میں نہ جائیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے بڑھاپے کو جوانی میں بدل کر جنت میں داخل فرمائیں گے۔

(۳) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بطورِ خوش طبعی فرمایا: "يَا ذَا الْأُذُنَيْنِ!" (رواه أبوداود والترمذی، مشکوٰۃ: ٤١٦) "اے دو کان والے!" اسی بنا پر یہ عاجز بھی کبھی کبھی بطورِ خوش طبعی اپنے بچوں سے کہا کرتا ہے کہ "ایسا ماروں گا کہ دو کان کے بیچ میں سر لگا دوں گا!"

مذاق کی شرعی حدود و قیود:

الغرض کبھی کبھی خوش طبعی، خوش مزاجی اور دل لگی و ہنسی مذاق کر لینا بھی انسانی

فطرت ہونے کے علاوہ انسیت، مسرت اور محبت کا سبب ہے، جو کہ مباح ہے، بشرطیکہ شرعی حدود و قیود میں رہ کر ہو، البتہ اس موقع پر اگر کوئی شخص شرعی حدود و قیود سے تجاوز کر جائے جس سے سامنے والے کی دل شکنی و دل آزاری یا ایذا رسانی ہو جائے تو اس وقت پھر یہ مذاق نہیں رہتا؛ بلکہ تمسخر بن جاتا ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں، ہمارے علماء نے کتاب اللہ اور اسوۂ رسول اللہ ﷺ کو سامنے رکھتے ہوئے ہنسی مذاق کے مندرجۂ ذیل شرعی آداب اور حدود و قیود بیان فرمائے ہیں:

(۱) مذاق کا مقصد انسیت و خوش دلی ہو:

مذاق کا مقصد اپنے ساتھی کو مانوس اور اس کے دل کو خوش کرنا ہو، اس کی تکلیف، تحقیر اور تذلیل مقصود نہ ہو، ورنہ یہ مذاق نہیں؛ بلکہ تمسخر و استہزاء بن جائے گا، جس کی قرآن و حدیث میں ممانعت وارد ہوئی ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ﴾ (الحجرات: ١١)

ترجمہ: "اے ایمان والو! نہ تو مرد مردوں کا مذاق و تمسخر اُڑائیں، کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ ہی عورتیں عورتوں کی ہنسی اُڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔"

اسی طرح حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "لَا تُمَارِ أَخَاكَ، وَ لَا تُمَازِحْهُ، وَ لَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ." (رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ٤١٧)

ترجمہ: "اپنے بھائی سے نہ جھگڑا کرو، نہ اس کا مذاق اُڑاؤ اور نہ اس سے ایسا وعدہ کرو جس کو تم پورا نہ کرسکو۔"

حاصل یہ کہ قرآن وحدیث میں جس ہنسی مذاق کی ممانعت وارد ہے اس سے مراد وہ مذاق ہے جو کسی کی تحقیر وتکلیف کا سبب ہو، اس سے دل میں کینہ پیدا ہوتا ہے۔

(۲) مذاق حقیقت وراست گوئی پر مبنی ہو:

ہنسی مذاق حقیقت وحق پر مبنی ہو۔ جیسا کہ حدیث مذکور میں خود حضور ﷺ کا اس سلسلہ میں یہی معمول منقول ہے، اس لیے ہنسی مذاق اگر باطل، جھوٹ اور کسی گناہ پر مبنی ہو تو اس کی بڑی سخت ممانعت اور مذمت وارد ہوئی ہے، ایک حدیث میں فرمایا:

عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "وَيْلٌ لِمَنْ يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ، لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ، وَيْلٌ لَهُ، وَيْلٌ لَهُ." (رواه أحمد و الترمذي، مشكوٰة: ٤١٢)

ترجمہ: ''آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کے لیے بڑی سخت ہلاکت ہو جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے (ہنسی مذاق میں) جھوٹ بولے، اس کے لیے ہلاکت ہے، اس کے لیے ہلاکت ہے۔'' (بعض علماء فرماتے ہیں کہ ''ویل'' جہنم کی ایک وادی کا نام ہے)۔
(مظاہر حق جدید: ۴/۴۸۰)

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ سُفْيَانَ بْنِ أَسَدٍ الْحَضْرَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "كَبُرَتْ خِيَانَةً أَنْ تُحَدِّثَ أَخَاكَ حَدِيْثًا هُوَ لَكَ بِهِ مُصَدِّقٌ، وَ أَنْتَ بِهِ كَاذِبٌ." (رواه أبو داود، مشكوٰة: ٤١٣)

ترجمہ: ''آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات اس طرح کہو کہ وہ تمہیں اس میں سچا سمجھ رہا ہو، حالاں کہ تم اس سے جھوٹ بول رہے ہو۔''

اس قسم کی روایات کے پیش نظر علماء نے فرمایا کہ جو مذاق جھوٹ، دھوکہ اور کسی گناہ

پر مبنی ہو اس کی ممانعت اور سخت مذمت آئی ہے۔

ہنسی مذاق کی ایک رسمِ بد:

آج کل یکم اپریل کو بطورِ مذاق ''اپریل فول'' کی رسم منائی جاتی ہے، تو یہ طریقہ مذاق کے شرعی حدود وقیود سے باہر اور بیک وقت سات کبیرہ گناہوں کا مجموعہ ہے، جس میں (۱) جھوٹ (۲) دھوکہ (۳) خیانت (۴) ایذا رسانی (۵) غیروں کی مشابہت (۶) تحقیر مسلم (۷) گناہ کو جائز سمجھنا۔ وغیرہ گناہوں کا ارتکاب ہے، اس لیے اس برے مذاق اور رسم بد سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

بعض اوقات یہ مذاق بڑی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتا ہے، چنانچہ منقول ہے کہ ایک شخص اپنی آفس میں کام کر رہا تھا، اسی دوران اس کی بیوی کا فون آیا، اس نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا کہ ہمارے بیٹے کو کسی نے گولی ماردی اور وہ نہایت سنگین حالت میں قریبی ہسپتال میں زیر علاج ہے، سنتے ہی اس کے ہوش اُڑ گئے اور وہ فوراً ہسپتال کے لیے روانہ ہوگیا، ٹینشن کی وجہ سے اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا، وہ تیزی سے گاڑی چلا کر ہسپتال پہنچنا چاہتا تھا، اس کا دھیان ڈرائیونگ کے بجائے بیٹے میں اُلجھا ہوا تھا کہ اچانک سامنے سے آرہی ایک بس سے اس کی گاڑی ٹکرا گئی اور اُسی موقع پر وہ مرگیا، اسی ہسپتال میں جب اس کی لاش پہنچی اور گھر والوں کو اطلاع دینے کے لیے فون کیا گیا تو اس کے والد صدمہ برداشت نہ کر سکے اور دل کے دورے کی وجہ سے ان کا بھی انتقال ہوگیا، ہسپتال میں جب اس کی بیوی نے اپنے شوہر اور خسر کی لاش کو ایک ساتھ دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں، کیوں کہ اپریل فول کی شکل میں اس کا یہ مذاق اس کی تباہی کا سبب بن چکا تھا۔

یہ غیر شرعی مذاق کی نحوست ہے، اسی لیے کسی نے کہا ہے:

ہر وقت ہنسنا ہنسانا تجھے برباد نہ کردے
تنہائی کے لمحات میں کبھی رو بھی لیا کر

(۳) مذاق میں استخفافِ دین وشریعت نہ ہو:

(۳) ہنسی مذاق اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور شعائرِ دین کے متعلق نہ ہو۔ ہنسی مذاق کی شرعی حدود وقیود میں یہ بات بطورِ خاص داخل ہے کہ ہنسی مذاق خواہ قولی ہو یا فعلی، بہر حال اللہ سبحانہ وتعالیٰ، حضراتِ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ وصلحاء نیز شعائرِ اسلام اور دینی احکام سے متعلق نہ ہو، اس لیے کہ ایسا مذاق اللہ جل شانہ، حضراتِ انبیاء علیہم السلام، صحابہ وصلحاء، کتاب وسنت، شعائرِ اسلام اور دینی احکام کے استخفاف اور ان کو حقیر وہیچ سمجھنے کو مستلزم ہونے کی وجہ سے کفر ہے۔

قرآنِ کریم میں ایک واقعہ کے تحت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس وقت غزوۂ تبوک کے لیے جاتے ہوئے بعض منافقین نے ازراہِ تمسخر واستہزاء آپس میں یوں کہا کہ اس شخص (رحمت عالم ﷺ) کو دیکھو کہ شام کے محلات اور روم کے شہروں کو فتح کر لینے کا خواب دیکھتا ہے، لگتا ہے اس نے رومیوں کی جنگ کو عربوں کی باہمی جنگ پر قیاس کر رکھا ہے، یہ کبھی نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کی خبر حضور ﷺ کو دے دی، حضور ﷺ نے جب ان سے باز پرس کی تو کہنے لگے کہ ''ہم کہیں سچ مچ ایسا یقین تھوڑا ہی رکھتے ہیں، ہم تو محض خوش طبعی، ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے، تاکہ سفر بآسانی کٹ جائے، قرآنِ پاک میں اس واقعہ کو یوں نقل فرمایا گیا:

﴿ وَ لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ط قُلْ أَ بِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝﴾ (التوبة : ٦٥)

ترجمہ: ''اگر آپ ان سے (اس برے مذاق کے متعلق) سوال کریں گے تو وہ کہہ دیں گے کہ ہم تو بس یوں ہی باتوں میں مشغول دل لگی اور ہنسی مذاق کر رہے تھے، آپ (ان سے) کہہ دیجیے گا کہ کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہے تھے؟'' یہ تو عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے، خوش طبعی اور ہنسی مذاق کے لیے اور کوئی بات نہ تھی؟

تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ، اس کی آیات اور اس کے رسول کا مذاق بنانا کفر ہے، لہٰذا ان کو فرمایا گیا:

﴿ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيْمَانِكُمْ ﴾ (التوبة : ٦٦)

ترجمہ: ''اب تم عذر بیان نہ کرو، تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہوگئے۔''

(مستفاد از: انوار البیان: ۲/۵۵۶)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور شعائرِ دین واحکامِ اسلام کے ساتھ مذاق کرنا کفر ہے، مثلاً داڑھی رکھنا حضور ﷺ کی اطاعت ہے، آپ ﷺ کے ساتھ اظہارِ محبت ہے اور نہ رکھنا گناہِ کبیرہ ہے، لیکن اس کا مذاق اُڑانا کفر ہے۔

(۴) ہنسی مذاق گاہے گاہے اور مناسب موقع پر ہو:

آخری بات یہ ہے کہ جو مذاق شرعی حدود وقیود میں رہتے ہوئے کیا جائے وہ بھی ہر وقت اور ہر جگہ نہیں، بلکہ کبھی کبھی اور مناسب موقع وجگہ پر ہو، صاحبو! یہ بات درست نہیں کہ ایک مسلمان ہنسی مذاق ہی کو اپنی پہچان اور اوڑھنا بچھونا بنالے، قرآنِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ کفار کا ہے، اسی لیے ارشاد ہوا کہ

﴿ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ﴾ (التوبة : ٨٢)

ترجمہ: ''یہ (بے ایمان دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں اور (آخرت میں) زیادہ روئیں۔''

ایک مومن کے شایانِ شان نہیں کہ وہ ہر وقت ہنسی مذاق ہی کرتا رہے، یہ چیز قلوب کو مردہ بنادیتی ہے، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو آدمی زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہوجاتا ہے، جو آدمی زیادہ مذاق کرتا ہے اسے لوگ بے حیثیت سمجھتے ہیں، اور جو شخص باتیں زیادہ کرتا ہے اس کی لغزشیں زیادہ ہوتی ہیں، جس کی لغزشیں زیادہ ہوتی ہیں اس کی حیا کم ہوتی ہے، جس کی حیا کم ہوا اس کا تقویٰ کم ہوتا ہے، اور جس کا تقویٰ کم ہوا اس کا دل مردہ ہوجاتا ہے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۳/۵۴۲)

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ''مزاح (مذاق) میں افراط اور مداومت ممنوع ہے۔'' (احیاء العلوم:۳/۱۲۸)

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہیں کہ ''افراط سے مراد بہت زیادہ ہنسنا اور ہنسانا، اور مداومت سے مراد یہ ہے کہ زیادہ وقت ہنسی مذاق میں گزارے۔'' (قاموس الفقہ :۵/۸۲)

اور جس طرح ہر وقت ہنسی مذاق مناسب نہیں اسی طرح ہر جگہ بھی مناسب نہیں، مثلاً مساجد اور سنجیدہ مجالس ہنسی مذاق کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔

خلاصہ :

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی پاکیزہ تعلیمات میں جہاں عقائد وایمان اور عبادات و معاملات میں اعتدال ہے وہاں معاشرت واخلاق میں بھی میانہ روی کا لحاظ رکھا گیا ہے، اسی لیے اس میں نہ تو ترش روئی ہے اور نہ ہی بے پناہ ہنسی مذاق، نہ تنگ دلی اور تیوری چڑھانا ہے، اور نہ زور زور سے قہقہہ لگانا، افراط وتفریط کے اس دور میں اگر ایک طرف تہذیب جدید نے پوری توانائی صرف کر کے زندگی کو ہنسی مذاق بنا دیا ہے تو دوسری طرف بعض لوگوں نے اس تصور کو بھی فروغ دیا کہ اسلام صرف عبادات اور خوف وخشیت کا نام ہے، جس میں ہنسی مذاق، شگفتہ روئی اور زندہ دلی کی کوئی جگہ نہیں، حالاں کہ حضور ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیاں جہاں زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت کا نمونہ ہیں وہاں ان کی زندگیاں خوش طبعی وخندہ روئی اور خوش دلی وتفریح قلبی کے سلسلہ میں بھی بہترین اُسوہ ہیں، جیسا کہ واضح کیا گیا، اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے شرعی حدود وقیود میں ہنسی مذاق کی جائے تو یہ انسیت ومودّت کا ذریعہ ہے۔

لبوں پہ گو ہے ہنسی بھی ہر دم اور آنکھ بھی میری تر نہیں
مگر جو دِل رو رہا ہے پیہم، کسی کو اس کی خبر نہیں
(حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ)

لب ہیں خنداں، جگر میں تیرا درد وغم ۔۔۔ تیرے عاشق کو لوگوں نے سمجھا ہے کم

حق تعالیٰ ہمیں اپنے فضل وکرم سے تمام امور میں شرعی حدود وقیود کا پابند بنا دے، آمین۔

۲۴/ ذی الحجہ/ ۱۴۳۵ھ، قبل الجمعہ
مطابق: ۹/ستمبر/ ۲۰۱۵ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
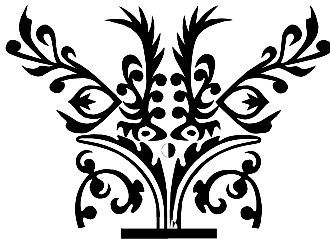
(۲۱)

ہدیہ کے فضائل ومسائل

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "تَهَادَوۡا، فَإِنَّ الۡهَدِيَّةَ تُذۡهِبُ الضَّغَائِنَ." (رواه الترمذی، مشکوٰة: ٢٦١ / باب العطايا)

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آپس میں ہدیہ وتحفہ دیتے رہو، کیوں کہ ہدیہ دل کے بہ کثرت کینہ کو بھی ختم کردیتا ہے۔''

ہدیہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور محبت کا وسیلہ ہے:

اللہ رب العزت جن خوش نصیب بندوں کو اپنے فضل خاص سے نوازنا چاہتے ہیں ان کے دلوں میں جوڑ، الفت اور محبت پیدا فرمادیتے ہیں، یہ آپس کی الفت ومحبت اللہ تعالیٰ کے فضل خاص کی علامت ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَ اَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِي الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مَاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيۡنَهُمۡ﴾ (الأنفال: ٦٣)

ترجمہ: ''اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت (ومحبت) پیدا کردی، اگر تم زمین بھر کی ساری دولت بھی خرچ کردیتے تو ان کے دلوں میں یہ الفت (ومحبت) پیدا نہ کرسکتے، لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا۔'' (ان میں الفت ومحبت پیدا فرمادی)۔

اور یہ آپس کا جوڑ اور الفت ومحبت اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ خوشگوار زندگی کا اس کے بغیر تصور نہیں کیا جاسکتا، اس نعمت سے محروم رہنے والے عموماً سکونِ زندگی سے محروم ہی رہتے ہیں، محبت کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن وحدیث میں اس کی ترغیب دی گئی ہے، اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ ان اعمال کی بھی ترغیب دی گئی ہے جن سے آپس میں الفت ومحبت پیدا ہوتی ہے، مثلاً آپس میں ہدیہ وتحفہ کا لینا دینا، ہدیہ وتحفہ وہ چیز ہے جو اپنے چھوٹوں کو اظہارِ شفقت، دوستوں کو اظہارِ محبت اور بڑوں کو اظہارِ عقیدت کے لیے بلا کسی معاوضہ وغرض کے پیش کی جاتی ہے، شریعت مطہرہ میں اس کی بڑی ترغیب دی گئی ہے، وجہ یہ ہے کہ ہدیہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور محبت کا وسیلہ ہے، اس سے آپسی تعلقات میں خوشگواری اور الفت ومحبت پیدا ہوتی ہے، اسی لیے حدیث میں ہے: "تَهَادَوۡا، تَحَابُّوۡا." (الأدب المفرد للبخاری/ باب من لم يقبل الهدية لما دخل البغض فی الناس/الجزء: ١/ص: ٢٠٨، مشکوٰة: ٤٠٣/باب المصافحة و المعانقة / الفصل الثالث)

اور مذکورہ حدیث میں ارشاد فرمایا کہ "تَهَادَوۡا، فَإِنَّ الۡهَدِيَّةَ تُذۡهِبُ الضَّغَائِنَ." "آپس میں ہدیہ وتحفہ کا لین دین رکھا کرو، کیوں کہ اس سے دلوں کی کدورت وعداوت اور کشیدگی ودوری ختم ہوتی ہے۔'' (اور الفت ومحبت پیدا ہوتی ہے، اور اگر پہلے سے محبت ہو تو اس میں مزید اضافہ ہوتا ہے)۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہدیہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور خوشنودی کا بھی ذریعہ ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

عَنۡ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنۡ لَقِيَ أَخَاهُ الۡمُسۡلِمَ بِمَا يُحِبُّ لِيَسُرَّهٗ بِذٰلِكَ، سَرَّهُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ." (رواه الطبرانی بإسناد حسن)

"جوشخص کسی مسلمان سے اس کی پسندیدہ چیز (ہدیہ) لے کر ملاقات کرے، تاکہ اس کے ذریعہ اسے خوش کرسکے، تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دِن اپنی خوشنودی سے سرفراز فرمائے گا۔" (نورِ نبوت:۲۲، مرتب: مفتی محمد سلمان منصور پوری)

حضور ﷺ کو حضراتِ صحابہؓ کا ہدیہ دینا:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حضور ﷺ اور حضراتِ صحابہؓ کے مابین اور خود حضراتِ صحابہؓ کے درمیان آپس میں جو بے پناہ محبت تھی اس کی دو بنیادی وجہیں ہیں: ایک تو خود اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان محبت پیدا فرمادی، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ﴾ (الأنفال:٦٣) یہ اس کے فضلِ خاص کی علامت ہے۔ اور دوسری ظاہری وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا آپس میں ہدیہ کا لین دین بہت عام تھا، جس کی وجہ سے ان میں بے پناہ محبت تھی، حضرات صحابہؓ حضور ﷺ کی ضرورتوں کا بہت ہی زیادہ خیال فرماتے تھے اور ضرورت کی چیزیں آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیۃً پیش فرماتے، مثلاً مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں آپ ﷺ پر بہت تنگی تھی، کئی کئی دنوں تک گھر میں چولہا جلنے کی نوبت نہ آتی، ان دنوں آپ ﷺ کے جو پڑوسی تھے علامہ عینیؒ کے بقول ان میں سیدنا ابوایوب انصاری، سعد بن عبادہ، سعد بن معاذ اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہم بطورِ خاص تھے۔ (عمدۃ القاری:۱۳/ ۱۳۶، شمائل کبریٰ:۲/ ۱۲۳)
سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان دنوں ہمارے انصاری پڑوسی اونٹ اور بکریوں کا دودھ ہدیۃً بھیج دیا کرتے تھے، اور اسی پر ہمارا گزر بسر ہوجاتا تھا۔ (شمائل کبریٰ:۲/ ۱۱۸)

حضراتِ صحابہؓ کو حضور ﷺ کی کسی بھی ضرورت کا احساس ہوجاتا تو فوراً وہ چیز آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیۃً پیش فرمادیتے، جیسے جب آپ ﷺ ہجرت فرماکر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کے پاس چارپائی نہیں تھی، اور اہلِ مکہ چارپائی کو پسند کرتے تھے، آپ ﷺ نے اپنے پڑوسی حضرت ابوایوب انصاریؓ سے پوچھا کہ تمہارے پاس چارپائی نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، جب حضرت اسد بن زرارہؓ کو اس کا پتہ چلا تو انہوں

نے فوراً ایک چارپائی ساگو کی لکڑی کی بنواکر آپ ﷺ کی خدمت میں بھیج دی، جس پر وفات تک آپ ﷺ سوئے اور نماز بھی پڑھی، اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد لوگوں نے تبرکاً اسے جنازہ کے طور پر استعمال بھی کیا۔ (سبل الہدیٰ:۷/ ۵۶۴، شمائل کبریٰ:۲/ ۱۱۰)

ایک اور واقعہ ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ ان کے والد نے حریرہ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا، تو آپ ﷺ نے صرف اتنا فرمایا کہ اے جابر! کیا یہ گوشت ہے؟ انہوں نے عرض کیا: نہیں، مگر حضرت جابرؓ منشا فوراً سمجھ گئے اور اپنے والد سے یہ بات عرض کی، ان کے والد نے کہا کہ شاید حضور ﷺ کو گوشت کی رغبت ہے، اس لیے فوراً ایک پلی ہوئی بکری ذبح کی، اور چوں کہ حضور ﷺ کو بھونا ہوا گوشت زیادہ پسند تھا اس لیے فوراً اسے بھون کر خدمت اقدس میں پیش کیا، آپ ﷺ نے دعا دی کہ اے اللہ! میری جانب سے حضراتِ انصار کو جزاءِ خیر عطا فرما۔ (سبل الہدیٰ:۷/ ۱۸۸، شمائل کبریٰ:۲/ ۱۱۳)

ان روایات و واقعات میں ہمارے لیے عبرت و ہدایت یہ ہے کہ ہمیں بھی اپنے بڑوں اور پیشواؤں کا خیال رکھتے ہوئے ان کی خدمت میں اکراماً ہدایا اور تحائف پیش کرنے چاہیے، جیسا کہ صحابہ کا معمول تھا، اس سے ایک تو بزرگوں کی محبت حاصل ہوگی، دوسرے ان کی دعائیں بھی ملیں گی۔

پھر ہدیہ کا لینا اور دینا یوں تو سنت ہے، کوئی بھی کسی کو ہدیہ دے سکتا ہے، کیا چھوٹا اور کیا بڑا، کیا امیر اور کیا غریب، حتیٰ کہ کسی مصلحت و ضرورت کے تحت غیر مسلم کو بھی ہدیہ دیا جاسکتا ہے، مگر دیندار لوگوں کو ہدیہ پیش کرنا زیادہ بہتر اور افضل ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ عمومی اور خصوصی حالات میں اپنے ہدایا حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے، جیسے حضرت انس رضی اللہ کی روایت ہے کہ جب حضور ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو رخصتی کے وقت میری والدہ ام سلیم نے حضور ﷺ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے لیے گھی، پنیر اور کھجور کا حلوہ بنا کر پیش کیا۔ (بخاری:۵۵۷)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شادی اور اس کے علاوہ کسی بھی جائز تقریب اور خوشی کے موقع پر ہدیہ دینا اور لینا جائز ہے، البتہ واپس لینے کی نیت سے ہدیہ وتحفہ نہ دیا جائے، جیسا کہ شادی بیاہ کے موقع پر آج کل اس میں عام ابتلاء ہے، نیز غیر اسلامی تقریبات میں اس کا لین دین جائز نہیں۔

حضور ﷺ کا حضرات صحابہؓ کو ہدیہ دینا:

الغرض حدیث پاک میں ہے کہ حضرات صحابہؓ حضور ﷺ کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے ہدیہ پیش فرماتے تھے، (اور یہی بہتر بھی ہے) اور حضور ﷺ اُسے قبول فرماتے، پھر بعد میں حسب موقع صحابہ کو اس کا بدلہ بھی عنایت فرماتے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: " كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ وَ يُثِيْبُ عَلَيْهَا." (رواه البخاري/ باب ممّن لا تحل له الصدقة/الجزء :١/ الصفحة: ٤١١)

"یعنی آپ ﷺ صرف حضرات صحابہ کا ہدیہ قبول ہی نہ فرماتے؛ بلکہ انہیں ہدیہ عطا بھی فرماتے تھے۔" کیوں کہ ﴿هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۝﴾ (الرحمٰن: ٦٠) "احسان کا بدلہ احسان" تو ہدیہ کے بدلہ ہدیہ۔

اس سلسلہ میں کئی روایات ہیں، مثلا ایک مرتبہ آپ ﷺ کی خدمت میں ایک خچر پیش کیا گیا، جسے آپ ﷺ نے اپنے محسن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہدیۃً دے دیا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۴۹۱، شمائل کبریٰ: ۲/۱۱۳)

ایک مرتبہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں ایک گھوڑا پیش کیا، جس کو "ورد" کہا جاتا تھا، یہ گھوڑا آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بطورِ ہدیہ عطا فرمایا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۴۹۰، شمائل کبریٰ: ۲/۱۱۳)

اسی طرح حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی خدمت

میں ایک مرتبہ طائف سے انگور ہدیہ میں آئے، تو آپ ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ یہ خوشہ لے جاؤ اور اپنی والدہ کو پہنچادو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہدیہ میں آئی ہوئی چیز کسی دوسرے کو ہدیۃً دی جاسکتی ہے، اور بیچی بھی جاسکتی ہے، البتہ اگر کسی نے ہدیہ دیتے وقت خود استعمال کرنے کی قید لگائی ہو تو پھر وہ کسی دوسرے کو ہدیہ دینا بہتر نہیں، لیکن اگر ہدیہ کر دیا تو گناہ بھی نہیں، ایک مرتبہ آپ ﷺ کے پاس ریشمی کپڑا آیا، تو آپ ﷺ نے اسے حضرت عمر، حضرت اسامہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو یہ فرماتے ہوئے عطا فرمایا کہ تم اسے اپنی عورتوں کو دے دینا۔ (طحاوی: ۲/۳۴۶، شمائل کبریٰ: ۲/۱۱۲)

نیز حضرت عبداللہ بن انیس اسلمیؓ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور ﷺ نے ایک عصا ہدیۃً عطا فرمایا، جس کو انہوں نے اپنی وفات تک استعمال کیا، جب ان کی وفات ہوئی تو وہ عصا ان ہی کے ساتھ (برکۃً) دفن کیا گیا۔ (مصنف عبدالرزاق: ۳/۱۸۵، شمائل کبریٰ: ۲/۱۱۲)

تو ان روایات سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ بھی اپنے اصحاب کو ہدایا سے نوازتے تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ﴿هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۝﴾ (الرحمٰن: ٦٠)

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ صحابہ کو حسب موقع ہدیہ وغیرہ پیش فرما کر اپنے عمل سے اُمت کو ترغیب دینا چاہتے تھے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ ہدیہ کے بدلہ میں ہدیہ دینا اگر چہ واجب تو نہیں، لیکن حسن اخلاق میں سے ہے، اس لیے حکم تو یہی ہے کہ ہدیہ کا بدلہ ہدیہ سے دیا جائے، ورنہ اپنے ہدیہ دینے والے کا شکریہ ادا کرے، اس کے لیے کلمۂ خیر کہے یا کم از کم دعا کر دے۔

حضرات صحابہؓ کا آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دینا:

اور یہ اسی کا اثر تھا کہ آپ ﷺ کے اصحاب میں بھی آپس میں ہدیہ کا خوب رواج

ہو گیا، بلکہ جب حضور ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کے ساتھ مہاجرین کی اچھی خاصی جماعت تھی، ان سب کو انصارِ مدینہ نے للہ فی اللہ اپنا مہمان بنالیا تھا، انصار میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، لیکن اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مہاجرین کی خدمت میں سب نے حصہ لیا، اس صورتِ حال سے مہاجرین کے دلوں میں یہ خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انصار کے اس غیر معمولی ایثار، حسن سلوک اور ہدایا کی وجہ سے ہماری ہجرت و عبادت کا ثواب بھی ہمارے ان محسنین کے حصہ میں آجائے اور ہم خسارہ میں رہ جائیں، انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں اپنا یہ خدشہ ظاہر کیا، تو آپ ﷺ نے اس موقع پر انہیں اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا:

"لَا، مَا دَعَوْتُمُ اللّٰهَ لَهُمْ، وَ أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ." (رواه الترمذی، مشكوٰة/باب العطايا/الفصل الأول/الجز:٢/الصفحة:١٨٥)

ترجمہ: "ایسا نہ ہوگا، شرط یہ ہے کہ تم ان کے ان احسانات و ہدایا کے عوض ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں اور دل و زبان سے ان کے احسانات کا اعتراف اور شکر گزاری کرتے رہو۔"

اللہ تعالیٰ تمہارے اتنے عمل کو بھی ان کے احسان کے بدلے اور شکریہ کے طور پر قبول فرمائے گا اور تمہاری طرف سے ان کے احسان و ایثار کا مکمل بدلہ اپنے خزانۂ کرم سے عطا فرمائے گا۔ یہ ابتدائی دور کا حال تھا، بعد میں جب وسعت پیدا ہوگئی تو حضرات انصار و مہاجرین میں ہدیہ کا لین دین عام ہو گیا تھا، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرات صحابہ حسن تعلق کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہدیہ لینے دینے کا معاملہ رکھتے تھے۔ (مجمع الزوائد: ۴/ ۱۴۹)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک مرتبہ حضور ﷺ سے پوچھنے لگیں کہ میرے دو پڑوسی ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کو ہدیہ دینے کی گنجائش ہے، تو کس کو ہدیہ بھیجوں؟ آپ

ﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں میں سے جس کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو اسے بھیج دو۔ (بخاری: ۳۵۳)

مطلب یہ ہے کہ الاول فالاول، پہلے خویش، بعد میں درویش۔

مخلصانہ ہدایا کی کمی:

افسوس ہے کہ آج کل اول تو ہم لوگوں میں باہم مخلصانہ ہدیہ کا لین دین بہت ہی کم ہو گیا ہے، بعض خاص حلقوں میں اگر ہے بھی تو بس اپنے بزرگوں، اماموں اور پیروں کو ہدیہ پیش کرنے کا مزاج ہے، لیکن اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ ہدیہ کا رواج ہی تقریباً ختم ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے آپس کی محبت والفت میں فرق آ گیا، اور جن کے درمیان ہدیہ کا لین دین ہے تو وہاں بھی عموماً ہدیہ وتحفہ جیسی سنت، رسم و رواج اور فخر و ریاکاری وغیرہ کی نذر ہوگئی۔ اسی وجہ سے ہدیہ وتحفہ کے لین دین کے باوجود اس سے آپس میں محبت و الفت پیدا ہونے کے بجائے دلوں میں عداوت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، ان حالات میں ضروری ہے کہ ہدیہ وغیرہ سے متعلق شرعی ہدایات کو پیش نظر رکھا جائے اور اس کے متعلق عمل کیا جائے، تاکہ اس کے مقاصد اور فوائد حاصل ہوں۔

ہدیہ کے متعلق شرعی ہدایات:

اس سلسلہ میں ہمارے علماء نے ہدیہ دینے کے متعلق بنیادی طور پر تین باتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی بات یہ بیان فرمائی کہ ہدیہ اپنے حلال مال سے خلوصِ نیت یعنی اظہارِ محبت یا عقیدت وشفقت کی غرض سے دیا جائے، کیوں کہ اگر حرام مال سے ہدیہ دیا، یا رسم و ریاکاری یا کسی اور فاسد غرض سے اگر ہدیہ دیا جائے تو وہ ہدیہ نہیں؛ بلکہ گناہ ہے، مثلاً آج شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں میں رسم اور ریاکاری کے طور پر ہدیہ کے نام سے ایسی چیزیں پیش کی جاتی ہیں

جن کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا، جیسے مصنوعی گلدستے پیش کیے جاتے ہیں، جو اکثر و بیشتر کوڑے ہی کی نظر ہو جاتے ہیں، یا نوٹوں کا ہار پہنایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا مقصد صرف ریا کاری کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ کیوں کہ اگر ہدیہ مقصود ہے تو اس کو ہار ہی کی شکل میں دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اسی طرح بعض لوگ محفل اور بڑے مجمع میں سب کو دکھا کر بلکہ فوٹو اور ویڈیو گرافی کے ساتھ ہدیہ دیتے ہیں، تو یہ بھی ریا کاری ہی کی شکل ہے، جس سے احتیاط ضروری ہے، نیز سرکاری یا غیر سرکاری عہدوں پر فائز ذمہ داروں کو اپنے کام نکلوانے کی غرض سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ بھی ہدیہ ہرگز نہیں، بلکہ وہ رشوت ہے، جو ناجائز اور حرام ہے، ایسے ہدایا سے کبھی محبت پیدا نہیں ہوسکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہدیہ اپنی استطاعت اور حیثیت کے مطابق برضا ورغبت دیا جائے، زبردستی اور مجبوری میں اگر کوئی چیز پیش کی جائے تو وہ بھی ہدیہ نہیں، گناہ ہے، جیسے شادی جیسی دیگر تقریبات کے موقع پر جہیز وغیرہ کے عنوان سے جو کچھ دیا جاتا ہے اکثر اس میں یہی بات ہوتی ہے کہ اس کو لازم اور ضروری سمجھ کر مجبوراً دیا جاتا ہے، تو اس قسم کے ہدایا سے بھی کیسے محبت پیدا ہوسکتی ہے؟ اس کے برخلاف جو ہدیہ اظہارِ محبت کی غرض سے اپنی حیثیت کے مطابق برضا ورغبت پیش کیا جاتا ہے اس سے دلوں میں محبت والفت پیدا ہوتی ہے، اس لیے ہدیہ کے لیے قیمتی اور مہنگی چیز کا ہونا ضروری نہیں؛ بلکہ مختصر اور معمولی چیز بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

جیسے ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کے ایک مرید کے دل میں ان سے ملنے کی تمنا ہوئی، راستہ میں آتے ہوئے مرید کے دل میں خیال آیا کہ حضرت کی خدمت میں کوئی چیز ہدیۃً پیش کرنی چاہیے، لیکن وہ اپنی غربت کی وجہ سے اور تو کچھ نہ لے جاسکے، صرف جنگل سے لکڑیاں چن کر پیش کیں کہ حضرت! میری حیثیت اس سے زیادہ کی نہیں تھی، یہ لکڑیاں اس نیت سے لایا ہوں کہ چولہا جلانے کے کام آجائیں گی، چوں کہ بڑے خلوص سے یہ ہدیہ پیش

158

کیا تھا اس لیے شیخ نے بھی اس کی بڑی قدر فرمائی، اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ بھائی! ہمارے ایک دوست چولہا جلانے کے لیے لکڑیاں لائے ہیں، لہٰذا اسے اچھی طرح رکھو اور جب ہمارا انتقال ہو جائے تو غسل کے لیے پانی ان ہی لکڑیوں سے گرم کرنا، شاید ان کے خلوص کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہماری مغفرت فرما دے۔

صاحبو! ہدیہ کے بارے میں یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ کیا دیا جارہا ہے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کون کس جذبہ ونیت سے ہدیہ دے رہا ہے؟

تیسری بات یہ ہے کہ واپسی کی نیت سے نہ دیا جائے، آج کل شادی اور حج وغیرہ کے مواقع پر جو کچھ دیا جاتا ہے اس میں عموماً نیت یہ ہوتی ہے کہ ہمارا جب موقع آئے گا تو اتنی یا اس سے زیادہ قیمت کی کوئی چیز ہمیں بھی دی جائے گی، ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی ہدیہ نہیں، بلکہ اسے قرض کہنا چاہیے، خلاصہ یہ ہے کہ ہدیہ اظہارِ محبت، حسب استطاعت برضا ورغبت اخلاصِ نیت کے ساتھ دیا جائے، اور خود لینے والا بھی ان چیزوں کا لحاظ رکھے، اگر ان شرعی ہدایات کے مطابق ہدیہ کا لین دین ہو تو پھر یہ ہدیہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ، سب سے زیادہ حلال مال اور آپس میں محبت والفت کا بہتر ذریعہ بنے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عمل عطا فرما کر ہمارے دلوں کو جوڑ دے، نیز حادثہ میں عاجز کے بائیں ہاتھ کی جو ہڈی ٹوٹی ہے اللہ پاک اسے بھی جوڑ دے اور آئندہ ہمیشہ کے لیے ناگہانی آفات وبلیات سے اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔

۱۴/ شوال المکرّم/ ۱۴۳۶ھ/ قبل الجمعہ
مطابق: ۳۱/ جولائی/ ۲۰۱۵ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ،
وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۲۲)

وصیت کی اہمیت اور ضرورت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَا حَقُّ امۡرِئٍ مُسۡلِمٍ لَهٗ شَيۡءٌ يُوۡصِي فِيۡهِ يَبِيۡتُ لَيۡلَتَيۡنِ إِلَّا وَ وَصِيَّتُهٗ مَكۡتُوۡبَةٌ عِنۡدَهٗ." (متفق عليه، مشكوٰة : ٢٦٥ / باب الوصايا)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس کے پاس مال یا معاملات کی کوئی قابل وصیت چیز ہو اور وہ دو راتیں (تھوڑا وقت بھی) اس حالت میں گزارے کہ اس کے پاس وصیت نامہ لکھا ہوا نہ ہو۔''

وصیت کی حقیقت:

اللہ رب العزت نے قرآنِ کریم میں جتنے بھی احکام وفرائض نازل فرمائے ہیں خواہ وہ اوامر سے متعلق ہوں یا نواہی سے، اور عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے، کوئی فرض اور حکم ایسا نہیں ہے جو حکمت سے خالی ہو، بلکہ اگر غور کیا جائے تو ایک ایک حکم میں کئی کئی

حکمتیں اور مصلحتیں نظر آتی ہیں، مثلاً احکامِ الٰہیہ میں ایک حکم وصیت ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی جائداد کے ایک تہائی یا اس سے کم میں کسی غیر وارث کو بطورِ احسان مالک بنانے کی ہدایت وتاکید کرنا، یا پھر کسی کو اپنی زندگی ہی میں اپنے مرنے کے بعد کسی کام کی ذمہ داری سونپنا اور اس کی تاکید کرنا وصیت کہلاتا ہے۔

وصیت کا حکم:

اس کا حکم قرآنِ پاک میں اس طرح بیان کیا گیا:

﴿كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ إِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۨ الۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ وَ الۡأَقۡرَبِيۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ۝﴾ (البقرة : ١٨٠)

ترجمہ: ''تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے تو وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرے، بشرطیکہ اس نے مال چھوڑا ہو، یہ حکم لازم ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کا خوف رکھتے ہیں۔''

یہاں علماءِ مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ میں جس وصیت کی فرضیت کا حکم ہے اس سے مراد وہ وصیت ہے جو احکامِ وراثت کے نازل ہونے سے پہلے ابتداءِ اسلام میں والدین، یتیموں، بیواؤں اور غریب رشتہ داروں کے لیے فرض تھی، بعد میں جب اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو سن ہجری چار اور پانچ کے درمیان میراث کی تقسیم کا مفصل حکم آیت کریمہ ﴿يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ......الخ﴾ میں نازل ہوا، تو وصیت کی فرضیت کے اس حکم کو استحباب سے بدل دیا گیا، اور اس کی وسعت کو ایک تہائی میں محدود کر دیا گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آیت کریمہ میں جس وصیت کا ذکر ہے اب وہ فرض نہیں بلکہ مستحب ہے، اس کے علاوہ جو لوگ شرعی اعتبار سے وارث نہیں ہیں ان کے حق میں ایک تہائی تک وصیت کرنا بھی مستحب ہے، البتہ اگر کسی کو یہ خطرہ ہو کہ اس کے مرنے کے بعد بعض ورثاء یا کوئی ایک وارث تمام ترکہ پر قبضہ کر لے گا اور دیگر حقداروں کو محروم کر دیا جائے گا تو ایسی صورت میں ورثاء کے

شرعی حصص کے بقدر ایک وصیت نامہ لکھ کر کورٹ میں رجسٹر کرا لینا ضروری ہے، یا پھر کسی کے ذمہ کوئی امانت، حق یا قرض ہو جو ورثاء کو معلوم نہ ہو، تو تحریری طور پر یا زبانی اس کی وصیت کرنا اب بھی فرض اور ضروری ہے۔ اسی کا تذکرہ مذکورہ حدیث میں آیا ہے کہ

”مَا حَقُّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ لَهٗ شَيْءٌ يُوْصِي فِيْهِ يَبِيْتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَ وَصِيَّتُهٗ مَكْتُوْبَةٌ عِنْدَهٗ.“ (بخاری : ۳۸۲/۱)

ترجمہ: ”کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ جس چیز کی وصیت کرنا اس پر ضروری ہو، اور وصیت کیے بغیر اس پر دو راتیں (عرصۂ قلیل) بھی گزر جائیں۔“

حدیث پاک کے راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جیسے ہی میں نے یہ حدیث سنی تو اپنا وصیت نامہ لکھ کر سرہانے رکھ لیا۔ (شرح السنہ: ۲۷۸/۵)

وصیت کی حکمت:

اب دیکھئے کہ اس حکم میں کیا کیا حکمتیں ہیں؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، معلوم نہیں کہ کس کی زندگی کا سلسلہ کب ختم ہو جائے، اور تحریر یا کم از کم زبانی وصیت نہ کرنے کی صورت میں یہ عین ممکن ہے کہ ہم سے کسی کی حق تلفی ہو جائے، جو ہمارے مواخذہ کا ذریعہ بن جائے۔ (العیاذ باللہ العظیم)

لہٰذا شریعت نے بطورِ خاص ایسے موقع پر وصیت کا حکم فرمایا، تاکہ حق والے کو بآسانی اس کا حق پہنچ جائے اور ہم اپنے مرنے کے بعد بریٔ الذمہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض اوقات ورثاء کے علاوہ دیگر رشتہ دار اور اقارب ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی وجہ سے وراثت کے حقدار نہیں ہوتے، جیسے پوتا، نواسا وغیرہ، حالاں کہ وہ بھی ضرورت مند ہیں، تو شریعت نے بطورِ استحباب ایسے موقع پر ایک تہائی میں وصیت کے ذریعہ ان کی مدد اور نصرت کا راستہ کھول دیا۔

160

تیسری بات یہ ہے کہ شریعت نے وصیت مستحبہ کے ذریعہ ہر شخص کو یہ موقع دے دیا کہ اگر کسی کے اعمال میں کمی وکوتاہی رہ گئی ہے تو وہ اپنے مرنے کے بعد مال کو کسی کارِ خیر میں خرچ کرنے کی وصیت کر کے اپنے اعمال کی کمی وکوتاہی کی تلافی کر سکتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مال میں سے ایک تہائی حصہ مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کی وصیت کر دے، ان شاء اللہ اس کے ذریعہ حق تعالیٰ اس کے اعمال میں ہونے والی کمی وکوتاہی معاف فرما دیں گے، بلکہ عاجز کے خیالِ ناقص میں اپنے مال میں ایک تہائی حصہ کارِ خیر میں خرچ کرنے کی وصیت اخلاصِ نیت اور ثوابِ آخرت کی غرض سے کی جائے تو یہ ایک طرح کا صدقہ بھی ہے، اس لیے اُمید یہی ہے کہ حق تعالیٰ وصیت کے مطابق مصارفِ خیر میں مال خرچ کرنے پر صدقہ کا ثواب بھی عطا فرمائیں گے۔

وصیت کی ان حکمتوں اور حقیقتوں سے حضراتِ صحابہؓ بخوبی واقف تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنا مال مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کی اس قدر وصیتیں کرتے تھے کہ خود حضور ﷺ کو انہیں کمی کرنے کی ہدایت کرنی پڑتی تھی۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

اس سلسلہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا واقعہ تو بڑا ہی مشہور ہے، کہ فتح مکہ کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر آپ سخت بیمار ہو گئے، حتیٰ کہ انہیں اپنی زندگی کی اُمید نہ رہی، رحمت عالم ﷺ جب ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، تو حضرت سعدؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا:

”يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ لِيْ مَالًا كَثِيْرًا، وَ لَيْسَ يَرِثُنِيْ إِلَّا ابْنَتِيْ، أَفَأُوْصِيْ بِمَالِيْ كُلِّهٖ؟“

ترجمہ: ”اے اللہ کے رسول! میرے پاس الحمد للہ بہت مال ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت دیا ہے، اور ورثاء میں ایک بیٹی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، تو کیا میں اپنے تمام مال

کو کارِ خیر میں خرچ کرنے کی وصیت کر دوں؟''

اللہ اکبر! ایک طرف تو کارِ خیر میں خرچ کرنے کی وصیت کا یہ جذبہ، دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ اپنی طرف سے کوئی فیصلہ بھی نہیں، بلکہ جو حضور ﷺ کا ارشاد ہوگا اسی کے مطابق عمل ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، سارے مال کو خرچ کرنے کی وصیت کرنا مناسب نہیں، کچھ کم کر دو، حضرت سعدؓ عرض کرتے ہیں: حضور! دو تہائی مال کے بارے میں وصیت کر دوں؟ سارا نہیں تو آدھا؟ فرمایا: نہیں، اور کم کر دو، (سوچنے کی بات ہے کہ مدنی معاشرے میں تو خرچ کرنے والوں کو یہ کہنا پڑتا تھا کہ تھوڑا اور کم کر دو، جب کہ آج کے معاشرے میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ تھوڑا زیادہ کر دو) حضرت سعدؓ نے پھر اجازت چاہی کہ حضور! تیسرے حصے کی وصیت کر دوں؟ تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "الثُّلُثُ، والثُّلُثُ كَثِيرٌ." ''ہاں، مال کے تیسرے حصے کی وصیت کر سکتے ہو، حالاں کہ وہ بھی زیادہ ہے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک حکیمانہ بات ارشاد فرمائی:

" إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ."

(متفق علیه، مشکوٰة: ۲٦٥)

ترجمہ: ''اصل بات یہ ہے کہ تم اپنے وارثوں کو مالدار اور خوشحال چھوڑ کر جاؤ یہ بہتر ہے اس سے کہ تم ان کو غریب، تنگدست اور مفلس چھوڑ کر جاؤ، پھر وہ لوگوں کے سامنے اپنی ضرورت کے لیے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔''

مال اور اعمال کی وصیت:

صاحبو! اللہ تعالیٰ نے اگر کسی شخص کو مالدار اور اس کے ورثاء کو بھی خوشحال بنایا ہو تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے مال کے تیسرے حصے کو کارِ خیر میں خرچ کرنے کی وصیت کرے، لیکن اگر کسی وجہ سے ایک تہائی مال کی وصیت نہ کر سکے تو کم از کم ان کو نیک اعمال ہی کی وصیت کرے، یہ حضرات انبیاء علیہم السلام، صحابۂ کرامؓ اور صلحاءِ امت کی سنت ہے کہ وہ

اپنی اولاد، اعزہ واقرباء کو دین اسلام اور شرعی احکام پر قائم رہنے اور معاصی و بدعات و خرافات سے بچنے کی وصیت کیا کرتے تھے، چنانچہ قرآنِ کریم میں حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام کی وصیت کا تذکرہ موجود ہے:

﴿ وَ وَصّٰى بِهَآ إِبْرٰهِيمُ بَنِيهِ وَ يَعْقُوبُ ؕ يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ۝﴾ (البقرة: ۱۳۲)

ترجمہ: ''اور ملت ابراہیمی کی وصیت کی حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب (علیہما السلام) نے اپنی اولاد کو، فرمایا: میرے بچو! بے شک اللہ نے تمہارے لیے منتخب فرمایا اس دین کو، لہٰذا موت تک اس پر قائم ودائم رہنا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ وصیت کرنا انبیاءِ کرام علیہم السلام، صحابہؓ اور صلحاءِ امت کا طریقہ رہا ہے۔

عجیب وغریب وصیت مع نصیحت:

اور بعض صلحاء کے حالات میں تو عجیب وغریب وصیت کا تذکرہ ملتا ہے، مثلاً ہندوستان کے ایک مشہور بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنی وفات سے پہلے یہ وصیت فرمائی کہ ان کی نمازِ جنازہ ایسا شخص پڑھائے جو ہمیشہ عفیف رہا ہو، (بدکاری بلکہ بدنگاہی تک سے محفوظ رہا ہو) نمازِ عصر کی سنتیں نہ چھوڑی ہوں، اور ہمیشہ نماز تکبیرِ اولیٰ سے پڑھی ہو، نمازِ جنازہ کے وقت جب اس وصیت کا اعلان ہوا تو اس وقت کے بادشاہ سلطان شمس الدین التمشؒ نے بھی اس کو سنا، تھوڑی دیر انتظار کیا، جب کوئی آگے نہ بڑھا تو بادشاہِ وقت یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ میری خواہش تو یہی تھی کہ کسی کو میرا راز معلوم نہ ہوتا، لیکن حضرت کی وصیت اور حکم کے بعد اب کوئی چارہ بھی نہیں، اور بادشاہ نے آگے بڑھ کر نمازِ جنازہ پڑھائی۔ (''کتابوں کی درسگاہ میں'' /ص: ۸۷)

نیز منقول ہے کہ ایک بزرگ نے اپنے آخری وقت میں اپنے بیٹے کو وصیت مع نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ”بیٹا! مرنے کے بعد میرے پیروں میں یہ پھٹے پرانے موزے پہنا دینا، میری خواہش ہے کہ مجھے اسی طرح قبر میں دفن کیا جائے، بیٹے نے وصیت پر عمل کرنے کا وعدہ کرلیا، جب والد محترم کا انتقال ہوگیا تو غسل دیے جانے کے بعد اس نے اس وصیت کا اظہار کیا، مگر تمام لوگوں نے بیک زبان کہا کہ ہماری شریعت میں ایسی وصیت پر عمل نہیں ہوسکتا، اب بیٹا اپنی لاعلمی کی وجہ سے وصیت کے مطابق عمل کرنے پر اصرار کرنے لگا اور اِدھر اُدھر علماء سے رجوع کرنے لگا، مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ شرعاً اس کی گنجائش نہیں، اسی دوران ایک شخص نے حاضر ہوکر مرحوم باپ کا خط اس کے بیٹے کے حوالے کیا جس میں مرحوم نے ایک دوسری وصیت مع نصیحت اس طرح لکھی کہ ”بیٹے! دیکھ رہے ہو؟ موت کے بعد مال و دولت اور زمین و جائداد تو دور کی بات ہے، اس کی بھی اجازت نہیں کہ انسان ایک پھٹا پرانا موزہ تک اپنے ساتھ لے جائے، بیٹا! ایک دِن تمہیں بھی اسی مرحلہ سے گزرنا ہے، لہٰذا مال کے بجائے نیک اعمال کا اہتمام کرو، اس کے علاوہ کوئی چیز کام نہ آئے گی۔“

وصیت کی فضیلت:

اگر ہم بھی حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام، صحابہؓ اور صلحاءِ امت کی سنت کے مطابق اس طرح کی وصیت کا اہتمام کریں گے تو سنتِ انبیاء علیہم السلام کی فضیلت کا ثواب تو حاصل ہوگا ہی، مزید برآں حدیث پاک میں مذکور وصیت کی فضیلت بھی حاصل ہوگی، ایک روایت میں وارد ہے:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”مَنْ مَاتَ عَلٰى وَصِيَّةٍ مَاتَ عَلٰى سَبِيْلٍ وَ سُنَّةٍ، وَ مَاتَ عَلٰى تُقًى وَ شَهَادَةٍ، وَ مَاتَ مَغْفُوْرًا لَهٗ.“ (رواه ابن ماجه، مشکوٰة: ۲۶۶)

ترجمہ: ”جو آدمی (فرض، مسنون یا مستحب) وصیت کر کے مرا تو وہ صراطِ مستقیم

یعنی سیدھے راستے اور پسندیدہ طریقے پر مرا، اس کی موت تقویٰ اور شہادت والی ہوئی، (یعنی اس کو متقیوں اور شہیدوں میں شامل کیا جائے گا) اور اس کی موت مغفرت کی حالت میں ہوئی۔“

کتنی بڑی فضیلت ہے، اس کے حصول کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بھی اپنا ایک وصیت نامہ مرتب کریں، جس میں اگر حقوق اللہ وحقوق العباد میں کوئی کمی وکوتاہی رہی ہو تو اس کی تلافی کے لیے ایک تہائی مال میں سے تاکید کریں، یا تہائی مال سے صدقاتِ نافلہ اور اپنے متعلقین کو اعمالِ صالحہ کی وصیت وتاکید کریں۔

عاجز کی وصیت اور معذرت:

”اس موقع پر یہ عاجز اپنے تمام اہل خانہ واقرباء کو بتاکید یہ وصیت کرتا ہے کہ مایوس کن حالات میں کسی بھی ہسپتال میں ہرگز نہ رکھیں اور خدانخواستہ اگر عاجز کے ذمہ حقوق اللہ و حقوق العباد میں سے کوئی حق باقی رہ گیا ہو تو ایک تہائی مال میں سے اس کو ادا کرنے کا پورا اہتمام کیا جائے، اس کے بعد جائدادِ منقولہ وغیر منقولہ شریعت مطہرہ کے حکم کے مطابق تمام ورثاء کے درمیان تقسیم کردی جائے، نیز ہر موقع پر اعمالِ صالحہ وشرعیہ کا اخلاصِ نیت واتباعِ سنت کے ساتھ اہتمام اور معاصی، خرافات، فضولیات اور بدعات سے مکمل اجتناب کیا جائے۔“

علاوہ ازیں یہ عاجز ربِ کریم کے فضلِ عظیم پر یقین رکھتے ہوئے مرنے کے بعد کفن پر مذکورہ شعر لکھنے کا بھی اپنی اولاد واحباب سے خواہشمند ہے کہ:

اِصْنَعْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ ☆ وَ لَا تَفْعَلْ بِنَا مَا نَحْنُ أَهْلُهٗ

یعنی اے ربِ کریم! آپ ہمارے ساتھ وہی معاملہ فرمائیے جو آپ کی شایانِ شان ہے، وہ معاملہ مت فرمائیے جس کے ہم مستحق ہیں۔

اس وصیت کے بعد اللہ کے ان تمام بندوں اور بندیوں کی خدمت میں جن کا کوئی حق ہمارے ذمہ ہو خواہ مالی حق ہو یا غیر مالی، اہل حقوق سے دست بستہ نہایت لجاجت و سماجت سے التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے واسطے ہمیں دل سے معاف کر دیں، معاف کرنے والوں کے بڑے فضائل کتاب وسنت میں وارد ہوئے ہیں، یہ عاجز خود بھی بارگاہِ الٰہی میں مغفرت و معافی کی اُمید پر اپنے حقوقِ غیر مالیہ جو کسی کے ذمہ ہوں بلا استثناء کے معاف کرتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ دعا ہے کہ ربِ کریم! سفر آخرت سے قبل تمام حقوق ومظالم سے بعافیت سبکدوش کرا دیجیے، اور فی الحیاۃ و بعد الممات تمام معاملات اپنی چاہت اور شریعت و سنت کے مطابق مقدر فرما دیجیے۔

” فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ! أَنْتَ وَلِيِّیْ فِیْ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ، تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ أَلْحِقْنِیْ بِالصَّالِحِيْنَ.“ ...... ويرحمُ اللّٰهُ عَبدًا قَالَ : ” آمينا“

(اے) آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز (اور رکھوالا) ہے، مجھے اس حالت میں دنیا سے اٹھانا کہ میں تیرا فرماں بردار رہوں اور مجھے نیک لوگوں میں شامل کرنا، اور اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو اس دعا پر آمین کہے۔

اللہ رب العالمین اس دعا کو عاجز کے اہل وعیال، متعلقین اور محسنین ومرحومین کے حق میں بھی قبول فرمائے۔ آمین۔

۱۷/ ذی الحجہ/ ۱۴۳۶ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۱/ اکتوبر/ ۲۰۱۵ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

163

(۲۳)

بدعت کی مذمت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: ” أَمَّا بَعْدُ...... فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ، وَ خَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم، وَ شَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ.“ (راوہ مسلم : ۱/ ۲۸۵، مشکوٰۃ : ۲۷/ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

ترجمہ: ”حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد وثنا اور خطبہ کے بعد ارشاد فرمایا کہ کائنات میں سب سے بہترین کلام کتاب اللہ ہے، اور سب سے بہترین طریقۂ زندگی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے، اور سب سے بدترین (فتنہ کی) چیز (دین اسلام میں) نئی باتیں ایجاد (پیدا) کرنا ہے، (جس کو بدعت کہتے ہیں) اور ہر بدعت ضلالت وگمراہی (کا منبع وسرچشمہ) ہے۔“ (العیاذ باللہ العظیم)

اتباع کا حکم اور ابتداع کی ممانعت:

اللہ رب العزت نے ہمیں فلاحِ دارین سے نوازنے کے لیے ایک طرف تو اتباع کا حکم فرمایا اور دوسری طرف دارین کے خسارے سے بچنے کے لیے ابتداع سے منع بھی فرمایا،

اتباع کہتے ہیں زندگی کے ہر شعبے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام اور طریقہ کی مکمل پیروی کرنا، اسی کا نام دین ہے، اور یہی صراطِ مستقیم ہے جس پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد فرمایا:

﴿ وَ أَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ﴾ (الأنعام : ۱۵۳)

ترجمہ: ''اور (اے پیغمبر! ان سے یہ بھی کہو کہ) یہ میرا سیدھا راستہ ہے، لہٰذا اس کے پیچھے چلو، اسی کا اتباع کرو۔'' اس سے بہتر راستہ اور طریقہ کوئی نہیں ہوسکتا، اسی کو مذکورہ حدیث میں فرمایا گیا: "خَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ."

لیکن اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف اوروں کے طریقے پر چلے، یا اپنی طرف سے بندگی کرنے اور زندگی گزارنے کا نیا طریقہ ایجاد کر کے اس کے پیچھے چلے تو یہ ہے ''ابتداع'' یعنی بدعت، جس کی ممانعت قرآنِ پاک میں وارد ہے:

﴿ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ﴾ (الأنعام : ۱۵۳)

اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ پڑو، ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے، لوگو! یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے تاکید کی، تاکہ تم متقی بنو۔

جب سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ خلیفہ بنے تو سب سے پہلے جو خطبہ دیا اس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے: "إِنِّيْ مُتَّبِعٌ وَ لَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ." (طبقات ابن سعد : ۱۸۳/۳، اصلاحی خطبات : ۱۹۰/۱)

دورِ صحابہؓ بدعات سے پاک تھا:

مطلب یہ ہے کہ ''میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا متبع ہوں، مبتدع نہیں ہوں۔'' اور یہ حال صرف صدیق اکبرؓ ہی کا نہیں؛ بلکہ تمام صحابہؓ کا تھا، ہر صحابی متبع

164

رسول تھا، کوئی بھی مبتدع نہ تھا، اس لیے کہ بدعت کا سبب یا تو جہالت ہوتی ہے یا شرارت، اور صحابہؓ نہایت شریف اور علم میں پختہ تھے، یہی وجہ ہے کہ دورِ صحابہؓ اتباعِ سنت کے نور سے منوّر اور بدعات کی آمیزش سے پاک تھا، اس کی تائید حضور پاک ﷺ کی اس پیشین گوئی سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا، وَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَ إِيَّاكُمْ وَ مُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ." (رواه أحمد و أبو داوٗد و الترمذی، مشکوٰۃ : ۳۰)

ترجمہ: ''میرے بعد تم بہت زیادہ اختلاف و افتراق دیکھو گے، اس وقت تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم میرے اور میرے ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کے طریقے کو لازم پکڑ لینا، اسی اسوہ اور طریقہ پر اعتماد کرنا، اور اسے دانتوں سے (مضبوطی کے ساتھ) پکڑ لینا، اور دین میں پیدا شدہ ہر نئی بات سے اجتناب کرنا، کیوں کہ دین میں پیدا شدہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس روایت کے پیش نظر امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ عام بدعات جن کا تعلق علوم وعبادات سے ہے یہ خلفاءِ راشدین کے آخری دورِ خلافت میں رونما ہوئیں۔
(مجموع الفتاویٰ: ۳۵۴/۱۰)

مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کا دور عموماً بدعات سے محفوظ رہا، امت میں بدعات کا شیوع دورِ صحابہ کے بعد ہی سے ہوا۔

بدعت کی حقیقت:

سوال یہ ہے کہ بدعت کی حقیقت کیا ہے؟ تو ''بدعت'' لفظ ''ابتداع'' سے ہے، جس کے معنیٰ نئی چیز کے ہیں، جب آدمی کوئی نئی چیز ایجاد کرے تو کہا جاتا ہے: "اِبْتَدَعَ الْأَمْرَ"

جیسے قرآن میں حق تعالیٰ کے متعلق ارشاد فرمایا گیا: ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ﴾ (البقرۃ : ۱۱۷) وہ آسمان وزمین کا موجد ہے۔ یعنی آسمان وزمین کو بغیر کسی نظیر کے ایجاد کرنے والا ہے۔

لیکن اصطلاحِ شریعت میں ہر نئی چیز کو بدعت نہیں کہتے، بلکہ بدعت دین کے معاملہ میں ایسی نو ایجاد چیز کو کہتے ہیں جو نہ عہدِ رسالت میں ہوئی ہو، نہ عہدِ صحابہ میں، نہ حضور ﷺ کے قول وارشاد یا خاموشی سے اس کا جواز ملتا ہو اور نہ ہی اس زمانہ میں اس کی کوئی اصل اور نظیر ہو۔ (قاموس الفقہ: ۲/۲۹۱)

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ ”بدعت کی اس تشریح سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیوی ایجادات، جدید وسائل وآلات وغیرہ بدعت میں داخل نہیں ہیں، اس لیے کہ ان کا تعلق دین سے نہیں ہے، اسی طرح وہ دینی چیز جو موجودہ صورت میں تو قرونِ خیر میں موجود نہ تھی؛ لیکن اس کی اصل ان ادوار میں موجود ہو وہ بھی بدعت نہ ہوگی، مثلاً مدارس کہ صفہ اس کی نظیر ہے، ووٹ کہ بیعت اس کی نظیر ہے، نماز کے لیے آلۂ مکبر صوت کا استعمال کہ ازدحام کے وقت مکبرین کا تکبیراتِ انتقال کہنا اس کی اصل ہے، جہاد کے لیے جدید آلاتِ حرب کا استعمال کہ ﴿وَ أَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ..الخ﴾ (الأنفال: ٦٠) اس کو شامل ہے۔“ (قاموس الفقہ: ۲/۲۹۲)

خلاصہ یہ ہے کہ دین میں کوئی نئی بات دین سمجھ کر جاری کی جائے تو اسے بدعت کہتے ہیں، یہی فرق ہے رسم اور بدعت میں، رسم بھی بے اصل اور خلافِ شرع ہوتی ہے، مگر عموماً اسے دین اور ثواب سمجھ کر نہیں کیا جاتا، مگر بدعت والے عمل کو دین اور ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ فافہم۔ (مستفاد از: ”مآرب الطلبہ“: ۱۴۶)

بدعت کا سبب جہالت ہے یا شرارت:

بدعت سے حفاظت کے لیے کتاب وسنت کا صحیح علم اور اس کا اتباع ضروری ہے،

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امت میں بدعت کی اشاعت کے پیچھے دو اسباب اکثر مؤثر رہے ہیں: (۱) جہالت۔ (۲) نفس وشیطان کی شرارت۔ کبھی تو آدمی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر نفس وشیطان کی پیروی کرنے سے بدعت کا مرتکب ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ أَهْوَآءَهُمْ ؕ وَ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (القصص: ٥٠)

ترجمہ: ”پھر اگر یہ تمہاری نہ مانیں تو سمجھ لو کہ درحقیقت یہ لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں، اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہش کے پیچھے چلے، بے شک اللہ تعالیٰ ظالمین کو ہدایت نہیں دیتا۔“

علماءِ سوء اسی سبب بدعت میں مبتلا ہوئے، اس کے علاوہ بدعت کا بڑا سبب جہالت ہے، اکثر عوام اسی سبب سے بدعات میں مبتلا ہوئے، دورِ صحابہ بدعات سے محفوظ اس لیے بھی تھا کہ وہ علم وہدایت کا دور تھا، بعد میں جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اور لوگ عہدِ رسالت اور زمانۂ علم وہدایت سے دور ہوتے گئے، علم کم ہوتا رہا اور جہالت وضلالت عام ہوئی تو بدعات پھیل گئیں، اس لیے کہ جہالت وبدعات لازم ملزوم ہیں، جہاں کہیں دینی اعتبار سے جہالت پائی جائے گی وہاں بدعات کا ہونا یقینی ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَ لٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتّٰى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوْسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا، فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوْا وَ أَضَلُّوْا.“ (متفق علیه، مشکوٰۃ: ۳۳/ کتاب العلم)

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ علم کو بندوں سے چھین کر ختم نہیں فرمائیں گے، بلکہ علماء کو (موت دے کر) اٹھا کر ختم کر دیں گے، یہاں تک کہ جب (کسی علاقہ وزمانہ میں) کوئی

(صحیح اور معتبر) عالم دین باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا رئیس، سردار، رہبر اور پیشوا بنا لیں گے، پھر جب ان سے مسائل معلوم کیے جائیں گے تو وہ بغیر علم ہی کے فتویٰ دیں گے (اس طرح) وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ بدعت و ضلالت کا بنیادی سبب جہالت ہے، چنانچہ آج جہاں کہیں بھی جہالت عام ہے وہاں بدعات بکثرت رائج ہیں، جہالت ہی کے سبب عین بدعت کو سنت، معصیت کو عبادت اور بے دینی کو دین سمجھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بدعت شیطان کا نہایت پسندیدہ عمل ہے۔ مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ عام گناہوں کے مقابلہ میں شیطان کو بدعت زیادہ پسند ہے۔ (شعب الایمان: ۷/ ۵۹)

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بندہ کوئی عام گناہ کرتا ہے تو اس کے ضمیر پر ایک ٹھیس لگتی ہے، اس لیے وہ کبھی نہ کبھی اس گناہ سے توبہ ضرور کرتا ہے، لیکن بدعتی شخص چوں کہ اپنے عمل بدعت کو عین عبادت سمجھتا ہے، اس لیے عموماً اسے توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، نتیجۃً وہ بدعت کا علم بردار اپنے آپ کو سنت کا ٹھیکے دار سمجھتا ہے، اس طرح وہ بدعت کے دلدل میں جہالت کے سبب مزید دھنستا چلا جاتا ہے، ان ہی لوگوں کے متعلق قرآن نے فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالًا ○ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا○﴾ (الكهف: ۱۰۳-۱۰۴)

ترجمہ: ''آپ لوگوں سے کہیں کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ کون لوگ ہیں جو اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ دنیوی زندگی میں ان کی ساری دوڑ دھوپ سیدھے راستے سے بھٹکی رہی (ان کا عمل اس دنیا میں اکارت ہوگیا) اور وہ (دل میں) یہی سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔''

حالاں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک وہ عمل اچھا نہیں جو ان کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر ہو، حدیث پاک میں اسے ''شر الامور'' یعنی سب سے بدترین کام کہا گیا، جس کا حاصل کچھ نہیں، دنیا و آخرت دونوں اعتبار سے خسارہ۔

بدعت کی مذمت:

اس کے علاوہ بھی بدعت کی بہت سخت مذمت وارد ہوئی ہے، ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ، فَهُوَ رَدٌّ." (متفق عليه، مشكوٰة: ۲۷)

ترجمہ: ''ہمارے اس دین اسلام میں جس نے کوئی ایسی نئی بات پیدا کی جس کا اس دین سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے، تو وہ رد کر دی جائے گی۔''

اسی لیے تو کہتے ہیں کہ:

کچھ نہ کرے گھٹا بڑھا اپنی طرف سے دین میں — جتنا نبی ﷺ بتا گئے اُتنا کرے تو مرحبا!

کیوں کہ دین اسلام کے احکام مکمل طور پر نازل ہو چکے، اس لیے اب اس میں ایجادات، اختراعات اور بدعات کا کوئی اعتبار نہیں، حتیٰ کہ شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کے بقول: ''دین کے بعض احکام وہ ہیں جن کو انجام دینے کا کوئی خاص طریقہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے متعین نہیں فرمایا، ان کاموں کے لیے بھی اگر کوئی شخص اپنی طرف سے کوئی خاص طریقہ متعین کر کے اسی کو لازم اور ضروری سمجھے تو وہ بھی بدعت بن جائے گا اور اسے رد کیا جائے گا، مثلاً ایصالِ ثواب، ذکر و اذکار، دعوت و تبلیغ اور سیرت النبی وغیرہ کے بیان کے لیے اپنی طرف سے کوئی خاص طریقہ متعین کر کے اس کو لازم و ضروری سمجھے تو یہ چیز بدعت کے دائرے میں آ کر قابل رد ہوگی۔'' (مستفاد از اصلاحی خطبات: ۱/ ۱۹۹)

بدعت سے اچھا عمل بھی قابل رد بن جاتا ہے، ایک حدیث پاک میں بدعت کی نحوست کو اس طرح بیان فرمایا گیا:

عَنْ غُضَيْفِ بْنِ الْحَارِثِ الثُّمَالِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ

اللّٰہِ ﷺ:" مَا أَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً إِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ، فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِنْ إِحْدَاثِ بِدْعَةٍ." (رواه أحمد، مشكوٰة : ۳۱)

ترجمہ: ”کوئی بھی قوم جب بدعت ایجاد کرتی ہے تو (چوں کہ بدعت کی ایجاد دراصل سنت کی عمارت کا انہدام اور اس سے انحراف ہے، اس لیے بدعت کی مرتکب قوم) اسی کے مانند سنت سے محروم کر دی جاتی ہے، اس لیے سنت کو مضبوطی سے پکڑ لینا، اس پر سختی اور پابندی سے عمل کرنا بدعت کے ایجاد سے بہتر ہے۔“

ایک روایت میں تو یہاں تک وارد ہے:

” إِنَّ اللّٰهَ حَجَبَ التَّوْبَةَ عَنْ صَاحِبِ كُلِّ بِدْعَةٍ." (شعب الإيمان:۷/ ۶۰)

ترجمہ: ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر بدعتی کو توبہ کی توفیق سے محروم کر دیتا ہے۔“

اس لیے کہ بندہ گناہ کے کام کو تو غلط سمجھتا ہے، لیکن بدعت کے گناہِ کبیرہ کو غلط ہی نہیں سمجھتا، تو پھر توبہ کیسے کرے گا؟ علاوہ ازیں بدعتی شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر دین کو ناقص سمجھتا ہے، جس کی نقد سزا یہ ملتی ہے کہ وہ توفیق توبہ سے محروم کر دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ ایک حدیث میں مدینہ طیبہ کی خاص حرمت وعظمت کے پیشِ نظر ارشاد فرمایا:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" الْمَدِيْنَةُ حَرَمٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ إِلىٰ ثَوْرٍ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيْهَا حَدَثًا، أَوْ اٰوىٰ مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلَائِكَةِ وَ النَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَ لَا عَدْلٌ." (متفق عليه، مشكوٰة : ۲۳۸)

ترجمہ: ”مدینہ طیبہ عیر سے لے کر مقام ثور تک حرم ہے، پس جس شخص نے اس خطہ میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعقیدہ اور بدعتی کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، اس کی فرض یا نفل کوئی عبادت قبول نہ ہوگی۔“

نیز ایک اور روایت میں فرمایا گیا:

عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ

لِصَاحِبِ بِدْعَةٍ صَوْمًا وَ لَا صَلوٰةً وَ لَا صَدَقَةً وَ لَا حَجًّا وَ لَا عُمْرَةً وَ لَا جِهَادًا وَ لَا صَرْفًا وَ لَا عَدْلًا، يَخْرُجُ مِنَ الإِسْلَامِ كَمَا تَخْرُجُ الشَّعْرَةُ مِنَ الْعَجِيْنِ." (رواه ابن ماجه/ص:۶ / باب اجتناب البدع والجدل)

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ کسی بھی بدعتی کا نہ روزہ قبول کرتا ہے نہ نماز، نہ زکوٰۃ، نہ حج، نہ عمرہ، نہ جہاد، نہ کوئی نفل، نہ کوئی فرض، بدعتی دین اسلام سے ایسے نکل جاتا ہے جیسے گوندھے ہوئے آٹے سے بال نکلتا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ جس طرح آٹے میں بال برداشت نہیں کیا جاتا اسی طرح دین میں بدعت اور بدعتی کو اللہ تعالیٰ برداشت نہیں فرماتے، اور جس طرح آٹے سے بال بآسانی نکل جاتا ہے اسی طرح دین اسلام سے بدعتی نکل جاتا ہے۔

ایک اور حدیث پاک میں فرمایا گیا:

عَنْ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ مَيْسَرَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالىٰ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ أَعَانَ عَلىٰ هَدْمِ الإِسْلَامِ." (رواه البيهقي في شعب الإيمان مرسلا: ۷/۶۱، مشكوٰة : ۳۱)

ترجمہ: ”جس شخص نے کسی بدعتی کی (اس کی بدعت کی بنیاد پر) تعظیم وتکریم کی تو اس نے اسلام کی بنیاد مٹانے پر تعاون کیا۔“ (اس لیے کہ بدعتی کی عزت افزائی دین کو نقصان پہنچانے کا سبب ہے)۔

ان حقائق کے پیشِ نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جس طرح حلال امور میں سب سے ناپسندیدہ چیز عند اللہ طلاق ہے، اسی طرح دین اسلام میں سب سے ناپسندیدہ چیز عند اللہ بدعت اور مسلمانوں میں سب سے ناپسندیدہ طبقہ اہل بدعت کا ہے۔

بدعات سے اجتناب:

بدعت کی ناپسندیدگی، مذمت اور نحوست کی بنیاد پر حضرات صحابہ وصلحاء حد درجہ محتاط

رہتے تھے، چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ کے متعلق منقول ہے کہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو دیکھا کہ وہاں ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے، جس میں ایک شخص پکار کر کہتا ہے کہ سو مرتبہ ’’اللہ اکبر‘‘ پڑھو، تو سب لوگ زور زور سے تکبیر کہنے لگے، پھر وہ شخص پکار کر کہتا ہے کہ ’’لا الٰہ الا اللہ‘‘ پڑھو، تو سب لوگ پڑھنے لگتے ہیں، اسی طرح وہ درود پڑھنے کو کہتا ہے تو سب لوگ درود پڑھنے لگتے ہیں، یہ کیفیت دیکھ کر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ’’کیا تم لوگ نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو؟ دراصل تم ایک بڑی بدعت کے مرتکب ہو رہے ہو، کیا تم حضرات صحابہ کے علم پر فضیلت رکھتے ہو؟

(احکام الاحکام: ۱/۵۲، بحوالہ: راہِ سنت: ۱۲۴)

یعنی اس طرح مسجد میں مل کر تکبیر وتہلیل (اور ذکر واذکار) کے نام پر شور مچانے کا عمل دورِ نبوت اور دورِ صحابہ سے ثابت نہیں ہے، اس پر نکیر کی وجہ یہی تھی کہ کہیں یہ مخصوص ہیئت ہی بعد میں خصوصیت کے ساتھ موجب ثواب نہ سمجھ لی جائے۔

(از: لمحاتِ فکریہ، حضرت مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری: ۳۶)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جب یہ دیکھا کہ اکثر ائمہ نماز کے بعد عموماً دائیں طرف رُخ کر کے بیٹھنے کا اہتمام کرتے ہیں، تو آپؓ نے محسوس کیا کہ کہیں یہ عمل بعد میں لازم نہ سمجھ لیا جائے، اس لیے آپؓ نے ارشاد فرمایا:

’’لَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ لِلشَّيْطَانِ شَيْئًا مِنْ صَلَاتِهِ، يَرَىٰ أَنَّ حَقًّا عَلَيْهِ أَنْ لَا يَنْصَرِفَ إِلَّا عَنْ يَمِينِهِ، لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَثِيرًا يَنْصَرِفُ عَنْ يَسَارِهِ.‘‘

(متفق علیه، مشکوٰة: ۸۷)

ترجمہ: ’’تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز کا کوئی حصہ شیطان کے حوالے نہ کرے، یعنی یہ نہ سمجھے کہ اس پر دائیں طرف رُخ کر کے بیٹھنا لازم ہے، اس لیے کہ میں نے حضور ﷺ کو بکثرت بائیں طرف رُخ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔‘‘

یہ باتیں بظاہر معمولی لگتی ہیں، لیکن احتیاط نہ کرنے یا غفلت برتنے سے یہی باتیں

بدعت کا سبب بن جاتی ہیں، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام دینی امور میں سنت کا لحاظ کیا جائے، اور سنت وشریعت کا علم حاصل کر کے اس کے مطابق صحیح عمل کرنے کا اہتمام کیا جائے، ان شاء اللہ اسی سے بدعت کا خاتمہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام کو سنت وشریعت کے کامل اتباع کی توفیق عطا فرما کر رسومات، خرافات، منکرات اور بدعات سے مکمل اجتناب کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

۲۱/صفر المظفر / ۱۴۳۷ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۴/ دسمبر/ ۲۰۱۵ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهُ، فَصَلِّ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهُ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهُ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
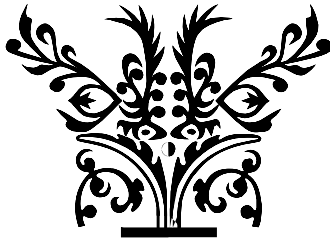
(۲۴)

مشورہ کی اہمیت وضرورت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلّٰی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ : "إِذَا كَانَ أُمَرَاءُ كُمۡ خِيَارَكُمۡ وَ أَغۡنِيَاءُ كُمۡ سُمَحَاءَ كُمۡ، وَ أُمُوۡرُكُمۡ شُوۡرٰی بَيۡنَكُمۡ، فَظَهۡرُ الۡأَرۡضِ خَيۡرٌ لَكُمۡ مِنۡ بَطۡنِهَا، وَ إِذَا كَانَ أُمَرَاءُ كُمۡ شِرَارَكُمۡ، وَ أَغۡنِيَاءُ كُمۡ بُخَلَاءَ كُمۡ، وَ أُمُوۡرُكُمۡ إِلٰی نِسَائِكُمۡ، فَبَطۡنُ الۡأَرۡضِ خَيۡرٌ لَكُمۡ مِنۡ ظَهۡرِهَا." (رواه الترمذی، مشکوٰة : ٤٥٩ / باب تغیر الناس)

ترجمہ : ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تمہارے امراء (حکام و ذمہ دار) بہترین لوگ ہوں، اور تمہارے مالدار لوگ سخی (اور دلدار) ہوں، اور تمہارے معاملات آپس میں مشوروں سے طے ہوتے ہوں، تو اس وقت تمہارے لیے زمین کی پشت (اوپر والا حصہ) اس کے پیٹ (نیچے والے حصہ) سے بہتر ہے، (ایسے مبارک زمانہ میں زندگی موت سے بہتر ہے، کیوں کہ اس صورت میں من مانی کے بجائے رب چاہی زندگی ہوگی اور کتاب و سنت پر عمل کرنا بھی آسان ہوگا، اور روایت میں ہے کہ جس کی عمر بڑی اور عمل بھی بڑھیا ہو وہ خوش نصیب ہے) لیکن جب تمہارے امراء اور

ذمہ دار تم میں سے شریر اور بدترین لوگ ہوں، اور تمہارے مالدار بخیل ہوں، اور معاملات عورتوں کے سپرد ہوں، (ہر معاملہ ان کے سپرد کر دیا جائے، ان ہی سے مشورہ ہو اور ان ہی کی رائے پر فیصلہ ہونے لگے) تو پھر اس وقت تم (نیک لوگوں کے لیے) زمین کا پیٹ اس کی پیٹھ سے بہتر ہے۔'' (موت زندگی سے بہتر ہے)

مشورہ کی افادیت:

اللہ رب العزت نے انسانوں کے مابین جس طرح ظاہری اعضاء کی قوت و طاقت میں فرق رکھا ہے اسی طرح فکری قوتوں اور ذہنی صلاحیتوں میں بھی امتیاز و فرق رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنے ذاتی امور و معاملات میں ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے مطابق سوچتا ہے اور غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص اپنی قوتِ فکریہ اور سوچ سمجھ خرچ کر کے جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ حقیقۃً صحیح اور درست بھی ہو، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی سمجھ بوجھ میں غلطی کر بیٹھتا ہے، اپنی فکری کوتاہی اور سمجھ کی کمی کے باعث نفع کے بجائے نقصان کا فیصلہ کر بیٹھتا ہے، ایسے مختلف اہم مواقع کے لیے شریعت مطہرہ نے ہمیں حکم دیا کہ آپس میں صلاح و مشورہ کے بعد کسی چیز کا فیصلہ لیا جائے اور کام کیا جائے، کیوں کہ جب کسی اہم معاملہ میں مختلف لوگوں سے صلاح و مشورہ لیا جاتا ہے تو اس کے تمام پہلو ظاہر ہو جاتے ہیں، اور ہر طرح کے نشیب و فراز اور نفع و نقصان کے متعدد احتمالات سامنے آجاتے ہیں، جس کے بعد عموماً انسان مناسب رائے قائم کر کے فیصلہ اور کام کر سکتا ہے، جس میں شر اور نقصان کا امکان کم ہوتا ہے، خیر اور نفع زیادہ ہوتا ہے، اسی لیے مشورہ کی افادیت بیان کرتے ہوئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَا خَابَ مَنِ اسۡتَخَارَ، وَ لَا نَدِمَ مَنِ اسۡتَشَارَ." (ذکره الهیثمی فی مجمع الزوائد : ۲/ ۲۸۰، عن أنس رضي اللّٰه عنه)

ترجمہ : ''جس نے استخارہ کیا وہ ناکام نہ ہوگا، اور جس نے مشورہ کیا وہ نادم نہ ہوگا۔''

لہٰذا حکم شرعی کے ساتھ دانائی اور عقلمندی بھی اسی میں ہے کہ ہم قابل غور امور اور اہم معاملات آپس کے مشورے سے طے کیا کریں، اور یاد رکھو! جس کے پاس صحیح مشورہ دینے والا شیخ، اُستاذ یا کوئی دوست ہوتا ہے، عموماً اس کا کوئی کام خراب نہیں ہوا کرتا۔

چنانچہ بیہقی کی ایک روایت ہے کہ جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے، اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو صحیح اور مفید صورت کی ہدایت کی جاتی ہے۔ (معارف القرآن: ۲/ ۲۱۹، مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

مشورہ کی اہمیت:

اسلامی شریعت میں مشورہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم میں ایک مستقل سورت خاص اسی نام سے موسوم ہے، جس میں ارشاد فرمایا گیا کہ سچے مسلمانوں کا شیوہ اور طریقہ یہی ہے کہ ﴿وَ أَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ: ۳۸) ''وہ غور طلب امور اور اہم معاملات میں ہمیشہ مشورہ کرتے رہتے ہیں۔'' (اب خواہ وہ اہم امور و معاملات دینی ہوں یا دنیوی، اور خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، اس میں اتنی وسعت ہے کہ زندگی کے تمام شعبے اس کے ماتحت آجاتے ہیں)۔

عاجز کا خیالِ ناقص تو یہ ہے کہ اہل ایمان بلکہ اہل زمان جب تک آیت شوریٰ میں بیان کردہ وصف سے متصف رہیں گے ان شاء اللہ خیر و خوبی پر باقی رہیں گے، علاوہ ازیں مذکورہ حدیث میں رحمت عالم ﷺ نے بہترین زمانہ کی تین علامتیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) ''إِذَا كَانَ أُمَرَاءُكُمْ خِيَارَكُمْ'' ''جب تمہارے امراء اور حکام نیک اور بہتر ہوں۔''

(۲) ''وَ أَغْنِيَاءُكُمْ سُمَحَاءَكُمْ'' ''جب تمہارے مالدار لوگ دلدار اور سخی ہوں۔''

(۳) ''وَ أُمُوْرُكُمْ شُوْرٰى بَيْنَكُمْ'' ''تمہارے اہم امور اور معاملات آپسی مشورہ سے طے ہوتے ہوں۔'' تو وہ زمانہ تمہارے زندہ رہنے کے لیے بہترین ہے، اس سے بھی باہمی صلاح و مشورہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، بلکہ اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ رب

العالمین نے سید المرسلین ﷺ کو بھی (اُن خاص اور اہم امور میں جن کے متعلق آپ ﷺ پر وحی نازل نہ ہوئی ہو) مشورہ کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (آل عمران: ۱۵۹)

''آپ اپنے اہم امور اور معاملات میں مومنین مخلصین حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ فرمالیا کریں۔'' تاکہ اس سے حضرات صحابہ کی دلجوئی بھی ہوجائے، نیز امت کے اہل علم و اجتہاد کو قیاس کی رہنمائی بھی مل جائے اور ساتھ میں امت کو مشورہ کی اہمیت بھی معلوم ہوجائے، کہ جب حضور ﷺ کو اہم امور میں مشورہ کا حکم ہے جن کے کمالِ عقل اور اصابتِ رائے میں کوئی کلام نہیں، تو ہم اس سے کیسے مستثنیٰ ہوسکتے ہیں؟

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ اس آیت کے ذریعہ یہ بھی تعلیم دی جارہی ہے کہ بڑے کو بھی اپنے آپ کو مشورہ سے بے نیاز نہیں سمجھنا چاہیے، چاہے چھوٹوں سے مشورہ کرنا پڑے، لیکن کرے ضرور۔ (اصلاحی خطبات: ۱۱/ ۲۹)

خود حضور پاک ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جن امور کے متعلق کوئی حکم الٰہی موجود نہ ہوتا ان میں آپ ﷺ صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کیا کرتے، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ اپنے ساتھیوں کے مشورہ کو اپنی ذاتی اور شخصی رائے پر ترجیح دیتے، اس سلسلہ میں غزوۂ اُحد کا واقعہ شاہد ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتی رائے مدینہ منورہ میں رہ کر دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی تھی، لیکن نوجوان صحابہؓ کی رائے کے مطابق آپ ﷺ نے مدینہ سے باہر نکل کر مدافعت کا فیصلہ فرمایا۔

مشورہ کی شرعی حیثیت:

چوں کہ قرآن وحدیث سے مشورہ کی اہمیت ثابت ہے، اس لیے ہمارے علماء نے مشورہ کی شرعی حیثیت پر کلام کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ اہم دینی وذاتی امور اور معاملات

جن کے متعلق کوئی صریح حکم قرآن وسنت میں وارد نہیں ہوا اور اس میں مختلف رائیں ہوسکتی ہیں ان میں ماہرین سے مشورہ کرنا مسنون ہے، اگر وہ معاملہ دین کا ہو تو اس صورت میں علماءِ ربانیین سے مشورہ کیا جائے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رحمت عالم ﷺ سے عرض کیا کہ حضور! آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم صراحۃً قرآنِ کریم میں نازل نہ ہوا ہو اور آپ سے بھی اس کے متعلق کوئی ارشاد ہم نے نہ سنا ہو تو پھر ہم کیا کریں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”شَاوِرُوا الفُقَهَاءَ الْعَابِدِيْنَ، وَ لَا تَمْضُوا بِرَأْيٍ خَاصٍّ.“

ترجمہ: ”ایسے کام کے لیے فقہاءِ عابدین (کو جمع کرو اور ان) کے مشورہ سے فیصلہ کرو، کسی کی تنہا رائے پر فیصلہ نہ کرو۔“

(ذکرہ الهيثمی فی مجمع الزوائد/ باب فی القياس و التقليد/الجزء: ١/ص: ١٠٧)

البتہ دین کے علاوہ کوئی اور معاملہ ہو تو پھر اس معاملہ کی جو لوگ مہارت وصلاحیت رکھتے ہوں ان سے مشورہ کیا جائے، جیسے رضاعت یعنی دودھ پلانے کا تعلق عورت سے ہے، اس لیے قرآن نے حکم دیا کہ ﴿عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ﴾ (البقرة: ٢٣٣) بچہ کا دودھ چھڑانا والدین کی رضامندی اور مشورہ سے ہونا چاہیے، کیوں کہ اس سلسلہ میں عورتوں ہی کو زیادہ تجربہ اور مہارت ہوتی ہے، لہٰذا اس معاملہ میں ان ہی سے مشورہ کرنا چاہیے۔

اور جن اہم امور و معاملات کا تعلق عوام سے ہے، جیسے حکومت کے اہم امور و معاملات (اور آج کل دینی اداروں کے اہم امور و معاملات) تو ان میں ان کے ماہرین سے مشورہ لینا واجب ہے، کیوں کہ اسلامی حکومت کی اصل بنیاد جمہوریت پر نہیں؛ بلکہ شورائیت پر ہے، جمہوریت وشورائیت بنیادی فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس سے مشورہ لیا جارہا ہے اس میں اہلیت بھی ہے یا نہیں، اور شوریٰ میں اس کا لحاظ کیا جاتا ہے، بلکہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بقول مجلس شوریٰ کے ارکان میں دو وصف ضروری ہیں،

ایک صاحبِ عقل ورائے ہونا، دوسرے عبادت گزار ہونا، جس کا حاصل ہے ذی رائے اور متقی ہونا، اور اگر شرعی مسئلہ ہے تو فقیہ ہونا بھی لازم ہے۔ (معارف القرآن: ۲/۲۲)

صاحبو! واقعہ یہی ہے کہ اگر ارکانِ شوریٰ اپنی ذمہ داری کے مطابق اہم امور میں امیر کو امانت داری سے مشورہ دیں، پھر امیر شوریٰ کی اجتماعی رائے کے مطابق امانت داری سے فیصلہ کرے تو ان شاء اللہ اس سے خیر ہی وجود میں آئے گی۔

اوصافِ مشیر:

اس لیے شریعت مطہرہ نے جہاں ہمیں اپنے خصوصی وعمومی اور انفرادی واجتماعی اہم امور ومعاملات میں مشورہ کا حکم دیا وہیں اس سلسلہ میں مشیر (مشورہ دینے والے) کو بھی چند امور کا پابند بنایا ہے، جس کی طرف ایک حدیث پاک سے رہنمائی ملتی ہے، جس میں فرمایا گیا:

”إِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ.“ (رواه الترمذی، مشکوٰة: ٤٣٠/باب الحذر والتأنی فی الأمور)

”یعنی جس سے مشورہ لیا جائے اُسے امانت دار ہونا چاہیے۔“

اس حدیث سے اوصافِ مشیر میں سے پہلا وصف یہ معلوم ہوا کہ وہ امانت دار ہو اور اس کے ضمن میں دوسرا وصف یہ معلوم ہوا کہ وہ تجربہ کار ہو، اس لیے کہ سچا اور اچھا مشیر امین ہوتا ہے، لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے جس چیز سے متعلق مشورہ لیا جاتا ہے اگر اس کی صحیح معلومات، تجربہ اور مہارت مشیر میں نہ ہو تو اسے صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ میں اس سلسلہ میں مشورہ دینے کی اہلیت نہیں رکھتا، اس بارے میں جو صحیح تجربہ، معلومات اور بصیرت رکھتا ہو اس سے مشورہ لیجیے، اور اگر اس کو اس معاملہ کا تجربہ واہلیت ہو تو پھر امانت دار مشیر ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ مشورہ لینے والے کی پوری خیر خواہی مدنظر رکھتے ہوئے جو رائے اس کے مناسب ہو دیانت داری کے ساتھ اس کے سامنے بیان کردے، مشورہ لینے والے کو راضی اور خوش کرنے کے لیے یا اپنے نجی مفاد کے لیے غلط مشورہ نہ دے، اس لیے کہ یہ امانت داری

کے خلاف ہے، اس سلسلہ میں بعض مرتبہ بڑی آزمائش سے دوچار ہونا پڑتا ہے، مثلاً ایک شخص اپنی وہ جائداد فروخت کرنا چاہتا ہے جو ہمارے مکان یا دوکان کے قریب ہے، اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر ہم خریدیں تو اگرچہ وہ ہمارے لیے بہتر ہو، لیکن صاحبِ مکان اور دوکان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ فی الحال فروخت نہ کرے، اس وقت اگر وہ ہم سے مشورہ کرتا ہے تو ہم اپنے فائدے کو مدنظر نہ رکھیں، بلکہ اس کے فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی مشورہ دیں کہ تم اس وقت اپنی جائداد فروخت نہ کرو۔ یا مثلاً ایک شخص کسی رشتہ کے متعلق ہم سے مشورہ لینا چاہتا ہے تو امانت داری کا تقاضا یہی ہے کہ جو صحیح صورتِ حال ہو اس سے ہم باخبر کر دیں، حتیٰ کہ اس رشتہ میں کوئی عیب اور واقعی خرابی ہو تو اس سے بھی مطلع کر دینا ضروری ہے، اس لیے کہ شریعت نے مشورہ دینے میں ضرورتاً غیبت اور اظہارِ عیب کو بھی جائز قرار دیا ہے، لہٰذا صحیح حقیقت کو صاف صاف بیان کر دینا ضروری ہے، جیسے ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا نقصان ہو، اسی طرح دوسرے بھی یہی چاہیں گے کہ ان کا بھی نقصان نہ ہو، اس لیے امانت داری کے ساتھ مشورہ طلب کرنے والے کو وہی رائے دی جائے جو خود کے لیے پسند ہو، ایک حدیث پاک میں وارد ہے کہ حضور ﷺ سے ایمان کے افضل امور واعمال کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"أَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ، وَ تَكْرَهَ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ."

(رواه أحمد، مشكوٰة: ۱۶)

ترجمہ: ''جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو، اور جو چیز اپنے لیے ناپسند ہو وہ دوسروں کے لیے بھی ناپسند کرو۔'' (یہ امانت داری کا تقاضا ہے)۔

پھر کبھی ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص کسی معاملہ میں مشورہ طلب کرتے ہوئے یہ چاہتا ہے کہ وہ معاملہ اس کے اور تمہارے درمیان راز ہی رہے، ایسی صورت میں "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" کا مطلب یہ بھی ہے کہ مشیر میں تیسرا وصف یہ ہو کہ وہ راز دار ہو، امانت داری کا تقاضا یہی ہے کہ جس نے مشورہ طلب کرتے ہوئے ہمیں اپنا ہمراز بنایا ہو تو اس کو صحیح مشورہ دینے کے بعد

اس کے معاملہ کو راز ہی میں رکھو، اس کے راز کو فاش کرنا خیانت ہے، اور مشیر امین ہونا چاہیے، خائن نہیں۔

ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کا کما حقہ لحاظ وہی شخص کر سکتا ہے جو متقی، پرہیزگار اور دیندار ہو، اس طرح مشیر کا چوتھا وصف یہ معلوم ہوا کہ وہ پرہیزگار اور دیندار بھی ہو، حضور ﷺ نے "إِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمَنٌ." فرما کر اس طرف بھی نہایت جامعیت کے ساتھ اشارہ فرما دیا ہے۔

خلاصہ:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سچا اور اچھا مشیر وہ ہے جس میں چار اوصاف ہوں: (۱) امانت دار ہو۔ (۲) تجربہ کار ہو۔ (۳) راز دار ہو۔ (۴) پرہیزگار و دیندار ہو۔ اگر کسی کو ایسا مشیر میسر ہو تو وہ اس کی خوش نصیبی ہے، اس لیے کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِالْأَمِيْرِ خَيْرًا، جَعَلَ لَهُ وَزِيْرَ صِدْقٍ، إِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهُ، وَ إِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ."

(مشكوٰة / كتاب الإمارة والقضاء / الفصل الثاني / ۳۲۲)

''اللہ تعالیٰ جس شخص کو مسلمانوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنا کر اس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے لیے کوئی مخلص وزیر (اور مشیر) متعین فرما دیتے ہیں، پھر وہ (ذمہ دار) کسی ضروری بات کو بھول جائے تو اس کا مشیر اسے یاد دلاتا ہے اور جو ذمہ داری یاد ہے اس میں مدد کرتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مخلص مشیر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اپنی نجی زندگی میں ان اوصاف کا حامل کوئی ایک آدھ مشیر تو ضرور ہونا چاہیے، ہم اگر اب تک کسی کو پیر نہ بنا سکے ہوں تو کم از کم ان اوصاف کے حامل کسی کو مشیر ہی بنا لیں، بالخصوص دینی کام انجام دینے والے مخلص مشیر کار تلاش کریں، پھر ان پر اعتماد کر کے ان کے مشورے کے مطابق اپنے اہم

معاملات و امور کو انجام دیں، تو ان شاء اللہ اس سے بھی زندگی میں بہت ہی خیر و خوبی اور کامیابی ملے گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مخلص مشیر بننے کی توفیق عطا فرمائے اور عند الضرورۃ خیر خواہ مشیر بھی عطا فرمائے۔ آمین۔

۱۵/ ذی الحجہ/ ۱۴۳۶ھ/ بروز: بدھ
مطابق: ۳۰/ ستمبر/ ۲۰۱۵ء، بزم صدیقی، بڑودا

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
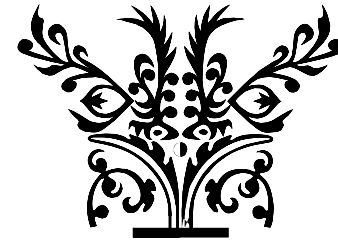
(۲۵)

استخارہ کی اہمیت اور اس کا طریقہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا الاسْتِخَارَةَ فِيْ الْأُمُوْرِ، كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْآنِ، يَقُوْلُ:" إِذَا هَمَّ أَحَدُكُمْ بِالْأَمْرِ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الْفَرِيْضَةِ، ثُمَّ لِيَقُلْ:" اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَ أَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَ أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَ لَا أَقْدِرُ، وَ تَعْلَمُ وَ لَا أَعْلَمُ، وَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَ عَاقِبَةِ أَمْرِيْ (أَوْ قَالَ:" فِيْ عَاجِلِ أَمْرِيْ وَ اٰجِلِهٖ") فَاقْدُرْهُ لِيْ وَ يَسِّرْهُ لِيْ، ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ، وَ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَ عَاقِبَةِ أَمْرِيْ (أَوْ قَالَ:" فِيْ عَاجِلِ أَمْرِيْ وَ اٰجِلِهٖ") فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَ اصْرِفْنِيْ عَنْهُ، وَ اقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ أَرْضِنِيْ بِهٖ، قَالَ:" وَ يُسَمِّيْ حَاجَتَهٗ."

(رواه البخاری، مشکوٰة : ۱۱۶ / باب التطوع)

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ ہمیں تمام امور میں استخارہ سکھاتے تھے، جس طرح کہ قرآن مجید کی کوئی سورت ہمیں سکھاتے تھے،

اورفرماتے تھے کہ جب بھی تم میں سے کوئی شخص کسی بھی کام کا ارادہ کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ فرض کے علاوہ دو رکعات نماز پڑھ لے اور پھر یہ دعا پڑھے جس کا مطلب یہ ہے کہ ’’اے اللہ! میں تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں تیرے علم کے وسیلے سے، اور میں تجھ سے قدرت طلب کرتا ہوں تیری قدرت کے واسطے سے، اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے بڑے فضل کا، تو ہی قادرِ مطلق ہے اور میں قادر نہیں ہوں، اور تو ہی تمام چیزوں کو جانتا ہے، میں نہیں جانتا، اور تو ہی تمام غیب کی باتوں کو جاننے والا ہے، اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ کام (جس کا میں نے قصد و ارادہ کیا ہے) میرے لیے دینی، دنیوی اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہے (آگے راوی کو حضور ﷺ کے ارشاد میں ذرا سا شک ہو گیا کہ آپ ﷺ نے ’’فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ‘‘ فرمایا، یا ’’وَ عَاجِلِ أَمْرِيْ وَ اٰجِلِهٖ‘‘ فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے جلد یا بدیر آنے والے معاملے کی بہتری و بھلائی کو بھی تو ہی جانتا ہے، لہٰذا جو بہتر ہو) اس کو مقدر اور آسان فرما دے، پھر تو اس میں میرے لیے برکت ڈال دے، اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے لیے دینی، دنیوی اور انجام کے اعتبار سے بہتر نہیں ہے (اسی طرح فوری اور دیر یا نفع کے اعتبار سے بھی بہتر نہیں ہے) تو پھر اس کام کو یا معاملہ کو مجھ سے پھیر دے، اور مجھے اس سے، اور میرے لیے وہی مقدر اور مہیا فرما جس میں میرے لیے خیر ہو، جہاں کہیں بھی ہو، اور پھر مجھے اس پر راضی بھی فرما دے۔‘‘

(روایت کے اخیر میں ہے کہ دعاءِ استخارہ میں جہاں لفظ ’’هٰذَا الْأَمْرَ‘‘ آیا ہے وہاں اپنے اس مقصود کام کا ذکر کرے جس کے لیے استخارہ کر رہا ہے، مثلاً ’’هٰذِهِ التِّجَارَةَ‘‘ یا ’’هٰذَا النِّكَاحَ‘‘ یا ’’هٰذَا الْبَيْتَ‘‘ وغیرہ۔ لیکن اگر عربی سے واقفیت نہیں ہے تو ’’هٰذَا الْأَمْرَ‘‘ کہتے وقت اپنے دل میں اس مقصد کا تصور کرے جس کے لیے استخارہ کیا جا رہا ہے)

تمہید:

اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے متعلق یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے

کہ جن احکام کا تعلق اوامر سے ہے خواہ وہ فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات ہی میں سے کیوں نہ ہوں ان میں سراپا خیر اور بھلائی ہے، ان میں سے کسی بھی حکم میں شر یا بگاڑ کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں، اور وہ احکام جن کا تعلق نواہی سے ہے یقیناً ان میں شر اور برائی ہے، بھلائی اور خیر کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں، لیکن اوامر و نواہی کے علاوہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے نہ قرآن و حدیث میں صاف صاف حکم دیا ہے، نہ منع فرمایا ہے، اور نہ ہی ان امور پر اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے، اصطلاحِ شریعت میں ان امور کو ’’مباح‘‘ کہتے ہیں، یہ امور حالات کے اعتبار سے نفع بخش بھی ہو سکتے ہیں اور نقصان دہ بھی، اس لیے ان امور کو انجام دیتے وقت انسان تردّد اور کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے، کیوں کہ بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ ایک انسان کسی چیز کو اپنے لیے اچھی اور بہتر سمجھتا ہے، لیکن حقیقت میں انجام کے اعتبار سے وہ اس کے لیے بہتر نہیں ہوتی، جب کہ بعض اوقات کسی چیز کو وہ اپنے لیے بری سمجھتا ہے، مگر وہی اس کے لیے انجام کے اعتبار سے بہتر ہوتی ہے، اب کس کے حق میں کیا اچھا اور کیا برا ہے؟ اس کا یقینی علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اور علمِ الٰہی کے مقابلہ میں انسان کا علم بالیقین ناقص ہے، اس حقیقت کو قرآنِ پاک نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرة: ۲۱۶)

ترجمہ: ’’عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو، حالاں کہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو، حالاں کہ وہ تمہارے حق میں بری ہو، اور (اصل حقیقت کو) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘

لہٰذا ان امور میں بہتر یہی ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کی طرف رجوع کر کے اسی سے اپنے متعلق تمام امور اور معاملات میں مشورہ کرے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں استخارہ کہتے ہیں۔

استخارہ کی حقیقت:

جس طرح ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے بہت سے امور میں ایک دوسرے سے مشورہ لیتے ہیں، اسی طرح استخارہ کی صورت میں ہم اپنے اللہ سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں، بدقسمتی سے آج کل گروہ بندی اور اختلافِ باہمی کی کثرت کی وجہ سے مشورہ کا سلسلہ ہی ختم ہوتا جارہا ہے، لیکن استخارہ ایک ایسا مبارک سلسلہ ہے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوسکتا، کیوں کہ استخارہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص جب کسی مباح اور جائز امر کے متعلق تردّد میں مبتلا ہو جائے، اسے کسی کام کے متعلق دونوں باتوں کا احتمال ہو کہ یہ کام مفید ہوگا یا مضر؟ تو ایسی صورت میں نماز یا دعاءِ استخارہ کے ذریعہ اللہ رب العزت سے خیر، بھلائی اور رہنمائی طلب کرنے کو استخارہ کہتے ہیں، یہ ایک مسنون عمل ہے، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ استخارہ سے خیر تو حاصل ہوتی ہے، خبر نہیں، اس عمل کے ذریعہ کسی بھی شخص کو گذشتہ یا آئندہ کی کوئی خبر نہیں مل سکتی؛ البتہ استخارہ کرنے والے کو خیر اور بھلائی کی رہنمائی ضرور حاصل ہوتی ہے، بشرطیکہ اس کو خودساختہ طریقوں کے بجائے مسنون طریقہ کے مطابق کیا جائے۔

استخارہ کا مسنون طریقہ مع اَدعیہ:

اس سلسلہ میں حضور پاک ﷺ کی پاکیزہ تعلیم اور طریقہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی ایسا مباح معاملہ اور مسئلہ پیش آجائے جس میں کسی ایک پہلو کو اختیار کرنے میں تردّد ہو جائے، مثلاً تجارت جوتوں کی کرے یا کپڑوں کی، حج ٹور سے کرے یا کمیٹی سے، یا اُس خاندان میں رشتۂ نکاح طے کرے یا اِس خاندان میں وغیرہ، تو اس وقت اگر وقت مکروہ نہ ہو تو دو رکعات نفل نماز پڑھ لے، اس لیے کہ حدیث میں منقول ہے:

"فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الْفَرِيْضَةِ."

امام نوویؒ کے بقول اس نماز کی پہلی رکعت میں سورۂ کافرون اور دوسری میں سورۂ اخلاص پڑھ لے تو بہتر ہے، البتہ اگر نمازِ استخارہ کا موقع ہی کسی وجہ سے نہ ہو، یا فرض نماز ادا

کرنے کے بعد استخارہ کرنا ہو تو نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف دل سے متوجہ ہو کر وہ دعا مانگے جو مذکورہ حدیث میں حضور اکرم ﷺ سے منقول ہے، فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ، وَ أَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَ أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَ لَا أَقْدِرُ، وَ تَعْلَمُ وَ لَا أَعْلَمُ، وَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَ عَاقِبَةِ أَمْرِيْ، فَاقْدُرْهُ لِيْ وَ يَسِّرْهُ لِيْ، ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ، وَ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ وَ مَعَاشِيْ وَ عَاقِبَةِ أَمْرِيْ، فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ وَ اصْرِفْنِيْ عَنْهُ، وَ اقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ أَرْضِنِيْ بِهٖ."

ترجمہ: ''اے اللہ! میں تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں تیرے علم کے وسیلے سے، اور میں تجھ سے قدرت طلب کرتا ہوں تیری قدرت کے واسطے سے، اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے بڑے فضل کا، تو ہی قادرِ مطلق ہے اور میں قادر نہیں ہوں، اور تو ہی تمام چیزوں کو جانتا ہے، میں نہیں جانتا، اور تو ہی تمام غیب کی باتوں کو جاننے والا ہے، اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ کام (جس کا میں نے قصد وارادہ کیا ہے) میرے لیے دینی، دنیوی اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہے تو اس کو میرے لیے مقدر اور آسان فرمادے، پھر تو اس میں میرے لیے برکت ڈال دے، اور اگر تیرے علم میں یہ کام میرے لیے دینی، دنیوی اور انجام کے اعتبار سے بہتر نہیں ہے تو پھر اس کام کو یا معاملہ کو مجھ سے پھیر دے، اور مجھے اس سے، اور میرے لیے وہی مقدر اور مہیا فرما جس میں میرے لیے خیر ہو، جہاں کہیں بھی ہو، اور پھر مجھے اس پر راضی بھی فرمادے۔''

صاحبو! حضور ﷺ کی یہ دعا اتنی جامع ہے کہ کوئی بندہ خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرلے ایسی دعا کبھی نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ یہ اتنی جامع دعا ہے کہ نماز کے بغیر بھی صرف اس دعا پر اکتفا کیا جاسکتا ہے، اور اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی طرف دعا کے ذریعہ متوجہ ہونا ہے، چنانچہ اس سلسلہ کی دوسری روایتوں میں ہے کہ اگر اچانک کوئی

معاملہ یا مسئلہ سامنے آجائے اور وقت کی کمی کی صورت میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا ہو اور نہ نماز کا موقع ہو، نہ مذکورہ تفصیلی دعا کا، تو ایسی صورت میں ایک مختصر سی دعا یہ بھی منقول ہے:

"اَللّٰھُمَّ خِرۡ لِیۡ وَ اخۡتَرۡ لِیۡ." (رواہ الترمذی / کتاب الدعوات / باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید/الجزء : ۱۱/الصفحة : ۴۲۲)

ترجمہ: ''اے اللہ! میرے لیے آپ منتخب اور پسند فرما دیجیے۔'' (کہ مجھے کونسا راستہ اختیار کرنا ہے)۔

اس کے علاوہ ایک اور دعا بھی منقول ہے:

"اَللّٰھُمَّ أَلۡھِمۡنِیۡ رُشۡدِیۡ وَ أَعِذۡنِیۡ مِنۡ شَرِّ نَفۡسِیۡ." (رواہ الترمذی/کتاب الدعوات/ باب ما جاء فی جامع الدعوات عن النبی ﷺ/ الجزء : ۱۱/ الصفحة : ۳۸۷)

ترجمہ: ''اے اللہ! جو صحیح معاملہ اور راستہ ہے وہ میرے دل میں ڈال دیجیے اور مجھے میرے نفس کے شر سے بچائیے۔''

نیز ایک دعا یہ بھی منقول ہے:

اَللّٰھُمَّ اھۡدِنِیۡ وَ سَدِّدۡنِیۡ." (رواہ مسلم/أبواب الذکر والدعاء/باب القعود من شر ما عمل)

ترجمہ: ''اے اللہ! میری رہنمائی فرمائیے اور مجھے سیدھے راستے پر رکھئے۔''

علماءِ کرام فرماتے ہیں کہ ان دعاؤں میں سے جو آسانی سے زبان پر آجائے اُسے اُسی وقت پڑھ لیں، یا کم از کم دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے مانگ لیں، اس کے بعد اگرچہ کوئی خواب نظر نہ آئے؛ مگر جو بات دل میں آئے اسے اللہ تعالیٰ کا جواب سمجھیں، استخارہ میں خواب (جو غیر اختیاری چیز ہے اس کا) نظر آنا ضروری نہیں ہے، ان شاء اللہ اس سے بھی استخارہ کا مقصد (تردّد کا ختم ہو جانا اور دل کا کسی ایک طرف مطمئن ہو جانا) حاصل ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و بھلائی کی رہنمائی مل جائے گی، اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

176

استخارہ کی اہمیت:

استخارہ اتنا مبارک اور اہم عمل ہے کہ خود حضور ﷺ تو اپنے تمام امور میں اس کا اہتمام فرماتے ہی تھے، ساتھ ہی حضراتِ صحابہ کو تعلیم قرآن کی طرح اس کی بھی تعلیم و تلقین فرمایا کرتے تھے، حضرت انس رضی اللہ فرماتے ہیں:

"یُعَلِّمُنَا الاسۡتِخَارَةَ فِیۡ الۡأُمُوۡرِ کَمَا یُعَلِّمُنَا السُّوۡرَةَ مِنَ الۡقُرۡآنِ."

ترجمہ: ''حضور ﷺ ہمیں ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے تعلیم قرآن کی طرح استخارہ کی بھی تعلیم و تلقین فرماتے۔''

لہٰذا ہمیں بھی تمام ہی مباح اور جائز امور میں اس کا اہتمام کرنا چاہیے، خواہ وہ امر اہم ہو یا نہ ہو اور اس میں تردّد ہو یا نہ ہو، صرف چند گنے چنے موقعوں اور کاموں کے وقت استخارہ کرنے کرانے پر اکتفا نہ کرنا چاہیے، اور عاجز کا خیالِ ناقص تو یہ ہے کہ استخارہ دراصل رجوع الی اللہ کا آسان ترین اور بہترین ذریعہ بھی ہے، اس لیے کسی اور سے استخارہ کرانے کے بجائے خود ہی سیکھ کر اس کا اہتمام کرنا بہتر ہے، بلکہ ایک حد تک ضروری بھی ہے، کیوں کہ ایک انسان اپنی ضرورت جتنے بہتر طریقے اور توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر سکتا ہے ظاہر ہے کوئی اور اس کیفیت کے ساتھ پیش نہیں کر سکتا۔ پھر استخارہ کی توفیق بھی ہر کسی کو نہیں ملتی، جو لوگ سعادت مند ہیں ان ہی کو حق تعالیٰ استخارہ کی توفیق عطا کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں آنے والی بات پر رضا مندی عطا فرماتے ہیں، جب کہ بدبختوں سے یہ توفیق ہی چھین لی جاتی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں استخارہ چھوڑ دینے کو انسان کی بدبختی کی نشانی قرار دیا گیا ہے:

عَنۡ سَعۡدٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "مِنۡ سَعَادَةِ ابۡنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضٰی اللّٰہُ لَهٗ، وَ مِنۡ شَقَاوَةِ ابۡنِ اٰدَمَ تَرۡکُهٗ اسۡتِخَارَةَ اللّٰہِ، وَ مِنۡ شَقَاوَةِ ابۡنِ اٰدَمَ سَخَطُهٗ بِمَا قَضٰی اللّٰہُ لَهٗ." (رواہ أحمد و الترمذی، مشکوٰۃ:۴۵۳)

ترجمہ: ”حق تعالیٰ کے فیصلہ پر رضامند رہنا بندے کے لیے سعادت مندی ہے، اور کسی بھی بندے کی بدبختی (دو باتوں میں ہے: ایک تو) یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ اور خیر طلب کرنا چھوڑ دے، اور (دوسرے یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے نالاں و ناراض ہو جائے۔“ (العیاذ باللہ العظیم)۔ بہر حال استخارہ خوش نصیبی کی علامت ہے اور اسے چھوڑ دینا بدبختی ہے۔

استخارہ کی فضیلت:

اس کے علاوہ استخارہ کی فضیلت کے لیے اتنی بات بھی کافی ہے کہ اس کے ذریعہ ہمیں بآسانی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور ساتھ ہی حضور ﷺ کی ایک سنت پر عمل کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے، اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ حدیث پاک میں استخارہ کی یہ فضیلت و بشارت منقول ہے کہ جس کام کے لیے استخارہ کیا جاتا ہے حق تعالیٰ اس میں کامیابی ڈال ہی دیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا:

”مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ، وَ لَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ، وَ لَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ.“

(ذکرہ السیوطی فی الجامع الصغیر/حرف المیم)

ترجمہ: ”استخارہ کرنے والا ناکام نہیں ہوتا اور مشورہ کرنے والا ندامت کا شکار نہیں ہوتا، اور میانہ روی سے خرچ کرنے والا کبھی محتاج نہیں ہوتا۔“

ان فضائل کا بھی تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے تمام امور و معاملات میں خود ہی استخارہ کا اہتمام کریں اور اس کا عمومی مزاج و رواج بنائیں۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیق عمل سے نوازے۔ آمین۔

یومِ عرفہ / ۱۴۳۶ھ/ بروز: جمعرات

مطابق: ۲۴/ستمبر/ ۲۰۱۵ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهُ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهُ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهُ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۲۶)

سفر کے آداب واحکام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " السَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ الْعَذَابِ، يَمْنَعُ أَحَدَكُمْ نَوْمَهٗ وَ طَعَامَهٗ وَ شَرَابَهٗ، فَإِذَا قَضٰى أَحَدُكُمْ نَهْمَتَهٗ مِنْ وَجْهِهٖ فَلْيُعَجِّلْ إِلٰى أَهْلِهٖ." (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۳۳۹/ باب آداب السفر)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سفر عذاب کا ایک حصہ ہے، جو تمہیں (وقت پر چین سے) سونے اور کھانے پینے سے روکتا ہے، لہٰذا جوں ہی مقصد سفر پورا ہو جائے فوراً اپنے گھر لوٹ جائے۔“

سفر کی حقیقت وضرورت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ بعض دینی اور دنیوی ضروریات ایسی بھی رکھی ہیں جن کی تکمیل کے لیے اس کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے اور کبھی تو ایک شہر، صوبہ اور ملک سے دوسرے شہر، صوبہ اور ملک تک سفر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، سفر کا یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں، بلکہ بہت پرانا ہے، سب سے پہلے انسانِ اوّل حضرت آدم علیہ السلام نے بحکمِ الٰہی

جنت سے زمین کا سفر کیا، پھر زمین کے مختلف مقامات پر بھی آپ نے دینی و دنیوی ضروریات پوری کرنے کے لیے سفر کیے، بعض روایات میں وارد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے اتارے گئے تو ان کے سفر کی پہلی منزل سری لنکا کی سرزمین تھی، وہاں سے انہوں نے بیل پر سوار ہو کر حجازِ مقدس کا سفر کیا، اور مکہ مکرّمہ میں کعبۃ اللہ کی پہلی تعمیر فرما کر حج ادا کیا، پھر آپ کے بعد جتنے بھی حضرات انبیاء علیہم السلام اور انسان دنیا میں تشریف لائے ان سبھی کو اپنی دینی و دنیوی ضروریات کی تکمیل کے لیے سفر کرنا پڑا، اور آج بھی اور آئندہ بھی سفر کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔

شریعت میں سفر کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنی اصلی جائے قیام (وطن اصلی) سے کسی بھی دینی یا دنیوی ضرورت کی تکمیل کے لیے اتنا دور جائے کہ جہاں تک پہنچنے میں پیدل یا اونٹ کی رفتار سے چلتے ہوئے تین دِن لگتے ہوں، موجودہ حساب سے اس کی مقدار اڑتالیس میل اور کلومیٹر کے اعتبار سے احتیاطاً ۷۸ کلومیٹر کی مسافت کو سفر اور اس عمل کرنے والے کو مسافر کہتے ہیں۔ غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کو کبھی دینی و دنیوی اور چھوٹے یا بڑے سفر کی ضرورت پیش نہ آئی ہو، اور بعض لوگوں کا تو وہ حال ہے جیسے کسی شاعر نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

کس کس پہ نظر رکھیں ہم؟ سب کی نظر میں رہتے ہیں
قسمت ہی کچھ ایسی پائی ہے کہ ہر وقت سفر میں رہتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ سفر بھی انسانی ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت ہے، جس سے مختلف حقائق، مقاصد اور فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

سفر کے فوائد:

یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت نے نہ صرف سفر کی اجازت دی؛ بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے، کیوں کہ سفر کا ایک بڑا فائدہ مناظر قدرت کا مشاہدہ ہے، واقعی سفر سے اللہ تعالیٰ

کی مخلوقات اور قدرت کے عجائبات کا مشاہدہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے خاص اس مقصد کے لیے سفر کرنے کی ترغیب دی ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ﴾ (العنکبوت : ۲۰)

یہ سفر کا من جانب اللہ گویا دعوت نامہ ہے، جس میں یہ فرمایا گیا کہ ذرا زمین میں سیر و سیاحت کر کے دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ابتدا میں مخلوق کو پیدا فرمایا۔ واقعی سفر میں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور قدرت کے عجائبات کا جو مشاہدہ ہوتا ہے وہ عموماً اپنے مقام اور وطن میں رہتے ہوئے نہیں ہوتا، خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العالمین نے اپنی مخلوقات اور قدرت کے عجائبات کا مشاہدہ کرانے کے لیے معراج کا سفر کرایا۔

سفر کا دوسرا فائدہ مناظر عبرت کا مشاہدہ ہے، قرآنِ کریم نے اس مقصد کے لیے بھی خاص طور پر سفر کرنے کی ترغیب دی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ثُمَّ انۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ﴾ (الأنعام: ۱۱)

”کہو کہ زمین میں چلو، پھر دیکھو کہ (پیغمبروں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟“

دراصل مشرکین عرب شام کے تجارتی سفر کے دوران قومِ ثمود اور قومِ لوط کی بستیوں سے گزرا کرتے تھے، جہاں ان کی تباہی کے آثار تھے، تو قرآن نے دعوتِ عبرت دیتے ہوئے سفر کی ترغیب دی کہ جن لوگوں نے دین حق کی تکذیب کی ان کا عبرت ناک انجام بھی دیکھو، بلکہ خاص اس غرض سے سفر کرو، کیوں کہ سفر کے دوران مناظر عبرت کے مشاہدات سے انسان عبرت، ہدایت اور نصیحت کی وہ باتیں سیکھ لیتا ہے جو بعض اوقات تعلیم گاہوں میں بھی نہیں سیکھ پاتا، سفر کا یہ بھی ایک اہم فائدہ ہے۔

سفر کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ کسب معاش اور روزگار کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے، قرآنِ پاک سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ ذَلُوۡلًا فَامۡشُوۡا فِیۡ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوۡا مِنۡ

رِزْقِهٖ﴾ (الملک:۱۵)

’’وہی اللہ ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع اور تصرف میں کر رکھا ہے، لہٰذا تم اس کی راہوں میں چلو پھرو (سفر کرو) اور اس کا رزق کھاؤ۔‘‘

حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات سفر سے رزق اور برکت کے دروازے کھل جاتے ہیں، اور حضور ﷺ نے بھی تجارت ہی کی غرض سے ابتداءً مکہ سے شام کا سفر فرمایا تھا۔ علاوہ ازیں اور بھی حقائق، مقاصد اور فوائد ہیں جن کے حصول کے لیے شریعت نے سفر کرنے کی نہ صرف اِجازت دی؛ بلکہ دعوت دی ہے، اور اس دعوت کو قبول کرنے کی ترغیب دے کر اس سلسلہ میں تفصیلات بھی بیان فرمائی ہیں۔

سفر کی قسمیں:

چنانچہ ہمارے علماء نے شرعی احکام کے اعتبار سے سفر کی پانچ قسمیں بیان فرمائی ہیں: (۱) واجب۔ (۲) مسنون و مستحب۔ (۳) مباح۔ (۴) مکروہ۔ (۵) حرام۔ جہاں تک تعلق ہے واجب کا تو فرمایا کہ جب حج اور جہاد مع الکفار بالسیف فرض ہو جائے تو یہ دونوں ایسی عبادتیں ہیں جو سفر کے بغیر بہت کم انجام پاتی ہیں، اس لیے ان دونوں عبادتوں کی ادائیگی کے لیے سفر کی ضرورت پیش آجانے پر یہ سفر واجب ہو جاتا ہے، اور واجب کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا سخت گناہ اور عذابِ الٰہی کا ذریعہ ہے، جیسا کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت کعب بن مالک، حضرت ہلال بن اُمیہ اور حضرت مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم پر شریک نہ ہونے کی بنا پر عتابِ الٰہی ہوا، پھر انہوں نے پچاس دن کے بعد سچی توبہ کے ذریعہ نجات حاصل کی۔

رہی بات سفر مسنون اور مستحب کی، تو نفلی حج، عمرہ اور دعوت الی اللہ، نیز علماء، اولیاء اللہ، احباب اور اقرباء کی عیادت، زیارت اور ملاقات کی غرض سے سفر کرنا مسنون، مستحب اور اجر وثواب کا باعث ہے، حضور ﷺ کا نفلی عمرہ کے لیے سفر کرنا ثابت ہے، اور دعوت الی

اللہ کی غرض سے آپ ﷺ کا سفر طائف تو تاریخ اسلام کا ایک زریں اور روشن حصہ ہے، اور علماء، اولیاء اللہ، احباب اور اقرباء کی عیادت، زیارت اور ملاقات کی غرض سے سفر کرنے والے کے لیے آپ ﷺ نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ:" إِذَا عَادَ الْمُسْلِمُ أَخَاهُ، أَوْ زَارَهٗ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ:" طِبْتَ وَ طَابَ مَمْشَاكَ، وَ تَبَوَّأْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا."

(رواه الترمذی، مشکوٰۃ:۴۲۶، حدیث قدسی نمبر: ۹)

’’جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عیادت وملاقات کے لیے (سفر کر کے) جاتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تو بھی اچھا، تیرا چلنا (سفر کرنا) بھی اچھا، اور تو نے (اس کے عوض) جنت میں اپنا گھر بنالیا۔‘‘

سفر مباح یہ ہے کہ کوئی شخص کسب معاش، حلال چیزوں کی تجارت، جائز ملازمت اور کسی صحیح غرض وضرورت کے تحت سفر کرے، چنانچہ حضرات صحابہؓ اور صلحاء سے کسب معاش کے سلسلہ میں سفر کرنا ثابت ہے، اور کتب فقہ میں اس کے احکام بھی موجود ہیں۔

ایک دل چسپ واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک دل چسپ واقعہ منقول ہے کہ حضرت ابوعلی شقیق بلخی اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہما اللہ دونوں ہم زمانہ تھے، ایک مرتبہ حضرت شقیق بلخیؒ نے تجارت کی غرض سے سفر کا ارادہ کیا تو سوچا کہ جانے سے پہلے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ سے ملاقات کرلوں، کیوں کہ اندازہ ہے کہ سفر سے واپسی پر کئی مہینے لگ جائیں گے، اس ملاقات کے چند دِن بعد حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے ایک مرتبہ دیکھا کہ حضرت شقیق بلخیؒ مسجد میں موجود ہیں، پوچھا کہ ’’آپ سفر تجارت پر نہیں گئے؟‘‘ فرمایا: ’’گیا تو تھا، مگر راستہ میں ایک واقعہ پیش آیا، جس سے متاثر ہوکر میں واپس آگیا، قصہ یہ ہوا کہ سفر کے دوران ایک غیر آباد جگہ پر پہنچا، تو وہاں میں نے ایک کمزور چڑیا دیکھی، جو اُڑنے کی طاقت سے محروم تھی، مجھے بڑا ترس آیا، سوچنے لگا

کہ اس ویرانے میں یہ چڑیا کیسے اپنا رزق پاتی ہوگی؟ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک اور چڑیا آئی، جس نے اپنی چونچ میں کوئی چیز دبا رکھی تھی، وہ معذور چڑیا کے پاس اُتری اور اپنی چونچ کی دبائی ہوئی چیز اس کے سامنے رکھ دی، جس کو اس نے اُٹھا کر کھالیا، یہ سلسلہ چلتا رہا اور میں دیکھتا رہا، میرے دِل میں خیال آیا کہ سبحان اللہ! جب اللہ تعالیٰ ایک معذور چڑیا کا رزق اس طرح اس کے پاس پہنچا سکتا ہے تو پھر مجھے حصولِ رزق کے لیے شہر در شہر سفر کی کیا ضرورت ہے؟ پس میں نے اسی وقت سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا اور واپس چلا آیا۔''

یہ سن کر حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے فرمایا کہ ''شقیق! تم نے اپاہج پرندے کی طرح بننا کیوں پسند کیا؟ جو دوسروں کے سہارے جیتا ہے، تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اُس پرندے کی طرح بن جاؤں جو اپنی قوتِ بازو سے خود بھی کما کر کھاتا ہے اور اپنے ہم جنسوں کو بھی کھلاتا ہے۔'' حضرت شقیقؒ نے جب یہ سنا تو حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کا ہاتھ چوم لیا اور فرمایا: ''ابو اسحاق! تم نے میری آنکھ سے پردہ ہٹا دیا، بات وہی صحیح ہے جو تم نے کہی۔''

(رازِ حیات: ۱۸۰، از: کتابوں کی درسگاہ میں: ۱۶۷)

بہر کیف تجارت اور ملازمت وغیرہ کی نیت سے سفر کرنا مباح ہے۔

اور سفر مکروہ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تنہا سفر کرنے سے بچا جائے، کیوں کہ حدیث میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي الْوَحْدَةِ مَا أَعْلَمُ، مَا سَارَ رَاكِبٌ بِلَيْلٍ وَحْدَهُ."

(رواه البخاری، مشکوٰۃ: ۳۳۸)

''اگر لوگ تنہا سفر کرنے کے ان تمام نقصانات سے واقف ہوتے جن سے میں واقف ہوں تو کوئی بھی مسافر کبھی تنہا سفر نہ کرتا۔''

اس لیے علماء نے فرمایا کہ تنہا سفر کرنا خواہ ایک رات ہی کا کیوں نہ ہو، مکروہ اور

خلافِ اولیٰ ہے، البتہ اگر اپنی ذاتی گاڑی سے تنہا سفر کرنے کے بجائے بس، ٹرین اور ہوائی جہاز وغیرہ کا سفر ہو تو ان میں مسافرین کی کثرت کے باعث ایک قافلہ کی شکل بن جاتی ہے، اس لیے بقولِ فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہٗ ''اگر چہ مسافرین میں متعارف لوگ موجود نہ ہوں، پھر بھی ایسے اسفار کو اجتماعی سفر ہی تصور کیا جائے گا۔''

(قاموس الفقہ: ۴/۱۵۷)

اور سفر حرام یہ ہے کہ العیاذ باللہ کسی حرام، ناجائز کام اور مقصد کے لیے سفر کیا جائے، یا عورت اپنے شوہر یا کسی اور محرم کے بغیر سفر کرے، خواہ وہ حج ہی کا سفر کیوں نہ ہو۔

سفر کے آداب:

الغرض سفر واجب ہو، مسنون و مستحب ہو، یا مباح، شریعت نے اسے بامراد، کامیاب اور بابرکت بنانے کے لیے چند آداب بتائے ہیں، جن میں سے پہلا بنیادی ادب یہ ہے کہ سفر سے پہلے استخارہ کرلیا جائے، یا کم از کم اہل خانہ یا کسی نیک دل انسان سے مشورہ کرلیا جائے، مثلاً یہ مشورہ کرلے کہ کب سفر کروں؟ کون سے ذریعہ و راستہ سے سفر کروں؟ وغیرہ، پہلے زمانے میں اور آج بھی بعض نادان لوگ کسی نجومی سے پوچھ کر یا غیر شرعی طور سے فال نکال کر سفر کرتے ہیں، جب کہ شریعت نے ہمیں اس سے نجات دلا کر استخارہ اور مشورہ کا طریقہ بتایا ہے۔ دوسرا ادب یہ ہے کہ سفر سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ والدین، بیوی، بچے یا کسی اور کا کوئی حق تو متاثر نہیں ہوتا؟ اگر ایسا ہو تو اس کی ادائیگی اور تلافی کا اہتمام کیا جائے۔ تیسرا ادب یہ ہے کہ سفر میں مسنون دعاؤں اور ذِکر و اذکار کا اہتمام کیا جائے۔

سفر کی دعائیں:

حضور اکرم ﷺ سے سفر کی جو پاکیزہ اور پر اثر دعائیں منقول ہیں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے بقول ''ان میں ایک مسافر کی

ضروریات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اِن اثر بھرے الفاظ میں سمٹ نہ آیا ہو، ایک مسافر کی بشری نفسیات سے آپ ﷺ سے زیادہ واقف کون ہوسکتا تھا؟ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس کا احاطہ ان دعاؤں میں نہ کرلیا ہو،'' وہ دعائیں یہ ہیں:

۱ - بِسۡمِ اللّٰهِ وَ اعۡتَصَمۡتُ بِاللّٰهِ وَ تَوَكَّلۡتُ عَلَى اللّٰهِ، وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ أَكۡبَرُ.

۲ - اَللّٰهُمَّ أَنۡتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ، وَ الۡخَلِيۡفَةُ فِی الۡأَهۡلِ وَ الۡمَالِ وَ الۡوَلَدِ.

۳ - اَللّٰهُمَّ إِنِّیۡ أَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ وَعۡثَاءِ السَّفَرِ، وَ كَآبَةِ الۡمَنۡظَرِ، وَ سُوۡءِ الۡمُنۡقَلَبِ فِی الۡأَهۡلِ وَ الۡمَالِ وَ الۡوَلَدِ. (رواه مسلم، مشكوٰة:۲۱۳)

۴ - اَللّٰهُمَّ هَوِّنۡ عَلَيۡنَا هٰذَا السَّفَرَ، وَ اطۡوِ عَنَّا بُعۡدَهٗ. (مسلم، مشكوٰة: ۲۱۳/ باب الدعوات فی الأوقات)

۵ - اَللّٰهُمَّ إِنِّیۡ أَسۡأَلُكَ فِیۡ سَفَرِیۡ هٰذَا الۡبِرَّ وَ التَّقۡوٰی وَ مِنَ الۡعَمَلِ مَا تَرۡضٰی. (رواه مسلم، مشكوٰة:۲۱۳)

ان دعاؤں کی اصل تاثیر اور ان میں چھپے ہوئے معانی کا صحیح ادراک تو ان عربی الفاظ ہی سے ہوسکتا ہے جو زبانِ رسالت مآب ﷺ سے ادا ہوئے، اور کون ہے جو ان معانی اور کیفیات کو کسی اور زبان میں منتقل کر سکے، تاہم بنیادی مفہوم سمجھنے کے لیے ان کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ کے نام سے میں شروع کرتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ کا سہارا لیتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے۔

(۲) اے اللہ! تو ہی میرے سفر کا ساتھی ہے، اور تو ہی میری غیر موجودگی میں میرے اہل وعیال اور مال ومنال کا محافظ ہے۔

(۳) اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں سفر کی مشقت سے، اور ایسے منظر سے جو غم انگیز ہو، اور اس بات سے کہ جب میں اپنے اہل وعیال اور مال ومنال میں واپس لوٹ کر آؤں تو وہ بری اور نقصان دہ حالت میں ہوں۔

(۴) یا اللہ! ہمارے لیے سفر کو آسان بنا دیجیے اور اس کی مسافت وطوالت کو ہمارے لیے کم کر دیجیے۔

(۵) اے اللہ! میں تجھ سے اس سفر میں نیکی، تقویٰ اور پرہیزگاری کی توفیق مانگتا ہوں، اور ہر اس عمل کی توفیق کا سوال کرتا ہوں جس سے تو راضی ہو جائے۔

آپ ﷺ جب سواری پر سوار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

" سُبۡحَانَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقۡرِنِيۡنَ وَ إِنَّا إِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ." (رواه مسلم، مشكوٰة:۲۱۳)

''پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے اس سواری کو تابع بنا دیا، ہم میں اس کی طاقت نہ تھی، اور بلا شبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

آپ ﷺ جب کسی نئی بستی یا نئے شہر میں قیام کی غرض سے داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

" اَللّٰهُمَّ إِنِّیۡ أَسۡأَلُكَ مِنۡ خَيۡرِ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ وَ خَيۡرِ أَهۡلِهَا وَ خَيۡرِ مَا فِيۡهَا، وَ أَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ شَرِّهَا وَ شَرِّ أَهۡلِهَا وَ شَرِّ مَا فِيۡهَا."

''اے اللہ! میں آپ سے اس بستی کی، اس کے رہنے والوں کی اور اس بستی کی بھلائی کا طلب گار ہوں، اور اس بستی، اس کے باشندوں اور اس بستی کے شر سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں۔''

سمندری سفر کے لیے آپ ﷺ سے باقاعدہ کوئی دعا منقول نہیں ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ ﷺ کو کبھی بھی سمندری سفر کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ علماء نے فرمایا ہے کہ قرآنِ کریم کی یہ آیت مقدسہ سمندری سفر کے وقت پڑھ لی جائے تو مناسب ہے:

﴿ بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖهَا وَ مُرۡسٰهَا ۭ إِنَّ رَبِّیۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝﴾ (هود: ۴۱)

جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے نام سے اس کا چلنا بھی ہے اور ٹھہرنا بھی، بے شک میرا رب غفور رحیم ہے۔

قلب ونگاہ اگر مادّے کے پار کچھ دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوں تو دوسری بات ہے، ورنہ ایک مسافر کے لیے اس سے بہتر رختِ سفر اور کیا ہوسکتا ہے؟ (جہانِ دیدہ)

سفر سے واپسی:

جہاں تک سفر سے واپسی کی بات ہے تو چوتھا بنیادی ادب یہ ہے کہ مقصد اور ضرورت پوری ہوتے ہی سفر سے لوٹ آئے، اسی کو حدیث مذکور میں فرمایا گیا ہے، اور واپسی کی اطلاع اپنے اہل وعیال کو ضرور کردے، موقع ہو تو مسجد میں دو رکعت نماز پڑھ کر یہ دعا کرے:

" ائِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ." (رواہ مسلم، مشکوٰۃ:۲۱۳)

''سفر سے ہم وطن کی طرف لوٹنے والے ہیں، توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں اور اپنے رب کی تعریف بیان کرنے والے ہیں۔''

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ شریعت نے سفر کے جو آداب واحکام بیان کیے ہیں اگر ان کی رعایت نہ کی جائے تب تو واقعی سفر ''سقر'' (عذابِ جہنم کا ایک حصہ) ہے، لیکن اگر ان آداب واحکام کی رعایت کی جائے تو پھر سفر خواہ پرخطر ہی کیوں نہ ہو مگر وسیلۂ ظفر بن جاتا ہے اور شہروں کے سفر میں جمالِ الٰہی کا تو جنگلوں کے سفر میں جلالِ الٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں سفر کے ان آداب واحکام پر عمل کرنے اور خصوصاً سفرِ آخرت کی تیاری کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

۹/شوال المکرّم/ ۱۴۳۷ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۱۵/ جولائی/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَإِنَّکَ أَنْتَ أَھْلُ التَّقْوٰی وَ أَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ

(۲۷)

امانت کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ:" قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ إِلَّا قَالَ:" لَا إِیْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَہٗ، وَ لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ."

(رواہ البیہقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ: ۱۵/ کتاب الإیمان/ الفصل الثانی)

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ہمارے سامنے شاذ ونادر ہی کوئی خطبہ دیا ہوگا جس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو کہ جس آدمی میں امانت (کا پاس ولحاظ) نہیں، اس کا ایمان بھی (کامل) نہیں، اور جس میں وعدہ (کا پاس ولحاظ) نہیں اس کا دین بھی (کامل) نہیں۔''

(دیگر احادیث مبارکہ میں کمالِ ایمانی کی مزید علامتیں بھی بیان کی گئی ہیں، جن کی تعداد علماء نے اٹھائیس تک بیان کی ہے)۔ (اشرف المشکوٰۃ:۱/۲۱۰)

آیتِ امانت کا شانِ نزول:

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی صلاح وفلاح کے لیے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان

میں ایک حکم اداءِ امانت بھی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰىٓ أَهْلِهَا ﴾ (النساء : ۵۸)

’’یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حقداروں تک پہنچاؤ۔‘‘

دراصل یہ حکم ایک خاص واقعہ کے تحت نازل ہوا تھا، بات یہ تھی کہ نزولِ قرآن سے قبل دورِ جاہلیت میں بھی بیت اللہ کو بڑی عظمت حاصل تھی، جس کی وجہ سے اس کی کسی بھی طرح کی خدمت بڑی عزت کی چیز سمجھی جاتی تھی، باقاعدہ کچھ لوگ بیت اللہ کی مخصوص خدمات کے لیے منتخب ہوتے تھے، پھر ایسے لوگ پوری قوم میں معزز اور ممتاز مانے جاتے تھے، دورِ جاہلیت کے ایامِ حج میں حجاجِ بیت اللہ کو زم زم پلانے کی خدمت رحمت عالم ﷺ کے عم محترم حضرت عباسؓ کے سپرد تھی، جس کو ’’سقایہ‘‘ کہا جاتا تھا، اسی طرح بیت اللہ شریف کی کنجی رکھنا اور مقررہ ایام میں بیت اللہ کو کھولنا، بند کرنا عثمان بن طلحہؓ سے متعلق تھا، آپؓ خود ہی فرماتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں ہم پیر اور جمعرات کے روز بیت اللہ کو کھولا کرتے تھے اور لوگ اس میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرتے تھے، ہجرت سے پہلے ایک روز رحمت عالم ﷺ اپنے بعض صحابہؓ کے ہمراہ بیت اللہ میں داخل ہونے کے لیے تشریف لائے (تو چوں کہ اس وقت تک عثمان بن طلحہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، اس لیے) انہوں نے رحمت عالم ﷺ کو اندر جانے سے روک دیا، بلکہ انتہائی ترش روئی کے ساتھ پیش آکر بداخلاقی کا معاملہ کیا، لیکن صاحب خلق عظیم ﷺ نے صبر وتحمل سے کام لیا اور اتنا فرمایا کہ ’’اے عثمان! شاید تم ایک روز بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، اس وقت مجھے اختیار ہوگا کہ میں جسے چاہوں سپرد کروں‘‘ عثمان بن طلحہ نے کہا کہ ’’اگر ایسا ہوا تو وہ دن قریش کی ہلاکت اور ذلت کا ہوگا‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’’نہیں، اس وقت قریش عزت میں ہوں گے‘‘ اس بات کا عثمان بن طلحہ کے دل میں یقین تو ہوگیا، مگر برادری کے بے جا خوف سے اس کا اظہار نہیں کیا، پھر جب مکہ مکرّمہ فتح ہوا، تو حضور ﷺ اور آپ کے صحابہؓ غالب اور اہل مکہ

مغلوب تھے، اور حالت مغلوبیت میں خوش اخلاقی کا معاملہ کرنا کوئی خاص بات نہیں، کمال یہ ہے کہ غلبہ کی حالت میں بھی خوش اخلاقی کا معاملہ کیا جائے، جیسا کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر کیا، اس وقت بیت اللہ کی چابی رحمت عالم ﷺ کے ہاتھ میں تھی، آپ ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے اور اندر دو رکعت نماز ادا فرمائی، جب بیت اللہ کے اندر سے باہر تشریف لائے تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے بقول زبانِ مبارک پر یہ آیت امانت تھی:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰىٓ أَهْلِهَا ﴾ (النساء : ۵۸)

’’یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حقداروں تک پہنچاؤ۔‘‘

آپ ﷺ نے حکم الٰہی کی تعمیل میں عثمان بن طلحہ کو بلایا اور بیت اللہ کی کنجی ان کے سپرد فرمادی، حضور ﷺ کی اس خوش اخلاقی اور امانت کی ادائیگی سے متاثر ہو کر حضرت عثمان بن طلحہؓ فوراً مسلمان ہوگئے۔ (مستفاد از: معارف القرآن شفیعی: ۲/۴۴۴)

اداءِ امانت کی تاکید:

اداءِ امانت کے متعلق حضور ﷺ کا یہ حال تھا کہ دشمنوں کی امانتیں بھی آپ ﷺ بڑے اہتمام سے ادا فرماتے تھے اور اپنی امت کو بھی اداءِ امانت کی خاص تاکید فرماتے تھے، حضرت انسؓ کی مذکورہ روایت کے مطابق حضور ﷺ کا شاید ہی کوئی بیان اور خطاب ایسا ہو جس میں آپ ﷺ اداءِ امانت کی اہمیت اور تاکید بیان نہ فرماتے ہوں، آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ’’لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهٗ‘‘ مطلب یہ ہے کہ اداءِ امانت کے بغیر ایمان میں کمال پیدا نہیں ہوسکتا۔

صاحبو! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور امانت میں خاص تعلق اور مناسبت ہے، لہٰذا جو شخص ایمان دار ہوگا وہ امانت دار بھی ہوگا، اور جو امانت دار نہیں وہ ایمان دار بھی نہیں، نہ اس کا ایمان کامل ہے، نہ اسے صلاح وفلاح حاصل ہے۔

امانت کی حقیقت:

اس موقع پر امانت کی حقیقت کو سمجھ لینا بھی ضروری ہے، قرآنِ کریم نے اداءِ امانت کا حکم دیتے ہوئے لفظِ ''امانات'' بصیغۂ جمع لاکر اس طرف اشارہ کردیا کہ امانت صرف اسی کا نام نہیں کہ ایک شخص کا مال وسامان کسی دوسرے شخص کے پاس بطورِ امانت رکھا ہو تو مطالبہ پر اسے جوں کا توں واپس کردے، بلاشبہ یہ تو امانت ہے ہی، جس کے متعلق ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَ لْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ﴾ (البقرة:۲۸۳)

اگر تم ایک دوسرے پر بھروسہ کرو تو جس پر بھروسہ کیا گیا وہ اپنی امانت ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور اپنے رب سے ڈرے۔

لیکن عربی زبان اور محاورۂ قرآن میں امانت کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ امانت کا مفہوم زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، وہ اس طرح کہ امانت کی حقیقت میں علماءِ مفسرین کے مختلف اقوال منقول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ امانت سے مراد قرآنِ کریم ہے، اسی لیے ارشادِ باری: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ الْجِبَالِ﴾ (الأحزاب:۷۲) میں مفسرین کی ایک جماعت نے امانت سے مراد قرآنِ کریم کو لیا ہے۔ (اشرف المشکوٰۃ:۱/۲۱۰)

اور جب امانت سے مراد قرآن ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جتنے بھی احکام ہیں خواہ ان کا تعلق عقائد سے ہو یا عبادات سے، معاملات سے ہو یا معاشرت سے، اللہ تعالیٰ سے ہو یا بندوں سے، غرض تمام ایمانی وقرآنی احکام کی صحیح ادائیگی امانت کے مفہوم میں داخل ہے، اور ان کی ادائیگی میں کسی بھی طرح کی کوتاہی کرنا خیانت ہے، بلکہ عاجز کا خیالِ ناقص تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت امانت ہے، نیز ہمارے پاس موجود ہر وہ چیز بھی امانت ہے جس کے ساتھ کسی کا حق متعلق ہو، اور جس کی حفاظت اور مالک کی طرف ادائیگی ہم پر لازم ہو، لہٰذا شوہر کے پاس بیوی امانت ہے، بیوی کے پاس عزت وآبرو امانت ہے،

ماں باپ کے پاس اولاد امانت ہے، استاذ کے پاس شاگرد امانت ہے، عالم کے پاس علم امانت ہے، حاکم کے پاس حکومت امانت ہے، مہتمم کے پاس مدرسہ امانت ہے، متولی کے پاس مسجد امانت ہے، مالدار کے پاس مال امانت ہے، عہدے دار کے پاس عہدہ اور منصب امانت ہے، ملازم کے پاس ملازمت کے اوقات وفرائض امانت ہیں، نیز ہر انسان کے پاس اس کی اپنی زندگی اور اس کے اوقات امانت ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ جو کچھ بھی ہے امانت کے مفہوم میں وہ داخل ہے، اس لیے کہ ہم ان چیزوں کے مالک نہیں؛ بلکہ محافظ اور امین ہیں۔

مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا ہے: ؎

ایں امانت چندروزہ نزدِ ماست   درحقیقت مالکِ ہر شئ خداست

امانت کی ادائیگی کمالِ ایمان اور کامیابی کا ذریعہ ہے:

قرآن کا جامع فرمان ان تمام امانتوں کے متعلق ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸)

''حق تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحقین کو پہنچایا کرو۔''

مطلب یہ ہے کہ ہر طرح کی امانت کی حفاظت اور اس کی کما حقہ ادائیگی کا اہتمام کرو، یہ کمالِ ایمانی اور کامیابی کا ذریعہ ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سب سے زیادہ کامل الایمان اور کامیاب حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام ہیں، تو حق تعالیٰ نے ان کا ایک بنیادی وصف یہی بیان فرمایا کہ وہ امین تھے، چنانچہ سورۂ شعراء میں متعدد انبیاء ورُسل علیہم السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے اپنی امتوں سے بطورِ خاص یہ فرمایا تھا کہ ﴿إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴾ (الشعراء: ۱۰۷) ''یقین جانو کہ میں تمہارے لیے ایک امانت دار پیغمبر ہوں۔''

نبوت سے قبل خود حضور ﷺ اہل مکہ میں صادق وامین کے لقب سے ملقب تھے،
علاوہ ازیں قرآنِ کریم نے جن اہل ایمان کی صلاح وفلاح کی بشارت کا اعلان کیا ان کا ایک
وصف یہ بھی بیان کیا کہ

﴿ وَ الَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَ عَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ۝﴾ (المومنون : ۸)

''یہ وہ لوگ ہیں جو امانتوں کی ادائیگی کرتے ہیں اور وعدہ کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔''

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ کامل الایمان اور کامیاب مسلمان کی بنیادی علامت
حفظِ امانت اور اداءِ امانت کا اہتمام بھی ہے، پھر یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت
کی علامت بھی ہے۔ حدیث پاک میں وارد ہے: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قرادؓ فرماتے ہیں
کہ ایک مرتبہ رحمت عالم ﷺ نے وضوء فرمایا، تو حضراتِ صحابہؓ نے آپ ﷺ کے بچے
ہوئے پانی سے تبرک حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے جسموں پر ملنا شروع کیا، آپ ﷺ
نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور
اس کے رسول ﷺ کی محبت نے، تب آپ ﷺ نے فرمایا:

"مَنۡ سَرَّهٗ أَنۡ يُحِبَّ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ أَوۡ يُحِبَّهُ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ، فَلۡيَصۡدُقۡ حَدِيۡثَهٗ إِذَا حَدَّثَ، وَلۡيُؤَدِّ أَمَانَتَهٗ إِذَا اؤۡتُمِنَ، وَ لۡيُحۡسِنۡ جِوَارَ مَنۡ جَاوَرَهٗ."

(مشكوٰة: ٤٢٤ / باب الشفقة والرحمة على الخلق)

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرے، یا اس کے
ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ محبت کریں تو اسے چاہیے کہ وہ تین کاموں کا اہتمام
کرے: (۱) جب بھی بات کرے تو سچ ہی بولے۔ (۲) جب اسے امین بنایا جائے تو امانت
کی حفاظت اور ادائیگی کا پورا لحاظ اور اہتمام کرے۔ (۳) اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا
معاملہ کرے۔

مزید امانت کی ادائیگی کی جو فضیلت ہے اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے

کہ ایک حدیث میں رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنۡ عَبۡدِاللّٰهِ بۡنِ عَمۡرٍوؓ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "أَرۡبَعٌ إِذَا كُنَّ فِيۡكَ فَلَا عَلَيۡكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنۡيَا: حِفۡظُ أَمَانَةٍ، وَ صِدۡقُ حَدِيۡثٍ، وَ حُسۡنُ خَلِيۡقَةٍ، وَ عِفَّةٌ فِيۡ طُعۡمَةٍ." (رواه أحمد و البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة: ٤٤٥ / كتاب الرقائق/الفصل الثالث)

''اگر تم میں چار خصلتیں پیدا ہو جائیں تو دارین کی صلاح وفلاح کے لیے کافی ہیں،
ان کے بعد اگر دنیا کی فرحتیں اور لذتیں فوت بھی ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں، وہ چار عظیم اور
بابرکت خصلتیں یہ ہیں: (۱) امانت کی حفاظت۔ (۲) بات میں سچائی۔ (۳) عمدہ اخلاق و
عادات۔ (۴) حلال روزی۔''

آج امانت کا فقدان ہے، جس کا بے حد نقصان ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ دارین کی صلاح وفلاح کے حصول کے لیے جن اوصاف سے
متصف ہونا ضروری ہے ان میں ایک امانت داری بھی ہے، جب تک ہم اس وصف سے کما
حقہ متصف نہیں ہوں گے تب تک ایمان میں کمال نصیب ہو سکتا ہے نہ کامیابی حاصل ہو سکتی
ہے۔ یاد رکھو! امانت کی صفت سے کما حقہ متصف ہونا ایک مومن کی شان ہے، جب کہ اس
وصف سے عاری ہونا منافق کی پہچان ہے، امانت کی اس قدر اہمیت کے باوجود آج اس کا
فقدان ہے، جس کا بے حد نقصان ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس قدر زمانہ خیر القرون سے
دور اور قیامت سے قریب ہوتا جا رہا ہے اسی رفتار سے لوگوں کے دلوں سے امانت و دیانت
کے جذبات ختم ہوتے جا رہے ہیں، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنۡ أَبِيۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: "بَيۡنَمَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحَدِّثُ إِذۡ جَاءَ أَعۡرَابِيٌّ فَقَالَ: "مَتَى السَّاعَةُ؟" قَالَ: "إِذَا ضُيِّعَتِ الۡأَمَانَةُ، فَانۡتَظِرِ السَّاعَةَ، قَالَ: "كَيۡفَ إِضَاعَتُهَا؟" قَالَ: "إِذَا وُسِّدَ الۡأَمۡرُ إِلَى غَيۡرِ أَهۡلِهٖ، فَانۡتَظِرِ السَّاعَةَ."

(رواه البخاري: ١/ ١٤، مشكوٰة: ٤٦٩ / باب أشراط الساعة/ الفصل الأول)

''ایک مرتبہ حضور پاک ﷺ گفتگو فرما رہے تھے کہ ایک دیہاتی نے آکر سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب امانت ضائع کر دی جائے تو (یہ قیامت کی نشانی ہے، لہٰذا) قیامت کا انتظار کرو، دیہاتی نے سوال کیا کہ امانت کیسے ضائع ہوگی؟ تو فرمایا: ''جب ذمہ داریاں (جو امانتیں ہیں) نااہل کو سونپی جائیں تو (ظاہر ہے کہ اس سے امانت ضائع ہوگی، اس لیے) قیامت کا انتظار کرو۔''

آج قربِ قیامت کی یہ نشانی ہر جگہ پائی جاتی ہے، خصوصاً سرکاری آفسوں کا جو حال ہے یہ اسی کا اثر ہے، بقولِ صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ:

''دفتر کھلا اور بابو جی اگر جلدی آگئے تو بھی اس کے آدھے گھنٹے کے بعد بہر حال اور کم از کم دس منٹ تک تو اپنے ڈیسک کے کاغذات اور فائلوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں صرف کیے، سست رفتاری تو جیسے ان بابو صاحب پر ختم ہے، اور بہ ظاہر اب ان کا کام چالو ہوا کہ چائے نوشی کے دورِ اوّل کا وقت آ گیا اور پچیس منٹ اس دور نے لے لیے، اور یہی رفتار کام کی آفس کے آخری وقت تک چلتی ہے، پھر تھوڑی دیر کے بعد چائے کا دور چلتا ہے، کچھ دیر گزرتی ہے کہ لنچ اور (کھانے کا گھنٹہ آجاتا ہے) خدا جانے انگریزی دور میں عملے والوں کی یہ بھوک کہاں چلی گئی تھی، اس کی مدت کہنے کو تو آدھے گھنٹے کی ہے، لیکن عملاً یہ ایک گھنٹے سے زیادہ کا ہوتا ہے، پھر ساتھیوں اور دوستوں کے پاس ان کے ڈیسک پر جانا اور گپ زنی بھی لازمی ہے، اور گفتگو سیاست سے لے کر دنیا کے ہر پبلک اور نجی موضوع پر ہوتی ہے، اپنے کام اور ذمہ داری کے بجائے تفریح، لااُبالی پن اور بے فکری کا سایہ شروع سے اخیر تک چھایا رہتا ہے، دفتر کے بند ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے کہ بابو صاحب فائلوں کو اٹھا کر چلنے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں، اور دِن بھر کی کاہلی اور سستی کا کفارہ اس وقت کی چستی اور مستعدی سے دیتے ہیں، اگر کوئی آفت کا مارا ہوا ضرورت منداسی وقت نازل ہوگیا تو اس کے لیے ترشا ترشا ہوا جواب رکھا ہوا ہے کہ ''بس! اب کل آیئے گا! آج بہت دیر ہوگئی ہے۔'' (صدقِ جدید:۶۸)

ضرورت ہے کہ اس پر دیانت داری سے توجہ دی جائے اور اللہ تعالیٰ کا ڈر دلوں میں پیدا کیا جائے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس پیدا کیا جائے، تاکہ ہم اس وصفِ عظیم سے متصف ہو جائیں، اور دارین کے خسران سے محفوظ رہ کر صلاح وفلاح کے حقدار بن جائیں۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں وصف امانت اور تمام اوصافِ جمیلہ سے متصف فرما کر ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

۱۳/ ذی الحجہ/ ۱۴۳۷ھ/ بروز جمعہ

مطابق: ۱۶/ ستمبر/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَصَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَھْلُہٗ، فَإِنَّکَ أَنْتَ أَھْلُ التَّقْوٰی وَ أَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ
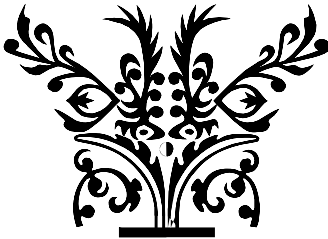
(۲۸)

وعدہ کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ عُبَادَةَ بۡنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:" اِضۡمَنُوۡا لِیۡ سِتًّا مِنۡ أَنۡفُسِکُمۡ، أَضۡمَنۡ لَکُمُ الجَنَّةَ، اُصۡدُقُوۡا إِذَا حَدَّثۡتُمۡ، وَ أَوۡفُوۡا إِذَا وَعَدۡتُمۡ، وَ أَدُّوۡا إِذَا ائۡتُمِنۡتُمۡ، وَ احۡفَظُوۡا فُرُوۡجَکُمۡ، وَ غُضُّوۡا أَبۡصَارَکُمۡ، وَ کُفُّوۡا أَيۡدِيَکُمۡ." (رواہ أحمد والترمذی، والبیهقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ:۴۱۵/ باب حفظ اللسان والغیبة والشتم)

ترجمہ: ’’حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ تم اپنے نفس (ذات) کی طرف سے چھ چیزوں کی ضمانت دو، تو میں تمہیں جنت کی بشارت دیتا ہوں: (۱) بات کرتے وقت ہمیشہ سچ بولو۔ (۲) اور جب (خیر اور مباح کام کا) عہد یا وعدہ کرو تو اس کو پورا کرو۔ (۳) امانت کی حفاظت اور ادائیگی کا اہتمام کرو۔ (۴) شرمگاہوں کی حفاظت کرو۔ (۵) اپنی نگاہوں کی حفاظت کرو۔ (۶) اپنے ہاتھ کو (قتل ناحق اور حرام چیزوں کے پکڑنے سے) روکو۔‘‘

187

ایفاءِ عہد علامت سعادت:

اللہ رب العزت نے اہل ایمان کو جن احکام کا پابند بنایا ہے ان میں ایک جامع حکم ایفاءِ عہد یعنی (زبانی، تحریری یا عملی طور پر فریقین کے درمیان باہمی رضامندی سے جو بات طے ہوا سے عہد، اور جانب واحد سے جو بات طے ہوا سے وعدہ کہتے ہیں۔) وعدہ پورا کرنا بھی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ﴾ (المائدۃ: ۱)

’’اے ایمان والو! اپنے عہدوں اور وعدوں کو پورا کرو۔‘‘

معلوم ہوا کہ جیسے نماز، روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں اور ان کی پابندی عین عبادت اور نیکی و پرہیزگاری کی علامت ہے، اسی طرح ایفاءِ عقود یعنی عہدوں اور وعدوں کو پورا کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہونے کی وجہ سے عین عبادت وسعادت اور نیکی و پرہیزگاری کی علامت ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے متقیوں، عقلمندوں اور جنتیوں کے اوصاف میں ایفاءِ عہد کو بطورِ خاص ذکر فرمایا، مثلاً سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

﴿ وَ الۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ﴾ (البقرۃ: ۷۷)

متقیوں کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں۔

دوسرے مقام پر سورۂ رعد میں فرمایا:

﴿ اَلَّذِيۡنَ يُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ ﴾ (الرعد: ۲۰)

عقلمندوں اور جنتیوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔

نیز مومنین فائزین کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ وَ الَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَ عَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ﴾ (المؤمنون: ۸)

’’وہ اپنی امانتوں اور وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔‘‘

اور مذکورہ حدیث میں جن چھ اعمال پر جنت کی بشارت ہے ان میں ایک عمل وعدہ پورا کرنا بھی ہے، جس سے ثابت ہوا کہ یہ علامت سعادت ہے۔ اس کے برخلاف بدعہدی اور وعدہ خلافی یہ بدبختی اور بے ایمانی کی نشانی ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے کہ حضور ﷺ اکثر اپنے مواعظ وخطبات میں یہ بات ضرور ارشاد فرماتے کہ

"لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، وَ لَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ." (رواه البيهقى فى شعب الإيمان، مشكوٰة : ١٥)

جو امانت دار نہیں وہ ایمان دار نہیں، اور جو وعدہ کا وفادار نہیں وہ دین دار نہیں۔

وہ وعدے جو بندوں نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہیں:

پھر یہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے ایفاءِ عہد کا حکم دیتے ہوئے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وعدوں کی بھی کئی قسمیں ہیں، من جملہ ان میں بعض وعدے وہ ہیں جو بندوں نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہیں، ایک تو وہی جو بندوں نے عالمِ ارواح میں اللہ رب العزت سے اجتماعی طور پر کیا تھا، جس کا سورۂ اعراف میں ذکر ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تمام ذرّیت کو ان کی پشت سے چیونٹیوں کی جسامت میں نکال کر وعدہ لیتے ہوئے سوال فرمایا تھا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" تو جواب میں سب نے کہا تھا: ﴿بَلىٰ﴾ (الأعراف: ١٧٢) "کیوں نہیں؟" ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ ہی کو اپنا رب مانیں گے۔ یہ اجتماعی وعدہ وادئ نعمان میں عرفات کے قریب لیا گیا تھا۔ (كما ورد فى مشكوٰة المصابيح : ٢٤)

اسی وعدہ کی یاد دہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف اوقات میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، قرآنِ پاک نے اللہ رب العزت سے کیے گئے اسی ربوبیت والوہیت کے وعدہ کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿وَ أَوْفُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ﴾ (النحل : ٩١)

"اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرو۔"

یہ تو اللہ سے کیا ہوا عالمِ ارواح کا ایک اجتماعی وعدہ تھا، اس کے علاوہ دنیا میں انفرادی طور پر جس نے بھی دینِ اسلام کو قبول کیا اس نے دراصل کلمۂ شہادت پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا وعدہ کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان بندے نے یہ وعدہ کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود مانتا ہوں، لہٰذا زندگی کے جس شعبے میں اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہوگا اس کو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے طریقے کے مطابق پورا کروں گا۔ اہل ایمان کے اسی وصف کو قرآنِ پاک نے یوں بیان فرمایا:

﴿وَ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ﴾ (الرعد : ٢٠)

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کے وعدے کو پورا کرتے ہیں اور وعدے کو توڑتے نہیں۔"

اس میں یہ انفرادی وعدہ جو کلمۂ شہادت پڑھ کر ہر مسلمان نے اللہ رب العزت سے کیا ہے داخل ہے۔ (مستفاد از: انوار البیان: ۳/۱۴۹)

اس کے علاوہ اللہ رب العزت سے کیے ہوئے وعدوں میں نذر بھی داخل ہے، (جو اللہ تعالیٰ کے لیے مانی جاتی ہے۔ مستفاد از: انوار البیان: ۲/۵۳)

قرآنِ پاک نے اہل ایمان کو ان تمام وعدوں کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (المائدة : ١)

"اے ایمان والو! اپنے وعدوں کو پورا کرو۔" (خواہ وہ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے ہوں یا بندوں سے)

وہ وعدے جو بندوں نے بندوں سے کیے ہیں:

وہ وعدے جو بندوں سے کیے ہوئے ہیں ان کی بھی مختلف قسمیں ہیں، مثلاً جس ملک کے ہم باشندے ہیں، جس ملک کی شہریت ہم نے حاصل کی ہے، اُس ملک میں عملاً ہم

نے یہ معاہدہ اور وعدہ کیا ہوا ہے کہ ہم اس ملک کے قانون کی پابندی کریں گے، لہٰذا ملکی
قانون کی پابندی (بشرطیکہ وہ خلافِ شرع نہ ہو) ضروری ہے، اور ملکی قانون کی خلاف ورزی
بھی وعدہ خلافی ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے ملک کا ویزا لینا بھی ایک معاہدہ اور وعدہ ہے،
ویزا لینے والا عملاً یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں اس ملک میں ویزا کی مدت سے زیادہ قیام نہیں
کروں گا، اب اگر کوئی شخص اس کے خلاف کرتا ہے تو یہ بھی وعدہ خلافی اور گناہ ہے۔ پھر جس
طرح عوام حکومت کے جائز اور مباح قوانین کی پابند ہیں اسی طرح حکام بھی اُن وعدوں کے
پابند ہیں جو انہوں نے اپنی عوام سے کیے ہیں، آج کل عموماً حکام اقتدار کے حصول کے لیے
دفع الوقتی کے طور پر بہت سے وعدے کر لیتے ہیں، حالاں کہ عین معاہدہ کے وقت بھی دل
میں اس وعدے کی خلاف ورزی کرنے کا ارادہ ہوتا ہے، اور وہ لوگ قصداً وعدہ خلافی کرتے
ہیں۔ بقولِ شاعر:

جمالِ یار میں رنگوں کا امتزاج تو دیکھ! سفید جھوٹ ہے ظالم کے سرخ ہونٹوں پر

ان کے علاوہ انفرادی طور پر جو وعدے ہم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں
ان میں مثلاً ''منگنی'' بھی شادی کا ایک وعدہ ہے، نکاح بھی ایک وعدہ ہے، جس میں عقدِ
نکاح سے منسلک ہونے والے میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا معاہدہ کرتے
ہیں، نیز تجارت، مضاربت، شرکت، قرض اور آپسی معاملات میں جتنے جائز اور مباح
وعدے کیے جاتے ہیں ان تمام معاہدوں اور وعدوں کے متعلق اصل حکم تو یہی ہے کہ معاہدہ
اور وعدہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو اور سوچ سمجھ کر ہی معاہدہ اور وعدہ کرو، جب
ایک مرتبہ تم نے کسی سے کوئی معاہدہ اور وعدہ کر ہی لیا تو اب ہر طرح کا معاہدہ اور وعدہ پورا
کرو، حتی الامکان ہر معاہدہ اور وعدہ نبھاؤ اور کسی بھی قسم کا معاہدہ اور وعدہ معمولی مت سمجھو۔

وعدہ وفائی کی اہمیت:

وعدہ وفائی کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ از حضرت آدم علیہ

السلام تا رحمت عالم ﷺ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی شریعتوں میں اس کی تعلیم و تاکید کی
گئی ہے، اور وعدہ وفائی بنیادی طور پر حضراتِ انبیاء و رسل علیہم السلام کا مقدس وصف ہے،
ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بطورِ خاص ارشاد ہوا:

﴿ وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی ﴾ (النجم: ۳۷)

''اور ابراہیم جو کہ مکمل وفادار تھے۔''

انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے ہر وعدے اور حکم کو کمالِ وفاداری کے ساتھ
پورا کیا۔ یہ وصف امام الانبیاء ﷺ میں بھی کامل اور مکمل طور پر پایا جاتا تھا، چنانچہ حضرت
عبداللہ بن ابو الحمساءؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کے ساتھ بعثت سے پہلے خرید و
فروخت کا معاملہ کیا، اس میں آپ ﷺ کا کچھ ثمن باقی تھا، تو میں نے آپ ﷺ سے وعدہ
کر لیا کہ آپ اسی جگہ رُک جایئے! میں ابھی ثمن لے آتا ہوں، لیکن میں وعدہ کرنے کے بعد
بھول گیا اور حضور ﷺ وہیں انتظار میں کھڑے رہے، روایتوں میں آتا ہے کہ صرف وعدے
کو پورا کرنے کے لیے تین دِن تک حضور ﷺ نے مسلسل انتظار فرمایا، اس دوران صرف
ضرورت کے لیے گھر جاتے، پھر اسی جگہ آ کر انتظار فرماتے، حضرت عبداللہ بن ابو الحمساءؓ خود
فرماتے ہیں کہ تین دِن کے بعد مجھے وہ وعدہ یاد آیا، میں فوراً اُس جگہ گیا تو حضور ﷺ کو
وہیں پایا، اس موقع پر آپ ﷺ نے صرف اتنا ہی فرمایا:

لَقَدْ شَقَقْتَ عَلَيَّ، أَنَا هٰهُنَا مُنْذُ ثَلَاثٍ أَنْتَظِرُكَ."

(رواه أبو داود، مشكوٰة: ٤١٦/ باب الوعد/ الفصل الثانی)

''تم نے (وعدہ پر نہ آکر) مجھے مشقت میں ڈال دیا، میں یہاں تین روز سے تمہارا
انتظار کر رہا ہوں۔'' ...... یہ ہے امام الانبیاء ﷺ کی کمالِ وعدہ وفائی۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

آپ ﷺ خود بھی وعدہ کو نبھاتے تھے اور اپنے صحابہؓ کو بھی اس کی تاکید فرماتے

تھے۔اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی نصیحت آموز واقعہ ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ حضور ﷺ کے رازدار اور مشہور صحابی ہیں، مسلمان ہونے کے بعد آپؓ نے اپنے والد کے ساتھ ہجرت مدینہ کا ارادہ کیا، تو راستے میں ان کی ملاقات مشرکین مکہ کے اس لشکر سے ہوئی جو جنگ بدر کے لیے آرہا تھا، ابوجہل نے آپؓ سے پوچھا کہ ''کہاں جارہے ہو؟'' فرمایا: ''ہم حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ طیبہ جارہے ہیں'' ابوجہل کہنے لگا: ''پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لیے کہ تم مدینہ جا کر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے'' آپؓ نے فرمایا: ''بھائی! ہمارا مقصد تو حضور ﷺ کی ملاقات اور زیارت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں'' ابوجہل کہنے لگا: ''اچھا! اگر یہی بات ہے تو پھر وعدہ کرو کہ مدینہ جا کر حضور ﷺ کی زیارت اور ملاقات ہی کریں گے، جنگ میں حصہ نہیں لیں گے'' حضرت حذیفہؓ اور آپؓ کے والد نے وعدہ کرلیا، چوں کہ دشمن بھی جانتے تھے کہ مسلمان وعدہ خلافی نہیں کرتے، اس لیے اس وعدے کے بعد انہیں چھوڑ دیا گیا، جب حضرت حذیفہؓ اور آپؓ کے والد حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو آپ ﷺ حضرات صحابہؓ کے ساتھ غزوۂ بدر کے لیے تشریف لے جا رہے تھے، ملاقات کے بعد حضرت حذیفہؓ نے ساری کارگزاری سنائی، پھر غزوۂ بدر میں شرکت کی اجازت طلب فرمائی کہ حضور! اسلام اور کفر کی یہ پہلی جنگ ہے، حق و باطل کا یہ پہلا معرکہ ہے، اس لیے ہماری خواہش ہے کہ ہم اس میں شرکت کریں، جہاں تک اس وعدے کا تعلق ہے جو ہم نے ابوجہل سے کیا ہے کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، تو وہ ''گردن پر تلوار رکھ کر کیا جانے والا وعدہ'' تھا، اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لیے ہم نے وعدہ کرلیا، جواب میں رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ''تم وعدہ کر کے زبان دے کر آئے ہو، اس لیے میں دشمن سے کیے گئے اس وعدے کے خلاف بھی تمہیں جنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دے سکتا'' محض ایفاءِ عہد اور وعدہ وفائی کی وجہ سے حضور ﷺ نے حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد کو جنگِ بدر میں شرکت جیسی عظیم فضیلت سے محروم رکھا، اسی سے ایفاءِ عہد اور وعدہ وفائی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(الاصابۃ: ۱/۳۱۶، از: اصلاحی خطبات: ۳/۱۴۸)

وعدہ خلافی کی مذمت:

مگر افسوس صد افسوس! آج کل وعدہ خلافی کرنا ایک معمولی سی بات بن کر رہ گیا ہے، معمولی منافع اور مفاد کے پیشِ نظر آپسی معاہدوں اور وعدوں کو نظر انداز کردینا کوئی گناہ اور برا کام نہیں سمجھا جاتا، خصوصاً سیاست کی دنیا میں تو یہ کمال اور ہنر سمجھا جاتا ہے، ایسے ہی لوگوں کی تنبیہ کے لیے ارشادِ باری ہے:

﴿وَ أَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی إسرائیل: ۳۴)

''اپنے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرو، بے شک وعدے کے متعلق سوال ہوگا۔''

اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو دنیا میں خواہ تمہیں کوئی نہ پوچھے، قیامت میں تو ضرور تمہاری باز پرس ہوگی، اور صرف باز پرس ہی نہیں؛ بلکہ وعدہ خلافی کرنے والوں کے لیے رُسوا کن عذاب بھی ہوگا، چنانچہ قرآنِ کریم میں عہد و وعدہ کی خلاف ورزی کرنے کے متعلق پانچ طرح کی وعیدیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) ﴿أُولٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ ''ان کے لیے آخرت اور جنت کی نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں ہے۔''

(۲) ﴿وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ ''اللہ تعالیٰ ان سے خوش کن انداز میں بات نہیں فرمائیں گے۔''

(۳) ﴿وَ لَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ ''اللہ تعالیٰ ان کی طرف قیامت کے دن نظرِ رحمت و محبت سے نہیں دیکھیں گے۔''

(۴) ﴿وَلَا يُزَكِّيْهِمْ﴾ اور نہ ان کے گناہوں کو معاف فرمائیں گے۔
(کیوں کہ عموماً عہد یا وعدہ کی خلاف ورزی کرنے سے کسی نہ کسی بندے کا حق تلف ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے حقوق میں تو کمی وکوتاہی کو معاف فرمادیتے ہیں، لیکن بندوں کے حقوق میں کمی وکوتاہی معاف نہیں فرماتے۔

(۵) ﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ (آل عمران:۷۷) **ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔** العیاذ باللّٰہ العظیم.

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ وعدہ خلافی کی یہ وعیدیں کفار ومشرکین کے لیے تو ہیں ہی، لیکن اگر کوئی مسلمان بھی اس عادتِ بد میں مبتلا ہوگیا تو اِن وعیدوں کا مطلب اس کے حق میں یہ ہے کہ وعدہ خلافی کی وجہ سے وہ بھی ان وعیدوں کا مستحق تو ہے، البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل ورحمت اور نبی ﷺ کی شفاعت کی برکت سے معاف کردے تو اور بات ہے۔ وما ذٰلك على الله بعزيز.

علاوہ ازیں وعدہ خلافی کرنے والوں کی مذمت میں حدیث پاک وارد ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ ؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ عِنْدَ اِسْتِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ." (رواه مسلم، مشكوٰة:۳۲۳/ باب ما على الولاة من التيسير)

ہر وعدہ خلافی کرنے والے کے لیے قیامت میں ایک نشان (اور جھنڈا) ہوگا، جو (وعدہ خلافی کرنے والے کی رُسوائی کے لیے) اس کی مقعد (پیچھے کی شرمگاہ) کے پاس گاڑ دیا جائے گا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے جتنی زیادہ اور بڑی وعدہ خلافی کی ہوگی اس کے بقدر اس کا نشان (اور جھنڈا) بلند ہوگا، یہ کوئی معمولی سزا اور رُسوائی نہیں ہے، اس لیے دارین کی رُسوائی سے بچنے کے لیے ایفاءِ عہد اور وعدہ وفائی کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایفاءِ عہد کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

۱۶/ ذی الحجہ/ ۱۴۳۷ھ/ بروز اتوار

مطابق: ۱۸/ ستمبر/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۲۹)

ائمۂ مساجد کا مقام اور ان کا اکرام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلإِمَامُ ضَامِنٌ، وَ الْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ، اَللّٰهُمَّ أَرْشِدِ الأَئِمَّةَ وَ اغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِيْنَ." (رواه أحمد و أبوداود و الترمذي، مشكوٰة:٦٥/ باب فضل الأذان و إجابة المؤذن)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امام (مقتدیوں کی نماز کا) ضامن اور ذمہ دار ہے، اور مؤذن امانت دار ہے، (کہ لوگ نماز، روزہ اور افطار کے اوقات میں اس پر اعتماد کرتے ہیں، لہٰذا اسے چاہیے کہ امانت داری سے اپنی ذمہ داری کو ادا کرے) اے اللہ! ائمہ کو رُشد و ہدایت عطا فرما اور مؤذنین کی مغفرت فرما۔

امام کے لغوی واصطلاحی معنیٰ:

اللہ رب العزت نے ائمۂ مساجد کو جس عظیم الشان مرتبہ ومقام سے نوازا ہے اس کا اندازہ ایک تو لفظِ امام (جس کی جمع ائمہ ہے اس) کے لغوی واصطلاحی معنیٰ پر غور کرنے سے

بھی واضح ہو جاتا ہے، اس لیے کہ " أَمَامَ " کے لغوی معنیٰ آگے اور سامنے کے ہیں، چوں کہ امام نماز کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام لوگوں میں مرتبہ و مقام کے اعتبار سے سب سے آگے ہوتا ہے اسی وجہ سے اسے امام کہتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی حکومت کے سربراہِ اعلیٰ کو بھی اس کے بلند مرتبہ و مقام کی وجہ سے امام کہتے ہیں، جیسے امام المسلمین، نیز عرفِ عام و اصطلاح میں کسی خاص علم وفن کے مقتدیٰ وممتاز شخصیت کو بھی اس کے اعلیٰ مقام کی وجہ سے امام کہتے ہیں، مثلاً فقہ میں امام ابوحنیفہؒ اور حدیث میں امام بخاریؒ وغیرہ، البتہ فقہاء کی اصطلاح میں لفظِ امام اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کی نقل وحرکت کی اقتدا و پیروی نماز میں کی جاتی ہے۔

ائمۂ مساجد کے لیے ہدایت کی دعا کا راز:

دوسری بات یہ بھی ہے کہ نماز چوں کہ ایمان کے بعد تمام اعمال میں سب سے اہم وافضل عمل اور اسلام کا رکنِ اعظم ہے، تو حدیث مذکور کے مطابق امام جو مقتدیوں کی نماز کا ضامن اور ذمہ دار ہے، وہ بھی مرتبہ ومقام کے اعتبار سے حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام کے بعد سب سے اہم وافضل ہوتا ہے، حکم بھی یہی ہے کہ لوگوں میں جو سب سے بہتر اور افضل ہو اسی کو اِمام بناؤ، یہی وجہ ہے کہ امام اعظم رحمت عالم ﷺ جب تک دنیا میں رہے خود ہی امامت فرماتے رہے، اور جب آپ ﷺ مرض الوفات میں تھے اور ضعف ونقاہت کی وجہ سے مسجد میں نماز کے لیے آنا دشوار ہو گیا تو حضور ﷺ نے نماز کے لیے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھایا، جو بلاشبہ پوری امت میں سب سے افضل تھے۔

صاحبو! حقیقت یہ ہے کہ انسانی جسم میں جو مرتبہ ومقام دل کا ہے، اسلامی معاشرہ میں وہی مرتبہ ومقام امام کا ہے، جیسے دل درست تو جسم درست، اور دل بگڑ گیا تو نظامِ جسم بھی بگڑ جاتا ہے، ایسے ہی امام کی نماز (اور اعمال واخلاق) درست ہوں گے تو لوگوں کی نماز (اور اعمال واخلاق) درست ہوں گے، اور اگر امام کی نماز (اور اعمال واخلاق) میں بگاڑ اور

فساد آ گیا تو اس کا اثر لوگوں کی نماز (اور اعمال واخلاق) پر بھی پڑے گا، اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے حدیث مذکور میں "الإِمَامُ ضَامِنٌ" فرمایا، یعنی امام اپنی نماز کے علاوہ مقتدیوں کی نماز کا بھی ذمہ دار ہے، مطلب یہ ہے کہ مقتدیوں کی نماز کا درست یا فاسد ہونا امام کی نماز پر موقوف ہے۔

اسی مضمون کو ایک دوسری روایت میں یوں بیان کیا گیا:

" وَ إِنْ أَحْسَنَ كَانَ لَهٗ مِنَ الأَجْرِ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ صَلّٰى خَلْفَهٗ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا، وَ مَا كَانَ مِنْ نَقْصٍ فَهُوَ عَلَيْهِ." (رواه الطبرانی فی الأوسط/ باب المیم من اسمه محمد/ الجزء:۱۷/ الصفحة : ۴۷، معارف الحدیث : ۲۱۸/۳)

اگر امام نے نماز اچھی طرح پڑھائی تو پیچھے نماز پڑھنے والے تمام ہی مقتدیوں کے مجموعی ثواب کے برابر اس کو ثواب ملے گا، بغیر اس کے کہ مقتدیوں کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے، اور نماز میں جو نقص اور قصور رہا ہوگا تو اس کا بوجھ تنہا امام پر ہوگا۔

جب امام کی نماز کا اثر مقتدیوں پر ہوتا ہے اور نماز کا اعمال واخلاق پر مؤثر ہونا اہل ایمان کے یہاں مسلم ہے تو امام کے اعمال واخلاق کا اثر بھی مقتدیوں پر ہونا ظاہر ہے، شاید اسی لیے حضور پاک ﷺ نے حدیث مذکور میں ائمۂ مساجد کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی، اس کا ایک راز یہ ہے کہ ہدایت کی فکر ائمۂ مساجد کا اصل منصب اور بنیادی کام ہے، چنانچہ ارشادِ باری میں اس طرف اِشارہ ملتا ہے:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا﴾ (السجدة: ۲۴)

(بنی اسرائیل میں) جن لوگوں کو (حضراتِ انبیاء ورسل علیہم السلام کے علاوہ) ہم نے منصب امامت سے نوازا وہ لوگوں کی رہنمائی اور ہدایت کی فکر کرتے ہیں۔

غور کیجیے! یہاں "يَهْدُوْنَ" فرمایا، "يَدْعُوْنَ" نہیں فرمایا، کیوں کہ ہدایت اصل ہے، اور دعوت اس کا ذریعہ ہے، ذرائع مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن مقصد ایک ہی ہوتا ہے، اور وہ

ہے ہدایت، اس لیے اصل کام اور مقصد کو بیان فرما دیا۔ لہٰذا ائمہ کا ہدایت یافتہ ہونا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے، کہ وہ جب خود ہدایت پر ہوں گے تو دوسروں کی ہدایت کا ذریعہ بن سکیں گے۔

ائمۂ مساجد کے اوصاف:

ائمۂ مساجد کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر حکم ہے کہ تم میں جو سب سے اچھے اوصاف کا حامل ہو اسے امام بناؤ، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اِجْعَلُوْا أَئِمَّتَكُمْ خِيَارَكُمْ، فَإِنَّهُمْ وَفْدُكُمْ فِيْمَا بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ رَبِّكُمْ." (رواه الدارقطني/ باب تخفيف القراءة لحاجة، والبيهقي/ الجزء: ٣ / الصفحة: ٩٠، كنز العمال / الحديث: ٢٠٤٣٢/ الجزء: ٧ / الصفحة: ٥٩٦، معارف الحدیث: ۳/۲۱۷)

تم میں سے بہترین اوصاف والے کو اپنا امام بناؤ، کیوں کہ وہ تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان سفیر اور نمائندہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سب سے اچھے اوصاف چوں کہ حضور ﷺ کے تھے، اس لیے جب تک آپ ﷺ اس دنیا میں رونق افروز رہے تب تک آپ ﷺ ہی امت کے امام بھی رہے، لیکن اب آپ ﷺ کی عدمِ موجودگی میں اس منصبِ عظیم کا حقدار وہ ہے جو بنیادی طور پر آپ ﷺ کے اخلاق و اوصاف کی پیروی کرے اور آپ ﷺ کی شریعت و سنت کا عالم و عامل ہو، قرآنِ کریم نے اس کی طرف نہایت ہی جامعیت کے ساتھ اشارہ فرمایا:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (السجدة: ٢٤)

اور ہم نے ان میں سے کچھ لوگوں کو امام اور پیشوا بنا دیا، جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، جب کہ انہوں نے صبر کیا، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔

حضرت مفتیٔ اعظم مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں علماءِ بنی اسرائیل میں سے بعض کو امامت و پیشوائی کا درجہ عطا فرمانے کے دو سبب مذکور ہیں: اوّل صبر کرنا، دوسرے آیات اللہ پر یقین کرنا۔

ابن کثیرؒ نے اسی سے بعض علماء کا قول نقل فرمایا: " بِالصَّبْرِ وَ الْيَقِيْنِ تُنَالُ الْإِمَامَةُ فِي الدِّيْنِ. " یعنی صبر و یقین کے ذریعہ کسی کو بھی امامت کا درجہ مل سکتا ہے، لیکن صبر کا مفہوم عربی زبان کے اعتبار سے بہت وسیع اور عام ہے، اس کے لفظی معنیٰ باندھنے اور ثابت قدم رہنے کے ہیں، اس جگہ صبر سے مراد احکامِ الٰہی کی پابندی پر ثابت قدم رہنے اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان سے رکنا ہے، جس میں تمام احکامِ شریعت کی پابندی داخل ہے، اور یہ بہت بڑا عملی کمال ہے۔

دوسرا سبب اس کا اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین رکھنا ہے، اس میں آیات کے مفہوم کو سمجھنا اور سمجھ کر اس پر یقین رکھنا دونوں داخل ہیں، یہ بھی بہت بڑا علمی کمال ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ امامت اور پیشوائی کے لائق اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہ لوگ ہیں جو (حتی الامکان) عمل میں بھی کامل ہوں اور علم میں بھی کامل ہوں۔ (مستفاد از: معارف القرآن: ۷/۷۴)

بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

جامع مسجد دہلی کے شاہی اِمام کی تقرری کا واقعہ:

بہر کیف ائمۂ مساجد کے اوصاف میں بنیادی بات یہ ہے کہ حتی الامکان وہ علمی اور عملی کمال کے حامل ہونے چاہییں، یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی شہرت کی حامل دہلی کی عظیم الشان جامع مسجد (جس کا اصل نام ''مسجد جہاں نما'' ہے) جس کی تعمیر ہندوستان کے پانچویں مغل بادشاہ شاہ جہاں نے ۱۰/شوال المکرّم/۱۰۶۰ھ مطابق: ۶/اکتوبر/۱۶۵۰ء بروز

جمعہ چھ ہزار مزدوروں کے ذریعہ شروع کروائی، اور چھ سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد جب اس کی تعمیر مکمل ہوگئی تو شاہ جہاں نے چاہا کہ شریعت کی ہدایت کے مطابق (اس بے مثال مسجد کے لیے) امام بھی ایسا ہی بے مثال ہونا چاہیے، جو اعلیٰ علمی، عملی اوصاف اور خوبیوں کا مالک ہو، چنانچہ اس تعلق سے شاہ جہاں نے بخارا (جو اس زمانہ میں علوم وفنون کا مرکز تھا، اور اطراف وجوانب کے اہل کمال سمٹ کر وہاں جمع ہوگئے تھے، اس لیے وہاں) کے بادشاہ کو خط لکھا کہ جامع مسجد دہلی کی امامت کے لیے ایک صحیح النسب، نجیب الطرفین سید کو جو علم وعمل میں کمال رکھتا ہو بھیجا جائے، اس پر شاہِ بخارا نے اپنے داماد حضرت سید عبدالغفور شاہ بخاریؒ کو ہندوستان کے پایۂ تخت شاہ جہاں آباد (دہلی) بھیجا، شاہ جہاں نے امام صاحب کے دہلی تشریف لانے پر ان کا پرشوکت استقبال کیا، اور یکم شوال/۱۰۶۶ھ مطابق: ۲۴/ جولائی/ ۱۶۵۶ء بروز پیر شاہ جہاں اور تمام وزراء، امراء اور رعایا نے امام سید عبدالغفور شاہ بخاریؒ کی اقتدا میں پہلی نمازِ عید الفطر جامع مسجد دہلی میں ادا کی، نماز کے بعد امام صاحب کے احترام و اکرام میں شاہ جہاں نے خلعت ونعمت (بادشاہ کی طرف سے دیا گیا لباس، دوشالہ اور جاگیر) سے سرفراز فرماکر ''امامت عظمیٰ'' کے منصب پر تقرری کا اعلان کیا اور ''شاہی امام'' کا خطاب عطا فرمایا۔

ائمۂ مساجد کا احترام:

واقعہ یہ ہے کہ علمی وعملی کمالات کے حامل ائمۂ مساجد تو بلاشبہ احترام واکرام کے لائق ہیں ہی، بالفرض اگر کسی امام میں علمی یا عملی طور پر کچھ نقص اور کمزوری پائی جائے تب بھی وہ صحیح العقیدہ ہونے کی حیثیت سے احترام واکرام کے لائق ہے، کیوں کہ حدیث پاک میں تو یہاں تک ارشاد ہوا کہ اگر خدانخواستہ امام فاسق وفاجر ہو، حتیٰ کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوجائے تب بھی اس کی بے حرمتی نہ کرو، بلکہ اس کے پیچھے نماز پڑھ لو، چنانچہ فرمایا:

وَ الصَّلٰوۃُ وَاجِبَۃٌ عَلَیْکُمْ خَلْفَ کُلِّ مُسْلِمٍ، بَرًّا کَانَ أَوْ فَاجِرًا، وَ إِنْ عَمِلَ

الْکَبَائِرَ." (رواہ أبوداود، مشکوٰۃ/ص:۱۰۰)

''تم پر نماز باجماعت واجب ہے ہر مسلمان کے پیچھے، خواہ امام نیک ہو یا فاسق، فاجر اور مرتکب کبائر ہو۔'' (کیوں کہ فسق وفجور کا تعلق اس کی ذات سے ہے، دوسروں کی نماز پر اس کا اثر نہیں پڑے گا، البتہ کفر وشرک اس سے مستثنیٰ ہیں، کیوں کہ عقائد کے اعتبار سے امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحیح عقیدہ پر قائم ہو۔ (مظاہر حق جدید:۱/ ۸۵۵)

اس سے ثابت ہوا کہ ائمۂ مساجد ان کی علمی یا عملی کوتاہی کے باوجود احترام واکرام کے لائق ہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ ائمۂ مساجد کا احترام واکرام ہمارے ایمان وعمل کا ایک حصہ ہے، اور احترام کا مطلب یہ ہے کہ ان کی عزت کی جائے، ان کی بے ادبی وگستاخی ایک سچے پکے مومن کے شایانِ شان نہیں ہے، بلکہ یہ منافق کی پہچان ہے، چنانچہ حدیث پاک میں مروی ہے:

" ثَلَاثَۃٌ لَا یَسْتَخِفُّ بِحَقِّھِمْ إِلَّا مُنَافِقٌ، ذُوالشَّیْبَۃِ فِیْ الإِسْلَامِ، وَ ذُوالعِلْمِ، وَ إِمَامٌ مُقْسِطٌ." (المعجم الکبیر للطبرانی/ الحدیث:۷۸۱۹)

''تین قسم کے لوگوں کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کے ساتھ منافق ہی پیش آسکتا ہے: (۱) بوڑھا مسلمان۔ (۲) عالم دین۔ (۳) انصاف پرور امام۔ (خواہ اس کی امامت و ذمہ داری کا دائرہ مسجد تک محدود ہو یا ملک تک)

یاد رکھو! ائمۂ مساجد کے احترام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ان کے پوشیدہ عیوب تلاش نہ کیے جائیں، اور اگر کسی طرح ان کے عیوب پر اطلاع ہوجائے تو لوگوں کے سامنے بلا کسی ضرورتِ شرعیہ کے ان کی برائیاں اور کوتاہیاں بیان نہ کی جائیں؛ کیوں کہ اس سے ایک تو عوام الناس میں ان کا وقار مجروح یا ختم ہوجائے گا، اور دوسرے شرعی امور میں بھی ان کی باتوں سے لوگوں کا اعتماد ختم یا کم ہوجائے گا، لیکن افسوس کہ آج علماء اور ائمۂ مساجد پر بلا تحقیق تبصرے کرنا، ان کی برائیوں کو سرعام بیان کرنا، ان پر طعنے کسنا، ان کو حقارت کی نگاہ

سے دیکھنا اور اونٹ تک نگل جانے والے مصلیان کا ائمۂ مساجد میں تنکے تلاش کرنا ایک عام معاشرتی برائی اور وبائی مرض بن چکا ہے، یہ صورتِ حال نہایت افسوس ناک ہے، بلکہ تشویش ناک اور تکلیف دہ ہے، اپنی دینی، دنیوی اور اُخروی صلاح وفلاح کے لیے اس برائی کی اصلاح فوری طور پر نہایت ضروری ہے۔

ائمۂ مساجد کی خدمت:

اصل بات یہ ہے کہ اِکرام واحترام سے بڑھ کر ائمۂ مساجد کی خدمت کی جائے، یہ تمام لوگوں اور خصوصاً ذمہ داروں کی بنیادی ذمہ داری ہے، خدمت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ضروریات کا لحاظ کیا جائے، ان کا اس قدر مالی تعاون کیا جائے یا اتنی تنخواہ مقرر کی جائے کہ اس سے ان کی اور ان کے اہل وعیال کی ضروریات بآسانی پوری ہوسکیں، تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ دین کی خدمت انجام دے سکیں، اس لیے کہ خود حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ إِلْحَافًا﴾ (البقرة: ۲۷۳)

”ان فقراء پر خرچ کرو جو راہِ خدا میں اس طرح گھرے ہوئے ہیں کہ وہ (کسب معاش کے لیے) زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، ناواقف لوگ حیا اور عفت کی وجہ سے انہیں مالدار خیال کرتے ہیں، حالاں کہ ان کے چہروں کی علامتوں سے تم (ان کی حاجت مندی کو) پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے بالکل ہی سوال نہیں کرتے کہ کہیں مخلوق کے سامنے گڑگڑانا پڑے۔“

ظاہر ہے کہ اس آیت کریمہ کا مصداق وہ لوگ ہیں جو دینی امور اور علوم میں مصروف ہونے کی وجہ سے کسب معاش کے لیے اپنا وقت فارغ نہیں کر سکتے، جیسے مدارس کے علماء اور مساجد کے ائمہ، اس لیے ان کی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرنا پوری امت مسلمہ کی

مشترکہ ذمہ داری ہے، مگر افسوس ہے کہ آج امت اس معاملہ میں مجرمانہ غفلت میں مبتلا ہے، حضور اکرم ﷺ کو اپنی امت پر جن باتوں کا خوف تھا ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ

”وَ إِنْ يَرَوْا ذَا عِلْمِهِمْ فَيُضَيِّعُوْنَهُ، وَ لَا يُبَالُوْنَ عَلَيْهِ.“ (مجمع الزوائد/ رقم: ٥٤٠)

”لوگ علماء کو دیکھیں گے اور ان سے بے توجہی برت کر (یعنی ان کی ضروریات سے لاپرواہ ہوکر) ان کو ضائع کردیں گے۔“

آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اس کے باوجود یہ علماء کا ظرف ہے کہ کم سے کم تنخواہوں پر اکتفا کیے ہوئے ہیں، ان شاء اللہ اللہ رب العزت بھی انہیں اس حدیث کا مصداق بنائے گا جس میں ارشاد ہے:

”عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”مَنْ رَضِيَ مِنَ اللّٰهِ بِالْيَسِيْرِ مِنَ الرِّزْقِ، رَضِيَ اللّٰهُ مِنْهُ بِالْقَلِيْلِ مِنَ الْعَمَلِ.“

(رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة: ٤٤٩)

”جو بندہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزقِ قلیل پر راضی ہوجائے گا تو حق تعالیٰ اس کے عمل قلیل پر راضی ہوجائیں گے۔“

نیز روزِ قیامت عرشِ الٰہی کے زیر سایہ جن خوش نصیب بندوں کو جگہ دی جائے گی ان میں ”قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ.“ (متفق عليه، مشكوٰة: ٦٨) کے تحت مساجد کے ائمہ اور مؤذنین ضرور داخل ہوں گے۔

ائمہ کی قلت علامت قیامت ہے:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ علماء اور مساجد کے ائمہ کے احترام واکرام اور ان کی ضروریات سے مجرمانہ غفلت کی نحوست ہے کہ آج امت کو بہترین مساجد تو میسر ہیں، مگر بہترین ائمہ میسر نہیں، بہترین مساجد کے ائمہ بھی مالی اعتبار سے کمزور ترین ہیں، کیوں کہ ہمارا

ایمان کمزور ہے، اس لیے ہمارا امام بھی کمزور ہے، اگر یہی حال رہا تو خطرہ ہے کہ امت بہترین اوصاف کے حامل ائمہ سے محروم نہ ہو جائے، حدیث پاک میں اسے علاماتِ قیامت میں سے شمار کیا گیا ہے:

عَنْ سَلاَمَةَ بِنْتِ الْحُرِّ قَالَتْ: "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَتَدَافَعَ أَهْلُ الْمَسْجِدِ لاَ يَجِدُوْنَ إِمَامًا يُصَلِّيْ بِهِمْ."

(رواه أحمد و أبو داود، مشكوٰة: ١٠٠)

"قیامت کی ایک علامت یہ ہے کہ مسجد والے امامت کو ایک دوسرے پر ڈالیں گے، کیوں کہ کوئی امام اور نماز پڑھانے والا ان کو نہیں ملے گا۔"

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ منصب امامت قیامت سے قبل ایک حقیر پیشہ بن جائے گا، جس کو کوئی قبول کرنے کو تیار نہ ہوگا، جس کی وجہ سے امت کو بہت مشکل سے کوئی صحیح امام میسر ہو سکے گا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اگر صحیح العقیدہ اور حق گو امام میسر بھی ہو تو جاہل ذمہ داران ایسے امام کو برداشت نہیں کریں گے۔ (واللہ اعلم)۔ یقیناً آج یہی پر آشوب حالات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ فإلى الله المشتكىٰ.

اب بھی ہم احساسِ ذمہ داری کے ساتھ بیدار ہو جائیں تو تلافی کا موقع ہے، ابھی بھی وقت زیادہ نہیں گزرا، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ائمۂ مساجد اور علماءِ امت کے ساتھ اپنی بساط، استطاعت اور وسعت کے مطابق احترام و اکرام اور خدمت کا معاملہ کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں جمیع رجالِ دین کی قدر دانی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

۱۶/ شوال المکرّم/ ۱۴۳۷ھ، یوم جمعہ، قبل المغرب

مطابق: ۲۲/ جولائی/ ۲۰۱۶ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۳۰)

فضائلِ حفظِ قرآنِ کریم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ، وَ الَّذِيْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَ يَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَ هُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ، لَهٗ أَجْرَانِ." (متفق عليه، مشكوٰة : ١٨٤)

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن کا (پڑھنے اور اس پر عمل کرنے میں) ماہر شخص معزز نیکو کار فرشتوں کے ساتھ ہوگا، اور وہ شخص جو قرآن کو پڑھنے میں مشقت برداشت کرتا ہے اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔"

حفاظتِ قرآن کی ضرورت:

اللہ رب العزت نے انسانیت کی ہدایت کے لیے قرآن نازل فرمایا، ہدایت انسان کی سب سے اہم اور عظیم ضرورت ہے، اور نزولِ قرآن کا خاص مقصد قیامت تک کی انسانیت کے لیے ہدایت ہے، ہدایت کی ساری راہیں قرآن ہی سے کھلتی اور نکلتی ہیں، اس لیے قرآنِ کریم کے بغیر ہدایت کا تصور بھی ممکن نہیں ہے، اس کی ایک ایک آیت بلکہ ایک

ایک لفظ کی تہہ میں ہدایت کا نور موجود ہے۔ بقولِ شاعر:

ہادی نہ پاؤ گے قرآن سے بہتر   گمراہ نہ پاؤ گے شیطان سے بدتر

جب یہ بات حقیقت ہے تو پھر قرآنِ کریم کی حفاظت کے لیے ایسے اہتمام وانتظام کی ضرورت تھی کہ قیامت تک اس کے الفاظ واحکام، حروف وعلوم، بلکہ اس کی ہر ہر حرکت اور نقطہ تک محفوظ رہیں اور ذرّہ برابر اس میں کمی زیادتی اور تبدیلی نہ ہو سکے، ظاہر ہے کہ ایسی حفاظت قادرِ مطلق ذات کے علاوہ اور کسی سے ممکن ہی نہیں تھی، اس لیے حق تعالیٰ نے اس کتابِ ہدایت کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی، چنانچہ فرمایا:

﴿ إِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ إِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۝﴾ (الحجر: ۹)

ترجمہ: ''بے شک ہم ہی نے قرآن کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ''قرآن اور دیگر کتب میں یہی ایک بنیادی فرق ہے کہ اور کتابیں موجود تو ہیں لیکن محفوظ نہیں ہیں، کیوں کہ اور کتابوں کی محافظ قومیں ہوا کرتی تھیں، جب کہ قرآن قوموں کا محافظ ہے، (بشرطیکہ اس سے مکمل وابستگی اختیار کی جائے) اور قرآن کا محافظ خود رب العالمین ہے۔''

حفاظتِ قرآن کا بہترین ذریعہ حفظِ قرآن ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے اس دنیائے دارالاسباب میں تحت الاسباب حفاظتِ قرآن کے لیے حفظِ قرآن کو نہایت آسان کر دیا؛ کیوں کہ حفاظتِ قرآن کا آسان ترین ذریعہ حفظِ قرآن ہی ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے اس کے حفظ کو بھی آسان فرما دیا جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ وَ لَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ۝﴾ (القمر: ۱۷)

ترجمہ: ''ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے اور یاد کرنے کے لیے آسان بنا

دیا، تو کیا کوئی ہے اس سے نصیحت حاصل کرنے اور یاد کرنے والا؟''

اس بات کو حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی ایک ہی سورت میں چار مرتبہ بیان فرمایا، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ قرآن کے احکام سے نصیحت و ہدایت حاصل کرنا اور اس کے الفاظ کو زبانی یاد کرنا آسان کر دیا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ذکر کے معنیٰ یاد کرنے اور حفظ کرنے کے بھی آتے ہیں، اور کسی کلام سے نصیحت وعبرت حاصل کرنے کے بھی آتے ہیں، یہ دونوں معانی یہاں مراد ہو سکتے ہیں، کہ حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم (کی حفاظت کے لیے اس) کے حفظ کو آسان کر دیا، اور یہ بات اس سے پہلے کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی، یہ حق تعالیٰ کی تیسیر وآسانی ہی کا اثر ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے پورے قرآن کو ایسا حفظ کرتے ہیں کہ ایک زبر زیر کا فرق نہیں آتا، چودہ سو برس سے ہر زمانہ، ہر طبقہ اور ہر خطہ میں ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں حافظوں کے سینوں میں اللہ کی یہ کتاب محفوظ ہے۔'' (معارف القرآن: ۸/۲۳۰)

پھر کیوں نہ ہو ممتاز اسلام دنیا بھر کے مذہبوں میں
وہاں مذہب کتابوں میں، یہاں قرآن سینوں میں

حفظِ قرآن کے حیرت انگیز واقعات:

صاحبو! یہ کلام اللہ کا اعجاز اور معجزہ ہے کہ ہر پاک دِل انسان عمر کی قید کے بغیر بآسانی اسے یاد کر کے اپنے سینے میں محفوظ کر لیتا ہے، یہ خیال کہ ''قرآن کو یاد کرنا اور حفظ کرنا لوہے کے چنے چبانے کے برابر ہے'' بالکل جاہلانہ خیال ہے، قرآن صرف حافظہ کی مدد سے یاد نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کے معجزہ ہونے کی وجہ سے یاد ہوتا ہے، دیگر ساری کتابیں آنکھیں کھول کر پڑھی جاتی ہیں، اور قرآن کا اعجاز دیکھیے کہ اسے آنکھیں بند کر کے مگر دِل کھول کر پڑھا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں نہایت حیرت انگیز واقعات منقول ہیں۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے حضرت ہشام کلبیؒ سے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حافظہ کی تیزی کا ثبوت ایسا پیش کیا کہ شاید کسی نے نہ دیا ہو، لیکن ایک مرتبہ مجھ سے بھول بھی ایسی ہوئی کہ شاید کسی سے نہ ہوئی ہو، میرے حافظہ کی تیزی کا ثبوت تو یہ ہے کہ الحمدللہ پورا قرآن صرف اور صرف تین دِن میں مکمل حفظ کرلیا، اور بھول کا یہ حال ہے کہ ایک مرتبہ اپنی داڑھی درست کرنے بیٹھا اور داڑھی مٹھی میں لے کر نیچے کے بال کاٹنا چاہتا تھا، مگر بدحواسی اور بھول سے اوپر کے بال کاٹ ڈالے اور پوری داڑھی ہاتھ میں آ گئی۔

(رد المحتار، از: ''تراشے'' /ص:۱۷)

اسی طرح ایک اور حیرت انگیز واقعہ حضرت امام محمدؒ کے متعلق علامہ زاہد الکوثریؒ نے "بلوغ الأمانی فی سیرة الإمام محمد بن حسن الشیبانی" میں نقل کیا ہے کہ جب چودہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ امام محمدؒ حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ النعمانؒ کی مجلس درس میں حاضر ہوئے تو امام صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں قرآن ازبر (حفظ) یاد ہے یا نہیں؟ فرمایا: نہیں، ارشاد ہوا کہ پہلے قرآن حفظ کرلو، پھر مجلس میں شرکت کرنا، کیوں کہ فقہ کے طالب علم کو اس کی سخت ضرورت ہے، کہتے ہیں کہ اس حکم کے بعد امام محمدؒ چلے گئے اور سات دِن تک غائب رہنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! الحمدللہ میں نے ان سات دِنوں میں پورا قرآن حفظ کرلیا، آپ جہاں سے چاہیں میرا امتحان لے لیجیے، امام صاحبؒ کو بڑا تعجب ہوا، بہت خوش ہوئے اور درس میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمادی۔ (بلوغ الامانی /صفحہ:٦، از: ''فضائل حفظِ قرآن'' /ص:۱۹۸)

ہمارے اس زمانہ میں بھی اس قسم کا ایک عجیب واقعہ پیش آیا، بودھن پور کے ایک مدرسہ گلزارِ مغیثی میں ایک دس سالہ بچہ محمد امجد نے اپنے استاذ مولانا دلشاد صاحب کے پاس صرف تین ماہ میں قرآنِ کریم مکمل حفظ کرلیا۔ (گجراتی ماہنامہ ''بیانِ مصطفیٰ'' /صفحہ:۱۷/ اگست/ ۲۰۰۵ء)

جن لوگوں نے قرآن کو اپنا مشغلہ اور اوڑھنا بچھونا بنالیا، اللہ تعالیٰ نے ان عاشقین

قرآن کے لیے حفظِ قرآن کو آسان کردیا، حتیٰ کہ بعض تو وہ ہیں جنھوں نے صرف قرآن کی آیات ہی نہیں احکامات کو بھی محفوظ کرلیا، (اللھم اجعلنا منھم) ان ہی کے متعلق قرآن کہتا ہے:

﴿ بَلْ هُوَ ايٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ (العنكبوت : ٤٩)

ترجمہ: ''بلکہ یہ (قرآن) صاف آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا۔'' تو ان لوگوں نے قرآنِ پاک کے نقوش کو نفوس اور سینوں میں اور علوم کو اپنی زندگیوں میں محفوظ کرلیا۔

حفظِ قرآن اس امت کی خصوصیت:

علماء فرماتے ہیں کہ حفظِ قرآن حفاظتِ قرآن کا ذریعہ ہونے کے ساتھ اس امت کی عظیم خصوصیت بھی ہے، ورنہ اُمم سابقہ کا کوئی بھی اُمتی کتاب اللہ کا حافظ نہ ہوسکا، جب کہ اس اُمت کا حال یہ ہے کہ اس کی کتاب ہر زمانہ کے لاکھوں، کروڑوں اُمتیوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور قیامت تک رہے گی، اس اُمت کے خوش قسمت لوگوں نے کلام اللہ سے بے پناہ عشق ومحبت اور تعلق کا ثبوت پیش کرکے اس کو اپنا مقصدِ زندگی بنالیا، تو حق تعالیٰ نے ان کو اپنے کلام کا حافظ ومحافظ بنالیا، جس کی وجہ سے وہ حافظ کہلانے لگے، حالاں کہ درحقیقت حافظِ قرآن تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○﴾ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں قرآنِ کریم کے سب سے پہلے حافظ سرکارِ دوعالم ﷺ ہیں؛ مگر عالم ظاہر میں حفاظِ کرام حفاظتِ قرآنی میں چوں کہ اللہ رب العزت کے نائب ہیں اس لیے یہ ''حافظ'' کا عظیم لقب اور شرف انہیں بھی مل گیا۔

(بحمداللہ اس حقیر پرتقصیر غفرلہ القدیر نے بھی علمی گھرانے وماحول میں مؤرخہ:۲۱/ ربیع الآخر/ ۱۳۹۸ھ مطابق:۳۱/ مارچ/ ۱۹۷۸ء بروز پیر پیدا ہونے کے بعد اپنے بچپن ہی میں مورخہ:۲۲/ ذوالقعدہ/ ۱۴۱۱ھ بروز جمعرات حضرت قاری یعقوب صاحب ساکن نرولیؒ کے پاس مادرِ علمی دارالعلوم بڑودا میں بعمر تیرہ سال تکمیل حفظ کی سعادت حاصل کی)۔

حکیم العصر حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حفاظِ کرام اللہ تعالیٰ کی سرکاری ذمہ داری کے منتخب افراد ہیں، اس لیے حافظِ قرآن کی تعظیم در اصل اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے، حدیث میں پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِیْ مُوْسٰی الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللّٰهِ إِكْرَامَ ذِیْ الشَّیْبَةِ الْمُسْلِمِ، وَ حَامِلِ الْقُرْآنِ غَیْرِ الْغَالِیْ فِیْهِ، وَ لَا الْجَافِیْ عَنْهُ، وَ إِكْرَامَ السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ." (رواه أبو داود، مشکوٰۃ المصابیح : ۴۲۳)

مطلب اور خلاصہ یہ ہے کہ بوڑھے مسلمان، حافظِ قرآن اور انصاف کرنے والے حاکم کا اکرام دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا اکرام ہے۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں ان حفاظ کے پاکباز اور پاک دِل ہونے کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ ان کے سینوں میں اللہ جل جلالہٗ کا مقدس کلام ہے، کیوں کہ قرآنِ پاک نے اُس وادیٔ طویٰ کو مقدس فرمایا جہاں حضرت حق زید مجدہٗ نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام سے کلام فرمایا: ﴿ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴾ (طٰہٰ : ۱۲) جب وادیٔ طویٰ حق تعالیٰ کے کلام فرمانے کی وجہ سے مقدس ہے تو وہ سینہ کیسے مقدس نہ ہوگا جس میں ربِ کریم کا پورا کلام اپنے الفاظ واحکام کے ساتھ موجود اور محفوظ ہے، پس جس دل میں ہوگا قرآن، اسی کو نصیب ہوگا حقیقی اطمینان، پھر یہ تو نقد نفع اور انعام ہے۔

حافظ کو بہترین عطا کا وعدہ:

حافظ کو مزید جس انعام واکرام سے نوازا جائے گا اُس کو ایک حدیثِ قدسی میں اس طرح بیان فرمایا:

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " یَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی: " مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ عَنْ ذِكْرِیْ وَ مَسْأَلَتِیْ، أَعْطَیْتُهٗ أَفْضَلَ مَا أُعْطِیَ السَّائِلِیْنَ." (مشکوٰۃ : ۱۸۶، حدیث قدسی نمبر:۴)

مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنی زندگی کا اہم مشغلہ اور مقصد قرآن کو بنالیا ہو، دِن رات اسی میں لگا رہتا ہو، اس کی تلاوت میں، اس کے الفاظ یاد کرنے میں، اس کے احکام کے تدبر وتفکر میں، یا پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے میں اخلاص کے ساتھ اتنا مشغول رہتا ہو کہ ذکر واذکار اور دعاؤں کا خاص موقع نہیں ملتا، تو وہ یہ نہ سمجھے کہ ذکر واذکار والوں کے مقابلہ میں وہ کچھ خسارہ میں ہے، بالکل نہیں، ذکر ودعا کی فضیلتیں مسلم ہیں، لیکن جو شخص قرآنِ کریم کی تعلیم وتعلم کے مبارک مشغلہ میں ہے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں اللہ جل شانہ کا یہ فیصلہ ہے کہ میں اس بندے کو اس سے زیادہ اور بہتر (جزا وبدلہ) دوں گا جو ذکر اور دعا کرنے والوں کو دیتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ جو بندہ قرآن کی تعلیم وتعلم سے وابستہ ہوجاتا ہے وہ اگرچہ مانگتا کم ہے؛ لیکن اس کو ملتا زیادہ ہے، کیوں کہ ربِ کریم نے اس کے لیے بہترین بدلہ اور افضل ترین عطا کا وعدہ کر رکھا ہے، لہٰذا اسے ہر جگہ نوازا جائے گا، دُنیا میں بھی اور عقبیٰ میں بھی، اس لیے بھی کہ ایک عام مسلمان وارثِ قرآن ہے تو حافظ اور صاحبِ قرآن درحقیقت عاشقِ قرآن اور صاحبِ ایمان ہے، کیوں کہ قرآن کنز الایمان ہے، لہٰذا جس کے سینے میں قرآن محفوظ ہے اس کا ایمان بھی محفوظ رہے گا اور وہ خود بھی دارین میں شرور وفتن سے محفوظ رہے گا۔ ان شاءاللہ۔

قبر میں حافظ کی حفاظت:

ایک حدیث قدسی میں وارد ہے کہ مرنے کے بعد حافظِ قرآن کو قبر میں بھی خوب نوازا جائے گا، جس کے دل میں قرآن محفوظ ہے قبر میں اس کا جسم بھی محفوظ ہوگا، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

" إِذَا مَاتَ حَامِلُ الْقُرْآن أَوْحَی اللّٰهُ إِلَی الْأَرْضِ أَنْ لَا تَأْكُلِیْ لَحْمَهٗ."

یعنی حامل قرآن (اس سے مراد وہ حافظ قرآن ہے جو قرآنِ کریم کے حروف وعلوم کا حافظ اور

عامل ہے، جب اس) کا انتقال ہو جاتا ہے تو جہاں اسے دفن کیا جاتا ہے اس قبر کو من جانب اللہ حکم دیا جاتا ہے کہ اے قبر! حافظِ قرآن میرا مہمان ہے، لہٰذا تو اس کے گوشت و پوست اور جسم کو محفوظ رکھنا، خراب نہ کرنا، اذیت نہ دینا، قادرِ مطلق ذات قبر کو گویائی عطا فرماتی ہے، وہ کہتی ہے:

"إِلٰهِي! كَيْفَ أَكُلُ لَحْمَهُ ؟ وَ كَلَامُكَ فِيْ جَوْفِهٖ." (کنز العمال: ۱/۵۵۵، فضائل حفظ قرآن: ۴۵/ حدیث قدسی نمبر: ۵)

الٰہی! جس کے پیٹ میں تیرا کلام محفوظ ہے میرے پیٹ میں اس کا جسم بھی محفوظ رہے گا، جس نے تیرے کلام کو ضائع نہیں کیا میری کیا مجال کہ میں اسے ضائع کروں؟ میں برابر اس کی حفاظت کروں گی، ماں کی گود سے زیادہ اس کو اپنی گود میں راحت پہنچاؤں گی۔

روایات میں منقول ہے کہ جیسے حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے اجسام کو قبر کی مٹی خراب نہیں کر سکتی ایسے ہی حفاظِ قرآن کے اجسام بھی قبر میں محفوظ رہتے ہیں، قبر کی مٹی انہیں خراب نہیں کرتی، حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑے ان کے جسموں کو نہیں کھاتے، البتہ اگر کسی اور وجہ سے حافظِ قرآن کا جسم محفوظ نظر نہ آئے - العیاذ باللہ العظیم - مثلاً کوئی شخص حافظ قرآن ہو کر بھی مرتکب کبائر ہوا اور کبائر کے ارتکاب کی وجہ سے اس کا جسم قبر میں محفوظ نہ رہے تو یہ حدیث پاک کے خلاف نہیں۔ فافہم۔

حشر میں حافظِ قرآن مقرب فرشتوں کے ساتھ ہوگا:

مذکورہ حدیث کے مطابق حافظ قرآن کا قبر میں اکرام ہوگا، اس کے بعد میدانِ حشر میں بھی اس کے ساتھ خصوصی اعزاز واکرام کا معاملہ کیا جائے گا، اسے عرشِ الٰہی کے زیر سایہ گویا وی. آئی. پی. (V.I.P.) لوگوں کے ساتھ رکھا جائے گا۔

مذکورہ حدیثِ پاک میں فرمایا گیا کہ

"اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ." (مشکوٰۃ: ۱۸۴)

ترجمہ: "وہ حافظ قرآن جسے قرآن کے الفاظ واحکام میں مہارت حاصل ہے (جسے قرآن خوب یاد ہو کہ پڑھنے میں اٹکے نہیں) وہ میدانِ محشر میں مقرب فرشتوں (مراد کاتبین وحی، یا کاتبین اعمال فرشتوں) کے ساتھ ہوگا۔"

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں "سفرۃ" کا جو لفظ ہے اس سے اکثر شارحین نے حاملین وحی فرشتے مراد لیے ہیں، اور بعض حضرات نے اس سے حضراتِ انبیاء ورُسل علیہم السلام مراد لیے ہیں، اور لفظی معنیٰ میں دونوں ہی کی گنجائش ہے، حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو بندے قرآنِ کریم کو کلام اللہ یقین کرتے ہوئے اس سے شغف رکھیں اور کثرتِ تلاوت اور اہتمام کی وجہ سے قرآنِ پاک سے ان کو مناسبت اور مہارت حاصل ہو جائے تو (میدانِ محشر میں) ان کو حضراتِ انبیاء ورُسل علیہم السلام یا حاملین وحی فرشتوں کی معیت اور رفاقت حاصل ہوگی۔ (معارف الحدیث: ۵/۸۶)

حافظ کی شفاعت سے دس جہنمی اہل خانہ جنت میں:

اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ حافظ کو شفاعت کا حق بھی دیا جائے گا، اور اس کی شفاعت سے جہنمیوں کی تقدیر بدل جائے گی، ان کے لیے جنت کے فیصلے کر دیے جائیں گے۔ ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَاسْتَظْهَرَهٗ، فَأَحَلَّ حَلَالَهٗ وَ حَرَّمَ حَرَامَهٗ، أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ، وَ شَفَّعَهٗ فِيْ عَشَرَةٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهٖ، كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُمُ النَّارُ." (رواه أحمد و الترمذی و ابن ماجه و الدارمی، مشکوٰۃ: ۱۸۷)

مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے قرآن کی تلاوت اس کے حقوق کی رعایت کے ساتھ کی، "فَاسْتَظْهَرَهٗ" پھر اس نے حفظ بھی کر لیا، اور یہ حافظ قرآن شخص عامل قرآن بھی تھا، قرآن پاک میں حلال بتائی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھ کر اختیار کرتا اور حرام چیزوں کو حرام سمجھ کر

اجتناب کرتا تھا، تو حق تعالیٰ اس صاحبِ قرآن کو جنت کا مہمان بنائیں گے، اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل فرمائیں گے، اور صرف اسے ہی نہیں؛ بلکہ اس حافظ قرآن کی برکت اور شفاعت سے اس کے اہلِ خانہ میں سے دس وہ افراد جن پر ان کی بداعمالیوں اور غفلتوں کے سبب جہنم واجب ہو چکی ہوگی (مگر وہ دنیا میں حافظ قرآن کے اس حفظ قرآن والے عمل کو بہت مبارک سمجھتے تھے، اس کی ہمت افزائی کرتے تھے، اس کا ادب واحترام کرتے تھے) تو انہیں بھی حافظ قرآن کی شفاعت پر جہنم سے نجات دی جائے گی، (بشرطیکہ وہ مومن ہوں، مشرک اور کافر نہ ہوں) اور انہیں ہمیشہ کی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

حضرت محی السنہ شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ''باعمل حافظ قرآن کو قیامت کے دِن جنت میں جانے کے لیے گیارہ پاسپورٹ ملیں گے، ایک سے تو وہ خود جنت میں جائے گا، اور دس کے ذریعہ وہ اپنے خاندان کے ان لوگوں کا انتخاب کر کے جنت میں لے جائے گا جن کے لیے دوزخ کا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔ قرآن کہتا ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (آل عمران: ۱۸۵)

ترجمہ: ''جو شخص نارِ جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا گیا وہ تو کامیاب ہو گیا۔''

حشر میں حافظِ قرآن اور اس کے والدین کا مقام:

کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں حافظِ قرآن موجود ہیں، خصوصاً وہ ماں باپ جنھوں نے دُنیا میں اپنی اولاد کی آخرت سنوارنے کے لیے اپنی اولاد کو حافظ قرآن اور عالم قرآن بنایا، انہیں اِس عظیم اور مبارک عمل پر کیا اجر ملے گا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، کیوں کہ ان کا اجر اتنا عظیم ہے کہ ساری دُنیا والے مل کر بھی نہیں دے سکتے، انہیں ان کا اجر قیامت میں کائنات کا خالق اور مالک ہی دے گا۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا:

عَنْ مُعَاذٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَ عَمِلَ بِمَا فِيْهِ، أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءُهٗ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ

الشَّمْسِ فِيْ بُيُوْتِ الدُّنْيَا، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِيْ عَمِلَ بِهٰذَا؟''

(رواه أحمد و أبو داود، مشكوٰة: ١٨٦)

ترجمہ: ''جس شخص نے قرآن پڑھا، (اسے حفظ کیا اور) پھر اس پر عمل کیا، (علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے قرآن یاد کیا۔'' گویا ان کے نزدیک یہاں حفظِ قرآن مراد ہے) اس کے والدین کو قیامت کے دِن ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی دنیا کے سورج کی روشنی سے بہتر ہوگی، تو تمہارا اس بندہ کے بارے میں کیا خیال ہے جو اس پر عمل بھی کرے۔''

اس سے سمجھ لو کہ جب قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے والے حافظ کے والدین کو اتنا نوازا جائے گا تو خود حافظ کو کتنا نوازا جائے گا! اسے جنت اور اس کی نعمتوں میں سے کیا کچھ نہیں دیا جائے گا! یقیناً اسے جنت کے اعلیٰ درجوں میں ان اعلیٰ نعمتوں سے نوازا جائے گا جو آج ہمارے تصور سے باہر ہیں۔

جو خوش نصیب حافظ قرآن ہو گیا　　فضل خدا سے صاحبِ ذی شان ہو گیا
جن کا دُلارا حافظ قرآن ہو گیا　　وہ والدین حشر کے دِن ہوں گے تاج دار
محفوظ جس کے سینے میں قرآن ہو گیا　　اس کو جلا سکے گی نہ دوزخ کی آگ بھی
دوزخ میں جن کے جانے کا اعلان ہو گیا　　دس ایسے آدمیوں کو جنت دلائے گا
جن کا پسر بھی حافظ قرآن ہو گیا　　مانند آفتاب وہ چمکیں گے حشر میں
انسان جس کے فیض سے ذی شان ہو گیا　　حفظ قرآن پاک کی برکت نہ پوچھئے

لہٰذا اے حفاظِ کرام! ہمیں آج دنیا والوں کی ناقدری سے شکستہ دِل ہو کر احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس اجرِ عظیم پر نظر رکھنی چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے حفاظِ کرام کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

ایک اہم پیغام:

صاحبو! یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں ہدایت وعنایت سے نوازنے کے لیے قرآنِ کریم جیسی عظیم الشان دولت عطا فرمادی، اب جو بھی اس سے فائدہ اٹھائے گا، مطلب یہ کہ جو شخص قرآنِ کریم کی تصدیق و تعظیم، تلاوت مع التجوید، تذکر وتدبر اور اس پر عمل کر کے حسبِ استطاعت اس کی تبلیغ و تعلیم کرے گا اور اس کے حقوق ادا کرے گا وہ گنہگار ہونے کے باوجود نوازا جائے گا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴾ (فاطر:۳۲)

ترجمہ: ’’پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچائی جن کو ہم نے منتخب فرمایا، پھر بعض تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں متوسط درجے کے ہیں، اور بعض وہ ہیں جو اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں بڑھتے چلے جاتے ہیں، یہ اللہ کا بڑا فضل ہے۔‘‘

ظاہر ہے کہ یہاں کتاب سے مراد قرآن اور اس کے وارثین سے مراد حضور ﷺ کی اُمت کے مسلمان ہیں، جن کی تین قسمیں ہیں، پھر ان تین قسموں کی تفسیر میں مفسرین کے تقریباً پینتالیس اقوال منقول ہیں:

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

(۱) ظالم سے مراد وہ ہے جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے؛ لیکن اس پر عمل نہیں کرتا۔ (یا ایک قول یہ ہے کہ اس کی برائیاں نیکیوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوں، خواہ دُنیا والے اسے کچھ بھی سمجھیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو وہ ظالم ہی ہے، قیامت کے دِن اس کا حساب سخت ہوگا، والعیاذ باللہ)۔

(۲) متوسط وہ ہے جو قرآنِ کریم کی تلاوت بھی کرتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے (یا اس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں، یہ اس کے خوش نصیب ہونے کی علامت ہے،

قیامت کے دِن اس کا حساب آسان ہوگا)۔

(۳) سابق وہ ہے جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے، اس پر عمل بھی کرتا ہے اور اس کا علم بھی رکھتا ہے، (یا وہ جس کی نیکیاں زیادہ ہوں اور برائیاں کم ہوں، قیامت کے دِن اس کا کوئی حساب نہ ہوگا) یہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ کے فضلِ عظیم ہونے کی علامت ہے۔ (اور یہی قرآنِ کریم کا بہترین وارث اور جانشین ہے) (تفسیر قرطبی:۱۴/ ۳۴۷، از: فضائل حفظ قرآن:۲۶)

حدیث پاک میں ہے کہ یہ تینوں قسمیں اللہ تعالیٰ کے منتخب اور پسندیدہ بندوں کی ہیں، اور وہ سب مراتب و درجات کے تفاوت کے حساب سے جنت میں ضرور داخل ہوں گے۔ (رواہ البیهقی فی کتاب البعث والنشور عن اسامة بن زید، مشكوٰة :۲۰۸)

مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا:

نیکاں را ہست میراث از خوشاب   آں چہ میراث است "أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ"

ترجمہ: ’’نیک لوگوں کے لیے میراث بہت اچھی ہے، ان کی میراث وہ ہے جو حق تعالیٰ نے انہیں "أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ" کہہ کر عطا فرمائی ہے۔‘‘

حق تعالیٰ ہمیں اور ہماری اولاد کو قرآنِ کریم کا حافظ، قاری، عالم، عامل اور داعی بنا کر قرآن سے مکمل وابستگی عطا فرما کر سابق بالخیرات میں شامل فرمالیں۔ آمین۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْآنَ فِي الدُّنْيَا قَرِيْنًا، وَ فِي الْآخِرَةِ شَافِعًا، وَ فِي الْقَبْرِ مُؤْنِسًا، وَ فِي الْقِيَامَةِ صَاحِبًا، وَ عَلَى الصِّرَاطِ نُوْرًا، وَ فِي الْجَنَّةِ رَفِيْقًا، وَ مِنَ النَّارِ سِتْرًا. آمين.

ترجمہ: ’’اے اللہ! تو قرآنِ پاک کو ہمارا ہم نشین بنا دے، ہمارے حق میں آخرت میں شفاعت کرنے والا بنا دے، قبر میں اُنسیت کا باعث بنا دے، قیامت کے دِن ساتھ رہنے والا بنا دے، پل صراط پر گزرنے کے وقت اسے روشنی بنا دے، جنت کا ساتھی بنا دے اور عذابِ جہنم سے حفاظت کا ذریعہ بنا دے۔‘‘

آمين يا رب العالمين. وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين.

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۳۱)

اعمالِ صالحہ کی ضرورت واہمیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ ثَوۡبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ:" لَمَّا نَزَلَتۡ: ﴿ وَ الَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَ الۡفِضَّةَ وَ لَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ أَلِيۡمٍ ۝﴾ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِيۡ بَعۡضِ أَسۡفَارِهٖ، فَقَالَ بَعۡضُ أَصۡحَابِهٖ:" نَزَلَتۡ فِي الذَّهَبِ وَ الۡفِضَّةِ، لَوۡ عَلِمۡنَا أَيُّ الۡمَالِ خَيۡرٌ فَنَتَّخِذَهٗ"، فَقَالَ:" أَفۡضَلُهٗ لِسَانٌ ذَاكِرٌ، وَ قَلۡبٌ شَاكِرٌ، وَ زَوۡجَةٌ مُؤۡمِنَةٌ تُعِيۡنُهٗ عَلٰى إِيۡمَانِهٖ." (رواه أحمد و الترمذي و ابن ماجه، مشكوٰة : ۱۹۸/باب ذكر الله عزوجل و التقرب إلى الله / الفصل الثاني)

ترجمہ: ''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿ وَ الَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَ الۡفِضَّةَ وَ لَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ أَلِيۡمٍ ۝﴾ (التوبة : ۳۴) یعنی وہ لوگ جو سونے اور چاندی کو جمع تو کرتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے، تو ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، بعض صحابہ نے عرض کیا کہ مذکورہ آیت سونے اور چاندی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، (اور ہم نے ان کے بارے میں حکم کو پہچانا اور ان کی مذمت کو بھی جان لیا،

کاش کہ ہم یہ جانیں کہ ان کے علاوہ کونسا مال و دولت بہتر ہے، تو ہم اسی کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے، تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ (دنیا کی) عظیم الشان دولت ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل اور ایمان والی ایسی بیوی ہے جو (اپنے شوہر کو) ایمان و اعمال پر آمادہ کرے (اور معاصی سے روکے)''

مال کے بالمقابل اعمال کی اہمیت زیادہ ہے:

اللہ جل شانہٗ نے مال و دولت کو دنیوی اور دینی امور کی ادائیگی کے لیے بلاشبہ ایک بڑا اور اہم سبب بنایا ہے، جس کی وجہ سے مال و دولت کی بھی خاص ضرورت واہمیت ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مال و دولت ہی سب کچھ نہیں، کیوں کہ مال و دولت سے انسان سکون کا سامان تو خرید سکتا ہے، سکون و اطمینان نہیں، کھانا اور غذا تو خرید سکتا ہے، بھوک نہیں، مشروب اور پینے کا سامان تو خرید سکتا ہے، پیاس نہیں، دوا تو خرید سکتا ہے، شفا نہیں، کتابیں تو خرید سکتا ہے، علم نہیں، دوکانیں تو خرید سکتا ہے، رزق نہیں، بستر تو خرید سکتا ہے، نیند نہیں، اس لیے مال و دولت کی ضرورت و اہمیت تو ہے، لیکن تمام پریشانیوں اور دشواریوں کا حل مال ہی میں نہیں، بلکہ بے دینی کے سبب اکثر اوقات مال ہی مختلف قسم کی پریشانیوں کا سبب بن جاتا ہے، جب کہ نیک اعمال سے بندہ اکثر نجات حاصل کر لیتا ہے، اس لیے مال کے مقابلہ میں نیک اعمال کی اہمیت زیادہ ہے۔

ایک واقعہ:

اس کی تائید مذکورہ حدیث کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں رحمت عالم ﷺ کے ساتھ تھے، دورانِ سفر آپ ﷺ پر وہ آیت طیبہ نازل ہوئی جس میں اللہ رب العالمین نے سونے اور چاندی کو کمانے اور جمع کرنے والے ایسے افراد کی مذمت بیان فرمائی جو راہِ خدا میں خرچ کرنے سے گریز کرتے

ہیں، جو لوگ صرف جمع کرنا جانتے ہیں، خرچ کرنا نہیں، جو صرف مالدار ہیں، دیندار اور دلدار نہیں، ایسے لوگوں کے لیے یہی مال و دولت ہلاکت کا ذریعہ ہے، جس کا تذکرہ آیت کریمہ میں ہوا، اس موقع پر بعض صحابہؓ نے یہ سوال کیا کہ حضور! ”لَوْ عَلِمْنَا أَيُّ الْمَالِ خَيْرٌ فَنَتَّخِذَهٗ“ مال و دولت اور سونے چاندی سے زیادہ بہتر اور افضل کیا چیز ہے؟ اس کی طرف بھی نشاندہی فرما دیجیے، تاکہ ہم اس کو حاصل کرنے کی کوشش کیا کریں اور کلامِ الٰہی میں جس مال و دولت کی ناپسندیدگی بیان ہوئی اس سے احتیاط کریں، اس وقت آپ ﷺ نے تین ایسی چیزوں کا تذکرہ فرمایا جو حصولِ مال کے بجائے نیک اعمال کا ذریعہ ہیں، اس لیے ان کو اپنانے کی گویا تلقین فرمائی ہے، ان میں پہلی چیز کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”لِسَانٌ ذَاكِرٌ“...... دنیا کی دولت کے مقابلہ میں عظیم الشان اور افضل ترین دولت یادِ الٰہی میں مشغول و مصروف رہنے والی زبان ہے، بولنے اور چکھنے والی زبان تو تقریباً ہر ایک کو میسر ہے، لیکن اگر کسی خوش نصیب کو فکرِ آخرت اور اہل اللہ کی صحبت کے سبب ذکرِ الٰہی سے تر رہنے والی زبان مل جائے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو گویا دنیا کا قیمتی سرمایہ حاصل ہو گیا، کیوں کہ سب سے پہلے وہ ذکرِ الٰہی کے ذریعہ سکونِ قلبی و سکونِ زندگی اور پھر دارین کی کامیابی حاصل کر سکتا ہے، جیسا کہ قرآن و حدیث میں اس کی بشارتیں وارد ہوئی ہیں۔

آگے حضور ﷺ نے دوسری چیز کا تذکرہ یوں فرمایا کہ ”وَقَلْبٌ شَاكِرٌ“...... اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا دل بھی دنیا کی عظیم الشان دولت ہے، سینے میں دھڑکنے والا دل تو ہر کسی کو میسر ہے، لیکن اگر کسی خوش نصیب کو اللہ رب العزت کی نعمتوں کا دھیان و استحضار اور دنیوی امور میں خود سے کم درجہ کے لوگوں پر نظر رکھنے کے سبب شکرِ الٰہی میں سرشار رہنے والا دل مل جائے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ لسانِ ذاکر کی طرح یہ قلبِ شاکر بھی دنیا کا عظیم الشان سرمایہ ہے، اس سے موجودہ نعمتوں کی حفاظت اور آئندہ کے لیے نعمتوں میں برکت و اضافہ ہوگا، جیسا کہ قرآن و حدیث میں اس کی بشارتیں دی گئی ہیں۔

اخیر میں دنیا کی تیسری عظیم الشان دولت حضور ﷺ نے نیک عورت کو قرار دیا، ارشاد ہے:

”وَزَوْجَةٌ مُؤْمِنَةٌ تُعِيْنُهٗ عَلٰى إِيْمَانِهٖ.“

دنیا کی عظیم الشان دولت وہ نیک عورت بھی ہے جو اپنے شوہر کو اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ اور تقوی پر آمادہ کرے، شوہر سے محبت کرنے والی بیوی تو تقریباً ہر کسی کو میسر ہوتی ہے، لیکن اگر کسی خوش نصیب کو شادی سے قبل انتخابِ رشتہ میں دینداری کو ملحوظ رکھنے کے سبب اللہ سے محبت کرنے والی بیوی مل جائے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ عورت دنیا کی عظیم الشان دولت ہے اور دارین کی نجات کا سبب ہے۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جس خوش نصیب کو لسانِ ذاکر اور قلبِ شاکر میسر ہو جائیں اسے -ان شاء اللہ تعالیٰ- مومنہ اور صالحہ شریکۂ حیات ضرور میسر ہوگی، غالباً اسی لیے تینوں کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

مال زندگی کی ضرورت ہے
تو نیک اعمال زندگی کا مقصد ہیں:

الغرض اس روایت سے یہ واضح ہو گیا کہ مال کے مقابلہ میں نیک اعمال کی اہمیت زیادہ ہے، وجہ یہ ہے کہ مال تو زندگی کی ضرورت ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

﴿جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ (النساء: ۵)

لیکن نیک اعمال زندگی کا مقصد ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝﴾ (الذاريات: ۵۶)

ترجمہ: ”اور میں نے جنات اور انسان کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ (الملک : ۲)

ترجمہ: ''(اللہ) نے موت اور زندگی اس لیے پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مال اگرچہ زندگی گزارنے کا ذریعہ اور ضرورت ہے، لیکن نیک اعمال زندگی کا بنیادی اور اصلی مقصد ہیں، اس لیے بھی مال کے مقابلہ میں نیک اعمال کی اہمیت زیادہ ہے۔

مال دنیا کی کرنسی ہے تو اعمال آخرت کی:

علاوہ ازیں دنیا کی کرنسی مال ہے، لیکن آخرت کی کرنسی نیک اعمال ہیں، اس لیے مرتے ہی مال تو بے وفائی کرتا ہے، ساتھ چھوڑ دیتا ہے، لیکن نیک اعمال مرنے والے کا ساتھ نہیں چھوڑتے؛ بلکہ پوری وفاداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے قبر اور حشر میں بھی کام آتے ہیں، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "یَتْبَعُ الْمَیِّتَ ثَلَاثَۃٌ، فَیَرْجِعُ اثْنَانِ، وَ یَبْقٰی مَعَہٗ وَاحِدٌ، یَتْبَعُہٗ اَھْلُہٗ وَ مَالُہٗ وَ عَمَلُہٗ، فَیَرْجِعُ اَھْلُہٗ وَ مَالُہٗ، وَ یَبْقٰی عَمَلُہٗ." (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۴۴۰)

ترجمہ: ''میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، جن میں سے دو تو واپس لوٹ آتی ہیں اور ایک ساتھ رہ جاتی ہے، اس کے اہل وعیال، مال اور اعمال، پھر اعمال ساتھ رہتے ہیں، اور اہل وعیال اور مال ومنال مرنے والے کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔''

اسی کو حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھیؒ نے فرمایا:

مال و اولاد تیری قبر میں جانے کو نہیں   تجھ کو دوزخ کی مصیبت سے چھڑانے کو نہیں
جز عمل قبر میں کوئی بھی تیرا یار نہیں   کیا قیامت ہے کہ تو اس سے خبردار نہیں

صاحبو! واقعہ یہی ہے کہ دنیا کی تمام دولت، سونا، چاندی، روپیہ، پیسہ، زمین وجائداد، گھربار، مکان، دوکان، باغ اور کھیت وکھلیان سب کے سب یہی رہ جائیں گے، ان کی حیثیت پانی کے بلبلہ کی طرح ہے، کب ختم ہو جائیں کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن اعمال کا یہ حال نہیں، لہٰذا اس سے بھی مال کے مقابلہ میں اعمال کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

امام غزالیؒ نے ایک نصیحت آموز واقعہ ''اِحیاء'' میں بیان فرمایا ہے کہ حضرت شقیق بلخیؒ نے اپنے شاگرد حضرت حاتم اصمؒ سے رخصتی کے وقت دریافت کیا کہ ''تم نے تقریباً ۳۳ سال کا طویل عرصہ میرے ساتھ گزارا، بتاؤ! اس دوران تم نے کیا سیکھا؟'' عرض کیا: ''حضرت! آٹھ باتیں سیکھیں اور ان پر عمل کرنے لگا'' فرمایا: ''وہ کیا ہیں؟'' عرض کیا: ''(۱) میں نے مخلوق کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہر ایک کا کوئی نہ کوئی محبوب ہے، لیکن محبت کا یہ سلسلہ قبر تک رہتا ہے، بعد میں ختم، اس لیے میں نے محبت کا یہ سلسلہ قبر اور حشر تک باقی رکھنے کے لیے نیک اعمال کو اپنا محبوب بنالیا۔ (۲) میں نے دیکھا کہ اموال کی حفاظت کے لیے لوگوں نے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں، پھر جب میں نے قرآن پاک میں پڑھا کہ ﴿مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ﴾ (النحل : ۹۶) تو اپنے اموال کو راہِ خدا میں خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ کرلیا۔ (۳) فرمانِ باری: ﴿وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ﴾ (الرحمٰن : ۴۶) اور ﴿وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ وَ نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی﴾ (النّٰزعٰت: ۴۰) کو پڑھا تو آپ کی صحبت میں رہ کر خوب محنت کی اور نفس کو قابو میں کر کے اسے طاعت پر آمادہ کرلیا۔ (۴) لوگوں کو دیکھا کہ حسب نسب اور مال ومنصب میں عزت تلاش کر رہے ہیں، جب کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ (الحجرات:۱۳) تو میں نے آپ جیسے متقیوں کی صحبت میں رہ کر تقویٰ اختیار کرنے کی کوشش کی، تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی نظر میں عزت پاؤں۔ (۵) لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے کی نعمتوں پر حسد کرتے ہوئے

پایا، پھر حق تعالیٰ کے فرمان: ﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ﴾ (الزخرف:۳۲) میں غور کیا اور کوشش کر کے حسد سے خود کو بچائے رکھا، یہ سوچا اور یقین کر لیا کہ تقسیم صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، لہٰذا حسد کا کوئی فائدہ نہیں۔ (۶) لوگوں کو مختلف وجوہات کے سبب ایک دوسرے سے دشمنی کرتے ہوئے دیکھا، جب کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿ إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ (فاطر:۶) ''تمہارا حقیقی دشمن تو شیطان ہے۔'' لہٰذا میں نے اسی کو اپنا دشمن بنالیا۔ (۷) لوگوں کو دیکھا کہ روزی روٹی کے لیے خود کو ذلیل کرتے ہیں اور حلال وحرام تک کی پرواہ نہیں کرتے، لیکن جب میں نے ارشادِ باری: ﴿ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (هود:۶) میں غور کیا تو رزق کے متعلق مطمئن ہو کر حقوق کی ادائیگی میں مشغول ہو گیا، جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے رزق آسان کر دیا۔ (۸) میں نے یہ بھی دیکھا کہ ہر ایک کو کسی نہ کسی پر بھروسہ ہے، پھر جب میں نے ارشادِ باری کو پڑھا: ﴿ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ (الطلاق:۳) تو اسی پر بھروسہ کر لیا۔''

یہ سن کر حضرت شیخ بلخیؒ نے فرمایا کہ ''تمام قرآنی وآسمانی علوم اِن آٹھ باتوں میں آ گئے، ان پر عمل کرنے والا قرآنی وآسمانی علوم پر عمل کرنے والا سمجھا جائے گا۔''

(فضائل صدقات/صفحہ:۳۵۴/علماءِ آخرت کی بارہ علامات)

دنیا کے نزدیک مال کی اہمیت ہے
تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعمال کی:

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مال کی اہمیت مخلوق اور دنیا والوں کے نزدیک تو ہے، لیکن دنیا کے خالق کے نزدیک پوری کائنات کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں، اس کے یہاں مال کی نہیں، اعمال کی قدر وقیمت ہے، چنانچہ ایک حدیث قدسی میں ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام

نے ایک مرتبہ بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ پروردگار! مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیجیے کہ میں اس کے ذریعہ آپ کو یاد کر سکوں یا پکارا کروں، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: '' يَا مُوْسٰى! قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' اے موسیٰ! ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' پڑھا کرو، سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''یا اللہ! یہ عمل تو تیرے تمام (موحد) بندے کرتے ہیں، میں تو کوئی مخصوص عمل چاہتا ہوں، تب حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

'' يَا مُوْسٰى! لَوْ أَنَّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعَ وَ عَامِرَهُنَّ غَيْرِيْ وَ الْأَرَضِيْنَ السَّبْعَ وُضِعْنَ فِيْ كِفَّةٍ، وَ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' فِيْ كِفَّةٍ، لَمَالَتْ بِهِنَّ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ.'' (رواه في شرح السنة، مشكوٰة المصابيح: ۲۰۱) (حديث قدسی: ۸)

ترجمہ: ''اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور میرے علاوہ ان میں موجود تمام آبادی، نیز ساتوں زمینوں کو ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں ''لا الٰہ الا اللہ'' (کا اجر وثواب) رکھ دیا جائے، تو اس عمل والا پلڑا جھک جائے گا۔''

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک زمینوں اور آسمانوں کے اموال اور خزانوں کے مقابلہ میں ایک اخلاص بھرے عمل کی کیا قیمت ہے۔

حضراتِ صحابہؓ کا جذبۂ عمل:

یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہؓ وصلحاء کا یہی جذبہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ اعمال کا اہتمام کیا جائے، آج کی دنیا حصولِ مال میں ایک دوسرے سے سبقت کرتی ہے، جب کہ وہ نیک اعمال میں سبقت فرماتے تھے، ان کے یہاں ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (البقرة:۱۴۸) پر قابل رشک عمل تھا۔

اس سلسلہ میں حدیث پاک میں ایک واقعہ منقول ہے:

عَنْ أَبِيْ صَالِحٍ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: '' إِنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِيْنَ

أَتَـوُا النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالُوْا، حضرت ابوصالح فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان
ہے کہ ایک مرتبہ فقراءِ مہاجرین حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عجیب وغریب شکایت
کرنے لگے کہ " ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالدَّرَجَاتِ الْعُلٰى وَ النَّعِيْمِ الْمُقِيْمِ." یارسول اللہ!
یہ مالدار حضرات مقاماتِ عالیہ اور جنت کی نعمتیں حاصل کرنے میں ہم سے آگے بڑھ گئے،
فَقَالَ: وَ مَا ذٰلِكَ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا، وہ کیسے؟ "قَالُوْا: يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّيْ وَ
يَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ، وَ يَتَصَدَّقُوْنَ وَ لَا نَتَصَدَّقُ وَ يُعْتِقُوْنَ وَ لَا نُعْتِقُ." کہنے لگے
کہ بات یہ ہے کہ یہ اہل ثروت و دولت ہماری طرح نماز و روزہ کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن
اس کے ساتھ وہ مالدار ہونے کے سبب صدقہ، سخاوت و خیرات کرتے ہیں، غلام آزاد کرتے
ہیں، اور ہم اپنی غربت کے سبب یہ کام نہیں کر پاتے، فَقَالَ: " أُعَلِّمُكُمْ شَيْئًا تُدْرِكُوْنَ بِهٖ
مَنْ سَبَقَكُمْ وَ تَسْبِقُوْنَ بِهٖ مَنْ بَعْدَكُمْ، وَ لَا يَكُوْنُ أَحَدٌ أَفْضَلَ مِنْكُمْ، إِلَّا مَنْ صَنَعَ
مِثْلَ مَا صَنَعْتُمْ، آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جس کے ذریعہ تم
آگے نکل جانے والوں کو پکڑ لو اور تمہارے بعد آنے والوں سے آگے نکل جاؤ، اور تم سے کوئی
افضل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ بھی تمہاری طرح اعمال کا اہتمام نہ کرنے لگے" قَالُوْا: "بَلٰى
يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" انہوں نے عرض کیا: "حضور! ضرور بتائیں، قَالَ: "تُسَبِّحُوْنَ وَ تُكَبِّرُوْنَ
وَ تَحْمَدُوْنَ دُبُرَ كُلِّ صَلٰوةٍ ثَلَاثًا وَّ ثَلَاثِيْنَ مَرَّةً" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہر فرض نماز کے
بعد ۳۳ مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ، ۳۳ مرتبہ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اور ۳۳ مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ پڑھ لیا کرو، (اس
کا ثواب صدقہ، خیرات اور غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر ہے) ان فقراءِ مہاجرین نے اس
پر عمل شروع کر دیا، تو راویٔ حدیث حضرت ابوصالح کا بیان ہے کہ کچھ دنوں کے بعد پھر فقراءِ
مہاجرین نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا کہ حضور! ہمارے مالدار بھائیوں نے بھی ان اعمال
کا اہتمام شروع کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: " ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ." (یہ اللہ
تعالیٰ کا فضل و کرم ہے، وہ جسے چاہے عطا کرے)۔ (متفق علیه، مشکوٰۃ: ۸۹)
اس سے معلوم ہوا کہ مالِ حلال کے ساتھ توفیق اعمال کا ملنا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل

ہے۔ ان حقائق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم بھی مال کے بالمقابل نیک اعمال کو زیادہ اہمیت دیں
اور مال کے لیے دین کے ضروری اعمال ہرگز ترک نہ کریں۔
حق تعالیٰ ہمیں اپنی رضا کے لیے حلال مال اور توفیق نیک اعمال عطا فرمائے۔ آمین۔

۱۴/ رجب المرجب/ ۱۴۳۷ھ، قبل الجمعہ
مطابق: ۲۲/ اپریل/ ۲۰۱۶ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ،
وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
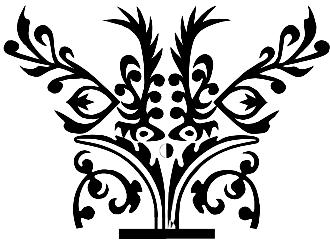
(۳۲)

مال و دولت کی ضرورت و اہمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ:" أَرْسَلَ إِلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنِ اجْمَعْ عَلَيْكَ سِلَاحَكَ وَ ثِيَابَكَ، ثُمَّ ائْتِنِيْ"، قَالَ:" فَأَتَيْتُهُ وَ هُوَ يَتَوَضَّأُ"، فَقَالَ:" يَا عَمْرُو! إِنِّيْ أَرْسَلْتُ إِلَيْكَ لِأَبْعَثَكَ فِيْ وَجْهٍ يُسَلِّمُكَ اللّٰهُ وَ يُغَنِّمُكَ، وَ أَزْعَبُ لَكَ زَعْبَةً مِنَ الْمَالِ" فَقُلْتُ:" يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا كَانَتْ هِجْرَتِيْ لِلْمَالِ، وَ مَا كَانَتْ إِلَّا لِلّٰهِ وَ لِرَسُوْلِهٖ"، قَالَ:" نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ." (رواه أحمد، وفی شرح السنة، مشكوٰة : ۳۲۶ / باب رزق الولاة و هداياهم)

ترجمہ: ’’حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ مجھے رحمت عالم ﷺ نے یہ پیغام بھیجا کہ تم (سفر کی تیاری کے لیے) اپنے ہتھیار اور کپڑے (وغیرہ) تیار کرلو، پھر میرے پاس آؤ، حضرت عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں (تیاری کرکے) خدمت اقدس میں حاضر ہوا، تو اس وقت آپ ﷺ وضو فرما رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’’اے عمرو! میں نے تمہیں اس لیے پیغام دے کر بلایا تاکہ تمہیں ایک جگہ (امیر لشکر بنا کر بھیجوں) پھر تم اللہ کے فضل سے صحیح سالم لوٹو (اور وہ مہم تمہارے ہاتھ فتح ہو) اور تم کو مالِ غنیمت حاصل ہو اور میں

208

تمہیں مال سے کچھ حصہ دوں‘‘، تو میں نے عرض کیا: ’’یا رسول اللہ! میرا ایمان لانا اور ہجرت کرنا مال کے خاطر نہ تھا، بلکہ میری ہجرت خالص اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے تھی‘‘، تب آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کے صالح اور نیک بندے کے لیے جائز اور پاکیزہ مال و دولت اچھی چیز (اور قابل قدر نعمت) ہے۔‘‘

مال زندگی کی اہم ضرورت:

اللہ رب العزت نے چوں کہ دنیا کو دارالاسباب بنایا ہے، اس لیے اسباب کے بغیر سب کچھ کر سکنے کی قدرت ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی سنت و عادت یہی ہے کہ انسانوں اور دیگر بہت سی مخلوقات کی ضروریات عام طور پر اسباب ہی کے ذریعہ پوری فرماتے ہیں، اُن اسباب میں ایک اہم سبب مال ہے، مال وہ سبب ہے جس کی ضرورت ہر انسان کو پیدائش سے بھی پہلے اور موت کے بعد تک ساری زندگی میں قدم قدم پر دینی و دنیوی امور کی انجام دہی کے لیے پیش آتی ہے، اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے قرآن نے مال کو ”قِیَام“ سے تعبیر کیا، چنانچہ فرمایا:

﴿ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ (النساء : ۵)

ترجمہ: ’’اللہ تعالیٰ نے مال کو تمہارے لیے زندگی گزارنے کا ذریعہ اور قیمتی سرمایہ بنایا ہے۔‘‘

معلوم ہوا کہ مال زندگی کی نہایت ہی اہم ضرورت ہے، جیسے جسم انسانی کی درستی کا دارومدار اسباب کے تحت صحت مند خون پر ہے، ایسے ہی نظام زندگی کی درستی کا دارومدار حلال مال و دولت کے حصول پر ہے، اس کے بغیر زندگی کا نظام اور سسٹم درہم برہم ہوجاتا ہے اور بالآخر ایک اچھا انسان اور سچا مسلمان بھی وہ کام کر گزرتا ہے جو واقعی اچھے انسان اور سچے مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہوتا، اسی لیے ایک حدیث پاک میں فقر کو کفر کا سبب قرار دیا گیا:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُوْنَ

كُفُرًا، وَ كَادَ الْحَسَدُ أَنْ يَغْلِبَ الْقَدَرَ." (أخرجه البيهقي في شعب الإيمان: ۵/۲۶۲، مشكوٰة: ۴۲۹)

ترجمہ: ''یعنی قریب ہے کہ فقر بندے کو کفر تک پہنچا دے اور حسد تقدیر پر غالب آجائے۔''

واقعی بعض اوقات ایک شخص تنگی و مفلسی سے عاجز آکر قضاءِ الٰہی پر اعتراض یا ناراضگی کا اظہار کر بیٹھتا ہے، یا کافروں جیسی حرکت کرنے لگتا ہے۔

مال کما کر جمع کرنے کا حکم:

اسی لیے صاحب کشاف علامہ زمخشریؒ نے آیت کریمہ: ﴿جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ کے تحت فرمایا کہ مال مومن کا ہتھیار ہے۔ (کشاف: ۴۶۱)

جیسے ہتھیار سے آدمی اپنا دفاع اور حفاظت کرتا ہے ایسے ہی مال کے ذریعہ بھی انسان اپنے ایمان، آبرو اور جان کی حفاظت کرسکتا ہے، یہ مال کا بہت ہی بڑا فائدہ ہے، اسی لیے حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے تھے کہ ''گذشتہ زمانہ میں مال ناپسندیدہ شئی تھی، مگر ہمارے زمانہ میں مومن کی ڈھال بن چکا ہے۔'' (معارف القرآن: ۲/۳۰۳)

مسند احمد کی ایک روایت ہے:

" لَيَأْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَنْفَعُ فِيهِ إِلَّا الدِّينَارُ وَ الدِّرْهَمُ."

(رواه أحمد، مشكوٰة: ۲۴۳)

ترجمہ: ''لوگوں پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ جب درہم و دینار (روپیہ اور پیسہ) ہی کام آئیں گے۔''

اسی لیے ایک حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: " مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ

يَقِيَ دِيْنَهُ وَ عِرْضَهُ بِمَالِهِ فَلْيَفْعَلْ." (المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۲/۵۸)

ترجمہ: ''تم میں سے جو شخص اپنے دین و ایمان اور عزت و آبرو کی حفاظت مال کے ذریعہ کرسکتا ہو اسے ضرور کرنا چاہیے۔''

ان حقائق کے پیش نظر ہمارے علماء نے فرمایا کہ جائز طریقہ سے مال کمانا اور نیک نیتی کے ساتھ زائد از ضرورت مال جمع کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے؛ بلکہ ضروری بھی ہے، اس لیے بقولِ شاعر:

کر تو بھی ترقی دنیا میں اسبابِ تجارت پیدا کر
قارون کی دولت ٹھکرا دے عثمان کی دولت پیدا کر

مال و دولت کی قلت و کثرت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہے:

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مال و دولت کی کثرت عند اللہ بندے کے مقبول ہونے کی علامت نہیں، کیوں کہ ارشادِ باری ہے:

﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَ يَقْدِرُ﴾ (الرعد: ۲۶)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق (جس کی ایک شکل مال و دولت بھی ہے) میں وسعت کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگی کر دیتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مال و دولت کی قلت اور کثرت کا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے یہاں مقبولیت سے کوئی تعلق نہیں، اس کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہے، چنانچہ مالی اعتبار سے تنگی اور کشادگی کی ایک حکمت امام بغویؒ نے اس آیت کریمہ کے تحت حضرت انس بن مالکؓ سے منقول ایک حدیث قدسی میں نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے کچھ مومن بندے ایسے ہیں جو خاص عبادت کی توفیق کا مجھ سے

سوال کرتے ہیں، مگر میں انہیں اس کی توفیق اس لیے نہیں دیتا کہ اس سے ان میں عجب اور خود بینی پیدا ہوجائے گی، جو ان کی ہلاکت کا سبب ہے، میرے بعض مومن بندے وہ ہیں جن کے ایمان کے زیادہ موزوں مالداری ہی ہے، اگر میں ان کو فقر و فاقہ میں مبتلا کروں تو وہ ان کی ہلاکت کا سبب ہے، میرے بعض بندے وہ ہیں جن کے ایمان کے شایانِ شان فقیری ہی ہے، اگر میں انہیں مالداری عطا کروں تو یہ ان کی ہلاکت کا سبب ہے، میرے بعض بندے وہ ہیں کہ ان کے ایمان کی حفاظت تندرستی میں ہے، اگر میں ان کو بیمار کردوں تو یہ ان کی ہلاکت کا سبب ہے، جب کہ بعض بندے وہ ہیں جن کے ایمان کی حفاظت بیماری میں مضمر ہے، اگر میں انہیں تندرست کردوں تو یہ ان کی ہلاکت کا سبب ہے، لہٰذا میں اپنے بندوں کے دلوں کی کیفیت کے بارے میں اپنے علم کے مطابق (خاص حکمت کے تحت) ان کے امور کی تدبیر کرتا ہوں، میں جاننے والا باخبر ہوں۔ (تفسیر مظہری: ۸/۳۲۴) (حدیث قدسی نمبر: ۹)

مال کی کثرت عنداللہ مقبولیت کی علامت کب ہے؟

اس سے ثابت ہوا کہ مالی اعتبار سے تنگی و کشادگی کا نظام من جانب اللہ خاص حکمت عادلہ پر مبنی ہے، لہٰذا مالداری عنداللہ قبولیت کی اور فقیری محرومی کی علامت نہیں ہے۔ البتہ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مسلمان کو مالِ کثیر سے نوازا اور اس کے مکاسب و مصارف بھی شرعاً درست ہیں، یعنی مال کمانے اور خرچ کرنے کے طریقے صحیح اور شریعت کے مطابق ہیں تو پھر یقیناً ایسے شخص کے لیے مال و دولت کی کثرت عنداللہ مقبولیت، اس کے فضل خاص کی علامت اور قابل قدر نعمت ہے، حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام میں سے سیدنا داود، سلیمان، ایوب اور یوسف علیہم السلام کے علاوہ بھی متعدد حضرات کو اللہ تعالیٰ نے اس فضل خاص اور نعمت عظمیٰ سے نوازا تھا، اور اکابر صحابہؓ میں سے سیدنا عثمان غنی،

عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن عوام وغیرہم رضی اللہ عنہم کو بھی اس فضل الٰہی سے وافر حصہ عطا ہوا تھا، اسی کو حدیث مذکور میں "نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ" فرمایا گیا، یعنی نیک آدمی جو مباح ذرائع سے کما کر شکر کے ساتھ صحیح اور ضرورت کی جگہوں میں خرچ کرے اس کے لیے مال اللہ تعالیٰ کی بڑی زبردست خیر اور نعمت ہے، ایسے ہی خوش نصیب شخص کے لیے جو کہ مالدار، دلدار اور دیندار ہے حدیث پاک میں فرمایا گیا:

"لَا بَأْسَ بِالْغِنٰی لِمَنِ اتَّقَی اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ." (رواه أحمد، مشکوٰة: ٤٥١ / باب استحباب المال و العمر للطاعة)

مطلب یہ ہے کہ مالداری کے ساتھ فخر و فحاشی اور عیاشی نہیں؛ بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری بھی ہے تو ایسے متقی کے لیے مالداری مضر نہیں، کیوں کہ وہ مال کو دینی، دنیوی اور اُخروی فوائد کے حصول میں خرچ کرے گا، جس کی وجہ سے اس متقی مالدار کا حال و مآل دونوں بہتر ہوں گے۔

مال و دولت کے چند فوائد:

صاحبو! واقعۃً ہمارے مالدار اگر متقی بن جائیں تو پھر مال کے ذریعہ بہت سے دینی اور دنیوی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں، دنیوی فوائد تو ظاہر ہیں، دینی اور اُخروی فوائد یہ ہیں کہ مال چوں کہ بالواسطہ یا بلا واسطہ عبادت کا ذریعہ بنتا ہے، اور ہر وہ عبادت جو اتباعِ سنت اور اخلاصِ نیت کے ساتھ ادا کی جائے اس پر اجرِ عظیم کی بشارت ہے، مال کے ذریعہ مالدار بندہ مساجد اور مدارس وغیرہ کی تعمیر کرکے نیز دینداروں اور غریبوں کی خدمت کرکے فضل کریم اور اجر عظیم کا مستحق بن سکتا ہے، چنانچہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ جنگ تبوک کے موقع پر جب رحمت عالم ﷺ نے چندے کا اعلان فرمایا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے تنہا ایک تہائی فوج کے اخراجات کا ذمہ لے لیا، چوں کہ فوج تیس ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ یا مجاہدین پر مشتمل تھی، اس حساب سے گویا آپؓ نے تیرہ ہزار مجاہدین کا خرچ اٹھایا،

علاوہ ازیں انہوں نے دیگر صحابہؓ کے لیے بھی ایک ہزار اونٹ، ستر گھوڑے اور ایک ہزار دینار نقد پیش کیے، آپ ﷺ اس فیاضی کو دیکھ کر اتنے خوش ہوئے کہ اشرفیوں کو ہاتھوں سے اچھالتے اور فرماتے: ”مَا ضَرَّ عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذَا الْيَوْمِ“ یعنی آج کے بعد عثمان کا کوئی کام اس کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ (مشکوٰۃ: ۵۶۱)

ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فضیلت آپؓ کو اخلاص کے ساتھ انفاقِ مال کے ذریعہ حاصل ہوئی، اس لیے اگر مال کے مکاسب و مصارف صحیح ہوں تو اس سے بہت سے فوائد و فضائل حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن اگر خدانخواستہ مکاسب غلط ہیں، تو پھر مصارف بھی غلط ہی ہوں گے، اور یہ چیز دارین میں ہلاکت کا ذریعہ ہوگی۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا کر پرہیزگار، مالدار، دلدار اور دیندار بنادے۔ آمین۔

۷/ رجب المرجب/ ۱۴۳۷ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۱۵/ اپریل/ ۲۰۱۶ء (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
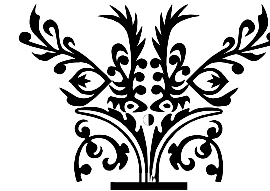
(۳۳)

فضائل صدقہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”إِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ، ثُمَّ تَلَا: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ ......الآية﴾ (رواه الترمذی، مشکوٰۃ/ص:۱۶۹)

ترجمہ: ”حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی (اللہ تعالیٰ کا) حق ہے، پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ أَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَأْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَأْسِ ؕ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ (البقرة: ۱۷۷)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''صرف یہی نیکی نہیں کہ تم اپنے چہروں کو مشرق و مغرب کی طرف پھیر لو، بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ بندے اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں، اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیں، اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور جب کوئی عہد کرلیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں، اور تنگی و تکلیف میں نیز جنگ کے وقت صبر و استقلال کے خوگر ہوں، ایسے ہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔''

صدقہ کی حقیقت:

اللہ رب العزت کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے بنیادی طور پر دو طریقے ہیں: نیک اعمال اور انفاقِ مالِ (حلال)۔ رضاءِ الٰہی کے حصول کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ نیک اعمال کا اہتمام کیا جائے، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا حلال مال اس کی رضا کے لیے بلا کسی معاوضہ کے اس کی راہ میں خرچ کیا جائے، جسے صدقہ کہتے ہیں، یہ ایک عام لفظ ہے، جس کا اطلاق زکوٰۃ اور صدقۂ واجبہ کے علاوہ صدقۂ نافلہ پر بھی ہوتا ہے، زکوٰۃ اور حقوق و واجبات کے علاوہ جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے وہ سب کا سب صدقۂ نافلہ ہے، اور مذکورہ حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ اور حقوق و واجبات کو ادا کرنا تو ضروری ہے، لیکن نفلی صدقات مستحب ہیں۔

صدقہ کی ترغیب:

قرآن و حدیث میں جا بجا اس کی ترغیب دی گئی ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ﴾ (البقرۃ:۱۹۵)

''اور اللہ کے راستے میں مال خرچ کرو۔''

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ○﴾ (آل عمران: ۹۲)

''تم نیکی کے مقام پر اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچو گے جب تک اُن چیزوں میں سے (اللہ تعالیٰ کے لیے) خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں، اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔''

مولانا جلال الدین رومیؒ نے اس کی ترجمانی اس طرح فرمائی ہے: ؎

ہر چہ خواہی صرف کن در راہِ اُو   لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا

نیز ایک مقام پر ارشاد ہوا:

﴿ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡہِ وَ لَا خُلَّۃٌ وَّ لَا شَفَاعَۃٌ﴾ (البقرۃ:۲۵۴)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے وہ دن آنے سے پہلے پہلے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرلو جس دن نہ کوئی سودا ہوگا، نہ کوئی دوستی (کام آئے گی) اور نہ کوئی سفارش ہو سکے گی۔''

مطلب یہ ہے کہ قیامت اور موت کے آنے سے پہلے جس قدر آسانی سے خرچ کر سکو کرلو۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ وَ اَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ○﴾ (المنافقون: ۱۰)

ترجمہ: ''جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تمہیں موت آجائے، پھر تم بطورِ افسوس کہو کہ میرے رب! اگر تھوڑی مہلت مل جائے تو میں صدقہ کرتا اور صلحاء میں سے ہوجاتا۔''

معلوم ہوا کہ اگر زندگی میں صدقات وخیرات کا اہتمام نہ کیا تو موت کے وقت اور اس کے بعد شرمندگی کا سامنا ہوسکتا ہے، اور اگر زندگی میں اس کا اہتمام کیا تو اس کی برکات ظاہر ہوں گی، یہی وجہ ہے کہ احادیث طیبہ میں بھی صدقات کی خوب ترغیب آئی ہے، چنانچہ ایک موقع پر ہمارے آقا ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "بَادِرُوْا بِالصَّدَقَةِ، فَإِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا." (رواه رزين، مشكوٰة/ص:١٦٧)

ترجمہ: ''لوگو! اللہ کے لیے مال وصدقہ دینے میں جلدی کرو، (یعنی فقر سے پہلے صدقہ کرلو، مرض سے پہلے صدقہ کرلو اور موت سے پہلے صدقہ کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں فقر، مرض اور موت کی وجہ سے صدقہ نہ کرسکو اور تم صدقہ کے فضائل سے محروم ہوجاؤ، آج موقع ہے تو فوراً صدقہ کا اہتمام کرلو) اس لیے کہ مصیبت صدقہ سے متجاوز نہیں ہوتی۔''

اس سلسلہ میں کئی واقعات اور مشاہدات ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے اور بھی بہت سی خیرات وبرکات حاصل ہوں گی۔

صدقہ کی برکات:

قرآن وحدیث میں صدقہ کی صرف ترغیب ہی نہیں دی گئی، بلکہ اس کے ساتھ اس کی برکات بھی بیان کی گئی ہیں، مثلاً ایک جگہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (البقرة: ٢٦٧-٢٦٨)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو پیداوار ہم نے تمہارے

لیے زمین سے نکالی ہے اس کی اچھی اور پاکیزہ چیزوں کا ایک حصہ (اللہ کے راستہ میں) خرچ کیا کرو اور یہ نیت نہ رکھو کہ بس ایسی خراب قسم کی چیزیں (اللہ کے نام پر) دیا کرو گے جس کو (اگر دوسرا تمہیں دے تو نفرت کے مارے) تم آنکھ میچے بغیر نہ لے سکو، اور یاد رکھو کہ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ ہر قسم کی تعریف اسی کی طرف لوٹتی ہے، شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا، ہر بات جاننے والا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں صدقہ کی ترغیب دے کر اس کی دو عظیم الشان برکات بیان فرمائی گئیں کہ صدقہ کی برکت سے ایک تو تم (آخرت میں) مغفرت اور دوسرے فضل کے مستحق بن جاؤ گے، معلوم ہوا کہ صدقہ کی برکات دنیا وآخرت دونوں میں نصیب ہوتی ہیں، دنیوی برکت ایک تو یہ ہے کہ اس سے بلائیں ٹل جاتی ہیں اور مشکلات آسان ہوجاتی ہیں، جیسا کہ ابھی روایت گزری کہ "فَإِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا" اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

حدیث پاک میں ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک شخص جنگل میں تھا، جہاں اس نے بادلوں سے ایک آواز سنی کہ ''فلاں شخص کے باغ کو پانی دو'' اس آواز کے بعد بادل ایک طرف چلا اور پتھریلی زمین پر جاکر خوب برسا، پانی ایک نالی میں جمع ہوکر بہنے لگا اور بہتے بہتے ایک شخص کے باغ میں جا پہنچا، جہاں وہ پانی کے انتظار ہی میں کھڑا تھا، اس شخص کو بڑا تعجب ہوا، اس نے باغ والے سے نام پوچھا، تو اس نے وہی نام بتلایا جو اس نے بادل سے سنا تھا، پھر اس نے باغ والے کو سارا قصہ سنا کر حقیقت حال دریافت کی، تو اس نے عرض کیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ جو چیز مجھے اپنے باغ سے حاصل ہوتی ہے میں اس کے تین حصے کرتا ہوں، ایک حصہ صدقہ کرتا ہوں، دوسرا حصہ گھر والوں پر خرچ کرتا ہوں اور تیسرا باغ پر۔ (مسلم شریف، مشکوٰۃ:۱۶۵)

دوسری برکت یہ ہے کہ صدقہ دینے سے مال میں اضافہ اور برکت ہوتی ہے، غالباً

اسی حقیقت کو بتلانے کے لیے قرآن نے ایک جگہ صدقہ کو قرض سے تعبیر فرما کر اس کی ترغیب دی، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (البقرة : ٢٤٥)

ترجمہ: کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسن دے؟''۔ یہاں صدقہ کو قرض سے اسی لیے تعبیر کیا کہ جس طرح قرض ادا کیا جاتا ہے اسی طرح صدقہ کا اجر بھی ضرور دیا جاتا ہے، چنانچہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَ مَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَ مَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ."

(رواه مسلم، مشكوٰة : ١٦٧)

ترجمہ: ''صدقہ مال کو کم نہیں کرتا، بلکہ مال میں اضافہ اور برکت کا سبب ہوتا ہے، اور قصور معاف کر دینے سے آدمی نیچا نہیں ہوتا، بلکہ اللہ اس کو عزت عطا فرماتے ہیں، اور جو اللہ کی رضا کے لیے تواضع و عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور سر بلندی عطا فرماتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ سے مال میں اضافہ اور برکت ہوتی ہے۔

ایک عجیب وغریب واقعہ:

اور کبھی تو اس برکت کا فوری طور پر ظہور ہو جاتا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب واقعہ منقول ہے، (اگر چہ اس کی صحت میں بعض علماء نے کلام بھی کیا ہے، تاہم اس سے قطع نظر کرتے ہوئے محض نصیحت کے طور پر نقل کیا جاتا ہے) سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک مرتبہ فاقہ ہو گیا، جب کوئی صورت نہ بن پائی تو آپ نے اپنے شوہر سیدنا علی کرّم اللہ وجہہٗ کو اپنی چادر دے کر فرمایا کہ اسے بیچ دو، تاکہ کچھ کھانے کا انتظام ہو سکے، حضرت علیؓ بادلِ ناخواستہ چادر لے کر بازار گئے اور چھ درہم میں اسے بیچ دیا، اس سے

214

کھانا خریدنا چاہتے تھے کہ ایک فقیر نے سوال کرتے ہوئے اپنے فقر و فاقہ کا اظہار کیا، تو آپؓ نے ایثار (جو سخاوت کا اعلیٰ درجہ ہے) سے کام لیتے ہوئے وہ چھ درہم اس سائل کو عطا فرما دیے اور خالی ہاتھ گھر واپس جانے لگے، راستہ میں ایک شخص ملے جن کے پاس ایک نہایت خوبصورت اونٹنی تھی، انہوں نے حضرت علیؓ سے عرض کیا: ''یہ بہت عمدہ اونٹنی ہے، آپ اسے خرید لیجیے'' آپ نے فرمایا: ''بھائی! میری جیب تو اس وقت خالی ہے، کیسے خریدوں؟'' اس نے کہا: ''کوئی بات نہیں، قیمت بعد میں دے دینا'' آپ نے اللہ تعالیٰ کی مدد سمجھ کر اسے سو درہم اُدھار میں خرید لیا اور گھر جانے لگے، ابھی ذرا آگے چلے تھے کہ ایک اور صاحب ملے، عرض کرنے لگے: ''اے علی! یہ بڑی اچھی اور عمدہ اونٹنی ہے، کیا آپ مجھے بیچنا چاہو گے؟'' آپؓ نے مناسب نفع کے ساتھ بیچنے کا ارادہ کیا اور بھاؤ تاؤ کے بعد ایک سو ساٹھ درہم میں سودا طے ہو گیا، اس شخص نے ایک سو ساٹھ درہم نقد دیے اور اونٹنی لے کر چلتا بنا، حضرت علیؓ نے بازار میں پہلے شخص کو تلاش کر کے سو درہم جو اُدھار تھے ادا کیے اور کچھ دراہم کا غلہ وغیرہ خریدا اور بقیہ حضرت فاطمہؓ کو لاکر دیے اور پورا واقعہ سنایا، بعد میں انہوں نے یہ عجیب وغریب واقعہ حضور ﷺ کو سنایا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے علی! یہ سودا مبارک ہو، اونٹنی بیچنے والے حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے اور خریدنے والے حضرت میکائیل علیہ السلام تھے، اور یہ اس چھ درہم صدقہ کی برکت تھی جو تم نے سائل کو دیے تھے۔'' (کتاب قلیوبی از: خطباتِ منوّر: ۳/ ۲۰۷)

صدقہ سے خاتمہ بالخیر نصیب ہوتا ہے:

صدقہ کرنے سے بلاؤں سے حفاظت ہوتی ہے، سہولت نصیب ہوتی ہے، مال میں برکت ہوتی ہے، اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اس کی برکت سے خاتمہ بالخیر نصیب ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ

غَضَبَ الرَّبِّ وَ تَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ." (رواه الترمذی، مشكوٰة: ١٦٨)

ترجمہ: ''صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب وغصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے، (جو سب سے بڑی بلا ہے) اور بری موت کو دور کرتا ہے، (جو سب سے بڑی مصیبت ہے)۔''

محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''جس طرح دنیا کی مادّی چیزوں حتیٰ کہ جڑی بوٹیوں تک کے خواص اور اثرات ہوتے ہیں، اسی طرح انسانوں کے اچھے برے اعمال و اخلاق کے بھی خواص و اثرات ہوتے ہیں، جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ہی معلوم ہوتے ہیں، اس حدیث پاک میں صدقہ کی دو خاصیتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ اگر بندے کی کسی بڑی لغزش اور معصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب اس کی طرف متوجہ ہو تو صدقہ اس غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے، اور اس کی وجہ سے بندہ بجائے اللہ کے غضب و ناراضگی کے اس کی رضا و رحمت کا مستحق بن جاتا ہے، اور دوسری خاصیت یہ ہے کہ وہ بری موت سے بندہ کو بچاتا ہے، یعنی صدقہ کی برکت سے بندے کو خاتمہ بالخیر نصیب ہوتا ہے۔'' (معارف الحدیث: ۴/۷۰)

صدقہ کی یہی سب سے بڑی برکت ہے کہ اس سے خاتمہ بالخیر نصیب ہوتا ہے، عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جس خوش نصیب کا خاتمہ صدقہ کی برکت سے خیر پر ہو جائے گا آخرت میں اسے مغفرت اور نجات، خیر کثیر اور اجر عظیم سے نوازا جائے گا، کیوں کہ صدقہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ بھی وعدہ ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا﴾ (البقرة: ٢٦٨)

صدقہ کرنے والو! میں تمہیں مغفرت اور فضل عظیم سے نوازوں گا۔ اب کتنا نوازا جائے گا؟ اسے احادیث میں مختلف جگہوں پر بیان فرمایا گیا ہے۔

صدقہ کا اجر وثواب:

ایک حدیث میں وارد ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ حضور!

صدقہ پر اللہ رب العزت آخرت میں کیا اجر وثواب عطا فرمائیں گے؟

عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ قَالَ: قَالَ أَبُوْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: "يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! أَ رَأَيْتَ الصَّدَقَةَ مَا ذَا هِيَ؟"

اس وقت آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قَالَ: "أَضْعَافٌ مُضَاعَفَةٌ، وَ عِنْدَ اللّٰهِ الْمَزِيْدُ." (رواه أحمد، مشكوٰة: ١٧٠)

''صدقہ کا اجر وثواب چند در چند ہے اور اللہ کے یہاں بہت ہے۔'' یعنی جتنا تم صدقہ کرو گے اس کا کئی گنا تمہیں اجر وثواب دیا جائے گا۔ (بشرطیکہ اخلاص و یقین کے ساتھ صدقہ کیا جائے)

قرآنِ کریم میں صدقہ کا اجر وثواب دس سے لے کر سات سو گنا تک بیان کیا گیا ہے، اور وہ بھی کوئی آخری حد نہیں ہے، کیوں کہ صاحبو! جب اس کا خزانہ لامتناہی ہے تو اس کا اجر وثواب بھی لامتناہی ہوگا، اسی کو قرآنِ پاک نے ایک مقام پر بیان فرمایا:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾
(البقرة: ٢٦١)

ترجمہ: ''جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیاں اُگائے (اور) ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں صدقہ کرنے سے سات سو گنا تک اجر وثواب ملتا ہے، اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے (اس کے اخلاص و یقین کے بقدر) اجر وثواب میں کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے، اللہ بہت وسعت والا (اور) علم والا ہے۔''

ایک حدیث میں تو صدقہ کی قلیل مقدار پر بھی عظیم اجر وثواب کا مرتب ہونا بیان کیا گیا ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: "مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ -وَ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ إِلَّا الطَّيِّبَ- فَإِنَّ اللّٰهَ يَتَقَبَّلُهَا بِيَمِيْنِهٖ، ثُمَّ يُرَبِّيْهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرَبِّیْ أَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ، حَتّٰى تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ." (متفق علیه، مشکوٰۃ: ۱۶۷)

ترجمہ: ''جو شخص بھی اپنی حلال کمائی سے (صورت یا قیمت کے لحاظ سے) کھجور کے برابر بھی صدقہ یا خیرات کرتا ہے (جس کی بظاہر کوئی خاص قیمت بھی نہیں ہوتی) - اور اللہ تعالیٰ حلال مال کے علاوہ قبول بھی نہیں کرتا - تو اللہ تعالیٰ اس کے اس معمولی صدقہ کو بھی اپنے دائیں ہاتھ سے (بڑی محبت) کے ساتھ قبول کرتا ہے، پھر اس صدقہ کو مصدِق (صدقہ دینے والے) کے لیے پالتا ہے، جیسے تم میں سے کوئی شخص بچھیرے کو پالتا ہے (معلوم ہوا کہ بچھیرا بھی پالنے کی چیز ہے) یہاں تک کہ اس کا ثواب (یا خود صدقہ) پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔''

اندازہ لگائیے کہ قلیل صدقہ کا اجر وثواب بھی کتنا عظیم الشان ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ ہر شخص اپنی وسعت کے مطابق نفلی صدقہ کا ضرور بالضرور اہتمام والتزام کرے، کیوں کہ صدقہ جنت کا دروازہ ہے، صدقہ گناہوں کا کفارہ اور مغفرت کا ذریعہ ہے، نفس کی پاکی اور حسن خاتمہ کا سبب ہے، صدقہ دوا بھی ہے اور شفا بھی، اور میت کے لیے بہترین ہدیہ بھی صدقہ ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں انفاق فی سبیل اللہ کی توفیق عطا فرما کر ہمارے اعمال واموال اور اہل وعیال کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

یومِ عاشوراء/ ۱۴۳۷ھ

مطابق: ۲۴/ اکتوبر/ ۲۰۱۵ء (بروز: سنیچر، بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۳۴)

سخاوت کی اہمیت وفضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِیْ أُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَا ابْنَ اٰدَمَ! أَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَيْرٌ لَكَ، وَ أَنْ تُمْسِكَهٗ شَرٌّ لَكَ، وَ لَا تُلَامُ عَلٰى كَفَافٍ، وَ ابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ." (رواه مسلم، مشکوٰۃ/ص: ۱٦٤/ باب الإنفاق و كراهية الإمساك)

ترجمہ: ''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابن آدم! تیرا ضرورت سے زائد مال (کارِ خیر میں) خرچ کر دینا تیرے لیے (دنیا وآخرت کے اعتبار سے) بہتر ہے، (کیوں کہ اس سے حاجتمندوں اور غریبوں کی ضرورت پوری ہوگی، جس سے ان کے دلوں میں تیری عظمت ومحبت پیدا ہوگی، اور آخرت میں تجھے اس پر اجرِ عظیم سے نوازا جائے گا۔) اور تیرا اسے روک لینا (دنیا وآخرت ہر اعتبار سے) برا ہے، (کیوں کہ وہ مال نہ تو دنیا میں دوسروں کے کام آ رہا ہے، اور نہ آخرت میں تجھے اس کا کوئی اجر ملنے والا ہے) اور بقدرِ کفایت (وضرورت مال جمع کرنے) پر تجھے کوئی ملامت نہیں کی جائے گی، اور اس مال کو خرچ کرنا ان لوگوں سے شروع کر جو تیرے عیال میں ہوں۔ (جن کا نفقہ تجھ پر لازم ہے)'' (حدیث قدسی نمبر: ۷)

سخاوت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت:

اللہ رب العزت کی صفاتِ حسنہ میں ایک خاص صفت ہے ''جود وسخا''، اللہ تعالیٰ جوّاد بھی ہے اور سخی بھی، جوّاد وہ ہے جو بغیر مانگے بھی بہت کچھ عطا کر دے، اور سخی اسے کہتے ہیں جو کسی بھی مانگنے والے کو کبھی بھی اپنی عطا و بخشش سے محروم نہ کرے، واقعہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم سبھی کو بلا کسی فرق و امتیاز کے بغیر مانگے زندگی، صحت، نعمت اور نہ جانے کیا کچھ عطا فرمایا ہے، اور مانگنے پر ہمیں محروم بھی کبھی نہیں کیا، اتنی بات ضرور ہے کہ وہ کبھی مانگنے والے کو وہ نہیں دیتا جو وہ مانگتا ہے، لیکن وہ خود ایسی چیز عطا کرتا ہے جو اس بندہ کے حق میں بہتر ہوتی ہے، چوں کہ سخاوت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، اور یہ بات کسی بھی سخی کے شایانِ شان نہیں کہ وہ مانگنے والے کو محروم رکھے، اور ہمارا خالق و مالک تو تمام سخیوں کا سخی ہے، وہ کیوں کسی کو محروم رکھے گا؟ اس لیے وہ سخی اپنے بندوں سے بھی یہی چاہتا ہے کہ میرے بندے بھی میری اس صفت سے اپنے آپ کو متصف کریں اور سخی بنیں۔

سخاوت کی حقیقت:

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جن اخلاقی نیکیوں پر زور دیا اور اپنے بندوں کو اُن کی ترغیب دی ان میں سے ایک سخاوت ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے جس کسی بندے کو جو دولت (روحانی وجسمانی) قوت اور (دینی و دنیوی) نعمت عطا فرمائی ہے اس سے صرف بندہ خود ہی فائدہ اور نفع نہ اٹھائے؛ بلکہ اپنوں اور دوسروں کو بھی اس سے فائدہ اور نفع پہنچائے۔ سخاوت کی اس حقیقت سے معلوم ہوا کہ اس میں کافی وسعت ہے، اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی اپنے مال ودولت اور علم و قابلیت سے دینی، دنیوی اور اُخروی اعتبار سے خدمت ونصرت کی جتنی بھی شکلیں ہیں درحقیقت وہ سب سخاوت ہی کی مختلف شاخیں ہیں، غالبًا اسی لیے ایک حدیث پاک میں

سخاوت کو جنتی درخت سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح درخت کی مختلف ٹہنیاں ہوتی ہیں اسی طرح سخاوت کی بھی مختلف شاخیں ہیں، البتہ ان میں اپنے مال کو بکثرت کارِ خیر میں خرچ کرنا مقدم اور مستحب ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ایک مقام پر فرمایا:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ﴾ (البقرة: ۱۷۷)

ترجمہ: ''نیکی بس یہی تو نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق ومغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دِن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں پر اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں، اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیں، اور غلاموں (اور قیدیوں) کو آزاد کرانے میں خرچ کریں۔''

اس آیت کریمہ میں انفاق فی سبیل اللہ (جو جذبۂ سخاوت کے بغیر ممکن نہیں) کو ایمان کے بعد بنیادی نیکی قرار دیا گیا، اور مختلف عنوانات سے اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

سخاوت نیک بندوں کی علامت اور اہل ایمان کی پہچان ہے:

اللہ تعالیٰ نے سخاوت کو اپنے مخصوص بندوں کی علامت اور اہل ایمان کی پہچان قرار دیا ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں سورۂ بقرہ (جو قرآنِ کریم کا گویا تمہیدی حصہ ہے، اس) کے پہلے ہی رکوع میں قرآنی ہدایت سے فائدہ اٹھا کر فلاح یاب ہونے والے اپنے مخصوص اور نیک بندوں کے جو اوصاف بیان فرمائے گئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

﴿ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ (البقرة: ٤)

ترجمہ: ''اور ہم نے جو کچھ (مال ودولت اور علم و قابلیت) انہیں عطا کیا ہے اس

میں سے وہ (ہماری رضا کے خاطر ہمارے بندوں پر بھی) خرچ کرتے ہیں۔“

ایک اور مقام پر متقیوں اور جنتیوں کی علامات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ﴾ (آل عمران: ۱۳۴)

ترجمہ: ”وہ خوشحالی میں بھی اور بدحالی میں بھی (اللہ تعالیٰ کے لیے) مال خرچ کرتے ہیں۔“

معلوم ہوا کہ سخاوت نیک لوگوں کی علامت اور اہل ایمان کی پہچان ہے، حدیث پاک سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک سچا اور پکا مومن سخی ہوتا ہے، (انتہائی درجہ کا) بخیل نہیں ہوتا، چنانچہ وارد ہے:

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ” خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ : اَلْبُخْلُ وَ سُوْءُ الْخُلُقِ.“ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص:۱٦٥)

ترجمہ: ”ایک سچے اور پکے مومن میں دو باتیں (بطورِ عادت و خصلت) جمع نہیں ہوسکتیں: ایک کنجوسی اور دوسری بد اخلاقی۔“

مطلب یہ ہے کہ جس دل میں ایمان کا چراغ روشن ہوتا ہے اس میں بخل اور بد اخلاقی نہیں ہوتی، اور جس بندے میں یہ دونوں باتیں ہیں اس میں یا تو ایمان کا نور نہیں یا اگر ہے تو بہت کم ہے۔

اس لیے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں: ؎

سخاوت کند نیک بخت اختیار — کہ مرد از سخاوت شود بختیار

”سخاوت وہ شخص اختیار کرتا ہے جو نیک بخت ہوتا ہے، کیوں کہ سخاوت آدمی کو نیک بناتی ہے۔“

سخاوت بود کارِ صاحب دلاں — سخاوت بود پیشۂ مقبلاں

”سخاوت نیک لوگوں کا طریقہ اور نیک بختوں کا شیوہ ہے۔“

بالخصوص جب ان پر فتوحات ہوتی ہیں تو ان کے جذبۂ سخاوت کا یہ حال ہوتا ہے کہ سخاوت کے زور سے مال اس طرح ختم ہو جاتا ہے جس طرح چھلنی میں پانی بھرتے ہی وہ ختم ہو جاتا ہے، بعض اوقات لاکھوں کی مقدار میں آتا ہے، لیکن وہ سب کا سب منٹوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ لوگ موجود کے ساتھ بخل کرنے کو معبود کے ساتھ بدگمانی کرنے کے برابر سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں سخاوت کے متعلق قابل رشک اور حیرت انگیز واقعات ملتے ہیں۔

سخیوں کے واقعات:

اس سلسلہ میں تمام رسولوں اور سخیوں کے سردار جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا حال یہ تھا کہ جب بھی کوئی سائل آکر آپ ﷺ سے کسی چیز کا سوال کرتا تو آپ ﷺ کبھی اسے محروم نہ فرماتے، ضرور کچھ نہ کچھ عطا فرما دیتے، اگر دینے کو کچھ نہ ہوتا تو وعدہ فرماتے، لیکن کبھی انکار نہ فرماتے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: ” مَا سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ شَیْئًا قَطُّ، فَقَالَ : ”لَا“. (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص:۵۱۹)

ترجمہ: ”آپ ﷺ نے سائل کو نہ دینے کے لیے کبھی ”لا“ یعنی ”نہیں ہے“ کا لفظ استعمال نہیں فرمایا۔“

فارسی زبان کے ایک شاعر نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

نہ رفت کلمۂ ”لا“ بزبانِ او ہرگز — مگر بہ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

” إِنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ ﷺ غَنَمًا بَیْنَ جَبَلَیْنِ، فَأَعْطَاهُ إِیَّاهُ.“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص:۵۱۹)

ترجمہ: ''ایک شخص نے خدمت اقدس میں حاضر ہوکر دو پہاڑوں کے درمیان کی جگہ بھر کر بکریاں مانگیں، تو آپ ﷺ نے اتنی کثیر مقدار میں بکریاں عنایت فرمادیں۔''

وہ شخص آپ ﷺ کی سخاوت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی قوم کے پاس جاکر کہنے لگا: ''اے میری قوم کے لوگو! مسلمان ہوجاؤ، اللہ کی قسم! محمد فقر وافلاس کا خوف کیے بغیر جود و سخا کا معاملہ کرتے ہیں۔''

یہی حال تھا آپ ﷺ کے اہل بیت کا، چنانچہ حضرت تمیم بن عروہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ (اپنے والد کی خالہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ انہوں نے ستر ہزار درہم تقسیم فرمادیے، حالاں کہ اس وقت ان کے جسم پر جو کرتہ تھا اس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ (فضائل صدقات: ۲/ ۲۴۰)

آپ ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق منقول ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے آپ کو پریشان کرنے کے لیے یہ حرکت کی کہ تمام قریشی سرداروں کے پاس جاکر یہ کہہ دیا کہ کل صبح ابن عباس کے یہاں آپ کو کھانے کی دعوت ہے، جس کی وجہ سے لوگ وقت پر کافی تعداد میں جمع ہوگئے، حضرت اس بات سے بالکل ہی بے خبر تھے، اس بارے میں آپ کو کچھ معلوم نہ تھا، دریافت کرنے پر کسی نے حقیقت حال سے واقف کیا، تو فوراً انتظامات شروع کردیے، ایک طرف خادموں کو بازار بھیج کر نوع بہ نوع کے پھل اور شہد وغیرہ منگوا کر اس میں مشغول کیا اور دوسری طرف باورچیوں کو کھانا تیار کرنے کا حکم فرمایا، اور کچھ ہی دیر میں ابھی تو لوگ پھل وغیرہ سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ کھانا تیار ہوکر آگیا اور لوگوں نے خوب شکم سیر ہوکر کھایا، اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے اپنے خزانچی سے پوچھا کہ ''کیا اتنی گنجائش ہے کہ ہم روزانہ اس دعوتی سلسلہ کو جاری رکھ سکیں؟'' انہوں نے عرض کیا: ''جی ہاں، اتنی گنجائش ہے''، تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے مجمع سے فرمایا کہ ''اب سے روزانہ صبح کو ہمارے یہاں دعوت ہے، لہٰذا روزانہ آجایا کریں۔''

(فضائل صدقات: ۲/ ۲۴۰)

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ جب سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مدینہ منورہ میں سخت قحط پڑا، اور اسی دوران حضرت عثمانؓ کا ایک تجارتی قافلہ ملک شام سے آرہا تھا، جس میں ایک ہزار اونٹوں پر اناج وغیرہ تھا، مدینہ کے تاجر اسے خریدنے کے لیے پانچ گنا تک قیمت لگانے لگے، تو آپؓ نے فرمایا کہ مجھے تو اس سے بھی زیادہ قیمت مل رہی ہے، یہ سن کر تجارِ مدینہ کو بڑا تعجب ہوا، کہنے لگے کہ کون آپ کو اس قدر قیمت دے رہا ہے؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بھی زیادہ قیمت دینے کا وعدہ کررہا ہے'' یہ فرماکر آپؓ نے سب لوگوں کو گواہ بناکر اُس قافلہ میں اونٹوں پر جتنا سامان تھا سارا اہل مدینہ پر خرچ فرمادیا۔ (قصص العرب: ۱/ ۸۹، از: حکیمانہ اقوال، نصائح اور واقعات: ۱۳۳)

حضرت قیس بن سعد خزرجی رضی اللہ عنہما ایک صحابی ہیں، ایک مرتبہ جب آپ بیمار ہوئے تو دوست واحباب اور اقرباء عیادت کے لیے نہ آئے، آپؓ کو بہت ہی تعجب ہوا، گھر والوں سے وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ حضرت! تمام دوست واحباب اور اعزہ و اقارب آپ کے مقروض ہیں، اس لیے آپ کے سامنے آتے ہوئے شرماتے ہیں، یہ سن کر آپؓ نے فرمایا کہ ''یہ مال بھی عجیب چیز ہے، جو دوستوں اور عزیزوں کی ملاقات بھی چھڑا دیتا ہے، پھر آپؓ نے خادم کو بلاکر تمام کے پاس یہ اطلاع بھیج دی کہ جس کسی کے ذمہ میرا قرض ہے میں نے اس کو معاف کردیا۔ (فضائل صدقات: ۲/ ۲۴۸)

ایک اور صحابی حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ انہوں نے حضرت خالد عقبی اموی کا مکان نوّے ہزار درہم میں خریدا، بعد میں جب حضرت خالد کے گھر والوں کو معلوم ہوا تو ان کو بہت رنج ہوا (کہ ہماری مجبوری کی وجہ سے ہمیں اپنا گھر تک بیچنا پڑا) حضرت عبداللہ بن عامرؓ کو جب اس کا پتہ چلا تو فوراً اپنے غلام کو ان کی خدمت میں بھیجا اور فرمایا: ''یہ مکان اور اس کی تمام قیمت تمہیں ہدیہ ہے۔''

(فضائل صدقات: ۲/ ۲۴۶)

حضرت یحییٰ برمکیؒ کے متعلق منقول ہے کہ آپؒ حضرت سفیان ثوریؒ پر ہر ماہ ایک ہزار درہم خرچ کرتے تھے، تو حضرت سفیان ثوریؒ (تہجد کے) سجدوں میں ان کے لیے یہ دعا کرتے تھے کہ یا اللہ! یحییٰ نے اپنی سخاوت سے میری دنیا کی کفالت فرمائی، تو اپنی عنایت سے اس کی آخرت کی کفالت فرمادے۔ کہتے ہیں کہ جب یحییٰ برمکیؒ کا انتقال ہوگیا تو کسی نے خواب میں ان سے حال معلوم کیا، تو عرض کیا کہ میری سخاوت کی بدولت حضرت سفیان ثوریؒ جو میرے حق میں دعا فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس سے میری مغفرت فرمادی۔

(مستفاد از: فضائل اعمال:۲/۵۷۷/ فضائل رمضان)

حقیقت یہ ہے کہ یہ تو بطورِ نمونہ چند ہی واقعات بیان کیے ہیں، ورنہ سخیوں کی سخاوت کے بے شمار واقعات منقول ہیں۔

سخاوت سے برکت:

صاحبو! سخاوت کی یہ جو عظیم الشان مثالیں ان سخیوں کی زندگی میں ملتی ہیں یہ سب برکات ہیں سخیوں کے سردار جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم وہدایت کی، قرآن کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرات صحابہؓ نے رحمت عالم ﷺ سے دریافت کیا:

﴿ وَ یَسْئَلُوْنَکَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (البقرۃ : ۲۱۹)

ترجمہ: ”حضور! اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہم کیا خرچ کریں؟ تو آپ ﷺ نے بحکم الٰہی جواب میں ارشاد فرمایا: ”جو کچھ زائد از ضرورت ہو اسے خرچ کرو۔“

حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا:

” یَا ابْنَ آدَمَ ! أَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَیْرٌ لَّکَ“.

”اپنے اور اہل وعیال کے ضروری نفقہ وخرچ کے علاوہ جو مال زائد ہو اس کو جمع کر کے رکھنے کے بجائے خرچ کر دینا یہ دنیوی اور اُخروی اعتبار سے بہتر ہے۔“

اُخروی اعتبار سے تو اجر وثواب کا ذریعہ ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَo﴾ (البقرۃ : ۲۷۴)

ترجمہ: ”جو لوگ اپنے اموال دِن رات خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر وثواب ہے اور انہیں نہ کوئی خوف لاحق ہوگا نہ کوئی غم پہنچے گا۔“

اور دنیوی اعتبار سے خیر وبرکت کا ذریعہ ہے، کیوں کہ حدیث پاک میں وارد ہے کہ سخاوت کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے فرشتے روزانہ برکت کی دعائیں کرتے ہیں:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَا مِنْ یَوْمٍ یُصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْهِ إِلَّا مَلَکَانِ یَنْزِلَانِ، فَیَقُوْلُ أَحَدُهُمَا:" اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا"، وَ یَقُوْلُ الآخَرُ:" اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِکًا تَلَفًا." (متفق علیه، مشکوٰۃ: ۱۶٤)

ترجمہ: ”حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ روزانہ صبح میں دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، جن میں سے ایک سخی کے لیے دعا اور دوسرا بخیل کے لیے بددعا کرتا ہے، پہلا فرشتہ کہتا ہے: ”اے اللہ! جو شخص اپنا مال اہل وعیال، صدقہ وخیرات اور مکارمِ اخلاق وطاعات میں تیری رضا کے لیے خرچ کرتا ہے اس کے مال میں برکت عطا فرما، اور جو بخل سے کام لیتا ہے دوسرا فرشتہ اس کے لیے بے برکتی کی دعا کرتا ہے۔“

دانائے رومؒ نے اس کی ترجمانی اس طرح فرمائی ہے:

گفت پیغمبر کہ در بازارہا   دو فرشتہ می کنند ایں در دعا
اے خدا! تو منفقاں را دہ خلف   اے خدا! تو ممسکاں را دہ تلف

اسی کا ثمرہ ہے کہ سخیوں کے مال میں خوب برکت ہوتی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ عام لوگوں کو تو ان کے گمان کے مطابق محنت سے مال ملتا ہے، جب کہ سخیوں کو ان کی سخاوت کی برکت سے مال ملتا ہے۔ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿ وَ مَا تُنفِقُوا مِنْ خَيرٍ يُّوَفَّ إِلَيكُمْ وَ أَنتُمْ لاَ تُظْلَمُونَ۝﴾ (البقرة : ۲۷۲)

ترجمہ: ”اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تمہیں پورا پورا اس کا بدلہ دیا جائے گا، اور تم پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

حدیث میں ہے کہ تین چیزیں بالکل سچی پکی ہیں: (۱) جس شخص پر ظلم ہوا ہو اور وہ بدلہ لینے کی طاقت حاصل ہونے کے باوجود رضاءِ الٰہی کی خاطر معاف کردے تو اللہ تعالیٰ اُسے عزت ورفعت سے نوازتے ہیں۔ (۲) جس نے سخاوت کا دروازہ کھولا اور اس کا مقصود صلہ رحمی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مال میں برکت عطا فرماتے ہیں۔ (۳) جس شخص نے مال بڑھانے کی خاطر مانگنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے فقر میں اِضافہ فرماتے ہیں۔
(مسند احمد، مشکوٰۃ:۴۳۳۳)

سخاوت کی فضیلت:

سخاوت کے زبردست فضائل میں سے یہ ہے کہ اس سے مال میں برکت نصیب ہوتی ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا، علاوہ ازیں سخاوت سے عنداللہ مقبولیت اور عندالناس محبوبیت ملتی ہے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”السَّخِيُّ قَرِيْبٌ مِنَ اللّٰهِ، قَرِيْبٌ مِنَ الْجَنَّةِ، قَرِيْبٌ مِنَ النَّاسِ، بَعِيْدٌ مِنَ النَّارِ، وَ الْبَخِيْلُ بَعِيْدٌ مِنَ اللّٰهِ، بَعِيْدٌ مِنَ الْجَنَّةِ، بَعِيْدٌ مِنَ النَّاسِ، قَرِيْبٌ مِنَ النَّارِ، وَ لَجَاهِلٌ سَخِيٌّ أَحَبُّ إِلٰى اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِيْلٍ.“ (رواه الترمذي، مشكوٰة: ١٦٤١)

ترجمہ: ”سخی اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی جنت اور لوگوں سے قریب اور دوزخ سے دور ہوتا ہے، جب کہ بخیل اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی جنت اور لوگوں سے دور اور دوزخ سے قریب ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو عبادت گزار بخیل کے مقابلہ میں جاہل سخی پسند ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ سخاوت کے بغیر انسان کی کوئی خاص عظمت وفضیلت نہیں۔

حکماء نے بڑی جامع بات کہی ہے کہ ”بے لطف ہے سیر بوستاں بلا دوستاں، بے لطف ہے زندگانی بے جوانی، بے لطف ہے شربت بے گلاب، زین بے رکاب، ریش بے خضاب، اور بے لطف ہے کلامِ بے حکمت، مردِ بے جرأت، زنِ بے عصمت اور دلِ بے سخاوت۔“

ایک بزرگ فرماتے تھے کہ ساری زندگی میں نے تین لوگوں کو تلاش کیا؛ مگر نہیں پایا، (۱) وہ ظالم جو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچ گیا ہو۔ (الا یہ کہ اس نے توبہ کرلی ہو) (۲) وہ سائل جو لوگوں سے مانگ مانگ کر غنی بن گیا ہو۔ (۳) وہ سخی جو اپنی سخاوت کی وجہ سے غریب بن گیا ہو۔

بقولِ شاعر:

کروسونے کے سو ٹکڑے تو قیمت کم نہیں ہوتی — بزرگوں کی دعا لینے سے عزت کم نہیں ہوتی
ضرورت مند کو دہلیز سے خالی نہ لوٹاؤ — خدا کے نام پر دینے سے دولت کم نہیں ہوتی

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں دو ہاتھ اس لیے دیے ہیں کہ ایک ہاتھ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف جو ہمارا خالق ہے لینے کے لیے بڑھائیں اور دوسرا ہاتھ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی طرف دینے کے لیے بڑھائیں، دعا وعاجزی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے لینا اور محبت و سخاوت کے ذریعہ اس کی مخلوق کو دینا چاہیے۔

حق تعالیٰ ہمیں اپنے کرم سے سخاوت کی صفت سے متصف فرما کر اپنے دربار میں مقبولیت اور لوگوں میں محبوبیت عطا فرمائے۔ آمین۔

۹/محرم الحرام/۱۴۳۶ھ، قبل الجمعہ
مطابق: ۲۳/اکتوبر/۲۰۱۵ء
(بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۳۵)

اسلام میں غربت اور گداگری کا علاج

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: – وَهُوَ عَلَى الۡمِنۡبَرِ، وَ هُوَ يَذۡكُرُ الصَّدَقَةَ وَ التَّعَفُّفَ عَنِ الۡمَسۡأَلَةِ– "اَلۡيَدُ الۡعُلۡيَا خَيۡرٌ مِّنَ الۡيَدِ السُّفۡلٰى، وَ الۡيَدُ الۡعُلۡيَا هِيَ الۡمُنۡفِقَةُ، وَ السُّفۡلٰى هِيَ السَّائِلَةُ."

(متفق علیه، مشکوٰۃ : ۱۶۲ / باب من لا تحلّ له المسألة و من تحلّ له)

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے اس موقع پر جب کہ آپ منبر پر تشریف فرما تھے اور صدقہ کرنے کی ترغیب اور سوال سے بچنے کی تاکید فرما رہے تھے یہ ارشاد فرمایا کہ ''اوپر کا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، اوپر کا ہاتھ خرچ کرنے والا اور لوگوں کو دینے والا ہاتھ ہے، جب کہ نیچے والا ہاتھ مانگنے والا ہاتھ ہے۔''

مسلمان لینے کے بجائے دینے والے بنیں:

اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ نے قرآن وحدیث میں اکثر وبیشتر مقامات پر اپنے ماننے والوں کو زکوٰۃ، خیرات، صدقات اور سخاوت کے عنوان سے مال خرچ کرنے کی

تاکید اور ترغیب فرمائی ہے، اس کے برخلاف بہت ہی کم مقامات پر زکوٰۃ، خیرات، صدقات وغیرہ لینے کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کا منشا یہی ہے کہ مسلمان فکر معاد کے ساتھ حصولِ معاش اور اس کے جائز ذرائع و اسباب اختیار کر کے اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ وہ خود زکوٰۃ، خیرات، صدقات اور سخاوت زیادہ سے زیادہ کیا کریں، اور اس طرح وہ لینے کے بجائے دینے والے بنیں، یعنی دوسروں کے سہارے جینے کے بجائے دوسروں کے لیے سہارا بن کر جئیں۔ اسی لیے مذکورہ حدیث میں رحمت عالم ﷺ نے اپنے خطاب کے دوران دینے کی ترغیب اور (بلا کسی مجبوری کے) سوال سے بچنے کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "اَلۡيَدُ الۡعُلۡيَا خَيۡرٌ مِّنَ الۡيَدِ السُّفۡلٰى." کہ ''دینے والا ہاتھ بہتر ہے لینے والے ہاتھ سے۔'' اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ دیگر مواقع پر کسی سخت مجبوری کے بغیر مانگنے والے بے غیرت فقیروں کے لیے سخت وعیدیں بھی بیان فرمائیں۔

بے غیرت فقیروں کی مذمت:

چنانچہ ایک حدیث پاک میں ہے، حضرت قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک ایسے قرض کی ضمانت لی جو دیت کی وجہ سے عائد ہوا تھا، (یعنی کسی اور شخص کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری لے لی، اس کے بعد) میں نے رحمت عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر صورتِ حال بیان کر کے مال کا سوال کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انتظار کرو، جب زکوٰۃ کا مال آئے گا تو ہم تمہیں دینے کے لیے کہہ دیں گے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''يَا قَبِيۡصَةُ ! إِنَّ الۡمَسۡأَلَةَ لَا تَحِلُّ إِلَّا لِأَحَدِ ثَلَاثَةٍ.'' ''قبیصہ! صرف تین لوگوں کے لیے سوال کرنا جائز ہے۔'' (ان کے علاوہ کے لیے حرام ہے) ان میں ایک تو وہ شخص جو کسی کے قرض کا ضامن بن گیا ہو، (یا خود حد سے زیادہ قرض دار ہو گیا ہو اور ادائیگی کا کوئی راستہ نہ ہو، بے عزتی کا خطرہ وخدشہ ہو، تو یہ بھی سوال کر سکتا ہے، بشرطیکہ مانگنے میں مبالغہ نہ کرے، بلکہ اتنے ہی مال کا سوال کرے کہ جس سے قرض ادا ہو جائے، اس کے بعد پھر نہ

مانگے) دوسرے اس شخص کے لیے جو کسی آفت ومصیبت میں (العیاذ باللہ العظیم) مبتلا ہونے کی وجہ سے برباد اور ہلاک ہو جائے (یا کسی ناجائز مقدمہ میں پھنس گیا اور خود اس کے پاس انتظام نہیں ہے، تو اس کے لیے بھی اس قدر مانگنا جائز ہے جس سے اس کا مقدمہ ختم ہوا اور اس کی محتاجی دور ہو جائے اور اس کی زندگی کے لیے سہارا ہو جائے) اور تیسرے اس شخص کے لیے جس کو (فقیری اور غریبی نے بے بس کر دیا ہوا اور اس کی وجہ سے) ایسے فاقے ہونے لگیں کہ اس کی قوم کے تین صاحب عقل وفراست حضرات بھی گواہی دیں (یہ بات آپ ﷺ نے اس بات کا احساس پیدا کرانے کے لیے فرمائی کہ لوگ سوال کرنے اور گداگری کو آسان نہ سمجھیں اور حتی الامکان اس مجبوری کے فعل سے بچتے رہیں) تو اس کے لیے بھی بقدرِ ضرورت مانگنا جائز ہے۔

لیکن جن لوگوں کو شرعاً مانگنے کی اجازت ہے ان کے لیے بھی حکم یہ ہے کہ اس طرح زور اور دباؤ ڈال کر نہ مانگا جائے کہ دینے والا شرما شرمی میں دے یا دینے پر مجبور ہو جائے، یہی حکم چندہ کا اور سفارش وغیرہ کا بھی ہے۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ”فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ يَا قَبِيْصَةُ! سُحْتٌ يَأْكُلُهَا صَاحِبُهَا سُحْتًا.“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ:۱۶۲) ”اے قبیصہ! ان تین کے علاوہ کسی بھی اور کے لیے سوال کرنا حرام ہے، اگر کوئی شخص ان تین مجبوریوں کے بغیر گداگری کر کے اور دست سوال دراز کر کے کسی سے کچھ لے تو وہ حرام لقمہ ہے۔“ ایک اور حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا، فَلْيَسْتَقِلَّ، أَوْ لِيَسْتَكْثِرْ.“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۱۶۲)

ترجمہ: ”جو شخص (بلا کسی شرعی مجبوری کے محض) اپنے مال میں اضافہ کے خاطر لوگوں سے سوال کرتا ہے (تو وہ اپنی اس ہوس ناکی اور حرص وطمع کی وجہ سے گویا لوگوں سے)

وہ آگ کے انگارے مانگتا ہے، اب وہ چاہے تو کم مانگے یا زیادہ۔“

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”مَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ حَتّٰى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَيْسَ فِيْ وَجْهِهٖ مُزْعَةُ لَحْمٍ.“ (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۱۶۲)

ترجمہ: ”جو شخص (بلا کسی شرعی مجبوری کے) ہمیشہ لوگوں کے سامنے سوال کرتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں ہوگا کہ اس کے منہ پر گوشت کی بوٹی نہ ہوگی۔“

اس عیب دار چہرے کی وجہ سے قیامت کے دن وہ پہچانا جائے گا اور اسے لوگوں کے درمیان بڑی شرمندگی ہوگی، کیوں کہ گداگری اور سوال کرنا دنیا میں بھی اسلامی شریعت، حمیت اور غیرت کے خلاف ہے، نیز دارین میں ذلت اور رسوائی کا سبب ہے، اس لیے کتاب وسنت میں عام لوگوں کے لیے عام حالات میں اس کی ممانعت و مذمت بیان فرمائی گئی۔

غریب، باغیرت اور عفیف کی امداد کی اہمیت:

دوسری طرف وہ لوگ جو غریب اور محتاج ہونے کے باوجود عفت اور غیرت کی وجہ سے مزاجِ شریعت کے مطابق عمل کرتے ہوئے گداگری کر کے لوگوں سے سوال نہیں کرتے بلکہ بزبانِ حال گویا کہتے ہیں:

هَنِيئًا لِأَرْبَابِ النَّعِيْمِ نَعِيْمُهَا ۔۔۔ وَلِلْعَاشِقِ الْمِسْكِيْنِ مَا يَتَجَرَّعُ

ترجمہ: ”یہ قسم ہا قسم کی نعمتیں مالداروں ہی کو مبارک ہوں، مجھ عاشق مسکین کو تو حلق تر ہو سکے اتنی ہی غذا کافی ہے۔“ یعنی مجھے نہ تو ملوّن ومرغّن کھانوں کی ہوس ہے اور نہ ہی نرم ونازک بستر کی تمنا، بلکہ ”مل گئی تو روزی، نہ ملی تو روزہ“

قرآنِ کریم میں ان ہی جیسوں کے متعلق ارشاد فرمایا گیا:

﴿ لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ ۫ یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعۡرِفُہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ﴾ (البقرۃ:۲۷۳)

ترجمہ: ''(تمہاری مالی امداد کے بطورِ خاص) مستحق وہ فقراء (اور علماء) ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ (دینی امور اور دینی علوم میں) اس طرح مقید کر رکھا ہے کہ وہ (تلاشِ معاش کے لیے) زمین میں (تجارت وغیرہ کے لیے) سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، چوں کہ وہ اتنے پاک دامن ہیں کہ کسی سے (اپنی ضروریات کے لیے) سوال نہیں کرتے، اس لیے ناواقف آدمی انہیں مالدار سمجھتا ہے، تم ان کے چہرے کی علامتوں سے ان (کی اندرونی حالت) کو پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے بطریق الحاح (مبالغہ، اصرار اور لگ لپٹ کر) سوال نہیں کرتے، اور تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ جو لوگ غریب مگر عفیف ہیں وہ بھی اصل میں مسکین اور تقویت، نصرت وامداد کے مستحق ہیں، حدیث پاک میں اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ، تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَ اللُّقْمَتَانِ، وَ التَّمْرَةُ وَ التَّمْرَتَانِ، وَ لٰكِنَّ الْمِسْكِيْنَ الَّذِيْ لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ، وَ لَا يُفْطَنُ بِهٖ، فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ، وَ لَا يَقُوْمُ، فَيَسْأَلُ النَّاسَ." (مفق علیه، مشکوٰۃ: ۱۶۱)

''مسکین وہ شخص نہیں ہے جو لوگوں کے پاس ایک لقمے یا دو لقموں یا ایک کھجور یا دو کھجوروں کے لیے جاتا ہے، دراصل مسکین وہ ہے جس کے پاس اتنا مال نہیں ہے جو اس کو مستغنی کر دے اور (وہ غریب چوں کہ عفیف اور باغیرت ہے اس لیے لوگوں کو) اس کے بارے میں پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ مستحق ہے کہ نہیں، تاکہ اس پر صدقہ کیا جائے، اور خود بھی وہ لوگوں سے مانگنے کے لیے کھڑا نہیں ہوتا۔''

جب کہ حالت یہ ہے کہ نہ کہہ سکتا ہے نہ سہہ سکتا ہے، نہ رہ سکتا ہے، تو یہ اور اس قسم کے دینی امور اور دینی علوم میں مشغول رہنے والے صلحاء، علماء اور طلبہ بھی اصل میں تقویت، نصرت وامداد کے مستحق ہیں۔

غربت اور گداگری کا پہلا علاج تلاشِ معاش ہے:

صاحبو! شریعت اسلامیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے صرف بلاضرورت سوال کرنے کی مذمت اور ضرورت مندوں کی امداد کی فضیلت بتانے ہی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ غربت اور گداگری دور کرنے کا علاج اور ذرائع بھی بتائے، تاکہ آج کا لینے والا کل دینے والا بن سکے، آج جو دوسروں کے سہارے جیتا ہے کل وہ دوسروں کا سہارا بن کر جینے والا بن جائے، جو شخص بے کار ہے وہ روزگار والا بن جائے، چنانچہ اس سلسلہ میں پہلا ذریعہ وعلاج تلاشِ معاش اور اس کے مناسب جد وجہد کرنا ہے، اولاً تو اسلام نے گداگروں اور غریبوں کو یہ اطمینان دلایا کہ سب کا رب اور پالنہار اللہ ہی ہے، امیروں اور غریبوں سبھی کا رزق بھی اسی کے ذمہ ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا ﴾ (ھود: ۶)

ترجمہ: ''اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ نے اپنے ذمہ نہ لے رکھا ہو۔''

لہٰذا اے گداگرو اور غریبو! ایسا نہیں ہے کہ تمہارا رزق مالداروں کے پاس ہے؛ بلکہ تمہارا رزق اسی خالق ورازق کے پاس ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ تلاشِ معاش کے لیے کوشش بھی نہ کرو، بلکہ حصولِ معاش کے لیے فکر کرو، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ جَعَلۡنَا النَّہَارَ مَعَاشًا ﴾ (النبأ: ۱۱)

ترجمہ: ''اللہ نے دِن کو کسبِ معاش کے لیے بنایا۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ﴾ (الأعراف : ۱۰)

ترجمہ: ”رب العالمین نے زمین میں تمہارے لیے رزق کے ذرائع اور اسباب بھی پیدا کیے۔“ اس لیے:

﴿ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (الجمعة : ۱۰)

”زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزقِ حلال اور معاش کی فکر کرو۔“ جو کہ فرض ہے، اور یہ کسب معاش کا کام خود رسول اللہ ﷺ بھی اپنے زمانۂ شباب میں کر چکے ہیں، نیز احادیث طیبہ میں بھی متعدد واقعات مذکور ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے جب کسی کو مانگتے ہوئے دیکھا تو اسے تنبیہ فرمائی، پھر اگر اس کے پاس کچھ نہ تھا تو اس کی مدد کی اور اس طرح اسے معاش پر لگایا۔

ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک انصاری صحابی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سوال کرنے لگے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”أَمَا فِي بَيْتِكَ شَيْءٌ؟“ ”تمہارے گھر میں کچھ ہے؟“ انہوں نے صاف عرض کیا: ”حِلْسٌ نَلْبَسُ بَعْضَهُ وَ نَبْسُطُ بَعْضَهُ، وَ قَعْبٌ نَشْرَبُ فِيهِ الْمَاءَ.“ ایک کملی ہے جس کے ایک حصے کو اوڑھتے اور دوسرے کو بچھاتے ہیں، اور ایک پیالہ بھی ہے جو پینے وغیرہ کے کام آتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”ائْتِنِي بِهِمَا“ ”وہ دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ“، یہ صحابی جب وہ دونوں چیزیں حضور ﷺ کے پاس لے کر حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان دونوں چیزوں کو ہاتھ میں لے کر فرمایا: ”مَنْ يَشْتَرِي هٰذَيْنِ؟“ ”ان کو کون خریدتا ہے؟“ ایک صحابی نے ایک درہم میں خریدنے کی پیشکش کی، تو آپ ﷺ نے زیادتی کا مطالبہ فرمایا، ایک اور صحابی نے دو درہم کی تیاری ظاہر کی، تو آپ ﷺ نے قبول کر لیا اور دو درہم ان انصاری صحابی کو دے کر فرمایا: اس میں سے

ایک درہم کا کھانا خرید کر اپنے گھر والوں کو دو، اور دوسرے کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس آؤ، انہوں نے ایسا ہی کیا، آپ ﷺ نے اس کلہاڑی میں اپنے دست مبارک سے ایک مضبوط لکڑی لگا دی اور پھر ان سے فرمایا: ”اذْهَبْ فَاحْتَطِبْ، وَ بِعْ، وَ لَا أَرَيَنَّكَ خَمْسَةَ عَشَرَ يَوْمًا.“ اسے لے جاؤ، جنگل میں جا کر لکڑیاں کاٹ کر جمع کرو، اور بیچو، اب اس کے بعد میں تمہیں پندرہ دن تک یہاں نہ دیکھوں، جلدی جاؤ، تلاشِ معاش کی فکر کرو، بے کار نہ رہو، کچھ نہ کچھ کام کرو، محنت مزدوری کرو، انہوں نے اس پر عمل کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں برکت دی اور ان کا فقر دور فرما دیا، انہوں نے جب حضور ﷺ کو اس کی بعد میں اطلاع دی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ صورتِ حال تمہارے لیے ذلتِ سوال سے بہتر ہے: ”هٰذَا خَيْرٌ لَكَ مِنْ أَنْ تَجِيْءَ الْمَسْأَلَةُ نُكْتَةً فِي وَجْهِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.“

(أبو داود، مشكوٰة : ۱۶۳)

غربت اور گداگری کا سدِ باب کس طرح کیا جائے؟

ذکر کردہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گداگری کے سدِ باب کے لیے مُثبت و منفی دونوں طرح کے اقدامات کی ضرورت ہے، مثبت اقدام تو یہ ہے کہ ایسے لوگ جو کچھ کام کرنے کی صلاحت رکھتے ہیں انہیں کام پر لگانے کی فکر اور کوشش کی جائے، اس کے باوجود اگر وہ لوگ کام پر آمادہ نہ ہوں اور گداگری چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں تو ان کی گداگری کی حوصلہ شکنی کی جائے، بھیک نہ دی جائے، کیوں کہ حدیث میں ہے:

عَنْ حُبْشِيِّ بْنِ جُنَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ لِغَنِيٍّ، وَ لَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ، إِلَّا لِذِيْ فَقْرٍ مُدْقِعٍ، أَوْ غُرْمٍ مُفْظِعٍ، وَ مَنْ سَأَلَ النَّاسَ لِيُثْرِيَ بِهِ مَالَهُ، كَانَ خُمُوْشًا فِيْ وَجْهِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَ رَضْفًا يَأْكُلُهُ مِنْ جَهَنَّمَ، فَمَنْ شَاءَ فَلْيُقِلَّ، وَ مَنْ شَاءَ فَلْيُكْثِرْ.“ (رواه الترمذي، مشكوٰة : ۱۶۳)

ترجمہ: ”گداگری اور لوگوں سے سوال کرنا کسی غنی، مالدار، تندرست، توانا اور

صحیح الاعضاء کے لیے حلال نہیں ہے، ہاں، ایسا فقیر جسے انتہائی مجبوری ومعذوری نے زمین پر ڈال دیا ہو، اسی طرح ایسے مقروض کے لیے جو کسی بھاری قرض کے نیچے دبا ہو (تو بقدرِ حاجت سوال کرنا جائز ہے) اور جو شخص اس لیے سوال کرتا ہے کہ اپنے مال وزر میں اضافہ کرے، تو وہ قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کے منہ میں زخم ہوگا، نیز دوزخ میں اسے (بلا کسی مجبوری کے گداگری کرنے کی سزا کے طور پر) گرم پتھر کھلائے جائیں گے، اب جس کا جی چاہے کم سوال کرے اور جس کا جی چاہے زیادہ۔'' العیاذ باللہ العظیم۔

اسی لیے علماء نے فرمایا کہ جو لوگ مالی اور بدنی صلاحیت رکھتے ہوں ان کے لیے بھیک مانگنا جائز نہیں، حتیٰ کہ ان کے متعلق علامہ ابن نجیم مصریؒ ''الاشباہ والنظائر'' میں فرماتے ہیں کہ ''إنَّ السَّائِلَ وَ المُعْطِيَ آثِمَان''...... یعنی ایسے گداگر اور سائل تو گنہگار رہیں ہی، ان کو بھیک دینے والے بھی گنہگار ہیں، کیوں کہ انہیں بھیک دینے کا مطلب ان کو اس کا عادی بنانا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ آپ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ مغرب کے بعد کسی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا، تو آپ نے کسی سے فرمایا کہ اس سائل کو کھانا کھلادو، انہوں نے تعمیل کی اور فوراً کھانا کھلا دیا، کچھ دیر کے بعد حضرت عمرؓ نے پھر اس کی آواز سنی، تو ان صاحب سے دریافت کیا کہ میں نے تم سے اس کو کھلانے کو کہا تھا؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! میں نے تو کھلا دیا، اس پر حضرت عمرؓ نے سخت ناراض ہو کر سائل کی طرف دیکھا تو اس کی بغل میں ایک جھولی تھی، جس میں بہت سی روٹیاں تھیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تو سائل نہیں، تاجر ہے، بھیک کا کاروبار کرتا ہے، اس کے بعد اس کی جھولی چھین کر صدقہ کے اونٹوں کے سامنے اُلٹ دی اور اس کو بطورِ سزا دُرّے مار کر آئندہ بھیک سے بچنے کی تاکید فرمادی۔ (فضائل اعمال: ۲/۳۶۸)

حضرت عمرؓ کے اس طرزِ عمل میں ہمارے لیے یہ سبق ہے کہ ہم بھی حتی الامکان اپنی

قوم کے گداگروں کو سوال کی ذلت سے بچائیں اور ہمیں بھی ان کا یہ مزاج بنانا چاہیے کہ وہ اپنا گاڑھا پسینہ بہا کر کمائیں، اگر کم میسر ہو تو قناعت سے گزارا کریں اور سادگی کے ساتھ جینا سیکھیں، لیکن دستِ سوال ہرگز دراز نہ کریں۔

کمالِ تشنگی میں بھی جگر کا خون پی جانا پر کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہ کرنا

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ ہماری قوم کے غریب و گداگر ان نبوی ہدایات و تعلیمات پر دل وجان سے عمل پیرا ہو جائیں تو غریبی و گداگری کا علاج بہت ہی آسان ہے۔

غربت اور گداگری کا دوسرا علاج: اعانتِ اقرباء:

لیکن اگر خدانخواستہ ان گداگروں اور غریبوں میں کسبِ معاش کی قدرت ہی نہیں ہے، یا وہ قدرت تو رکھتے ہیں اور ان میں کمانے کی صلاحیت اور حوصلہ بھی ہے، قرآن کی زبان میں وہ ''قَوِيٌّ أَمِيْنٌ'' ہیں، لیکن دینی امور اور دینی علوم میں مشغولیت کی وجہ سے کسبِ معاش کا موقع نہیں ہے، یا روزگار ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے، مطلب یہ ہے کہ کسب معاش کی کوشش کے باوجود انہیں کامیابی نہیں ملتی، یا جتنا کماتے ہیں اس میں ان کی اور ان کے ماتحتوں کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، تو ان صورتوں میں اسلام ان گداگروں اور غریبوں کے رشتہ داروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے ان گداگر اور غریب اقرباء کے ساتھ حسن سلوک اور اعانت کا معاملہ کریں، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبىٰ وَ الْيَتٰمىٰ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبىٰ وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (النساء: ٣٦)

ترجمہ: ''اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، نیز رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریب و دور کے پڑوسیوں، ساتھ میں اٹھنے بیٹھنے والوں، مسافروں اور اپنے مملوک

غلاموں اور باندیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرو۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ جو بھی پریشان حال ہو تم اپنی استطاعت کے مطابق جہاں تک ہو سکے اس کی مدد کرو، بالخصوص اقرباء کی، کیا بعید ہے کہ تمہاری اعانت سے ان گداگروں اور غریبوں کی ضروریات پوری ہو جائیں، یہ بھی اسلام میں گداگری و غریبی کے ختم کرنے کا ایک علاج ہے۔

غربت اور گداگری کا تیسرا علاج: قیامِ بیت المال:

خدانخواستہ اگر کوئی غریب و گداگر ایسا ہے کہ اس کا کوئی رشتہ دار ہے ہی نہیں، یا اگر ہیں تو وہ بھی اس کی طرح محتاج ہیں، یا وہ اقرباء جذبۂ ترحم و اعانت سے محروم ہیں، تو ایسے نازک موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس طرح کے گداگروں اور غریبوں کی اِمداد کا کیا طریقہ ہے؟ کس طرح ایک عاجز، مجبور، بے کس و بے بس کی مجبوری و غریبی کا علاج کیا جائے؟ کیا یہ مناسب ہے کہ انہیں مجبوری و بے بسی کے شکنجے میں سسکنے کے لیے یوں ہی چھوڑ دیا جائے؟ جب کہ ان کے اِردگرد ایسے سرمایہ دار اور مالدار افراد بھی موجود ہوں جنہوں نے اپنے مزدور و مجبور پڑوسیوں کی حسرت و غصہ سے بھری ہوئی وہ پکار بھی سن رکھی ہو جو شام کو خالی ہاتھ گھر لوٹتے وقت ان سرمایہ داروں اور مالداروں کی فلک بوس عمارتوں، بنگلوں اور ان کی عیاشیوں کو دیکھ کر بے ساختہ زبانِ حال سے اُٹھتی ہے:

کیا یہ شاہراہیں اسی لیے بنی تھیں کہ ان پر دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے؟
کیا زمین نے اسی خاطر اناج اُگایا تھا کہ نسلِ آدم و حوّا بلک بلک کے مرے؟
یہ ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں؟
چمن کو مالی نے اسی لیے خون سے سینچا تھا کہ اس کی اپنی ہی نگاہیں بہار کو ترسیں؟

یقیناً اسلام ایسے گداگروں، غریبوں اور محتاجوں کو فراموش نہیں کرسکتا، اسلام نے ان ہی کے لیے ’’بیت المال‘‘ کا منزل من اللہ پاکیزہ نظام پیش کیا ہے۔

بیت المال کی حقیقت و اہمیت:

بیت المال دراصل اسلامی حکومت کا خزانہ اور محکمۂ فائنانس (Finance) ہے، اسلامی حکومت کا ایک اہم کام اور فریضہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ جمع کر کے مستحقین میں تقسیم کرے، اسلامی ریاست میں بیت المال کی اہمیت و حیثیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے باضابطہ جہاد کیا جو ادائِ زکوٰۃ کے قائل تو تھے ہی؛ مگر زکوٰۃ بیت المال کو ادا کرنے کے منکر تھے۔

بیت المال ہی پر اسلامی مملکت کی اقتصادی اور معاشی نگہداشت کا بڑی حد تک مدار ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَ اعْلَمُوْا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ﴾ (الأنفال: ٤١)

ترجمہ: ’’اور (مسلمانو!) یہ بات اپنے علم میں رکھو کہ (دشمن کا جو مال جہاد کے دوران مجاہدین کے ہاتھ آیا ہو اس) مالِ غنیمت کا جو پانچواں حصہ ہے اس میں اللہ اور رسول اور ان کے قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں (زکوٰۃ کے مستحقوں) کا حق ہے۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے، ان میں سے چار حصے تو مجاہدین کے درمیان تقسیم ہوں گے، اور پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کیا جائے گا، پھر بیت المال کے اس پانچویں حصے (خمس) کو کس طرح تقسیم کیا جائے؟ اسی کی تفصیل کرتے ہوئے آیت کریمہ میں اولاً یہ بتایا گیا کہ یہ مال دراصل اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم کے مطابق تقسیم ہوگا، اس کے بعد پانچ مصارف بیان فرمائے گئے کہ ایک حصہ رحمت عالم ﷺ کا ہے، دوسرا حصہ آپ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں کا ہے، کیوں کہ انہوں نے آپ ﷺ کی اور دین اسلام کی نصرت میں بہت بڑی قربانیاں دی تھیں، اور ان کے لیے زکوٰۃ کا مال بھی حرام کیا گیا تھا، اور باقی تین حصے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں (زکوٰۃ کے مستحقوں)

میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔(آسان ترجمۂ قرآن:۱/۵۳۷)

بیت المال کا نظام کب مفید ہوسکتا ہے؟:

لیکن ظاہر ہے کہ اسلام کا پیش کردہ بیت المال کا نظام اسی وقت کما حقہ مفید ہوسکتا ہے جب کہ مکمل طور پر اسلامی ریاست وحکومت قائم ہو، جس کے حکمران بھی ایماندار ہوں، جو بیت المال پر اپنا قبضہ مالکانہ وحاکمانہ نہیں؛ بلکہ خادمانہ تصور کرتے ہوں، بالفاظِ دیگر اس کے حکمران حضرت عمرؓ کے ہم مزاج ہوں، جو تین باتوں پر قسم کھایا کرتے تھے: (۱) بخدا، بیت المال نہ میرا ہے اور نہ کسی اور کا۔ (۲) بخدا، بیت المال میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ (۳) قسم بخدا، اگر زندگی نے ساتھ دیا تو میں کوہِ صنعاء پر موجود چرواہے کو بھی اس کا حق پہنچاؤں گا۔ (مسند احمد:۳۸۹، بحوالہ: ''اسلامی معاشیات'' /ص:۱۵۹)

اور واقعی جب عمر ثانی سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس پر عمل کیا تو حضور ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہوئی، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب آدمی زکوٰۃ، خیرات اور صدقات دینے کے لیے سونا لے کر اِدھر اُدھر گھومتا پھرے گا؛ لیکن اسے کوئی لینے والا نہ ملے گا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۱۶۴)

چنانچہ منقول ہے کہ یحییٰ بن سعید وہ نوجوان تھے جنہیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے افریقہ جیسے علاقہ میں صدقہ وزکوٰۃ وصول کرنے اور تقسیم کرنے کے لیے بھیجا تھا، تو انہوں نے وصول تو کیا، لیکن انہیں وہاں کوئی فقیر نہ ملا جسے وہ رقم ادا کی جاتی۔ یقیناً گداگری اور غریبی کے ختم کرنے کا علاج بیت المال کا قیام بھی ہے۔

غربت اور گداگری کا چوتھا علاج

زکوٰۃ، صدقات اور خیرات وغیرہ:

اگر اسلامی ریاست وحکومت قائم نہیں ہے، یا حکومت اسلامیہ کے حکمران امانتدار

228

نہیں ہیں، مطلب یہ ہے کہ کسی طرح بیت المال کا نظام نہیں ہے، تو اس صورت میں اسلام نے گداگری وغریبی کے علاج کے لیے زکوٰۃ، صدقات، کفارات اور خیرات وغیرہ کا پاکیزہ نظام پیش کیا ہے، اسلام نے دولت کے امینوں اور اس کے نگرانوں (صاحب نصاب مالداروں) سے یہ مطالبہ کیا کہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے بعد جو کچھ بچ جائے وہ تمام تو نہیں؛ لیکن اس کا چالیسواں حصہ جسے زکوٰۃ کہتے ہیں وہ پس ماندہ لوگوں پر خرچ کریں، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ (البقرة : ٤٣)

ترجمہ: ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔''

مالداروں کو یہ حکم ایک بار نہیں؛ بلکہ بار بار دیا، کہیں تو انہیں مومنین کی صفت بتا کر رغبت دلائی:

﴿ وَ الَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ ○﴾ (المؤمنون : ٤)

ترجمہ: ''(اور کامل مومنین وہی ہیں) جو لوگ زکوٰۃ (کے اسلامی نظام) پر عمل کرتے ہیں۔''

تو کہیں اسے محسنین (مخلصین) کی صفتِ مخصوصہ بتا کر انہیں اُبھارا:

﴿ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ ○ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ○﴾ (لقمان : ٣-٤)

ترجمہ: ''جو نیک لوگوں کے لیے ہدایت ورحمت بن کر آئی ہے، وہ نیک لوگ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہی آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی اسلامی برادری میں داخلہ کی بنیاد بتایا گیا، چنانچہ فرمایا:

﴿ فَإِنْ تَابُوا وَ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ﴾ (التوبة : ١١)

ترجمہ: ’’لہٰذا اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔‘‘

گویا زکوٰۃ ایسا عظیم اسلامی رکن اور عبادت ہے کہ اس کی ادائیگی کے بغیر نہ کوئی صحیح معنیٰ میں مسلمان بن سکتا ہے اور نہ ہی وہ اسلامی برادری میں داخل ہوسکتا ہے، اور نہ ہی وہ غریبی دور کرنے کے علاج میں شریک ہوسکتا ہے، اسلام نے غربت کے خاتمہ کے لیے زکوٰۃ کا منظّم سسٹم دیا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ سونا، چاندی، زیورات، اموالِ تجارت اور نقد مال کا چالیسواں حصہ غریبوں کو بطورِ زکوٰۃ دینا فرض ہے، آج کل بازار، شوپنگ مولس، کارخانے اور فیکٹریاں کروڑوں واَربوں کے اموالِ تجارت سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، اگر ان کے مالک اپنے تمام اموال کی زکوٰۃ ادا کریں تو غربت کا علاج آسان ہے؛ لیکن چوں کہ وہ سال میں ایک ہی مرتبہ ہے، اور وہ بھی صاحب نصاب پر، اس لیے اسلام نے زکوٰۃ کے علاوہ ایک اور سسٹم روزہ اور قسم وغیرہ کے کفارات کا بھی رکھا ہے، جس کے ذریعہ گداگروں اور غریبوں کی مدد کی جاتی ہے۔

پھر روئے زمین پر لاکھوں، کروڑوں ایکر میں پھیلی ہوئی زرعی پیداوار میں بھی غریبوں کو شریک فرمایا:

﴿ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الأنعام:۱۴۱)

ترجمہ: ’’اور تم اس کی کٹائی کے دن اللہ کا حق ادا کرو۔‘‘ اس سے مراد عشر ہے۔ حدیث پاک میں بھی ہے: ”فِيْ كُلِّ شَيْءٍ أَخْرَجَتِ الْأَرْضُ الْعُشْرُ، أَوْ نِصْفُ الْعُشْرِ.“ (کنز العمال/الجزء: ۶) یعنی زمین سے جو بھی پیداوار برآمد ہو اس کا دسواں حصہ غریبوں کا ہے، اسی طرح باغوں اور پھلوں کی آمدنی میں بھی غریبوں کا بیسواں حصہ ہے۔

نیز جنگل میں چرنے والے جانوروں میں بھیڑ، بکریاں، گائے، بھینس اور اونٹ وغیرہ میں بھی غرباء کا حق اور حصہ ہے۔ اور یہ تو غریب پروری کا ایک معروف اور اجمالی خاکہ

ہے، علاوہ ازیں صدقاتِ نافلہ، وصایا اور خیرات کی بھی ترغیب دے کر اسلام نے غربت ختم کرنے کا بہترین اور انتہائی موثر علاج تجویز فرمایا ہے، بس ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ ہم لوگ شرعی ہدایات وتعلیمات کو اپنی عملی زندگی میں اپنائیں اور صحیح مصارف میں خرچ کریں، اگر ہم اسلامی حکومت قائم نہ کرسکیں تب بھی احکامِ اسلام پر عمل تو کر ہی سکتے ہیں، پھر مشاہدہ کریں کہ کتنی آسانی سے غربت کا خاتمہ ہوسکتا ہے، اور کس طرح کامیابی ہمارا مقدر بن سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام کو دارین میں خوشحالی وکامیابی سے ہمکنار فرمائے۔ آمین۔

۱۱/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۷ھ، قبل الجمعہ

مطابق: ۱۷/ جون/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
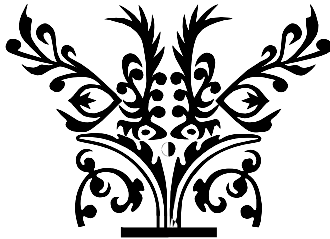
(۳۶)

فضول خرچی کی مذمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "الۡاِقۡتِصَادُ فِیۡ النَّفَقَةِ نِصۡفُ الۡمَعِیۡشَةِ، وَ التَّوَدُّدُ إِلیٰ النَّاسِ نِصۡفُ الۡعَقۡلِ، وَ حُسۡنُ السُّوَالِ نِصۡفُ الۡعِلۡمِ." (رواہ البیہقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ: ۴۳۰)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا نصف معیشت ہے (کیوں کہ زندگی گزارنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک تو محنت وجد وجہد کر کے حلال آمدنی کا انتظام کرنا اور دوسرا: جو کچھ آمدنی ہو اس کے مطابق اعتدال کے ساتھ اخراجات کا انتظام کرنا، اس میں معیشت کا آدھا انتظام ہے) اور لوگوں سے محبت کرنا آدھی عقل ہے (گویا کامل عقل یہ ہے کہ کچھ کام کرے اور آپس میں محبت بھی کرے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ محبت دین و دیانت کے خلاف نہ ہو) اور حسن سوال نصف علم ہے۔'' (مطلب یہ ہے کہ تمام شقوں کی تحقیقی خواہش رکھنی چاہیے اور احتمالات سے واقفیت بھی ضروری ہے)

فضول خرچی کی حقیقت:

اللہ رب العزت نے ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کا ایک بڑا ہی اہم ذریعہ مال کو بنایا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مال کے ذریعہ زندگی کی تقریباً تمام جائز ضروریات تو پوری ہو سکتی ہیں؛ مگر تمام خواہشات پوری نہیں ہو سکتیں، کیوں کہ ضروریات کی تو ایک حد اور انتہا متعین ہوتی ہے، جب کہ خواہشات کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہوتی، ضرورتیں تو فقیروں کی بھی پوری ہو جاتی ہیں؛ لیکن خواہشیں بادشاہوں کی بھی پوری نہیں ہوتیں۔ علاوہ ازیں دنیا ضروریات پوری کرنے کی جگہ ہے، خواہشات پوری کرنے کی جگہ آخرت میں جنت ہے، یہی وجہ ہے کہ جب بندہ مال واسباب کے ذریعہ زندگی کی ضروریات کے بجائے خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے تو مختلف قسم کی برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، ان ہی میں سے ایک برائی فضول خرچی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کی جو شرعی حدود متعین فرمائی ہیں، بندہ ان سے آگے بڑھ جائے، یا بالفاظِ دیگر یہ کہ حلال طریقے سے کمایا ہوا مال بندہ بے جا اور بے محل خرچ کرے تو یہ فضول خرچی کہی جائے گی جو کہ حرام ہے۔

فضول خرچی کی ممانعت:

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال کو بے جا اور بے محل (فضول خرچی میں) لگانا یہ نعمت مال کی ناقدری و ناشکری ہے، اور ناشکری بنیادی طور پر شیطان کا عمل ہے، اس لیے فضول خرچی والا عمل بھی شیطانی و غیر اسلامی ہے، قرآنِ کریم نے کئی مواقع پر فضول خرچی کی ممانعت و مذمت بیان فرمائی ہے، چنانچہ ایک مقام پر فضول خرچی کی ممانعت و مذمت ایک ساتھ اس طرح بیان فرمائی ہے:

﴿وَ لَا تُسۡرِفُوۡا ۚ إِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ﴾ (الأنعام: ۱۴۱)

ترجمہ: ''اور فضول خرچی نہ کرو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو

پسند نہیں کرتا۔“

اسی لیے جو اللہ تعالیٰ کے محبوب اور پسندیدہ بندے ہیں انہیں بھی فضول خرچی پسند نہیں ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک نے عباد الرحمٰن کی پہچان بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ الَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ يُسۡرِفُوۡا وَ لَمۡ يَقۡتُرُوۡا وَ كَانَ بَيۡنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۝ ﴾

ترجمہ: ”اور رحمان کے (خاص) بندے جب خرچ کرتے ہیں تو بے جا نہیں اُڑاتے اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ میانہ روی کے ساتھ ہوتا ہے۔“

وہ سخاوت تو کرتے ہیں، مگر فضول خرچی نہیں کرتے، کیوں کہ فضول خرچی رحمٰن کا نہیں؛ بلکہ شیطان کا پسندیدہ عمل ہے، جس سے انسان شیطان کے بہت قریب ہو جاتا ہے، اسی لیے قرآنِ کریم نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ (بنی إسرائیل: ۲۷)

ترجمہ: ”بالیقین فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔“

فضول خرچی کی پہلی قسم ”اسراف“ اور اس کی صورتیں:

اگر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ قرآنِ کریم میں فضول خرچی کے لیے دو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: ایک لفظ ”اسراف“ اور دوسرا ”تبذیر“، یوں تو دونوں ہی کا ترجمہ فضول خرچی سے کیا جاتا ہے، لیکن بعض علماء نے اسراف اور تبذیر میں فرق کیا ہے، اس اعتبار سے فضول خرچی کی دو قسمیں ہوگئیں: پہلی قسم اسراف اور دوسری تبذیر۔ اسراف کا مطلب یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی میں بے اعتدالی یعنی اپنی استطاعت وضرورت سے زیادہ یا حد سے بڑھ کر خرچ کرے کہ قرض کی نوبت آجائے، یا اس میں دوسروں کی حق تلفی ہو جائے، تو اسے اسراف کہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص اپنی جائز خوشی وضروریات کو ایک ہزار روپے میں پورا کرنے کی طاقت وحیثیت رکھتا ہے، مگر وہ سماجی رسم ورواج کے دباؤ میں یا دوستوں کے اصرار

پر یا پڑوسی اور رشتہ داروں کے لحاظ یا دیکھا دیکھی اور شرماشرمی میں دو ہزار روپے خرچ کرتا ہے اور اس کے لیے کسی سے قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے تو یہ بھی اسراف ہے، یا مثلاً کھانے پینے میں ایسی فضول خرچی کہ دس آدمیوں کے کھانے کی جگہ بیس آدمیوں کا کھانا پک جائے، جس میں سے آدھا استعمال ہوا اور آدھا ضائع ہو، اسی طرح ضروریات سے کہیں زیادہ لائٹنگ اور روشنی کا انتظام کرنا، نیز شادی بیاہ میں ہزاروں روپے کارڈ وغیرہ کی طباعت پر خرچ کرنا، دعوت میں کئی طرح کے پکوان بنانا، شادی میں حد سے زیادہ آرائش کرنا، نیز سواریوں میں ایک گاڑی سے ضرورت پوری ہو جانے کے باوجود کئی طرح کی گاڑیاں رکھنا، اور جب بھی کوئی نئے ماڈل کی گاڑی آئے تو بلا ضرورت نئی سے نئی گاڑی کا شوق رکھنا، یہ سب فضول خرچی کے دائرے میں آتا ہے، کیوں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان کے مال میں صرف اسی کا حق نہیں ہے، قرآن کے فرمان کے مطابق انسان کے مال میں اس کے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور ضرورت مندوں کا بھی حق ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَ فِيۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴾ (الذاریات: ۱۹)

ترجمہ: ”اور ان کے مال میں سائلوں (وہ ضرورت مند جو زبان سے اظہار کرتے ہیں) اور محروم لوگوں (جو اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کرتے) کا حق ہوتا ہے۔“

آیت کریمہ میں ”حق“ کا لفظ استعمال کر کے بتا دیا گیا کہ انسان ان لوگوں پر زکوٰۃ، صدقات اور خیرات کی شکل میں جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ یہ ان کا حق ہے، جو ان کو پہنچنا ہی چاہیے تھا، کیوں کہ مال ودولت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے، جس میں اہل حاجت کا بھی (باقاعدہ) حق ہے، اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ ہر انسان کی کچھ دینی ودنیوی ایسی ضروریات ہوتی ہیں کہ جہاں مال ودولت کی ضرورت پڑتی ہے، اب اگر کوئی شخص ان باتوں سے آنکھ بند کر کے بے اعتدالی سے خرچ کرے تو یہ بھی حدودِ شریعت سے تجاوز ہوا، اسی لیے یہ اسراف اور فضول خرچی میں داخل ہے، جو شرعاً ناپسندیدہ

عمل ہے۔

فضول خرچی کی قباحت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وضو جو کہ ایک عبادت ہے، اس میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی بہانے کو حضور ﷺ نے منع فرمایا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مَرَّ بِسَعْدٍ وَ هُوَ يَتَوَضَّأُ، فَقَالَ: " مَا هٰذَا السَّرَفُ؟" فَقَالَ: " أَفِي الْوُضُوْءِ إِسْرَافٌ؟" قَالَ: " نَعَمْ، وَ إِنْ كُنْتَ عَلٰى نَهْرٍ جَارٍ." (ابن ماجه: ٣٤، مشكوٰة: ٤٧)

ترجمہ: "ایک مرتبہ حضور ﷺ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس سے اس حال میں گزرے کہ حضرت سعدؓ وضو کر رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کیسا اسراف ہے؟ حضرت سعدؓ نے کہا: حضور! وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں، اگرچہ تم بہتی ہوئی نہر پر ہو۔"

یعنی جب پانی کی فراوانی ہو تب بھی حد سے زیادہ خرچ کرنا اسراف اور گناہ ہے، تو دیگر چیزیں جو اتنی فراوانی سے میسر نہ ہو سکتی ہوں ان میں اسراف کیوں کر گناہ نہ ہوگا؟

صاحبو! مال کے متعلق شریعت مطہرہ کا مطالبہ یہ ہے کہ ہر شخص دوسروں کے حقوق کو ادا بھی کرے اور حدود میں رہ کر حسب طاقت خرچ کرے، اس کے برخلاف جو بندہ حقوق کو ضائع کرتے ہوئے حدود سے بڑھ کر خرچ کرتا ہے تو یقیناً یہ اسراف ہے، جو فضول خرچی کی پہلی قسم ہے۔ (العیاذ باللہ العظیم)

فضول خرچی کی دوسری قسم "تبذیر" اور اس کی صورتیں:

فضول خرچی کی دوسری قسم "تبذیر" کا مطلب یہ ہے کہ بندہ زندگی کی جائز ضروریات کے بجائے فضولیات، فضول تقریبات، منکرات اور معاصی میں مال خرچ کرے،

اس کی ایک دو نہیں، سینکڑوں مثالیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں، مثلاً ایک شخص کسی کی زمین جائداد پر ناجائز اور زبردستی قبضہ حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف جھوٹے مقدمات میں ہزاروں روپے پانی کی طرح خرچ کرے، یا کوئی بندہ اپنے بھائی کو ناحق قتل کروانے کے لیے سپاری دے، کسی کا پیسہ سٹہ بازاری میں لگ رہا ہے تو کسی کا شراب نوشی، معاصی اور عیاشی میں خرچ ہو رہا ہے۔

مثلاً ایک سروے کے مطابق ہندوستان کے مسلمان داڑھی شیو کرانے اور گویا خود کے مسلمان ہونے کی پہچان مٹانے پر سالانہ چوبیس اَرب روپے خرچ کرتے ہیں، وہ اس طرح کہ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کی کم از کم تعداد بیس کروڑ مان لی جائے تو دس کروڑ عورتوں کی آبادی الگ کرنے کے بعد مردوں کی تعداد دس کروڑ بچتی ہے، اب اگر بچوں اور داڑھی رکھنے والوں کی تعداد پانچ کروڑ مان لی جائے تو داڑھی شیو کرانے والوں کی تعداد پانچ کروڑ یقینی ہے، اور داڑھی شیو کرانے کا ریٹ الگ الگ شہروں میں دس سے چالیس روپے تک ہے، اگر سب سے کم ریٹ کا حساب لگائیں تو دس کے حساب سے ایک ہفتہ میں پانچ کروڑ داڑھی شیو کرانے والے مسلمانوں کا خرچ پچاس کروڑ روپے ہوتا ہے، اور چار ہفتے یعنی ایک ماہ میں دو اَرب اور ایک سال میں چوبیس اَرب روپے ہو جاتے ہیں، اس طرح کے کئی مواقع ایسے ہیں کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا مال اس کے حکم کے خلاف استعمال ہوتا ہے، اسی کا نام تبذیر ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے: "التَّبْذِيْرُ الْإِنْفَاقُ فِيْ غَيْرِ حَقٍّ." (تفسیر ابن کثیر: ۳۶/۳) یعنی ناحق امور (گناہوں، گمراہیوں اور شیطانی راہوں) میں خرچ کرنے کو تبذیر کہتے ہیں، اس اعتبار سے تو فضول خرچی کی یہ دوسری قسم بہت ہی زیادہ بری اور خطرناک ہے، اللہ کے غضب اور پکڑ کا سبب ہے، چنانچہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: " لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ، عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا أَفْنَاهُ، وَ عَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا أَبْلَاهُ، وَ عَنْ مَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَ فِيْمَا أَنْفَقَهٗ، وَ مَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ." (رواه الترمذی: ۲/۶۷، مشکوٰۃ: ۴۴۳)

ترجمہ: ''بروزِ قیامت کسی بھی بندے کے قدم اس وقت تک بارگاہِ الٰہی سے نہ ہٹیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرلیا جائے: (۱) عمر کس چیز میں گزاری؟ (زندگی کن کاموں میں خرچ کی؟) (۲) جوانی کہاں بسر کی؟ (۳) مال کہاں سے کمایا تھا؟ (حلال طریقے سے یا حرام ذرائع سے؟) (۴) جو کچھ کمایا تھا اسے کہاں خرچ کیا؟ (حقوق میں یا فضول کاموں میں؟) اور (۵) جو کچھ جانا اس پر کیا عمل کیا؟''

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ہم مال کمانے میں احکامِ شریعت کے پابند ہیں اسی طرح مال خرچ کرنے میں بھی احکامِ شریعت کے پابند ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال کو حدود میں رہ کر حقوق میں خرچ کریں، فضول کاموں میں خرچ نہ کریں۔

فضول خرچی کے اسباب اور علاج:

فضول خرچی بہ شکل اسراف ہو یا بہ شکل تبذیر، بہر حال یہ عمل اسلام میں ناپسندیدہ، ناجائز اور حرام ہے، اس میں دینی اور دنیوی ہر اعتبار سے صرف نقصان ہی ہے، جب کہ فضول خرچی سے بچنا مالداری کا پہلا زینہ اور ذریعہ ہے، اسی لیے مذکورہ حدیث میں خرچ کرنے کے سلسلہ میں میانہ روی ملحوظ رکھنے کو نصف معیشت قرار دیا گیا ہے، یقیناً اعتدال سے خرچ کرنا ہی دانائی ہے، فضول خرچی میں کوئی بھلائی نہیں ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ فضول خرچی کا ایک بڑا سبب سماج کی فضول رسومات اور تقریبات کی پابندی ہے، اس لیے اس کا پہلا علاج یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں سماجی رسومات اور فضول تقریبات کے بجائے شرعی احکامات کی پابندی کا مکمل اہتمام کیا جائے۔

علاوہ ازیں فضول خرچی کا دوسرا بڑا سبب ناجائز خواہشات کی تکمیل کی حرص وہوس ہے، اس لیے اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں جہاں تک ہو سکے جائز ضروریات کو سادگی کے ساتھ پورا کرنے کا اپنے آپ کو عادی بنایا جائے، کیوں کہ زیادہ حرص وہوس اور خواہشات کا لامتناہی سلسلہ انسان کو نت نئی آسانیوں کا قیدی وعادی اور سہولت پسند

بنا دیتا ہے، اور پھر یہی چیز رفتہ رفتہ انسان کو فضول خرچی کی طرف لے جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے ہمیشہ اپنے لیے سادہ زندگی ہی پسند فرمائی اور اپنے ماننے والوں کو بھی اس کی ترغیب دی، یقیناً یہ اسراف اور فضول خرچی کا کامیاب علاج ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں سادگی اور احکامِ شرع کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

۱۴/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۷ھ، بروز: پیر

مطابق: ۲۰/ جون/ ۲۰۱۶ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ
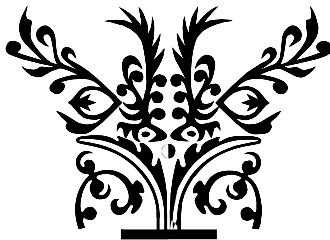
(۳۷)

بخل کی مذمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ بَکۡرٍ الصِّدِّیۡقِ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "لَا یَدۡخُلُ الۡجَنَّةَ خَبٌّ وَ لَا بَخِیۡلٌ وَ لَا مَنَّانٌ." (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ:١٦٥/ باب الإنفاق و کراھیة الإمساك)

ترجمہ: ”حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں (بغیر حساب وعذاب کے اوّل وہلہ میں) مکار (چال باز) بخیل (جو اپنے ذمہ واجب حقوق ادا نہ کرتا ہو) اور احسان جتلانے والا (یا قطع رحمی کرنے والا) داخل نہ ہوگا۔“

بخل کی حقیقت:

اللہ رب العزت نے اس دنیا میں مال واسباب اور دیگر ضروری اشیاء کو اس لیے پیدا فرمایا کہ انسان ان کو استعمال میں لائے اور ان کے ذریعہ مقاصد وفوائد حاصل کرے، اگر مال واسباب کے ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص بلا کسی وجہ کے تکلیف برداشت کرے، لیکن مال

واسباب کو اپنی دینی ودنیوی ضروریات اور واجبات میں خرچ نہ کرے تو یہ بخل ہے، جو شرعاً و عقلاً دونوں طرح مذموم ہے، نہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، نہ بندوں کو، نہ دنیوی اعتبار سے اچھا ہے، نہ اُخروی اعتبار سے۔

اس حقیقت کا اظہار قرآنِ پاک نے اس طرح فرمایا:

﴿وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ هُوَ خَیۡرًا لَّهُمۡ ؕ بَلۡ هُوَ شَرٌّ لَّهُمۡ ؕ سَیُطَوَّقُوۡنَ مَا بَخِلُوۡا بِهٖ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ﴾ (آل عمران:١٨٠)

”اور جو لوگ اللہ کے دیے ہوئے (مال واسباب) میں بخل سے کام لیتے ہیں وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ (بخل) ان کے لیے اچھی بات ہے، (حقیقت یہ ہے کہ) یہ ان کے حق میں بہت بری بات ہے، جس (مال واسباب) میں انہوں نے بخل سے کام لیا ہوگا قیامت کے دِن وہ ان کے گلے میں طوق بنا دیا جائے گا۔“

اسی کو حدیث پاک میں فرمایا گیا:

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنۡ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا، فَلَمۡ یُؤَدِّ زَکٰوتَهٗ، مُثِّلَ لَهٗ مَالُهٗ یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ شُجَاعًا أَقۡرَعَ لَهٗ زَبِیۡبَتَانِ، یُطَوَّقُهٗ یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ، ثُمَّ یَأۡخُذُ بِلِهۡزِمَتَیۡهِ، -یَعۡنِیۡ شِدۡقَیۡهِ- ثُمَّ یَقُوۡلُ: "أَنَا مَالُكَ، أَنَا کَنۡزُكَ." ثُمَّ تَلَا: ﴿وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ هُوَ خَیۡرًا لَّهُمۡ ؕ بَلۡ هُوَ شَرٌّ لَّهُمۡ ؕ سَیُطَوَّقُوۡنَ مَا بَخِلُوۡا بِهٖ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ﴾ (رواہ البخاری، مشکوٰۃ المصابیح:١٥٥/ کتاب الزکوٰۃ)

”جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال واسباب سے نوازا ہو، پھر وہ اس کا حق ادا نہ کرے، (اسے زکوۃ اور دیگر واجبات میں خرچ نہ کرے) تو وہ مال اس کے سامنے قیامت کے دِن ایک گنجے سانپ کی شکل میں لایا جائے گا، جس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ نقطے ہوں گے، (جو اس سانپ کے شدید زہریلا ہونے کی نشانی ہے) یہ سانپ اس بخیل کے گلے میں قیامت

کے دِن طوق بن جائے گا، پھر اس کا جبڑا پکڑ کر کہے گا کہ ’’میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں (جس میں تو بخل سے کام لیا کرتا تھا) پھر آپ ﷺ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی (جس میں بخل کی مذمت کا ذکر ہے)۔‘‘

اس سے واضح ہوا کہ بخل ہلاکت کا سبب ہے، امم سابقہ میں جن لوگوں کو ان کی بداعمالیوں کے سبب اللہ رب العزت نے ہلاک کیا ان میں ایک اہم سبب بخل بھی تھا۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

’’اِتَّقُوا الشُّحَّ، فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ.‘‘ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۴۲۰/ باب الإنفاق و کراهية الإمساك)

بخل کا سب سے اعلیٰ درجہ ’’شُح‘‘ ہے، جس میں بخل کے ساتھ حرص بھی ہو، فرمایا کہ اس بخل سے بچو، تم سے پہلے لوگوں کو اسی نے ہلاک کیا تھا۔

بخل کی وجہ سے ہلاکت کا ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ایک عبرت ناک واقعہ بیان کیا ہے کہ یمن کے شہر صنعاء سے کچھ فاصلے پر ’’ضَرَوان‘‘ نامی ایک علاقہ میں ایک آدمی کا بہت بڑا انگور کا باغ تھا، اس کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنے باغ اور کھیت کی پیداوار میں سے ایک سال کا خرچ رکھ کر باقی کا ایک اچھا خاصا حصہ غریبوں کو دیا کرتا تھا، جب اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے بیٹوں نے یہ طے کیا کہ ہمارا باپ بے وقوف تھا جو اتنی ساری پیداوار غریبوں کو دیا کرتا تھا، اب ہم جو باغ کی کٹائی کریں گے تو ایسا انتظام کریں گے کہ کوئی غریب آدمی وہاں آئے ہی نہیں، ہم صبح ہوتے ہی باغ کے پھل توڑ لیں گے، قرآنِ پاک نے اس کو یوں بیان کیا ہے:

﴿إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ۝ وَ لَا يَسْتَثْنُونَ ۝ فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَائِمُونَ ۝ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۝ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ۝ أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَارِمِينَ ۝ فَانْطَلَقُوا وَ هُمْ يَتَخَافَتُونَ ۝ أَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ

مِسْكِينٌ ۝ وَ غَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ ۝﴾ (القلم: ۱۷ إلى: ۲۵)

’’جب انہوں نے قسم کھائی تھی کہ صبح ہوتے ہی ہم باغ کے پھل توڑ لیں گے، اور (یہ کہتے ہوئے) وہ کوئی استثناء نہیں کر رہے تھے، (علماء نے اس کا ایک مطلب تو یہ بیان کیا کہ ان کا ارادہ تھا کہ سارے کے سارے پھل ہم توڑ لیں گے اور اس کے کسی بھی حصہ کا استثنا نہیں کریں گے، یعنی جیسا کہ ہمارا باپ غریبوں کے لیے ایک خاص حصہ متعین کر لیتا تھا ہم ایسا نہیں کریں گے۔ اور دوسرا مطلب استثنا کا ’’إن شاء اللّٰه‘‘ کہنا بھی ہوتا ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ جب یہ کہہ رہے تھے کہ ’’ہم صبح ہوتے ہی پھل توڑ لیں گے‘‘ تو اس وقت انہوں نے ’’إن شاء اللّٰه‘‘ نہیں کہا تھا، بہر کیف اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ ارادۂ بخل پسند نہیں آیا، نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے وقت جب وہ سوئے ہوئے تھے جہنم کی گھاٹی سے ایک آگ یا اس کی لو نکلی، جو اس باغ پر پھر گئی اور اس کی تمام پیداوار کو ہلاک و تباہ کر دیا) جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَائِمُونَ ۝ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۝﴾ (القلم: ۱۹-۲۰)

’’پھر ہوا یہ کہ جس وقت وہ سو رہے تھے اس وقت تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اُس باغ پر پھیرا لگا گئی، جس سے وہ باغ صبح کو کٹی ہوئی کھیتی کی طرح ہوگیا۔‘‘

بعد میں جب انہیں یہ احساس ہوا کہ باغ کی یہ ہلاکت بخل کی وجہ سے ہوئی ہے، تو انہوں نے اخلاص کے ساتھ توبہ کر لی، جیسا کہ ارشادِ باری سے بھی بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے:

﴿قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا طَاغِينَ ۝ عَسَىٰ رَبُّنَا أَنْ يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ ۝﴾ (القلم: ۳۱ إلى: ۳۳)

’’پھر سب نے متفق ہو کر کہا کہ افسوس ہے ہم سب پر، ہم سب نے سرکشی اختیار کر لی تھی، کیا بعید ہے کہ ہمارا رب ہمیں اس باغ کے بدلے اس سے اچھا عطا کرے، بے شک ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔‘‘

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب ان لوگوں نے اخلاص کے ساتھ اپنے بخل سے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک باغ عطا فرمایا، جس کے انگور کے خوشے اتنے بڑے بڑے تھے کہ ایک خوشہ ایک خچر پر لاد کر لے جاتے تھے۔ (انوار البیان: ۷/۴۵۶)

(شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ یہ علاقہ اب بھی ''ضَرَوان'' کہلاتا ہے، اور میں نے دیکھا ہے، وہاں چاروں طرف پھیلے ہوئے سبزہ کے درمیان ایک کالے پتھروں والا ویران علاقہ ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہی علاقہ اُس باغ کی جگہ تھی جو بعد میں آباد نہیں ہوسکی۔ واللہ اعلم۔ از: آسان ترجمۂ قرآن/صفحہ: ۱۷۸۳)

ایک اور عبرت ناک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک اور عبرت ناک واقعہ ہے، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں ایک شخص جس کا نام ثعلبہ بن حاطب تھا، ایک مرتبہ خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور درخواست کرنے لگا کہ حضور! آپ میرے لیے مالدار ہونے کی دعا فرمادیں، آپ ﷺ نے اسے پہلے تو یہ سمجھایا کہ بہت زیادہ مالدار ہونا مجھے پسند نہیں ہے، لیکن آنے والے شخص نے بار بار اصرار کیا اور یہ وعدہ کیا:

﴿ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ ﴾ (التوبۃ: ۷۵)

''اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل سے مالدار بنادیا تو صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ ضرور ادا کریں گے اور یقیناً نیک لوگوں میں شامل ہوجائیں گے۔'' ہر ایک کے جو مالی حقوق ہیں ان کو ادا کریں گے۔

آپ ﷺ نے اس موقع پر یہ حکیمانہ جملہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''تھوڑا مال جس کا تم شکر (اور حق) ادا کرسکو اس زیادہ مال سے بہتر ہے جس کا شکر (اور حق) ادا نہ کرسکو۔''

اس کے باوجود ثعلبہ بن حاطب کا اصرار جاری رہا، تو رحمت عالم ﷺ نے دعا فرمادی، جس کا اثر یہ ہوا کہ واقعی ثعلبہ بن حاطب کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ہی وقت میں خوب مالدار بنا

دیا، اس کے مال اور مویشی اتنے زیادہ ہوگئے کہ ان کی دیکھ بھال میں اولاً نمازیں چھوٹنے لگیں، پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب جانوروں کی زیادتی کے سبب مدینہ طیبہ سے باہر جا کر ایک فارم ہاؤس میں رہنا شروع کردیا، جس سے وہ مسجد نبوی کی نمازوں سے محروم ہوگیا، حتیٰ کہ اس نے جمعہ کو بھی حضور ﷺ کے پیچھے نماز میں آنا چھوڑ دیا، مزید نحوست یہ ہوئی کہ جب حضور ﷺ کے نمائندے زکوٰۃ کی وصول یابی کے لیے اس کے پاس گئے (تو مال کی محبت میں جو بخل کا سبب ہے) اس نے زکوٰۃ تو ادا نہ کی، مزید برآں پھبتیاں کسیں، کہنے لگا کہ یہ تو جزیہ ہے، اور ٹال مٹول کرکے ان حضرات کو واپس بھیج دیا، جس کو قرآنِ پاک نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ ﴾ (التوبۃ: ۷۶)

''لیکن جب اللہ نے ان کو اپنے فضل (مال) سے نوازا تو وہ اس میں بخل کرنے لگے اور منہ موڑ کر چل دیے۔'' (روح المعانی، بحوالہ طبرانی وبیہقی، از: آسان ترجمۂ قرآن: ۵۹۵)

جب حضور ﷺ کے نمائندوں نے واپس آکر کارگزاری سنائی تو آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا: "وَيْحَ ثَعْلَبَةَ، وَيْحَ ثَعْلَبَةَ، وَيْحَ ثَعْلَبَةَ" یعنی ثعلبہ پر سخت افسوس ہے۔ اتفاق سے اسی مجلس میں ثعلبہ کے کچھ اقارب بھی موجود تھے، یہ سن کر ان میں سے ایک آدمی فوراً سفر کرکے ثعلبہ کے پاس پہنچا اور اس کو ملامت کی، اور بتایا کہ تمہارے بخل کی مذمت میں قرآن نازل ہوا، اب ثعلبہ بھی گھبرایا اور (اخلاص سے تو نہیں، بلکہ خوفِ نفاق سے) مدینہ طیبہ خدمت اقدس میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگا کہ حضور! میرا صدقہ قبول کرلیا جائے، مگر حضور ﷺ کو بذریعۂ وحی یہ بتلا دیا گیا تھا کہ یہ اخلاص سے توبہ نہیں کررہا ہے، بلکہ اس کے دل میں نفاق موجود ہے، محض وقتی مصلحت سے مسلمانوں کو دھوکہ دے کر راضی کرنا چاہتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اس کا صدقہ قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ مجھے تمہارا صدقہ قبول کرنے سے منع فرما دیا گیا ہے، ثعلبہ ناکام واپس ہوگیا، اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد حضور ﷺ کی وفات ہوگئی، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہٗ خلیفہ ہوئے، تو ثعلبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہٗ کی

خدمت میں بھی حاضر ہو کر صدقہ دینے لگا، آپؓ نے فرمایا کہ جب حضور ﷺ نے قبول نہیں فرمایا تو میں کیسے قبول کرسکتا ہوں؟ آپؓ نے بھی منع فرمادیا، اس کے بعد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ، نے بھی اپنے دورِ خلافت میں اس کا صدقہ قبول کرنے سے منع کردیا، یہاں تک کہ دورِ عثمانی میں ثعلبہ مرگیا اور اس طرح بخل اس کی ہلاکت کا سبب بن گیا۔ نعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا. (از: معارف القرآن: ۴/ ۴۲۸)

بخل سے اجتناب پر کامیابی کی بشارت:

شیطان بھی سخی سے خوف کرتا ہے اور بخیل سے محبت رکھتا ہے، امام غزالیؒ نے ''احیاء العلوم'' میں نقل کیا ہے کہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام نے ایک مرتبہ شیطان سے دریافت فرمایا کہ تجھے سب سے زیادہ محبوب کون شخص ہے؟ اور سب سے زیادہ نفرت کس سے ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے سب سے زیادہ محبت مومن بخیل سے ہے اور سب سے زیادہ نفرت فاسق (گنہگار) سخی سے ہے، کیوں کہ بخیل تو اپنے بخل کی وجہ سے مجھے بے فکر رکھتا ہے کہ اس کا بخل ہی اس کو جہنم میں لے جانے کے لیے کافی ہے، لیکن فاسق سخی کا مجھے ہر وقت فکر سوار رہتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس کی سخاوت کی وجہ سے مغفرت نہ فرمادے۔ (''فضائل صدقات'': ۲/ ۱۶۱)

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ بخل سے کبھی فائدہ نہیں ہوتا، جیسے سخاوت سے کبھی نقصان نہیں ہوتا۔ عربی کا شاعر کہتا ہے:

أَنْفِقْ، وَ لَا تَخْشَ إِقْلَالًا، فَقَدْ قُسِّمَتْ — بَيْنَ الْعِبَادِ مَعَ الْآجَالِ أَرْزَاقٌ
لَا يَنْفَعُ الْبُخْلُ مَعَ دُنْيَا مُوَلِّيَةٍ — وَ لَا يَضُرُّ مَعَ الْإِقْبَالِ إِنْفَاقٌ

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ (مراد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی اور اجتنابِ معاصی کے جتنے راستے ہیں ان) میں خرچ کرتا رہ، مفلسی کا خوف مت کر، اطمینان رکھ، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے درمیان عمر کے ساتھ رزق بھی تقسیم فرمادیا ہے، (تیرا رزق تجھے ہی ملے گا، اور جب تک تیرا رزق تجھے نہ مل جائے تیری موت نہیں آسکتی) اور فنا ہونے والی دنیا میں بخل سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، اور نیک بختی کے ساتھ سخاوت کوئی نقصان نہیں

دے گی۔

قرآنِ کریم نے بخل سے اجتناب پر کامیابی کی بشارت دی ہے، فرمایا:

﴿وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ (الحشر: ۹)

اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھے جائیں وہی فلاح اور کامیابی پانے والے ہیں۔

بخل میں تین حروف ہیں، جن سے تین اشارے ملتے ہیں: ''ب'' سے بلا، ''خ'' سے خسران اور ''ل'' سے لوم یعنی ملامت۔ اب بخل سے بچنے کا مطلب ہے بلا، خسران اور لوگوں کی ملامت سے بچنا، تو یہ دنیا کی کامیابی ہے، اور آخرت کی کامیابی رضاءِ الٰہی اور جنت عدن کی شکل میں ملے گی۔

حدیث پاک میں وارد ہے کہ اللہ رب العالمین نے جنت کو اپنی خاص رحمت سے بنایا، پھر اس کو خوب آراستہ اور مزین کیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میری عزت کی قسم، میرے جلال کی قسم، عرش پر میری بلندی کی قسم! تجھ میں بخیل تو نہیں آسکتا۔ (سخی ضرور آسکتا ہے)۔ (از: فضائل صدقات: ۲/ ۱۵۹)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بخل سے بچ گیا وہ جنت عدن کی محرومی سے بھی بچ گیا، وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بھی بچ گیا، اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہوسکتی ہے؟

اسی لیے تو فرمایا گیا:

﴿وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ (الحشر: ۹)

اللہ تعالیٰ ہمیں بخل اور دیگر تمام رذائل سے محفوظ فرما کر اپنی مرضیات پر چلائیں۔ آمین۔

۲۵/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۷ھ/ قبل الجمعہ

مطابق: یکم جولائی/ ۲۰۱۶ء

نزیل: خانقاہ قدسیہ، مسجد شیخ زکریا، جامعہ سراج العلوم اجین

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۳۸)

شریعت میں طہارت اور صفائی کی حقیقت واہمیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ مَالِکِ نِ الۡأَشۡعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ”الطُّھُوۡرُ شَطۡرُ الۡإِیۡمَانِ، وَ الۡحَمۡدُلِلّٰہِ تَمۡلَأُ الۡمِیۡزَانَ، وَ سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ تَمۡلَآنِ أَوۡ تَمۡلَأُ مَا بَیۡنَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡأَرۡضِ، وَ الصَّلٰوۃُ نُوۡرٌ، وَ الصَّدَقَۃُ بُرۡھَانٌ، وَ الصَّبۡرُ ضِیَاءٌ، وَ الۡقُرۡآنُ حُجَّۃٌ لَکَ أَوۡ عَلَیۡکَ، کُلُّ النَّاسِ یَغۡدُوۡ، فَبَائِعٌ نَفۡسَہٗ، فَمُعۡتِقُھَا أَوۡ مُوۡبِقُھَا.“(رواہ مسلم، مشکوٰۃ المصابیح : ۳۸/ کتاب الطھارۃ/ الفصل الأول)

ترجمہ: ”حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ”طہارت و پاکیزگی حاصل کرنا (ایمان کا خاص جزو اوراس کا اہم شعبہ وحصہ، بلکہ) آدھا ایمان ہے،اور کلمۂ ”الحمدللہ“ (ایمان واخلاص کے ساتھ کہنا) میزانِ عمل کو (اجرو ثواب سے) بھردیتا ہے،اور ”سبحان اللہ“ اور ”الحمدللہ“ کہنا یہ دونوں یا فرمایا کہ ان میں سے

کوئی ایک کلمہ آسمان وزمین کے درمیانی خلاکو (اجروثواب سے) بھردیتا ہے،اور نماز نور ہے، (جس کا اثر دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ نماز سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے، پھر نمازی کے لیے فواحش ومنکرات سے بچنا آسان ہوجاتا ہے،اورآخرت میں اس کا اثر یہ ہوگا کہ نماز نمازی کو نور اور روشنی کا کام دے گی،اسی کوفرمایا: ﴿نُوۡرُھُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ أَیۡدِیۡھِمۡ وَ بِأَیۡمَانِھِمۡ﴾ التحریم : ۸) اور صدقہ (ثبوتِ ایمان کی) دلیل ہے،اور (طاعت ومعصیت اور مصیبت پر) صبر کرنا (سورج کی طرح روشن اور) اُجالا ہے، (جس سے صبر کرنے والا دین ودنیا کے ہر مرحلہ میں راہ تلاش کرلیتا ہے) اور قرآنِ کریم تمہارے لیے یا تمہارے خلاف حجت ودلیل ہے، (مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے قرآنِ کریم کے حقوق کو ادا کیا تو یہ قیامت کے دن تمہارے حق میں ایمان اور استحقاقِ جنت کی دلیل بنے گا، ورنہ تمہارے خلاف دلیل بنے گا) ہر آدمی جب صبح (نیند سے بیدار ہوتا ہے) تو اپنی ذات کو اپنے کاموں میں فروخت کرتا ہے، (لگاتا ہے) اب یا تو وہ اپنی ذات کونجات دلاتا ہے، یا پھر ہلاک کرتا ہے۔“ (مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی ایک مسلسل تجارت اور سوداگری ہے، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی ورضا طلبی والی زندگی گزارتا ہے تو اپنی ذات کے لیے بڑی اچھی کمائی اور سامانِ تجارت فراہم کررہا ہے،اوراگر وہ اس کے برخلاف نفس پرستی اور خدا فراموشی کی زندگی گزار رہا ہے تو اپنی ہی تباہی وبربادی کمارہا ہے۔ معاذ اللہ

پاکی وصفائی کی اہمیت:

اللہ رب العالمین پاک ہے، پاکی کو پسند کرتا ہے،اسی لیے اس نے پاکی وصفائی کو انسانی فطرت وطبیعت کا خاصہ بنا کر حتی الامکان ظاہری وباطنی پاکی وصفائی کو اختیار کرنے کا حکم بھی فرمایا،اور ساتھ ہی اپنے مخصوص بندوں کو باربار وضو اور مناسب وقفہ سے غسل کا حکم فرما کر ظاہری صفائی اور باطنی پاکیزگی کا ایک مکمل عملی نظام بھی پیش کردیا، کیوں کہ مسلمان کے لیے نماز، تلاوتِ قرآن پاک اور طوافِ بیت اللہ جیسی اہم عبادات کے لیے اللہ تعالیٰ نے پاکی وصفائی کو شرطِ لازمی قرار دیا ہے، یہ گویا پاکی وصفائی کا قدرتی نظام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے

ہمیں پاک وصاف رہنے کے لیے عطا فرمایا۔

یہاں ایک حقیقت سمجھ لیں کہ ایک ہے صفائی، اور ایک ہے پاکی، پاکی صفائی سے آگے کی چیز ہے، آج دنیا کی اکثر اقوام ظاہری صفائی کا تو خوب اہتمام کرتی ہیں، لیکن ذاتی اور اندرونی صفائی- جس کو پاکی کہتے ہیں- سے عموماً محروم ہیں، مثلاً پیشاب یا پاخانہ کے بعد اچھی طرح صفائی اور پاکی کا اہتمام کرنا، ان کے یہاں اس کا کوئی تصور ہی نہیں، جب کہ اسلام نے ظاہری نظافت کے ساتھ اندرونی طہارت کا بھی حکم دیا ہے، اور یہ کوئی معمولی حکم نہیں؛ بلکہ نہایت ہی اہم ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ ﴾ (البقرة : ۱۲۴)

''اور جب ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کے رب نے چند کلمات (واحکام) کے ذریعہ آزمایا، توانہوں نے ان کو پورا کیا۔''

یہاں چند کلمات واحکام سے کیا مراد ہے؟ تو اس سلسلہ میں حضرات مفسرین کے مختلف اقوال منقول ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے طہارت ونظافت کے دس احکام مراد ہیں، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیے گئے، جن پر آپ نے عمل فرمایا۔ وہ دس احکام یہ ہیں: (۱) مونچھیں کاٹنا (تاکہ کھاتے پیتے وقت بال آلودہ نہ ہوں) (۲) مسواک کرنا (تاکہ دانت صاف ہو جائیں) (۳) کلی کرنا (تاکہ منہ صاف ہو جائے (۴) ناک صاف کرنا (۵) سر کے بال میں مانگ نکالنا (تاکہ بالوں کی اچھی طرح صفائی ہو (۶) ناخن کاٹنا (۷) زیرناف کے بال کاٹنا (۸) بغل کے بال صاف کرنا (۹) ختنہ کرنا (۱۰) پیشاب وپاخانہ کے بعد پانی سے استنجا کرنا (تاکہ اچھی طرح صفائی حاصل ہو سکے۔ (مستفاد از انوار البیان: ۱/۱۶۳)

ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں انسانی فطرت کا تقاضا ہیں، اس لیے حدیث میں انہیں ''عَشْرٌ مِنَ الفِطْرَةِ'' (صحیحین، مشکوٰۃ : ٤٤) فرما کر ترغیب دی گئی ہے، جس سے اسلام

میں پاکی وصفائی کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

مزید برآں قرآنِ پاک اور احادیث مبارکہ میں غور کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں پاکی وصفائی کی حیثیت صرف ایک حکم ہی کی نہیں، بلکہ پاکی وصفائی دین اسلام کا ایک جزو، حصہ، شعبہ اور آدھا ایمان ہے، جیسا کہ حدیث مذکور میں ارشاد ہوا کہ ''الطُّهُورُ شَطْرُ الإِيْمَان'' ...... ''شَطْرٌ'' کے معنیٰ نصف اور آدھے کے ہیں، چنانچہ اسی مضمون کی ایک اور حدیث بھی ہے، جو امام ترمذیؒ نے ایک دوسرے صحابیؓ سے روایت کی ہے، اس میں ''الطُّهُورُ نِصفُ الإِيْمَان'' (ترمذی:۲/۱۹۰، مشکوٰۃ:۳۹) ہی کے الفاظ وارد ہیں۔ تو ''شطر'' اور ''نصف'' دونوں لفظوں کا مطلب یہی ہے کہ پاکی وصفائی دین اسلام کا خاص جزو، اس کا اہم حصہ اور شعبہ ہے، وجہ یہ ہے کہ ایمان لانے سے تو تمام چھوٹے بڑے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، البتہ وضوء وغسل سے تمام چھوٹے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۴۲، مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۱/۳۴۳)

اس سے ایک طرف تو پاکی وصفائی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے تو دوسری طرف وسعت، کیوں کہ پاکی وصفائی کا مطلب یہی نہیں کہ انسان ظاہری اعتبار سے صاف رہنے کا اہتمام کرے، بلکہ ظاہر کی طرح اندرونی اعتبار سے باطن کو بھی ظاہری اور باطنی ہر طرح کی ناپاکی وگندگی سے پاک صاف رکھنا ضروری ہے، اس لیے ہمارے علماءِ محققین ومحدثین نے پاکی وصفائی کے چار درجات بیان کیے ہیں:

پاکی وصفائی کا پہلا درجہ

ظاہر کو ظاہری ناپاکی سے پاک رکھنا:

پاکی وصفائی کا پہلا درجہ یہ ہے کہ ظاہر کو ظاہری ناپاکی وگندگی سے پاک صاف رکھا جائے، مثلاً جسم کا ظاہری حصہ، کپڑا، مکان، آنگن، محلّہ اور تمام متعلقہ ظاہری چیزوں کو ظاہری ناپاکی وگندگی سے پاک صاف رکھنا، قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر اس کا حکم آیا ہے،

مثلاً ارشادِ باری ہے:

﴿ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡھَکُمۡ وَ اَیۡدِیَکُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ وَ امۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ وَ اَرۡجُلَکُمۡ اِلَی الۡکَعۡبَیۡنِ ؕ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوۡا ؕ﴾ (المائدۃ:٦)

”اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو، (ارادہ کرو) تو اپنے چہرے اور کہنیوں سمیت اپنے دونوں ہاتھ دھولو، اور اپنے سر کا مسح کرو، اور اپنے پاؤں بھی ٹخنوں سمیت (دھولیا کرو) اور اگر تم جنابت (ناپاکی والی) حالت میں ہو تو سارے جسم کو (غسل کے ذریعہ) خوب اچھی طرح پاک کرو۔“

مطلب یہ ہے کہ اہتمامِ نماز سے پہلے چھوٹی، بڑی، حقیقی (نظر آنے والی) و حکمی (نظر نہ آنے والی) ناپاکی سے پاکی وصفائی کا اہتمام کرو، کیوں کہ پاکی وصفائی کے بغیر تو نماز بھی معتبر اور قبول نہیں ہوگی، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡھُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ”لَا تُقۡبَلُ صَلٰوۃٌ بِغَیۡرِ طَھُوۡرٍ، وَ لَا صَدَقَۃٌ مِنۡ غُلُوۡلٍ.“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ : ٤٠)

”پاکی اور طہارت کے بغیر نماز قبول نہیں اور مالِ حرام کا صدقہ قبول نہیں۔“

واقعہ یہ ہے کہ نماز کی خاطر کیے جانے والے وضو اور غسل کی برکت سے آدمی چھوٹی، بڑی، حقیقی، حکمی، ظاہری اور باطنی ناپاکی سے پاک صاف ہو جاتا ہے، کیوں کہ وضو میں جسم کے وہ اعضاء جو کھلے رہتے ہیں اور نسبتاً زیادہ غبار آلود ہوتے ہیں یعنی ہاتھ، پاؤں اور چہرہ وغیرہ بار بار دھلتے رہتے ہیں، ناک کی صفائی بھی ہو جاتی ہے، منہ کے اندر کی صفائی کلی کے ذریعہ ہو جاتی ہے، اور اگر مسواک بھی کرلیا تو یہ صفائی مزید رضاءِ الٰہی کا ذریعہ بھی ہے، اور پورے جسم کی پاکی وصفائی کے لیے غسل جنابت کو فرض قرار دیا، ظاہر ہے کہ وضو اور غسل کا بنیادی مقصد ظاہر کو ظاہری ناپاکی سے پاک صاف کرنا ہی تو ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ میں پاکی کا حکم دینے کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ

﴿ مَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیَجۡعَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّ لٰکِنۡ یُّرِیۡدُ لِیُطَھِّرَکُمۡ﴾ (المائدۃ:٦)

”(پاکی وصفائی کے ان احکام کے ذریعہ) اللہ تم پر کوئی تنگی مسلط نہیں کرنا چاہتا، لیکن یہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کردے۔“

کیوں کہ پاکی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اس لیے اپنے پاک بندوں کو اس نے یہ خاص حکم دیا ہے کہ ظاہر کو ظاہری ناپاکی و گندگی سے پاک صاف رکھو، یہ پاکی کا پہلا درجہ ہے۔

پاکی وصفائی کا دوسرا درجہ
ظاہر کو باطنی ناپاکی سے پاک رکھنا:

پاکی وصفائی کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنے ظاہری اعضاء کو باطنی ناپاکی سے پاک صاف رکھا جائے، اور باطنی ناپاکی سے مراد گناہ ہیں، کیوں کہ قرآن وحدیث میں گناہوں کو گندگی سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَ الۡمَیۡسِرُ وَ الۡاَنۡصَابُ وَ الۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ﴾ (المائدۃ: ٩٠)

”اے ایمان والو! شراب، جوا، مرتیاں اور فال نکالنے کے تیر یہ سب ناپاک (گندگی) اور شیطانی کام ہیں۔“

دیکھئے! یہاں ان معاصی کو ناپاکی اور گندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے اہل بیت (ازواجِ مطہرات اور بناتِ طاہرات) کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡھِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَھۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَھِّرَکُمۡ تَطۡھِیۡرًا ۚ﴾ (الأحزاب:٣٣)

”اے پیغمبر کے اہل خانہ! (گھر والو) اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور رکھے اور تمہیں ہر طرح کی مکمل پاکیزگی عطا کرے۔“

ظاہر ہے کہ یہاں بھی گندگی سے مراد گناہ اور معاصی ہیں، اور مکمل پاکیزگی کا مطلب یہ ہے کہ اہل بیت معصوم تو نہیں، لیکن اتنے متقی بن جائیں کہ وہ گناہوں کی گندگی سے اور گناہوں کی گندگی ان سے دور ہو جائے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ معاصی اور گناہ باطنی گندگی ہے۔

نیز ایک حدیث میں جھوٹ کے متعلق ارشاد ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:” إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيْلًا مِنْ نَتْنِ مَا جَاءَ بِهٖ.“ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ:۴۱۳)

”جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو اس سے (ایک باطنی) بدبو پھیلتی ہے، (جس کی وجہ سے محافظ) فرشتہ ایک میل دور ہو جاتا ہے۔“ (ظاہر ہے کہ بدبو گندی چیز ہی سے نکلتی ہے)۔

صاحبو! ان حقائق سے واضح ہوا کہ ہر معصیت ایک باطنی نجاست ہے، اور یہ اسلام کا کمال ہے کہ اس نے ظاہر کو ظاہری گندگی سے پاک صاف رکھنے کے علاوہ ظاہری اعضاء: آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کو معاصی اور گناہوں کی باطنی گندگی سے بھی پاک صاف رکھنے کی طرف توجہ دلائی، اب اگر ہم ظاہر سے ظاہری ناپاکی کو تو نہا دھوکر خوشبو لگا کر دور کریں، لیکن ظاہری اعضاء سے معاصی اور گناہوں کی باطنی گندگی و ناپاکی کو دور نہ کریں تو لوگوں کی نظروں میں بظاہر ہم کتنے ہی پاک صاف کیوں نہ ہو جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کی پاکیزہ مخلوق یعنی فرشتوں کی نظر میں ہم گناہوں کی وجہ سے گندے ہی شمار ہوں گے، اس لیے جیسے ظاہر کی ظاہری گندگی و ناپاکی کو دور کرنے کے لیے وضو اور غسل وغیرہ کا اہتمام ضروری ہے اسی طرح ظاہری اعضاء کی باطنی گندگی اور ناپاکی کو دور کرنے کے لیے سچی توبہ کا اہتمام کرنا بھی نہایت ہی ضروری ہے، تاکہ ہمیں پاکی کا دوسرا درجہ بھی حاصل ہو جائے، اور

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ ان شاء اللہ پہلے درجہ کی پاکی کا جب مکمل اہتمام کیا جائے گا تو اس کی برکت سے دوسرے درجہ کی پاکی کی بھی توفیق میسر ہوگی، غالبًا اسی لیے قرآنِ پاک اور احادیث مبارکہ میں طہارت اور توبہ دونوں کو ایک ساتھ بیان فرمایا گیا، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۝﴾ (البقرۃ: ۲۲۲)

”بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو کثرت سے توبہ اور طہارت کا اہتمام کرتے ہیں۔“

حدیث پاک میں وضو کے بعد کی جو دعا ہے اس میں بھی توبہ وطہارت کو ایک ساتھ ذکر فرمایا: ”اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَ اجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ (مشکوٰۃ: ۳۹)

”اے اللہ! مجھے توبہ اور طہارت کا اہتمام کرنے والوں میں سے بنا دے۔“

معلوم ہوا کہ اسلام میں توبہ اور طہارت دونوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے، اگر ظاہر کو ظاہری ناپاکی سے پاک کرنے کے لیے طہارت کی ضرورت ہے تو ظاہر کو باطنی ناپاکی سے پاک کرنے کے لیے سچی پکی توبہ کی ضرورت ہے۔

پاکی وصفائی کا تیسرا درجہ
باطن کو باطنی ناپاکی سے پاک رکھنا:

جب انسان اپنے ظاہر کو ظاہری اور باطنی گندگی و ناپاکی سے پاک صاف کر لیتا ہے تو اس سے آگے تیسرا درجہ پاکی وصفائی کا یہ ہے کہ اپنے باطن یعنی دل کو باطنی گندگی و ناپاکی (مراد گناہوں) سے پاک صاف کر لے، کیوں کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں: (۱) ظاہری۔ (۲) باطنی۔ ظاہری گناہوں سے مراد جسم کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہونے والے گناہ مثلاً جھوٹ اور غیبت وغیرہ، اور باطنی گناہوں سے مراد دل کے گناہ ہیں، مثلاً تکبر، نفاق، حسد، حب دنیا، حب جاہ، کینہ اور ریا وغیرہ، دونوں طرح کے گناہوں سے بچنا ضروری ہے، قرآنِ

پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَ بَاطِنَهُ﴾ (الأنعام: ۱۲۰)

"تم ظاہری و باطنی دونوں قسم کے گناہ چھوڑ دو۔"

تا کہ جسم کے ساتھ دل بھی گناہوں کی گندگی سے پاک ہو جائے، بلکہ ظاہر سے زیادہ تو باطن اور دل کی پاکی وصفائی ضروری ہے، جیسے روزانہ ہم گھروں میں برتنوں کو باہر کے ساتھ اندر سے بھی دھوتے ہیں، بلکہ باہر سے زیادہ اندر سے دھونے اور پاک کرنے کی فکر کرتے ہیں، اسی طرح بدن کا بھی معاملہ ہے، کیوں کہ دل اللہ تعالیٰ کا مسکن اور سلطان الاعضاء ہے، اس لیے جیسے ہم گندی جگہ جانا پسند نہیں کرتے ہمارا رب بھی گندے دل میں آنا پسند نہیں کرتا، اور اگر دل گندہ ہو گیا تو جسم کے تمام اعضاء پر اس کے اثرات پڑیں گے، اس لیے طہارتِ قلب (دل کی صفائی) نہایت ضروری ہے، حدیث پاک میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی، چنانچہ مروی ہے:

عَنِ ابْنِ الْمُسَيِّبِ سَمِعَ يَقُوْلُ: "إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ يُحِبُّ الطَّيِّبَ، نَظِيْفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ، كَرِيْمٌ يُحِبُّ الْكَرَمَ، جَوَادٌ يُحِبُّ الْجُوْدَ، فَنَظِّفُوْا، -أُرَاهُ قَالَ: "أَفْنِيَتَكُمْ"- وَ لَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ، قَالَ: " ذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِمُهَاجِرِبْنِ مِسْمَارٍ، فَقَالَ: "حَدَّثَنِيْهِ عَامِرُبْنُ سَعْدٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَهُ، إِلَّا أَنَّهُ قَالَ: " نَظِّفُوْا أَفْنِيَتَكُمْ."

(رواه الترمذي، مشكوٰة: ۳۸۵)

"اللہ تعالیٰ (تمام عیوب ونقائص) سے پاک ہیں اور پاکی کو پسند کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کریم وسخی ہیں اور کرم وسخاوت کو پسند کرتے ہیں، تم لوگ صفائی اور پاکی کا خوب خیال رکھو۔ راویؒ کہتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ ابن مسیّبؒ نے یہ کہا کہ تم اپنے صحنوں (اور آنگنوں) کو صاف رکھو، اور یہودیوں کی مشابہت اختیار مت کرو، (کیوں کہ ان کے صحن اور آنگن کوڑے کرکٹ سے آلودہ اور خراب ہوتے ہیں)۔ راویؒ کا بیان ہے کہ میں نے یہ قول مہاجر بن مسمار سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ عامر بن سعدؒ نے اپنے والدؓ سے یہ روایت نقل

کی ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح فرمایا جس طرح سعید بن مسیّبؒ نے فرمایا، فرق اتنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اپنے گھروں کے صحن صاف ستھرے رکھو"۔

یعنی اس روایت میں "أَفْنِيَتَكُمْ" کا لفظ صراحۃً مذکور ہے، حضرت سعید بن مسیّبؒ کے قول کی طرح شک کے ساتھ نہیں ہے۔ اس میں ایک قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے گھر کے آنگن کی صفائی کی طرف توجہ دلائی تو گھر کے اندرون کی صفائی تو بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوئی، اور جب گھر کی صفائی ضروری ہے تو کپڑے کی صفائی بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگی، کیوں کہ گھر سے ہمارا تعلق ہر وقت نہیں رہتا، لیکن کپڑے سے ہمارا تعلق ہر وقت رہتا ہے، اور جب کپڑے کی پاکی وصفائی ضروری ہے: ﴿وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ○﴾ (المدثر: ٤) تو جسم کی صفائی و پاکی جس پر کپڑا پہنا جاتا ہے بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوئی، اور جب جسم کے ظاہر کا پاک صاف ہونا ضروری ہے تو دل جس پر جسم کا دارومدار ہے اس کا پاک صاف ہونا تو بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوا، اور دل کی پاکی میں پاک لوگوں کی صحبت کو بڑا دخل ہے، اس لیے ظاہر و باطن کی پاکی وصفائی کے لیے دعا اور توبہ کے ساتھ ذکر اللہ کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت کا اہتمام ہونا چاہیے، اور تو اور، خود رحمت عالم ﷺ بھی طہارتِ قلب کے لیے دعا کا اہتمام فرماتے تھے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أُمِّ مَعْبَدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِيْ مِنَ النِّفَاقِ، وَ عَمَلِيْ مِنَ الرِّيَاءِ، وَ لِسَانِيْ مِنَ الْكَذِبِ، وَ عَيْنِيْ مِنَ الْخِيَانَةِ، فَإِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ." (رواه البيهقي، مشكوٰة: ۲۲۰)

"حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا کہ اے اللہ! میرے دل کو (باطنی گناہوں یعنی) نفاق (وغیرہ) سے، میرے عمل کو ریا سے، میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھوں کو خیانت سے پاک فرما دے، بے شک تو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے مخفی بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔"

پاکی وصفائی کا چوتھا درجہ دل کو ماسوا اللہ سے پاک صاف رکھنا

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جب بندہ اپنے ارادہ واختیار سے ظاہر وباطن کی ظاہری وباطنی گندگی وناپاکی سے پاکی حاصل کر کے پاکی وصفائی کے تینوں درجات حاصل کر لیتا ہے تو پھر حق تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے اسے پاکی وصفائی کا چوتھا درجہ عطا فرما دیتے ہیں جو سب سے اعلیٰ ہے، اور وہ ہے ماسوا اللہ سے دل کو خالی اور پاک کر لینا، اس مخصوص مقام کے حصول کے بعد بندہ کے دل میں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی محبت ہوتی ہے، زبان پر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے، پھر اس کا ہر عمل حتیٰ کہ جینا اور مرنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو جاتا ہے، وہ بندہ اس آیت کریمہ کا مصداق بن جاتا ہے جس میں فرمایا:

﴿ إِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (الأنعام: ۱۶۲)

بقولِ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ: ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی	اب تو آ جا، اب تو خلوت ہو گئی
اک تم سے کیا محبت ہو گئی	ساری دنیا ہی سے نفرت ہو گئی
یاس ہی اب دل کی فطرت ہو گئی	آرزو جو کی وہ حسرت ہو گئی
دل میں داغوں کی کثرت ہو گئی	رونما اک شانِ وحدت ہو گئی
عشق میں ذلت بھی عزت ہو گئی	لی فقیری، بادشاہت ہو گئی

ظاہر ہے کہ پاکی وصفائی کے اس اعلیٰ درجہ کے حصول کے بعد اللہ تعالیٰ اور اس کا تعلق حاصل ہو جاتا ہے، جس سے بڑی کوئی نعمت اور دولت نہیں ہو سکتی۔

رزقنا اللّٰه تعالیٰ الطهارة و النظافة ظاهرا و باطنا بمنه و فضله... آمين يا رب العالمين.

۷/ شوال المکرّم/ ۱۴۳۷ھ

مطابق: ۱۳/ جولائی/ ۲۰۱۶ء، بروز بدھ، (بزمِ صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

243

(۳۹)

انٹرنیٹ مفید یا مضر؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ دَعَا إِلٰى هُدًى كَانَ لَهٗ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهٗ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا، وَ مَنْ دَعَا إِلٰى ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهٗ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا." (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۲۹/ باب الاعتصام بالکتاب والسنة/ الفصل الأول)

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی کو ہدایت کی دعوت دی تو اس (داعیٔ خیر وہدایت) کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس کی پیروی واتباع کرنے والے کو ملتا ہے، اور اس اتباع کرنے والے کے اجر وثواب میں کچھ بھی کمی نہیں ہوگی، (کیوں کہ اتباع کرنے والے کو تو اس کے عمل کی وجہ سے ثواب ملے گا، لیکن داعیٔ خیر وہدایت کو اس کی قولی، فعلی اور عملی دعوت کی وجہ سے ''الدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ'' کے قانون اور ضابطہ کے مطابق ثواب ملے گا) اور جو شخص کسی کو شر اور ضلالت ومعصیت کی طرف (اپنے قول یا عمل سے) دعوت دے تو اس داعیٔ

شر وضلالت کو بھی اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا کہ اس کی پیروی کرنے والے کو ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے اس کے مرتکب کے گناہوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔‘‘

انٹرنیٹ کی حقیقت:

اللہ رب العالمین کی عطا کردہ قوتِ عقل وفکر کو استعمال کر کے عصر حاضر کے انسان نے ایسی نئی نئی چیزیں ایجاد کی ہیں کہ ماضی میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، اُن جدید اکتشافات وایجادات کا ایک اہم حصہ انٹرنیٹ بھی ہے، ’’انٹر‘‘ بمعنی انٹری کرنا، داخل ہونا، ’’نیٹ‘‘ بمعنی جال، انٹرنیٹ کا مطلب ہے جال میں داخل ہونا، یہ ’’انٹرنیشنل نیٹ ورک‘‘ (International Network) کا مخفف ومختصر اور بہت سے نیٹ ورکز کا مجموعہ ہے، جو دنیا کے کمپیوٹروں، موبائلوں اور ان کے ذریعہ انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا اور منسلک کرتا ہے، اس کا خیال پہلی مرتبہ ساٹھ کی دہائی میں امریکی وزارتِ دفاع سے متعلق بعض ذمہ داروں کے ذہن میں آیا، جنہیں رابطہ کے لیے ایک ایسے نظام کی ضرورت محسوس ہوئی جو بیرونی حملہ یا نیوکلیر جنگ کے دوران جزوی طور پر تلف یا خراب ہونے کے باوجود کام کرتا رہے، اس لیے کہ مروّجہ نظام معمولی خرابی یا جزوی نقصان کی صورت میں مکمل طور پر معطل ہو جاتا تھا، چنانچہ اس کے لیے انٹرنیٹ کا نظام وضع کیا گیا، شروع میں اس کا استعمال امریکی وزارتِ دفاع کی حد تک محدود تھا، پھر بتدریج غیر سرکاری اِدارے اس سے منسلک ہوئے اور آج اس نے ایک وسیع عالمی نظام کی شکل اختیار کر لی۔

انٹرنیٹ کی اہمیت:

اس وقت انٹرنیٹ اپنی عالم گیر، وسیع اور بہت سی مفید خدمات کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل بن گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد میں آئے دِن غیر معمولی اِضافہ ہوتا جا رہا ہے، سرکاری اور غیر سرکاری اِدارے، دفاتر، اسکول، گھروں اور

عوامی جگہوں میں انٹرنیٹ کے اسیروں کو جابجا دیکھا جاسکتا ہے، کیا عوام اور کیا خواص، کیا بڑے اور کیا برے، کیا مرد اور کیا عورتیں، کیا بچے اور کیا بوڑھے، تقریباً ہر کوئی اس جال میں پھنسا ہوا نظر آتا ہے، کیوں کہ انٹرنیٹ نے کمپیوٹرز اور موبائلز کو علاء الدین کا چراغ بنا رکھا ہے، اس لیے کہ انٹرنیٹ کا استعمال کرنے والا جو بھی اچھی یا بری، کام کی یا بے کار معلومات اس سے طلب کرے تو وہ فوراً حاضر پائے گا، جس کی وجہ سے انٹرنیٹ نے دوسری بہت سی چیزوں سے لوگوں کو مستغنی بلکہ غفلت میں مبتلا کر کے اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔

انٹرنیٹ کا مفید اور جائز استعمال:

انٹرنیٹ کی اس اہمیت کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ اس کا استعمال مفید اور جائز بھی ہوسکتا ہے اور مضر و ناجائز بھی، کیوں کہ اس کے جہاں بہت سے فوائد ہیں وہیں غفلت کے ساتھ استعمال کرنے کے نقصانات بھی کم نہیں، اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ انٹرنیٹ ایک دودھاری تلوار ہے، اور اس کی وہی حیثیت ہے جو لقمان حکیم کے بقول دل اور زبان کی ہے، کہ ’’بہتر ہے تو بہترین ہے اور بدتر ہے تو بدترین۔‘‘ اگر انٹرنیٹ کا صحیح، جائز اور مفید استعمال ہو تو یہ دین کی دعوت واشاعت، تعلیم وتربیت، سیاحتی مقامات کی معلومات، دوست و احباب اور اعزہ واقرباء کے ساتھ مراسلت وملاقات کے علاوہ آپسی تعلقات، تجارت اور معاملات وغیرہ کا نہایت ہی آسان اور بہترین ذریعہ ہے۔

انٹرنیٹ کے ناجائز استعمال کے نقصانات:

اگر انٹرنیٹ کا مضر اور ناجائز استعمال کیا جائے تو اس کے بہت سے نقصانات بھی ہیں، اس صورت میں یہ اُم الفواحش اور اُم الخبائث ہونے کے ساتھ "إثمهما أكبر من نفعهما" کا مصداق بھی ہے، پھر یہ ایک شیطانی چال بھی ہے اور جال بھی، اس میں داخل ہونے والا بآسانی شیطان کا شکار ہو کر گمراہی میں پھنس جاتا ہے، اس لیے کہ پہلے جن

گمراہیوں، گناہوں اور برائیوں کی ترویج واشاعت اور جرائم کا ارتکاب بہت مشکل تھا، آج انٹرنیٹ کے مضر اور ناجائز استعمال کی نحوست سے بہت ہی آسان ہوگیا ہے، اس لیے کہتے ہیں کہ اگر رمضان المبارک میں شیطان کے ساتھ انٹرنیٹ کو بھی بند کر دیا جائے تو بہت سے لوگ واقعی شریف بن جائیں۔

پہلا نقصان، شہوت پرستی:

یوں تو انٹرنیٹ کا ناجائز استعمال بہت سی برائیوں کی جڑ ہے، مگر تین برائیاں اس کے ذریعہ بہت ہی عام ہوگئی ہیں: (۱) شہوت پرستی (۲) زناکاری (۳) برائی کی ترویج۔ انٹرنیٹ کے ناجائز استعمال کا پہلا بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے ہوس اور شہوت پرستی بہت ہی عام اور آسان ہوگئی، کسی زمانہ میں گندی اور برہنہ تصاویر، فلمیں اور بے حیائی والی سیریلس کا اتنا عموم وشیوع نہ تھا، آج انٹرنیٹ کی نحوست سے یہ سب چیزیں بہت عام اور آسان ہوگئیں، جن سے بچوں اور اچھوں تک کی خلوت خراب اور شہوت کی نذر ہوگئی، انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں پر ایک عام نشہ سوار ہو چکا ہے، نمازیں اور قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے، مگر احساس تک نہیں، قرآن کا فرمان ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴾ (مريم : ۵۹)

حق تعالیٰ نے مرضیاتِ ربانی پر خواہشاتِ نفسانی کو قربان کرنے والوں کا ذکر خیر کرنے کے بعد فرمایا: ''پھر ان کے بعد ایسے ناخلف اور نالائق آ گئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا (وقت بے وقت پڑھا، یا غفلت سے پڑھا) اور شہوتوں کا اتباع کیا (جو سارے گناہوں کی جڑ ہے) یہ لوگ عنقریب خرابی وبربادی دیکھیں گے۔

''غَيٌّ'' کے متعلق روح المعانی میں بحوالۂ ابن جریر اور طبرانی حضرت ابو امامہؓ سے

مرفوعاً نقل کیا گیا ہے کہ ''غَيٌّ'' جہنم کے نشیب میں ایک نہر ہے، جس میں دوزخیوں کا پیپ بہتا اور جمع ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ ''غَيٌّ'' دوزخ میں پیپ کی ایک نہر یا وادی ہے، جو خوب گہری ہے، اس کا مزہ بہت خبیث ہے، اس میں وہ لوگ ڈالے جائیں گے جو ناجائز خواہشات کا اتباع کرتے تھے۔ (انوار البیان: ۳/۴۷۶)

کر نفس کا مقابلہ بار بار تو   سو بار ہار کے بھی ہمت نہ ہار تو

جو لوگ انٹرنیٹ کا غلط اور ناجائز استعمال کرتے ہوئے اپنی ہوس اور شہوت پوری کرتے ہیں ان کے لیے بہت ڈرنے کا مقام ہے، کہیں یہ نیٹ ان کے لیے جہنم کا گیٹ نہ بن جائے اور یہ سوچا جائے کہ غلط پاس ورڈ سے ایک چھوٹا سا موبائل لاک نہیں کھلتا، تو خواہشاتِ نفسانی والی زندگی سے جنت کا دروازہ کیسے کھلے گا؟

دوسرا نقصان، زناکاری:

جہاں تک زناکاری کا تعلق ہے تو انٹرنیٹ کی ایجاد سے پہلے صنف مخالف سے رابطہ وتعلق آج جیسا آسان نہ تھا، آج انٹرنیٹ کے چیٹنگ کے ذریعہ یہ آسان ہوگیا ہے، انٹرنیٹ پر معاملہ چیٹنگ سے شروع ہو کر سیٹنگ تک پہنچ جاتا ہے، یعنی گفتگو ہائے ہیلو اور ایس ایم ایس سے تعلق شروع ہو کر تصاویر وتحائف کے تبادلہ کے ذریعہ ناجائز تعلق کو مضبوط کیا جاتا ہے، پھر خارج میں جرائم، زناکاری اور بدکاری کا ارتکاب کیا جاتا ہے، اس طرح انٹرنیٹ کا ناجائز استعمال زناکاری اور بدکاری کا آسان ذریعہ بن جاتا ہے، قرآنِ پاک کا فرمان ہے:

﴿ وَ لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰىٓ إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَّ سَآءَ سَبِيۡلًا ﴾ (بنی إسرائيل : ۲۲)

زناکاری گمراہی کا ذریعہ ہے، اس لیے اگر گمراہی سے بچنا چاہتے ہو تو زنا کے قریب بھی مت جاؤ، جو چیز تمہیں بدکاری اور زناکاری سے قریب کر دے، جو زنا کی راہوں کو

آسان کر دے اس سے بھی بچو، لہٰذا انٹرنیٹ کا ناجائز استعمال مت کرو، ایسا چیٹنگ اور
شیئرنگ مت کرو جو زنا کا ذریعہ بنے۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
(رحمت عالم ﷺ نے ایک تفصیلی خواب بیان فرمایا، جس کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ) آپ
ﷺ کا گزر ایک ایسے سوراخ پر ہوا جو تنور کی طرح تھا، اس میں جھانک کر دیکھا تو برہنہ مرد و
زن نظر آئے، جن کے نیچے سے آگ کی لپٹ اوپر آتی اور اس میں موجود مرد و زن چیختے
چلاتے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں (حضرت جبرئیل و میکائیل
علیہما السلام) سے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: "وَ الَّذِیْ رَأَیْتَهٗ فِیْ
الثَّقْبِ فَهُمُ الزُّنَاةُ". (مشکوٰۃ: ۳۹۶/ کتاب الرؤیا) اور آپ نے تنور نما سوراخ میں جو چیز
دیکھی وہ زنا کار مرد اور عورتیں تھیں۔ العیاذ باللّٰہ العظیم.

جو لوگ انٹرنیٹ پر ناجائز چیٹنگ اور شیئرنگ کے ذریعہ بدکاری و زناکاری کی راہ
اختیار کرتے ہیں ان کے لیے مقامِ عبرت ہے۔

تیسرا نقصان، برائی کی ترویج و اشاعت:

پھر چیٹنگ اور شیئرنگ کی یہ داستان یہیں ختم نہیں ہوجاتی؛ بلکہ انٹرنیٹ کا ناجائز
استعمال کرنے والے اپنے فیس بک، واٹس ایپ، شیئر ایٹ، ژینڈر، ژاپیا اور وائی فائی جیسی
ایپلیکیشنز (Applications) کے ذریعہ اپنے حلقوں اور گروپس میں گندی تصاویر اور
فلموں کو منتقل کر کے برائیوں کی ترویج و اشاعت اور نہ ختم ہونے والے گناہوں کے مرتکب
ہوتے ہیں اور اس طرح مذکورہ حدیث کا مصداق بنتے ہیں، جس میں ارشاد فرمایا گیا:

"مَنْ دَعَا إِلٰی هُدًی كَانَ لَهٗ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهٗ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ
مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا."

جس نے اپنے قول و عمل یا انٹرنیٹ پر چیٹنگ اور شیئرنگ کے ذریعہ خیر و بھلائی کی

ترویج و اشاعت کی، یا اس کا ذریعہ بنا، تو اس خیر کے داعی اور مبلغ کو خود اپنے عمل کا بھی ثواب
ملے گا اور اس کی دعوتِ خیر سے جتنے لوگ عمل کریں گے ان سب کا اجر و ثواب بھی ملے گا، مثلاً
کسی کی فکر، دعوت و تبلیغ یا بیان سن کر یا کتاب پڑھ سن کر ایک لاکھ لوگ نیک اور نمازی بن
گئے، تو اس داعی اور مبلغ یا مقرر اور مصنف کو ہر وقت ایک لاکھ لوگوں کی نیکی اور نماز کا ثواب
ان نیک نمازیوں کے اجر و ثواب میں کمی کے بغیر ملتا رہے گا، یہ امت محمدیہ پر فضل الٰہی ہے،
ورنہ عدلِ الٰہی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ﴿لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى﴾ (النجم: ۳۹) کہ ہر
شخص کو اسی عمل اور کوشش پر اجر و ثواب ملے جو اس نے کی ہے؛ لیکن حق تعالیٰ نے حضور ﷺ
کے صدقہ میں نیکی کی اشاعت کا ذریعہ بننے کے نتیجہ میں جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان
کے اجر و ثواب کا بھی حقدار بنا دیا، اور چوں کہ اس امت میں خیر کی اشاعت کا سب سے پہلا
ذریعہ ہمارے آقا ﷺ بنے، اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ قیامت تک جتنی خیر وجود
میں آئے گی اس کا اجر حضور ﷺ کو ملتا رہے گا، اسی کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ إِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ﴾ (القلم: ۳)

اور بلاشبہ آپ کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

لیکن اس کے برخلاف جو شخص "وَ مَنْ دَعَا إِلٰى ضَلَالَةٍ" کا مصداق بن کر اپنے
قول و عمل یا چیٹنگ اور شیئرنگ کے ذریعہ برائیوں اور گمراہیوں کی ترویج و اشاعت کرے گا تو
"كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهٗ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا." اس برائی
اور گمراہی کو پھیلانے کا وبال اور عذاب تو اس پر ہوگا ہی، ساتھ ساتھ جن لوگوں نے اس کی
پھیلائی ہوئی برائی کا ارتکاب کیا ہوگا ان کے عذاب میں کچھ کمی کیے بغیر ان سب کے برابر
عذاب اس برائی کی ترویج و اشاعت کرنے والے کو بھی ہوگا۔

اس میں گمراہیوں اور برائیوں کو ایجاد کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم شر اور
برائی کے پھیلنے کا ذریعہ بن گئے (العیاذ باللہ العظیم) تو تا قیامت جتنے لوگ اس برائی کے
مرتکب ہوں گے ان سب کا گناہ اور اس کا عذاب تم کو بھی زندگی میں اور موت کے بعد ملے گا،

اور یہ تمہارے اس شر اور برائی کو پھیلانے کی سزا ہے جو تم نے اپنے قول وعمل یا انٹرنیٹ کی چیٹنگ وشیئرنگ کے ذریعہ پھیلائی ہے۔

انٹرنیٹ کے ناجائز استعمال سے کیسے بچیں؟

اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ انٹرنیٹ کا ناجائز استعمال ہرگز نہ کیا جائے، لیکن یہ اس وقت آسان ہوگا جب ہم تنہائی میں مراقبہ، ذکر اللہ اور تعلق مع اللہ کے ذریعہ اپنے وِل پاور (قوتِ ارادی) کو مضبوط کریں، بوقتِ ضرورت جہاں تک ہو انٹرنیٹ کا استعمال خلوت اور تنہائی کے بجائے پبلک پلیس (عام جگہوں) میں کریں، اس سلسلہ میں ہمارا رویہ شہد مکھی کی طرح ہونا چاہیے، جو صرف پھولوں کا رَس چوستی ہیں، عام مکھی کی طرح نہیں، پھر بھی گناہ ہو جائے تو توبہ کریں، اس کے لیے اس حدیث کو مدنظر رکھنا بھی مفید ہوگا جس میں فرمایا گیا:

عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: "لَأَعْلَمَنَّ أَقْوَامًا مِنْ أُمَّتِي يَأْتُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِحَسَنَاتٍ أَمْثَالِ جِبَالِ تِهَامَةَ بِيْضًا، فَيَجْعَلُهَا اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ هَبَاءً مَنْثُوْرًا." قَالَ ثَوْبَانُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! صِفْهُمْ لَنَا، جَلِّهِمْ لَنَا؛ أَنْ لَا نَكُوْنَ مِنْهُمْ وَ نَحْنُ لَا نَعْلَمُ." قَالَ: "أَمَا إِنَّهُمْ إِخْوَانُكُمْ وَ مِنْ جِلْدَتِكُمْ، وَ يَأْخُذُوْنَ مِنَ اللَّيْلِ كَمَا تَأْخُذُوْنَ، وَ لٰكِنَّهُمْ أَقْوَامٌ إِذَا خَلَوْا بِمَحَارِمِ اللّٰهِ انْتَهَكُوْهَا."

(رواه ابن ماجه : ۳۱۳ / كتاب الزهد/ باب ذكر الذنوب)

"میں اپنی امت کے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو قیامت میں تہامہ (تہامہ: بحر احمد کے کنارے حجاز کا نشیبی علاقہ) کے پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر آئیں گے، مگر حق تعالیٰ ان کو غبار بنا کر غارت کر دے گا، حضرت ثوبانؓ نے عرض کیا کہ حضور! ان لوگوں کی علامتیں بیان فرما کر انہیں ہمارے سامنے واضح فرما دیجیے، تا کہ ہم بے خبر ہو کر ان میں سے نہ بن جائیں، فرمایا: "وہ تمہارے بھائی اور تمہاری برادری سے ہوں گے اور تمہاری طرح رات کی عبادت کا اہتمام بھی کریں گے، لیکن تنہائیوں میں جب اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے سابقہ پڑے گا تو وہ ان کا ارتکاب کریں گے۔" العیاذ باللہ۔

اس حدیث پاک میں غور وفکر سے کام لیا جائے تو ان شاء اللہ ہم انٹرنیٹ کے ناجائز استعمال اور مضر اثرات سے محفوظ رہیں گے۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا وَ اهْدِ بِنَا، وَاجْعَلْنَا سَبَبًا لِمَنِ اهْتَدىٰ.

اے اللہ! ہمیں ہدایت دے اور ہدایت کا ذریعہ بھی بنا اور ہمیشہ اپنی مرضیات پر چلنے اور نامرضیات سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔

۲/ ربیع الثانی/ ۱۴۳۸ھ

مطابق: یکم جنوری/ ۲۰۱۷ء/ بروز اتوار (بزم صدیقی، بڑودا)

نعمت وزحمت کا باعث ہے موبائل اے پسر!

یہ موبائل بھی خدا کی ایک نعمت ہے جناب — کال، میسج، نیٹ، وٹس، فیس بک ہے لا جواب
اس کا استعمال بالکل ٹھیک کرنا چاہیے — معصیت کی راہ پہ ہرگز نہ چلنا چاہیے
معصیت کا آخری انجام ہوتا ہے برا — یاد رکھو! یہ نصیحت ہے ہماری بے خطا
جو غلط کرتے ہیں استعمال اس کا اے فتا! — بالیقیں کرتوت سے اپنے وہ ہوتے ہیں فنا
یہ موبائل آگ کے مانند ہے یارانِ پاک! — لطف پاؤ! پا کے گھر اپنا جلا کے کر دو خاک
لذّت وشہوت پڑی رہ جائیں گی دنیا میں یار — دین داری اور نکوکاری ہے فقط پائے دار
بے ضرورت نہ کبھی مسکال دینی چاہیے — وقت راحت کال بھی ہرگز نہ کرنی چاہیے
سیدھی سادی کال ہی اپنے موبائل پر لگا — گانے یا سنگیت بیہودہ نہ تو اس پر بجا
نہ اَذان و آیاتِ قرآنی کا اس پر یوز کر — احترامِ دین کی جانب نظر مرکوز کر
نیک مجلس اور مسجد میں سویچ آف رکھ — خالق ہر دو جہاں کا کچھ تو پیارے خوف رکھ
راہ میں گاڑی چلاتے فون مت سن اے پسر! — اس طرح کے حادثوں کی خوب ملتی ہے خبر
ہے دعاءِ خیر کا طالب تمہارا یہ ظفرؔ — اے میرے احبابِ وٹسپ! اے رفیقانِ سفر!

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

(۴۰)

دنیوی زندگی با مقصد اور اُخروی زندگی قیمتی کیسے بنے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِبَعْضِ جَسَدِيْ، فَقَالَ: "كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ، وَ عُدَّ نَفْسَكَ فِيْ أَهْلِ الْقُبُوْرِ."

(رواه الترمذي، مشكوٰة : ٤٥٠، باب الأمل و الحرص، الفصل الأول)

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے میرے جسم کا ایک حصہ پکڑ کر فرمایا: ''دنیا میں اس طرح رہو گویا تم اجنبی ہو، بلکہ راہ گیر مسافر ہو اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو۔''

دنیوی زندگی قیمتی ہونے کے باوجود عارضی ہے:

اللہ رب العزت نے اس دنیا کو فنا کے اصول پر پیدا فرمایا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی

ذات کے علاوہ یہاں کی ہر چیز فانی ہے، ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ (الرحمٰن : ٢٦) دنیا کی زندگی بھی نہایت قیمتی ہونے کے باوجود عارضی، وقتی اور فانی ہے، اس فانی دنیا میں انسان مختصر مدت کے لیے مسافر کی حیثیت سے مقیم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس فانی دنیا میں چند روزہ زندگی اپنی بندگی اور مرنے کے بعد یعنی آخرت کی تیاری کے لیے عطا کی ہے، غور کیا جائے تو اس سچائی سے بے خبر یا غافل رہنے والا انسان ہی طرح طرح کی برائی اور معاصی میں مبتلا ہو جاتا ہے، ورنہ جن لوگوں کو اس حقیقت کا یقین ہوتا ہے وہ اس فانی دنیا کی چند روزہ زندگی کو با مقصد طور پر گزارتے ہیں، موت سے پہلے ہی مابعد الموت کی تیاری کر کے اُسے قیمتی بنا لیتے ہیں، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے ہیں۔

جیسا کہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ کسی جنازہ میں تشریف لے گئے، تدفین کے بعد آپؒ نے فرمایا کہ لوگو! مرحوم کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اسے دنیا میں واپس لوٹا دیا جائے تو وہ کیا کرنا پسند کرے گا؟ جواباً کسی نے عرض کیا کہ توبہ واستغفار کا التزام اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرے گا، قرآنِ کریم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں مجرم لوگ حسرت کے ساتھ کہیں گے:

﴿رَبَّنَآ أَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوْقِنُوْنَ﴾ (السجدة : ١٢)

مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے، تاکہ اب ہم اعمالِ صالحہ کا اہتمام کریں، ہم با مقصد زندگی گزار کر آئیں گے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: لوگو! مرنے والے کے لیے تو اب اس کا موقع نہیں رہا، البتہ تمہارے اور ہمارے لیے موت سے پہلے تک اس کا موقع ہے، موت کے بعد کسی کے لیے کوئی موقع نہیں۔

لہٰذا اس فانی دنیا کی عارضی زندگی کو توبہ واستغفار کے التزام اور اعمالِ صالحہ کے اہتمام کے ساتھ با مقصد بنا لو، تاکہ موت کے بعد والی دائمی زندگی میں کامیابی مقدر بن

جائے۔

دنیوی زندگی کو بامقصد بنالو:

قرآن وحدیث میں جگہ جگہ اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، مثلاً قرآنِ کریم نے آلِ فرعون کے ایک مومن (جو فرعون کا چچازاد بھائی یا ولی عہد یا پھر اس کے محکمۂ پولس کا ذمہ دار تھا۔ انوار البیان: ۴/ ۶۳۸) کی نصیحت نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿یٰقَوۡمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا مَتَاعٌ ۫ وَّ اِنَّ الۡاٰخِرَۃَ هِیَ دَارُ الۡقَرَارِ○ مَنۡ عَمِلَ سَیِّئَۃً فَلَا یُجۡزٰۤی اِلَّا مِثۡلَهَا ۚ وَ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ یُرۡزَقُوۡنَ فِیۡهَا بِغَیۡرِ حِسَابٍ○﴾ (المؤمن: ۳۹ - ۴۰)

"اے میری قوم! یہ دنیوی زندگی تو بس تھوڑا سا (چند روزہ) مزہ ہے اور یقین جانو کہ آخرت ہی (دائمی) رہنے بسنے کا اصل مقام ہے، اور جس شخص نے کوئی برائی کی ہوگی اُسے اسی کے برابر بدلہ دیا جائے گا، اور جس نے نیک کام (یعنی توبہ کا التزام اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام) کیا ہوگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جب کہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، جہاں اُنہیں بے حساب رزق دیا جائے گا۔"

اس آیت کریمہ میں آلِ فرعون کے مردِ مومن نے جو قیمتی نصیحت فرمائی اس کا خلاصہ یہی ہے کہ لوگو! جب دنیوی زندگی نہایت مختصر ہے تو اس کو بامقصد بنالو، دنیوی زندگی کو شریعت کی ہدایات کے مطابق گزار کر اس کی ہر ساعت کو طاعت والی بنالو، تاکہ آخرت کی دائمی زندگی قیمتی اور کامیابی والی ہو جائے، لیکن اگر تم نے بے مقصد اور غفلت ومعصیت والی زندگی گزاری ہوگی تو آخرت میں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی، البتہ اگر توبہ کا التزام اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرلیا تو پھر آخرت کی دائمی زندگی قیمتی بن جائے گی اور وہاں کی کامیابی یقینی ہو جائے گی۔

سمجھدار وہ ہے جو بامقصد زندگی گزارے:

حدیث مذکور میں رحمت عالم ﷺ کی جو نصیحت منقول ہے اس میں بھی گویا اسی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس پیاری نبوی نصیحت کو صحیح طور پر سمجھ کر کماحقہ اس پر عمل کرلیا جائے تو بالیقین دنیوی زندگی بامقصد اور اُخروی زندگی قیمتی بن جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک موقع پر سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کو مخصوص اور پیار بھرے انداز میں نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "کُنۡ فِیۡ الدُّنۡیَا کَاَنَّکَ غَرِیۡبٌ، اَوۡ عَابِرُ سَبِیۡلٍ." "دنیا میں اجنبی بلکہ راہ گیر (مسافر) کی طرح زندگی گزارو۔"

صاحب جوامع الکلم ﷺ کی اس مختصر مگر پراثر نصیحت سے چند اشارے ملتے ہیں:

اس میں **ایک اشارہ** تو یہ ملتا ہے کہ جس طرح دنیا میں کوئی شریف اور سمجھدار آدمی بے مقصد سفر نہیں کرتا اور ہمیشہ مقصد سفر پیش نظر رکھ کر نظام بناتا ہے اسی طرح دنیا میں کوئی مومن (شریف اور سمجھدار بندہ) بھی بے مقصد زندگی نہیں گزار سکتا اور ہمیشہ مقصد زندگی کو پیش نظر رکھ کر اپنا نظام الاوقات بناتا ہے اور مومن بندہ کا مقصد زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی، اس کا قرب اور خوشنودی ہے، اور یہ چیزیں توبہ کے التزام اور اعمالِ صالحہ کے اہتمام سے حاصل ہوتی ہیں، لہٰذا اس بات کی فکر اور کوشش کرنے والا ہی درحقیقت سمجھدار اور ہوشیار ہے۔

اسی لیے حدیث پاک میں اس شخص کو دانشمند، ہوشیار اور عقلمند قرار دیا گیا ہے جو دنیوی زندگی کو بامقصد بنا کر اُخروی زندگی کو قیمتی بنانے کے لیے موت سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی بندگی اور آخرت کی تیاری کا اہتمام کرے، ارشادِ نبوی ہے:

عَنۡ شَدَّادِ بۡنِ اَوۡسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلۡکَیِّسُ مَنۡ دَانَ نَفۡسَهٗ وَ عَمِلَ لِمَا بَعۡدَ الۡمَوۡتِ، وَ الۡعَاجِزُ مَنۡ اَتۡبَعَ نَفۡسَهٗ هَوَاهَا، وَ تَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ." (رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ۴۵۱، باب استحباب المال والعمر للطاعة)

"عقلمند اور ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس کو مطیع، فرماں بردار اور تابع بنالے، (اس کے

بغیر توبہ کا التزام اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام مشکل ہے) اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کرے، اور نادان وہ ہے جو نفس کا فرماں بردار اور تابع دار بن جائے اور اللہ تعالیٰ سے (عمل کے بغیر یا بدعملی کے ساتھ) آرزوئیں اور اُمیدیں لگائے رکھے۔''

بامقصد زندگی گزارنے والا محض ضروریاتِ زندگی پر اکتفا کرتا ہے:

حدیث پاک میں "كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ." سے **دوسرا اشارہ** یہ ملتا ہے کہ سمجھ دار مسافر اس حقیقت سے واقف ہوتا ہے کہ سفر میں اس کا قیام چند روزہ ہے، اس لیے زیادہ ساز وسامان اپنے ساتھ نہیں رکھتا، اسی طرح بامقصد زندگی گزارنے والا خواہشات اور سہولیات کے پیچھے پڑنے کے بجائے محض ضروریاتِ زندگی پر اکتفا کر لیتا ہے، آپ ﷺ اس پیاری اور قیمتی نصیحت کے ذریعہ یہی بتانا چاہتے ہیں کہ تم بھی دنیا میں مسافر ہو، یہاں تمہارا قیام بھی چند روزہ ہے، اس لیے دُنیا میں زیادہ ساز وسامان جمع کرنے کی فکر مت کرو، بہترین سامان تو تقویٰ ہے، ﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ (البقرة : ۱۹۷) اس لیے تقویٰ کے ساتھ یہاں تمہاری جائز ضروریات پوری ہو جائیں تو کافی ہے، خواہشات اور سہولیات تو ان شاء اللہ آخرت اور جنت ہی میں پوری ہوں گی۔

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بامقصد زندگی گزارنے کے ساتھ اگرچہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے سہولیات کا انتظام کرنا جائز تو ہے، لیکن اگر تقویٰ کے ساتھ کسی کو بوقت ضرورت بقدرِ ضرورت روٹی، کپڑا اور مکان مل جائے تو پھر اس سے زیادہ کی فکر میں نہیں رہنا چاہیے، اسی میں عافیت اور حسابِ آخرت سے حفاظت ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "لَيْسَ لِابْنِ آدَمَ حَقٌّ فِي سِوٰى هٰذِهِ الْخِصَالِ، بَيْتٌ يَسْكُنُهُ، وَثَوْبٌ يُوَارِي عَوْرَتَهُ، وَجِلْفُ الْخُبْزِ وَ

الْمَاءُ." (مشكوٰة : ۳٦۹، باب الضيافة / الفصل الثالث)

''ابن آدم کا ان (تین) چیزوں کے سوا کسی چیز میں کوئی حق نہیں: (۱) وہ گھر جس میں رہ سکے۔ (۲) وہ کپڑا جس سے ستر ڈھانک سکے۔ (۳) اور روٹی کا ٹکڑا اور پانی۔''
کیوں کہ یہ وہ ضروریاتِ زندگی ہیں جن کے بغیر کوئی چارہ نہیں، اس لیے اگر جائز طریقے سے ان ضروریات کو پورا کیا گیا تو ان شاء اللہ آخرت میں کم از کم ان کے متعلق سوال نہ ہوگا، جیسا کہ مسند احمد اور بیہقی کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

الغرض جس طرح سمجھ دار مسافر دورانِ سفر محض ضروریات پر اکتفا کر لیتا ہے، اسی طرح مومن کو بھی دنیا میں جائز ضروریات پر اکتفا کر لینا چاہیے، جیسا کہ خود حضور ﷺ کا یہی معمول اور طریقہ رہا ہے۔

دُنیا سفر کی ایک منزل ہے، وطن نہیں:

اِرشادِ نبوی "كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ." سے **تیسرا اشارہ** یہ ملتا ہے کہ ایک سمجھ دار مسافر اس حقیقت سے باخبر ہوتا ہے کہ دورانِ سفر وہ جہاں بھی جائے اور رہے، لیکن بہرحال وہ جگہ اس کے سفر کی ایک منزل ہے، اس کا اصلی وطن اور مسکن نہیں، آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ٹھیک اسی طرح مومن بندے کو بھی اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے کہ وہ دنیا میں جہاں بھی جائے اور رہے، بہرحال یہ دنیا اس کے سفر کی ایک منزل ہے، اصلی وطن اور مسکن نہیں، بقول شاعر:

مسافر خانۂ دنیا میں جو آیا، ہوا راہی　　یہ منزلِ آمد ورفت ہے، اس میں کسی کا وطن نہیں

حدیث پاک میں وارد ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَامَ عَلٰى حَصِيْرٍ، فَقَامَ، وَقَدْ أَثَّرَ فِيْ جَسَدِهٖ، فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍؓ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! لَوْ أَمَرْتَنَا أَنْ نَبْسُطَ لَكَ وَنَعْمَلَ، فَقَالَ:

''مَا لِیْ وَ لِلدُّنْیَا ؟ وَ مَا اَنَا وَ الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ، ثُمَّ رَاحَ وَ تَرَکَھَا.'' (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ:۴۴۲، کتاب الرقاق)

''رحمت عالم ﷺ ایک مرتبہ چٹائی پر آرام فرما رہے تھے، جب اُٹھے تو جسد اطہر پر چٹائی کے نشان پڑ گئے، حضرت ابن مسعودؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر آپ کی اِجازت ہو تو ہم آپ کے لیے کسی عمدہ بچھونے کا انتظام کر کے بچھا دیا کریں، تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے دنیا سے کیا واسطہ؟ بس صرف اِتنا ہی واسطہ ہے کہ جیسے کوئی سوار (مسافر یا راہ گیر) کسی درخت کے سایہ تلے بیٹھ کر (تھوڑی دیر آرام کر کے یا ضرورت سے فارغ ہو کر) اُسے چھوڑ کر آگے چل دے۔''

جیسے ایک سمجھ دار مسافر دورانِ سفر کسی ہوٹل وغیرہ میں کھانے اور قضاءِ حاجت وغیرہ کے لیے قیام کر کے چل دیتا ہے، یا اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ذرا سا رُک کر آگے کوچ کر جاتا ہے، وہاں کی زیب و زینت میں مشغول ہو کر مقصدِ سفر سے غافل نہیں ہو جاتا، بالکل یہی حال ایک مومن کا بھی ہونا چاہیے، یہ دنیا سفر کی ایک مختصر منزل ہے، اس میں چند روزہ قیام آخرت کی تیاری کے لیے ہے، اس لیے اس کی زیب و زینت میں مشغول ہو کر مقصدِ زندگی سے غافل نہیں ہونا چاہیے، خود حق تعالیٰ نے اس کی نصیحت فرمائی ہے:

﴿فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا﴾ (الفاطر: ۵)

میرے بندو! دیکھو، کہیں دنیا کی رنگینی اور اس کی خوبصورتی تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے، اس کی زیب و زینت میں مست ہو کر مقصدِ زندگی اور آخرت کی تیاری سے غافل نہ ہو جانا، بقول خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ:

رہ کے دنیا میں زیبا نہیں بشر کو غفلت ۔۔۔ موت کا دھیان بھی لازم ہے کہ ہر آن رہے
جو بشر آتا ہے دنیا میں، یہ کہتی ہے قضا ۔۔۔ میں بھی پیچھے چلی آتی ہوں، ذرا دھیان رہے

دنیا سے دل لگانا دانائی نہیں:

فرمانِ نبوی ''کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ.'' سے **چوتھا اشارہ** یہ بھی ملتا ہے کہ جب دنیا تمہارے سفر کی ایک منزل ہے، وطن نہیں، تو دنیا و مافیہا سے دل لگانا بھی دانائی اور سمجھ داری نہیں ہے، جیسے ایک مسافر کو دورانِ سفر کسی منزل پر خواہ کتنی ہی سہولتیں میسر آجائیں، مگر اس کا دِل اپنے وطن ہی میں اٹکا رہتا ہے، بقولِ شاعر:

مسافر ہر کجا باشد، وطن را یاد می دارد ۔۔۔ چوں بلبل در قفس باشد، چمن را یاد می دارد

ترجمہ: مسافر جہاں بھی رہے وطن کو یاد رکھتا ہے، جیسے بلبل پنجرے میں ہوتے ہوئے چمن کو یاد رکھتی ہے۔

ایسے ہی ایک مومن کامل کو اس دنیوی مسافر خانہ میں خواہ کتنی ہی سہولتیں مل جائیں، مگر اس کا دل اپنے اصلی وطن یعنی آخرت اور جنت ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے اور وہ اُسے کبھی نہیں بھولتا، اس کی ساری فکریں، کوششیں اور توجہات اصلی وطن آخرت اور جنت کی طرف ہوتی ہیں، مومن کی شان یہ نہیں کہ وہ دنیا میں اپنا دل لگائے، اسے اپنا اصلی وطن سمجھ کر اسی پر مطمئن ہو جائے اور آخرت اور جنت کو یعنی وطن اصلی کو بھول جائے، اس لیے کہ یہ تو بے ایمان کی پہچان ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِھَا وَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝﴾ (یونس: ۷-۸)

''بلاشبہ جو لوگ ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں رکھتے اور دُنیوی زندگی پر قانع اور مطمئن ہو گئے اور ہماری آیات سے غافل ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ ان کے اعمالِ (بد) کی وجہ سے دوزخ ہی ہے۔''

اس سے **معلوم** ہوا کہ ایک مومن بندے کی یہ شان نہیں کہ وہ دنیا کو اپنا اصلی وطن سمجھ

کر اس پر مطمئن ہو جائے اور اپنی ساری توجہات کا مرکز دنیا ہی کو بنالے، ایک مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ دنیا میں تو رہتا ہے، لیکن دنیا کو دل میں نہیں رکھتا، وہ دنیا میں ایسے رہتا ہے جیسے کشتی پانی میں، اس کے دل میں دنیا کی عظمت کے بجائے حقارت ہوتی ہے، اس لیے اس کی ساری رغبت آخرت ہی کی طرف ہوتی ہے، سرکارِ دوعالم ﷺ نے اپنی امت کے دلوں میں دنیا کی حقارت اور آخرت کی رغبت پیدا کرانے کے لیے ارشاد فرمایا:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "الدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهٗ، وَ مَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهٗ، وَ لَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهٗ." (رواه أحمد، مشكوٰة: ٤٤٤، كتاب الرقاق، الفصل الثالث)

"یہ دنیا اُس کا گھر ہے (یعنی دنیا کو اپنا اصلی وحقیقی وطن اور مسکن وہی سمجھتا ہے) جسے آخرت و جنت پر یقین نہیں اور وہاں کے دائمی گھر کی اُسے فکر نہیں، یہ اُس کا مال ہے جس کا آخرت اور جنت میں کوئی مال نہیں، اور یہاں کے مال و دولت کو وہی جمع کرتا ہے جس میں کچھ بھی عقل اور سمجھ داری نہیں۔"

دنیا سے بے تعلقی حدیث کا اصل پیغام ہے:

ان حقائق کو مزید ذہن نشین کرانے کے لیے آگے ارشاد فرمایا: "وَ عُدَّ نَفْسَكَ فِيْ أَهْلِ الْقُبُوْرِ." دنیا مچھر کا پر اور دھوکہ کا گھر ہے، اس لیے یہاں رہ کر بھی اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرو۔ جیسے مرنے والوں کا بظاہر دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، تمہارا ابھی دنیا و مافیہا سے کوئی خاص دلی لگاؤ اور تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو مقصدِ زندگی مت بناؤ، اسے اپنی ضرورت سمجھو، اس لیے دنیا سے تمہارا تعلق بقدرِ ضرورت ہی ہونا چاہیے، یہی دنیا سے بے تعلقی کا مطلب اور حدیث کا اصل پیغام ہے، اس کے بغیر دنیا میں بامقصد زندگی گزارنا مشکل ہے۔

علاوہ ازیں حدیث پاک کے اخیری جملے "وَ عُدَّ نَفْسَكَ فِيْ أَهْلِ الْقُبُوْرِ." سے دوسرا اشارہ یہ بھی ملتا ہے کہ دنیا تمہارے لیے جیل یا مسافر خانہ ہے، اور تم دنیا میں بحیثیت

مسافر یا راہ گیر کے ہو، جب کہ آخرت میں جنت تمہارا وطن اصلی اور منزلِ حقیقی ہے، اس لیے اپنے آپ کو دنیا والوں میں شمار کرنے کے بجائے مرنے والوں میں شمار کرو، تاکہ مرنے کے بعد والی وطنِ اصلی کی دائمی زندگی کی فکر اور تیاری کرسکو، اس کے بغیر دنیا میں بامقصد زندگی مشکل ہے۔

جن لوگوں نے ان حقائق کو سمجھ لیا کہ دنیا کی زندگی قیمتی ہونے کے باوجود عارضی اور فانی ہے، اس میں ہمارا مختصر قیام اللہ تعالیٰ کی بندگی اور آخرت کی تیاری کے لیے ہے، اور یہ ہمارے سفر کی منزل ہے، وطنِ اصلی اور منزلِ مقصود نہیں، انہوں نے دنیا سے دھوکہ نہیں کھایا اور بقدرِ ضرورت ہی تعلق رکھا۔

ایک عبرت انگیز حکایت:

اس سلسلہ میں ایک نہایت عبرت انگیز واقعہ ہے کہ ہارون رشید کا ایک بیٹا تھا، جس کی عمر تقریباً سولہ سال کی تھی، لیکن اس عمر میں بھی وہ کثرت سے بزرگوں کی مجلس میں رہا کرتا تھا اور اکثر قبرستان چلا جاتا، وہاں جا کر قبرستان کے مردوں سے خطاب کر کے کہتا کہ تم لوگ ہم سے پہلے دنیا میں تھے، دنیا کے مالک تھے، لیکن اس دنیا نے تمہیں نجات اور مہلت نہ دی، حتیٰ کہ تم قبروں میں پہنچ گئے، کاش! مجھے کسی طرح خبر ہوتی کہ تم پر کیا گزری ہے اور تم سے کیا کیا سوال و جواب ہوئے ہیں، (تو میں اس کی ہمہ وقت فکر اور تیاری میں رہتا) اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتا:

تَرُوْعُنِي الجَنَائِزُ كُلَّ يَوْمٍ   وَ يُحْزِنُنِي بُكَاءُ النَّائِحَاتِ

"مجھے جنازے ہر دِن ڈراتے ہیں اور اُن پر رونے والیوں کی آوازیں مجھے غمگین رکھتی ہیں۔" (ان چیزوں نے میری دُنیا کو بدمزہ کر دیا)۔

ایک دِن وہ اپنے باپ (بادشاہ) کی مجلس میں آیا، اس کے پاس وُزراء واُمراء سب جمع تھے اور لڑکے کے بدن پر حسبِ معمول ایک معمولی سا کپڑا اور سر پر ایک لنگی بندھی ہوئی

تھی، اراکین سلطنت آپس میں کہنے لگے کہ اس پاگل لڑکے کی حرکتوں نے امیر المومنین کو بھی دوسرے بادشاہوں کی نگاہ میں ذلیل کر دیا ہے، اگر امیر المومنین اُس کو تنبیہ کریں تو شاید یہ اپنی اس حالت سے باز آجائے، امیر المومنین نے یہ بات سن کر اس سے کہا کہ بیٹا! تو نے مجھے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل کر رکھا ہے، اس نے یہ بات سن کر باپ کو تو کوئی جواب نہیں دیا، لیکن ایک پرندہ وہاں بیٹھا تھا اس کو کہا کہ اس ذات کا واسطہ جس نے تجھے پیدا کیا، تو میرے ہاتھ پر آکر بیٹھ جا، وہ پرندہ وہاں سے اُڑ کر اُس کے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا، پھر کہا: اب اپنی جگہ چلا جا، وہ ہاتھ پر سے اُڑ کر اپنی جگہ چلا گیا، اس کے بعد اُس نے عرض کیا کہ ابا جان! اصل میں آپ جو دنیا سے محبت کر رہے ہیں اُس نے مجھے رُسوا کر رکھا ہے، اب میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ سے جدائی اختیار کر لوں، یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا اور ایک قرآن شریف صرف اپنے ساتھ لیا، چلتے ہوئے ماں نے ایک بہت قیمتی انگوٹھی بھی اس کو دے دی (کہ احتیاج کے وقت اس کو فروخت کر کے کام میں لائے) وہ یہاں سے چل کر بصرہ پہنچ گیا اور مزدوروں میں کام کرنے لگا، ترتیب یہ تھی کہ ہفتہ میں صرف ایک دِن شنبہ کو مزدوری کرتا اور آٹھ دِن تک وہ مزدوری کے پیسے خرچ کرتا اور آٹھویں دِن پھر شنبہ کو مزدوری کر لیتا اور ایک درہم اور ایک دانق (یعنی درہم کا چھٹا حصہ) مزدوری لیتا، اس سے کم یا زیادہ نہ لیتا، ایک دانق روزانہ خرچ کرتا۔

ابو عامر بصریؒ کہتے ہیں کہ میری ایک دیوار گر گئی تھی، اس کو بنوانے کے لیے میں کسی معمار کی تلاش میں نکلا (کسی نے بتایا ہوگا کہ یہ شخص بھی تعمیر کا کام کرتا ہے) میں نے دیکھا کہ نہایت خوب صورت لڑکا بیٹھا ہے، ایک زنبیل پاس رکھی ہے اور قرآن شریف دیکھ کر پڑھ رہا ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ لڑکے! مزدوری کرو گے؟ کہنے لگا: کیوں نہیں کریں گے؟ آپ بتائیں، کیا خدمت مجھ سے لینی ہے؟ میں نے کہا: گارے مٹی (تعمیر) کا کام لینا ہے، اس نے کہا کہ ایک درہم اور ایک دانق مزدوری ہوگی اور نماز کے اوقات میں کام نہیں کروں گا، مجھے نماز کے لیے جانا ہوگا، میں نے دونوں شرطیں منظور کر لیں اور اس کو لا کر کام پر

لگا دیا، مغرب کے وقت جب میں نے دیکھا تو اس نے دس آدمیوں کے بقدر کام کیا، میں نے اس کو مزدوری میں دو درہم دیے، اس نے شرط سے زائد لینے سے انکار کر دیا اور ایک درہم اور ایک دانق لے کر چلا گیا، دوسرے دِن میں پھر اس کی تلاش میں نکلا، مگر وہ مجھے کہیں نہ ملا، میں نے لوگوں سے تحقیق کی کہ ایسی ایسی صورت کا ایک لڑکا مزدوری کیا کرتا ہے، کسی کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ملے گا؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ صرف شنبہ ہی کے دِن مزدوری کرتا ہے، اس سے پہلے تمہیں کہیں نہیں ملے گا، مجھے اس کے کام کو دیکھ کر ایسی رغبت ہوئی کہ میں نے آٹھ دِن اپنی تعمیر بند رکھی اور شنبہ کے دِن اس کی تلاش میں نکلا، وہ اسی طرح بیٹھا قرآن شریف پڑھتا ہوا ملا، میں نے سلام کیا اور مزدوری کرنے کو پوچھا، اس نے وہی پہلی دو شرطیں بیان کیں، میں نے منظور کر لیں، وہ میرے ساتھ آکر کام میں لگ گیا، مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ پچھلے شنبہ کو اس اکیلے نے دس آدمیوں کا کام کس طرح کر لیا، اس لیے اس مرتبہ میں نے اس طرح چھپ کر کہ وہ مجھے نہ دیکھے اس کے کام کرنے کا طریقہ دیکھا، تو یہ منظر دیکھا کہ وہ ہاتھ میں گارا لے کر دیوار پر ڈالتا ہے اور پتھر اپنے آپ ہی ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے چلے جاتے ہیں، مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اللہ تعالیٰ کا ولی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کی غیب سے مدد ہوتی ہی ہے، جب شام ہوئی تو میں نے اس کو تین درہم دینا چاہے، اس نے لینے سے انکار کر دیا کہ میں اِتنے درہم کا کیا کروں گا؟ اور ایک درہم اور ایک دانق لے کر چلا گیا۔

میں نے ایک ہفتہ پھر انتظار کیا اور تیسرے شنبہ کو پھر میں اس کی تلاش میں نکلا؛ مگر وہ مجھے نہ ملا، میں نے لوگوں سے تحقیق کی، ایک شخص نے بتایا کہ وہ تین دن سے بیمار ہے، فلاں ویرانہ جنگل میں پڑا ہے، میں نے ایک شخص کو اُجرت دے کر اس پر راضی کیا کہ وہ مجھے اس جنگل میں پہنچا دے، وہ مجھے ساتھ لے کر اس ویران جنگل میں پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ وہ بے ہوش پڑا ہے، آدھی اینٹ کا ٹکڑا سر کے نیچے رکھا ہوا ہے، میں نے اس کو سلام کیا، اس نے جواب نہ دیا، میں نے دوسری مرتبہ سلام کیا، تو اس نے (آنکھ کھولی اور) مجھے پہچان لیا،

میں نے جلدی سے اس کا سر اینٹ سے اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا، اس نے سر ہٹا لیا اور چند شعر پڑھے، جن میں سے دو یہ ہیں:

يَا صَاحِبِی ! لَا تَغْتَرِرْ بِتَنَعُّمٍ ۔۔۔ فَالْعُمْرُ يَنْفَدُ وَ النَّعِيْمُ يَزُوْلُ
وَ إِذَا حَمَلْتَ عَلَى الْقُبُوْرِ جَنَازَةً ۔۔۔ فَاعْلَمْ بِأَنَّكَ بَعْدَهَا مَحْمُوْلُ

"میرے دوست! دنیا کی نعمتوں سے دھوکہ میں نہ پڑ، عمر ختم ہوتی جا رہی ہے اور یہ نعمتیں سب ختم ہو جائیں گی، جب تو کوئی جنازہ لے کر قبرستان میں جائے تو یہ سوچتا رہ کہ تیرا بھی ایک دِن اسی طرح جنازہ اُٹھایا جائے گا۔"

اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ ابو عامر! جب میری روح نکل جائے تو مجھے نہلا کر میرے اسی کپڑے میں مجھے کفن دے دینا، میں نے کہا: میرے محبوب! اس میں کیا حرج ہے کہ میں تیرے کفن کے لیے نئے کپڑے لے آؤں؟ اس نے جواب دیا کہ نئے کپڑوں کے زندہ لوگ زیادہ مستحق ہیں، (یہ جواب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کا ہے، انہوں نے بھی اپنے وصال کے وقت یہی جواب دیا تھا) لڑکے نے کہا: کفن تو (پرانا ہو یا نیا، بہرحال) بوسیدہ ہو جائے گا، آدمی کے ساتھ تو صرف اس کا عمل ہی رہتا ہے، اور یہ میری لنگی اور لوٹا قبر کھودنے والے کو مزدوری میں دے دینا، اور یہ انگوٹھی اور قرآن شریف ہارون رشید تک پہنچا دینا اور اس کا خیال رکھنا کہ خود اُن ہی کے ہاتھ میں دینا اور یہ کہہ کر دینا کہ ایک پردیسی لڑکے کی یہ میرے پاس امانت ہے اور آپ سے یہ کہہ گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اسی غفلت اور دھوکہ کی حالت میں آپ کی موت آ جائے، یہ کہہ کر اس کی روح نکل گئی، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ لڑکا شہزادہ تھا۔

اس کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے موافق میں نے اس کو دفن کر دیا اور دونوں چیزیں گورکن کو دے دیں اور قرآن پاک اور انگوٹھی لے کر بغداد قصر شاہی کے قریب پہنچا تو بادشاہ کی سواری نکل رہی تھی، میں ایک اونچی جگہ کھڑا ہو گیا، اوّل ایک بہت بڑا لشکر

نکلا، جس میں تقریباً ایک ہزار گھوڑے سوار تھے، اس کے بعد اسی طرح یکے بعد دیگرے دس لشکر نکلے، ہر ایک میں تقریباً ایک ہزار سوار تھے، دسویں جتھے میں خود امیر المومنین بھی تھے، میں نے زور سے آواز دے کر کہا کہ اے امیر المومنین! آپ کو حضور اقدس ﷺ کی قرابت و رشتہ داری کا واسطہ، ذرا سا توقف کر لیجیے! میری آواز پر انہوں نے مجھے دیکھا تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا کہ میرے پاس ایک پردیسی لڑکے کی یہ امانت ہے، جس نے مجھے یہ وصیت کی تھی کہ یہ دونوں چیزیں آپ تک پہنچا دوں، بادشاہ نے ان کو دیکھ کر (پہچان لیا) تھوڑی دیر سر جھکایا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ایک دربان سے کہا کہ اس آدمی کو اپنے ساتھ رکھو، جب میں واپسی پر بلاؤں تو میرے پاس پہنچا دینا، جب وہ باہر سے واپسی پر مکان پہنچے تو محل کے پردے گروا کر دربان سے فرمایا: اس شخص کو بلا لاؤ، اگرچہ وہ میرا غم تازہ ہی کرے گا، دربان میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ امیر المومنین نے بلایا ہے اور اس کا خیال رکھنا کہ امیر پر صدمہ کا بہت اثر ہے، اگر تم دس باتیں کرنا چاہتے ہو تو پانچ ہی پر اکتفا کرنا، یہ کہہ کر وہ مجھے امیر کے پاس لے گیا، اس وقت امیر بالکل تنہا بیٹھے تھے کہ مجھ سے فرمایا کہ میرے قریب آ جاؤ، میں قریب جا کر بیٹھ گیا، کہنے لگے کہ تم میرے اس بیٹے کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں، میں اُن کو جانتا ہوں، کہنے لگے: وہ کیا کام کرتا تھا؟ میں نے کہا: گارے مٹی کی مزدوری کرتا تھا، کہنے لگے: تم نے بھی مزدوری پر کوئی کام اس سے کرایا ہے؟ میں نے کہا: کرایا ہے، کہنے لگے: تمہیں اس کا خیال نہ آیا کہ اس کی حضور اقدس ﷺ سے قرابت تھی؟ (کہ یہ حضرات حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد ہیں) میں نے کہا: امیر المومنین! پہلے اللہ جل شانہٗ سے معذرت چاہتا ہوں، اس کے بعد آپ سے عذر خواہ ہوں، مجھے اس وقت اس کا علم ہی نہ تھا کہ یہ کون ہیں؟ مجھے ان کے انتقال کے وقت ان کا حال معلوم ہوا، کہنے لگے کہ تم نے اپنے ہاتھ سے اسے غسل دیا؟ میں نے کہا کہ جی ہاں، کہنے لگے: اپنا ہاتھ لاؤ، میرا ہاتھ لے کر اپنے سینے پر رکھ دیا اور چند شعر پڑھے، جن کا ترجمہ یہ ہے: "اے وہ مسافر! جس پر میرا دِل پگھل رہا ہے اور میری آنکھیں اس پر آنسو بہا رہی ہیں۔ اے وہ شخص

جس کا مکان (قبر) دور ہے، لیکن اس کا غم میرے قریب ہے، بے شک موت ہر اچھے سے اچھے عیش کو مکدر کر دیتی ہے، وہ مسافر ایک چاند کا ٹکڑا تھا، (یعنی اس کا چہرہ) جو خالص چاندی کی ٹہنی پر تھا، (یعنی اس کے بدن پر) پس چاند کا ٹکڑا بھی قبر میں پہنچ گیا اور چاندی کی ٹہنی بھی قبر میں پہنچ گئی۔

اس کے بعد ہارون رشید نے بصرہ اس کی قبر پر جانے کا ارادہ کیا، ابو عامرؒ ساتھ تھے، اس کی قبر پر پہنچ کر ہارون رشید نے چند شعر پڑھے، جن کا ترجمہ یہ ہے: ''اے وہ مسافر! جو اپنے سفر سے کبھی بھی نہ لوٹے گا، موت نے کم عمری ہی میں اس کو جلدی سے اُچک لیا، اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک! تو میرے لیے اُنس اور دل کا چین تھا، لمبی راتوں میں بھی اور مختصر راتوں میں بھی، تو نے موت کا وہ پیالہ پیا ہے جس کو عنقریب تیرا بوڑھا باپ بڑھاپے کی حالت میں پئے گا، بلکہ دنیا کا ہر آدمی اس کو پئے گا، چاہے وہ جنگل کا رہنے والا ہو، یا شہر کا، پس سب تعریفیں اُسی اللہ کو سزاوار ہیں جس کی لکھی ہوئی تقدیر کے یہ کرشمے ہیں۔

ابو عامرؒ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جو رات آئی اس میں اپنے وظائف پورے کر کے میں لیٹا ہی تھا کہ میں نے خواب میں نور کا ایک قبہ دیکھا، جس کے اوپر اَبر کی طرح نور ہی نور پھیل رہا ہے، اُس نور کے اَبر میں سے اُس لڑکے نے مجھے آواز دے کر کہا: ابو عامر! تمھیں حق تعالیٰ شانہٗ جزاءِ خیر عطا فرمائے، (تم نے میری تجہیز و تکفین کی اور میری وصیت پوری کی) میں نے اس سے پوچھا کہ میرے پیارے! تیرا کیا حال گزرا؟ کہنے لگا کہ میں ایسے مولیٰ کی طرف پہنچا ہوں جو بہت کریم ہے اور مجھ سے بہت راضی ہے، مجھے اس مالک نے وہ نعمتیں عطا کیں جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کانوں نے سنیں، نہ کسی آدمی کے دل پر ان کا خیال گزرا۔ (یہ ایک مشہور حدیث کا مضمون ہے، حضور اقدس ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ جل جلالہٗ کا پاک ارشاد ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھیں، نہ کانوں نے سنیں اور نہ کسی کے دل پر ان کا خیال گزرا)۔

255

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تورات میں لکھا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اُن لوگوں کے لیے جن کے پہلو رات کو خوابگاہوں سے دور رہتے ہیں (یعنی تہجد گزاروں کے لیے) وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا، نہ کسی آدمی کے دل پر ان کا خیال گزرا، نہ اُن کو کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے، نہ کوئی نبی و رسول جانتا ہے۔ اور یہ مضمون قرآن پاک میں بھی ہے:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ﴾ (السجدة : ۱۷)

''کسی شخص کو خبر نہیں کہ آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کچھ سامان ایسے لوگوں کے لیے خزانۂ غیب میں موجود ہے۔'' (درِ منثور)

اس کے بعد اس لڑکے نے کہا کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ جو بھی دنیا سے اس طرح نکل آئے جیسا میں نکل آیا ہوں، اس کے لیے یہی اعزاز و اکرام ہے جو میرے لیے ہوا۔

صاحب روض کہتے ہیں کہ یہ سارا قصہ مجھے اور طریقہ سے بھی پہنچا ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ کسی شخص نے ہارون رشید سے اس لڑکے کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے بادشاہ ہونے سے پہلے یہ لڑکا پیدا ہوا تھا، بہت اچھی تربیت پائی تھی، قرآن پاک بھی پڑھا تھا اور علوم بھی پڑھے تھے، جب میں بادشاہ بن گیا تو یہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا، میری دنیا سے اس نے کوئی راحت نہ اُٹھائی، چلتے وقت میں نے ہی اس کی ماں سے کہا تھا کہ اس کو یہ انگوٹھی دے دے، اس انگوٹھی کا یاقوت بہت زیادہ قیمتی تھا؛ مگر یہ اس کو بھی کام میں نہ لایا، مرتے وقت واپس کر گیا، یہ لڑکا اپنی والدہ کا بڑا فرماں بردار تھا۔ (روض، فضائل صدقات: ۲۷۴)

حق تعالیٰ ہماری دنیوی زندگی کو بھی اسی طرح با مقصد بنا دے، تاکہ اُخروی زندگی میں کامیابی ہمارا مقدر بن جائے۔ آمین یا رب العالمین۔

تمّ الجزء الخامس من دروس الحديث الشريف، ولله الحمد أوّلًا و

آخراً و ظاهرًا و باطنًا، و ما كنا لنهتدي لو لا أن هدانا اللّٰه.

و ذٰلك فی السابع والعشرين من رمضان ۱٤۳۸ھ ليلة الجمعة قبل الفجر، ۲۳ / جون ۲۰۱۷ء

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم، و تب علينا إنك أنت التواب الرحيم، و صلّى اللّٰه على النبي الكريم، و علىٰ آله و أصحابه أجمعين، و من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

حرّره الخادم النادم و الراقم الآثم

ابوخلیق محمد شفیق بن شاہ بھائی بڑودوی

واردحال: خانقاہِ قدسیہ جامعہ سراج العلوم، اُجین، ایم. پی.

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَصَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ كَمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ افْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنْتَ أَهْلُ التَّقْوٰى وَ أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ

256
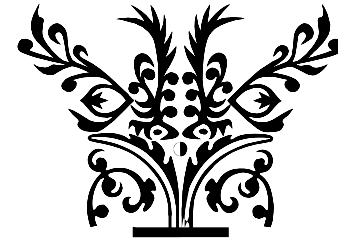
دعا بموقع حج بیت اللّٰہ

از: شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

الٰہی! تیری چوکھٹ پر بھکاری بن کے آیا ہوں — سراپا فقر ہوں، عجز و ندامت ساتھ لایا ہوں
بھکاری وہ کہ جس کے پاس جھولی ہے نہ پیالہ ہے — بھکاری وہ جسے حرص و ہوس نے مار ڈالا ہے
متاعِ دین و دانش نفس کے ہاتھوں سے لٹوا کر — سکونِ قلب کی دولت ہوس کی بھینٹ چڑھوا کر
لٹا کر ساری پونجی غفلت و عصیاں کے دلدل میں — سہارا لینے آیا ہوں تیرے کعبے کے آنچل میں
گناہوں کی لپٹ سے کائناتِ قلب افسردہ — اِرادے مضمحل، ہمت شکستہ، حوصلے مردہ
کہاں سے لاؤں طاقت دل کی سچی ترجمانی کی؟ — کہ کس جنجال میں گزری ہیں گھڑیاں زندگانی کی
خلاصہ یہ کہ بس جل بھن کے اپنی روسیاہی سے — سراپا فقر بن کر اپنی حالت کی تباہی سے
تیرے دربار میں لایا ہوں اپنی اب زبوں حالی — تیری چوکھٹ کے لائق ہر عمل سے ہاتھ ہے خالی
یہ تیرا گھر ہے، تیرے مہر کا دربار ہے مولیٰ — سراپا نور ہے، اِک مہبطِ انوار ہے مولیٰ
تیری چوکھٹ کے جو آداب ہیں میں ان سے خالی ہوں — نہیں جس کو سلیقہ مانگنے کا وہ سوالی ہوں
زباں غرقِ ندامت دل کی ناقص ترجمانی پر — خدایا رحم! میری اس زبانِ بے زبانی پر
یہ آنکھیں خشک ہیں، یا رب! انہیں رونا نہیں آتا — سلگتے داغ ہیں دل میں جنہیں دھونا نہیں آتا

دعاءِ قرآنی حسب ترتیب مصحف عثمانی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَللّٰهُمَّ لَكَ الۡحَمۡدُ كَمَا أَنۡتَ أَهۡلُهٗ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا أَنۡتَ أَهۡلُهٗ، وَ افۡعَلۡ بِنَا مَا أَنۡتَ أَهۡلُهٗ، فَإِنَّكَ أَنۡتَ أَهۡلُ التَّقۡوٰى وَ أَهۡلُ الۡمَغۡفِرَةِ

﴿۱﴾ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝ إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ۝ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا الضَّآلِّيۡنَ ۝

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہیں، جو تمام جہانوں کا رب ہے، جو بڑا مہربان، بہت رحم والا ہے، روزِ جزا کا مالک ہے، (اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما، ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ ان کے راستے کی جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔

﴿۲﴾ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارۡزُقۡ أَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ (البقرۃ : ۱۲۶)

ترجمہ: اے میرے پروردگار! اس شہر کو پرامن بنا دیجیے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں انہیں ہر طرح کے پھلوں کا رزق عطا فرمائیے۔

﴿۳﴾ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ إِنَّكَ أَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝ (البقرۃ : ۱۲۷)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرما لے، بے شک تو اور صرف تو ہی ہر ایک کی سننے والا ہر ایک کو جاننے والا ہے۔

﴿۴﴾ رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَ مِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ ۪ وَ أَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبۡ عَلَيۡنَا ۚ إِنَّكَ أَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ۝ (البقرۃ : ۱۲۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم (دونوں) کو اپنا مکمل فرماں بردار بنا لے، اور ہماری نسل سے بھی ایسی امت پیدا کر جو تیری پوری تابع دار ہو، اور ہمیں اپنی عبادتوں کے طریقے سکھا دے اور ہماری توبہ قبول فرما لے، بے شک تو اور صرف تو ہی معاف کرنے کا خوگر (اور) بڑی رحمت کا مالک ہے۔

﴿۵﴾ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّ فِي الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (البقرۃ : ۲۰۱)

اے ہمارے رب! ہمیں دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔

﴿۶﴾ رَبَّنَآ أَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ أَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝ (البقرۃ: ۲۵۰)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمیں صبر و استقلال کا پیکر بنا دے (ہمارے دلوں میں یہ اوصاف پیدا فرما دے) اور ہمیں ثابت قدمی بخش دے اور ہمیں اس بے ایمان قوم کے مقابلے میں فتح و نصرت عطا فرما دے۔

﴿۷﴾ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ إِنۡ نَّسِيۡنَآ أَوۡ أَخۡطَأۡنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ إِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَ اعۡفُ عَنَّا ۗ وَ اغۡفِرۡ لَنَا ۗ وَ ارۡحَمۡنَا ۗ أَنۡتَ مَوۡلٰنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝ (البقرۃ : ۲۸۶)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ فرمائیے، اور اے ہمارے رب! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا، اور اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیے جسے اُٹھانے کی ہم میں طاقت

نہ ہو، اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائیے، ہمیں بخش دیجیے اور ہم پر رحم فرمائیے، آپ ہی ہمارے حامی وناصر ہیں، اس لیے بے ایمانوں کے مقابلے میں ہمیں نصرت عطا فرمائیے۔

﴿۸﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ج إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ (ال عمران : ۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب! آپ کے ہمیں ہدایت سے نوازنے کے بعد ہمارے دلوں میں کجی پیدا نہ ہونے دیجیے اور خاص اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرمائیے، بے شک آپ کی ذات ہی وہ ہے جو بے انتہا بخشش کی خوگر ہے۔

﴿۹﴾ رَبَّنَآ إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ط إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

(ال عمران:۹)

ترجمہ: اے ہمارے رب! تو تمام انسانوں کو ایک ایسے دن جمع کرنے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، بے شک اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

﴿۱۰﴾ رَبَّنَآ إِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (ال عمران : ۱۶)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم آپ پر ایمان لے آئے ہیں، آپ ہمارے گناہوں کو بخش دیجیے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے۔

﴿۱۱﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ج إِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ (ال عمران : ۳۸)

ترجمہ: یارب! مجھے خاص اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔

﴿۱۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ أَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (ال عمران:۵۳)

ترجمہ: اے ہمارے رب! آپ نے جو کچھ نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے رسول (ﷺ) کی اتباع کی ہے، لہٰذا ہمیں اُن لوگوں میں لکھ دیجیے جو حق کی گواہی دینے والے ہیں۔

﴿۱۳﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ إِسْرَافَنَا فِيْ أَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (ال عمران : ۱۴۷)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بھی اور ہم سے ہمارے کاموں میں جو زیادتی ہوئی ہو اس کو بھی معاف فرمادے، ہمیں ثابت قدمی بخش دے اور بے ایمانوں کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرمادے۔

﴿۱۴﴾ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (ال عمران : ۱۹۱)

ترجمہ: اے ہمارے رب! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا، آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے۔

﴿۱۵﴾ رَبَّنَآ إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهٗ ط وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝

(ال عمران : ۱۹۲)

ترجمہ: اے ہمارے رب! آپ جس کسی کو دوزخ میں داخل کردیں اُسے آپ نے یقیناً رُسوا ہی کردیا، اور ظالموں کو کسی قسم کے مددگار نصیب نہ ہوں گے۔

﴿۱۶﴾ رَبَّنَآ إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْإِيْمَانِ أَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ق رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ۝ (ال عمران : ۱۹۳)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم نے ایک منادی کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ ''اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ'' چنانچہ ہم ایمان لے آئے، لہٰذا اے ہمارے پروردگار! ہماری خاطر ہمارے گناہوں کو بخش دیجیے، ہماری برائیوں کو ہم سے مٹا دیجیے اور ہمیں نیک لوگوں میں شامل کرکے اپنے پاس بلائیے۔

﴿۱۷﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ (ال عمران : ۱۹۴)

ترجمہ: اے ہمارے رب! وہ کچھ بھی عطا فرمائیے جس کا وعدہ آپ نے اپنے

پیغمبروں کے ذریعہ ہم سے کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دِن رُسوا نہ کیجیے، یقیناً آپ وعدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

﴿۱۸﴾ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا○ (النسآء : ۷۵)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لائیے جس کے باشندے ظلم توڑ رہے ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حامی پیدا کر دیجیے اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی مددگار بھی کھڑا کر دیجیے۔

﴿۱۹﴾ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنْفُسَنَا ۚ وَ إِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ○ (الأعراف : ۲۳)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں، اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں سے ہو جائیں گے۔

﴿۲۰﴾ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ أَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ○ (الأعراف : ۸۹)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ فرما دے، اور تو ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

﴿۲۱﴾ رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ○ (الأعراف : ۱۲۶)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم پر صبر کے پیمانے اُنڈیل دے اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے تابعدار ہوں۔

﴿۲۲﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِأَخِيْ وَ أَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَ أَنْتَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ○ (الأعراف : ۱۵۱)

ترجمہ: میرے رب! میری اور میرے بھائی کی مغفرت فرما دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما دے، تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

﴿۲۳﴾ أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ أَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ○ وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ إِنَّا هُدْنَآ إِلَيْكَ ۚ (الأعراف : ۱۵۵-۱۵۶)

ترجمہ: اے ہمارے رب! آپ ہی ہمارے رکھوالے ہیں، اس لیے ہمیں معاف کر دیجیے اور ہم پر رحم فرمائیے، بے شک آپ سارے ہی معاف کرنے والوں سے بہتر معاف کرنے والے ہیں، اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دیجیے اور آخرت میں بھی، ہم (اس غرض کے لیے) آپ ہی سے رجوع کرتے ہیں۔

﴿۲۴﴾ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ○ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○ (یونس : ۸۵-۸۶)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمیں ان ظالم لوگوں کے ہاتھوں آزمائش میں نہ ڈالیے اور اپنی رحمت سے ہمیں بے ایمان قوم سے نجات دیجیے۔

﴿۲۵﴾ رَبِّ إِنِّيْٓ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۚ وَ إِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَ تَرْحَمْنِيْٓ أَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ○ (هود : ۴۷)

ترجمہ: اے میرے رب! میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ آئندہ آپ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں، اور اگر آپ نے میری مغفرت نہ فرمائی اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں بھی اُن لوگوں میں شامل ہو جاؤں گا جو برباد ہو گئے ہیں۔

﴿۲۶﴾ أَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ أَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ○ (یوسف : ۱۰۱)

ترجمہ: (اے میرے رب!) تو ہی دنیا و آخرت میں میرا رکھوالا ہے، مجھے اس حالت میں دنیا سے اُٹھانا کہ میں تیرا فرماں بردار ہوں اور مجھے نیک لوگوں میں شامل کرنا۔

﴿۲۷﴾ رَبَّنَآ إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَ مَا نُعْلِنُ ۚ وَ مَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ○ (إبراهيم : ۳۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم جو کام چھپ کر کرتے ہیں وہ بھی آپ کے علم میں ہے اور جو کام علانیہ کرتے ہیں وہ بھی، اور اللہ تعالیٰ سے نہ زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی ہے نہ آسمان کی۔

﴿۲۸﴾ رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ۚ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلۡ دُعَآءِ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ○ (إبراهیم : ۴۰ - ۴۱)

ترجمہ: یارب! مجھے بھی نماز قائم کرنے والا بنا دیجیے اور میری اولاد میں سے بھی (ایسے لوگ پیدا فرمایئے جو نماز قائم کریں) اے ہمارے رب! میری دعا قبول فرما لیجیے، اے ہمارے رب! جس دن حساب قائم ہو میری، میرے والدین اور اہل ایمان کی مغفرت فرمایئے۔

﴿۲۹﴾ رَبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّ اجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا○ (بنی إسرائیل : ۸۰)

ترجمہ: یارب! مجھے جہاں داخل فرما اچھائی کے ساتھ داخل فرما اور جہاں سے نکال اچھائی کے ساتھ نکال، اور مجھے خاص اپنے پاس سے ایسا اقتدار عطا فرما جس کے ساتھ (تیری) مدد ہو۔

﴿۳۰﴾ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً وَّ هَیِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا○ (الکهف : ۱۰)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم پر خاص اپنے پاس سے رحمت نازل فرمایئے اور (ہماری اس صورتِ حال میں) ہمارے لیے بھلائی کا راستہ مہیا فرما دیجیے۔

﴿۳۱﴾ رَبِّ اِنِّیۡ وَهَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ وَ اشۡتَعَلَ الرَّاۡسُ شَیۡبًا وَّ لَمۡ اَکُنۡ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا○ (مریم : ۴)

ترجمہ: میرے رب! میری ہڈیاں تک کمزور پڑ گئی ہیں اور سر میں بڑھاپے کی سفیدی بھڑک اُٹھی ہے اور میرے رب! میں آپ سے دعا مانگ کر کبھی نامراد نہیں ہوا۔

﴿۳۲﴾ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ ○ وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ ○ وَ احۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ ○ یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ○ (طٰهٰ : ۲۵-۲۶-۲۷-۲۸)

ترجمہ: میرے پروردگار! میری خاطر میرا سینہ کھول دیجیے اور میرے لیے میرا کام آسان بنا دیجیے اور میری زبان میں جو گرہ ہے اُسے دور کر دیجیے، لوگ میری بات سمجھ سکیں گے۔

﴿۳۳﴾ رَبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا○ (طٰهٰ : ۱۱۴)

ترجمہ: اے میرے رب! مجھے علم میں اور ترقی عطا فرما۔

﴿۳۴﴾ اِنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ○ (الأنبیاء : ۸۳)

(اے میرے رب!) مجھے یہ تکلیف لاحق ہوگئی ہے، اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

﴿۳۵﴾ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَکَ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ○ (الأنبیاء : ۸۷)

ترجمہ: (اے اللہ!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ہر عیب سے پاک ہے، بے شک میں قصوروار ہوں۔

﴿۳۶﴾ رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ○ (الأنبیاء : ۸۹)

ترجمہ: یارب! مجھے اکیلا نہ چھوڑیئے، اور آپ سب سے بہتر وارث ہیں۔

﴿۳۷﴾ رَبِّ انۡصُرۡنِیۡ بِمَا کَذَّبُوۡنِ○ (المؤمنون : ۲۶)

ترجمہ: اے میرے رب! ان لوگوں نے مجھے جھٹلایا ہے اس پر تو ہی میری مدد فرما۔

﴿۳۸﴾ رَّبِّ اَنۡزِلۡنِیۡ مُنۡزَلًا مُّبٰرَکًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ○ (المؤمنون : ۲۹)

ترجمہ: اے میرے رب! مجھے برکت والا اُترنا نصیب فرما، اور تو بہترین اُتارنے والا ہے۔

﴿۳۹﴾ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ ○ وَ اَعُوۡذُ بِکَ رَبِّ اَنۡ

يَحْضُرُوْنِ○ (المؤمنون : ۹۷-۹۸)

ترجمہ: اے میرے رب! میں شیطان کے لگائے ہوئے چرکوں (اور وسوسوں) سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں اور میرے رب! میں ان کے اپنے قریب آنے سے بھی آپ کی پناہ میں آتا ہوں۔

﴿۴۰﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ○ (المؤمنون : ۱۰۹)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے ہیں، پس ہمیں بخش دیجیے اور ہم پر رحم فرمائیے، اور آپ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں۔

﴿۴۱﴾ رَبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ○ (المؤمنون : ۱۱۸)

ترجمہ: اے میرے رب! تو ہماری خطائیں بخش دے اور رحم فرمادے، تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

﴿۴۲﴾ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا○ (الفرقان : ۶۵)

ترجمہ: اے ہمارے رب! جہنم کے عذاب سے ہم کو دور رکھئے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا عذاب وہ تباہی ہے جو چمٹ کر رہ جاتی ہے۔

﴿۴۳﴾ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا○
(الفرقان : ۷۴)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمیں اپنے بیوی بچوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا سربراہ بنادے۔

﴿۴۴﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ○ وَ اجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ○ وَ اجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ○ وَ اغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ○ وَ لَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ○ (الشعراء : ۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷)

ترجمہ: اے میرے رب! مجھے حکمت عطا فرما اور مجھے نیک لوگوں میں شامل فرما

لے اور آنے والی نسلوں میں میرے لیے وہ زبانیں پیدا فرما دے جو میری سچائی کی گواہی دیں، اور مجھے ان لوگوں میں سے بنا دے جو نعمتوں والی جنت کے وارث ہوں گے، اور میرے باپ کی مغفرت فرما، یقیناً وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے، اور اس دِن مجھے رُسوا نہ کرنا جس دن لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

﴿۴۵﴾ رَبِّ نَجِّنِيْ وَ اَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ○ (الشعراء : ۱۶۹)

ترجمہ: اے میرے رب! جو حرکتیں یہ لوگ کر رہے ہیں مجھے اور میرے گھر والوں کو ان سے نجات دے۔

﴿۴۶﴾ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ○ (النمل : ۱۹)

ترجمہ: اے میرے رب! مجھے اِس بات کا پابند بنا دیجیے کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں، اور وہ نیک عمل کروں جو آپ کو پسند ہو، اور اپنی رحمت سے مجھے نیک بندوں میں شامل فرما لیجیے۔

﴿۴۷﴾ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ط (النمل : ۴۴)

اے میرے رب! حقیقت یہ ہے کہ میں نے (اب تک) اپنی ذات پر ظلم کیا ہے۔

﴿۴۸﴾ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ط (القصص : ۱۶)

اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، آپ مجھے معاف فرما دیجیے۔

﴿۴۹﴾ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ○ (القصص : ۱۷)

ترجمہ: اے میرے رب! آپ نے جو مجھ پر انعام کیا ہے تو میں آئندہ کبھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔

﴿۵۰﴾ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ○ (القصص : ۲۴)

اے میرے رب! جو کوئی بہتری تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں۔

﴿۵۱﴾ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ○ (العنکبوت : ۳۰)

اے میرے رب! ان مفسدوں کے مقابلے میں میری مدد فرما دیجیے۔

﴿۵۲﴾ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ○ (الصّٰفٰت : ۱۰۰)

اے میرے رب! مجھے ایسا بیٹا دے دے جو نیک لوگوں میں سے ہو۔

﴿۵۳﴾ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ○ (المؤمن : ۷)

ترجمہ: اے ہمارے رب! تیری رحمت اور علم ہر چیز پر حاوی ہے، اس لیے جن لوگوں نے توبہ کرلی ہے اور تیرے راستے پر چل پڑے ہیں ان کی بخشش فرما دے اور اُنہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔

﴿۵۴﴾ رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ○ (المؤمن : ۸-۹)

ترجمہ: اے ہمارے رب! انہیں ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں داخل فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے، نیز ان کے ماں باپ اور بیوی بچوں میں سے جو نیک ہوں انہیں بھی، یقیناً تیری اور صرف تیری ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت کی بھی کامل۔ اور ان کو ہر طرح کی برائی سے محفوظ رکھ، اور اُس دِن جسے تو نے برائیوں سے محفوظ کرلیا اس پر تو نے بڑا رحم فرمایا، اور یہی زبردست کامیابی ہے۔

﴿۵۵﴾ رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ج اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ○ (الأحقاف : ۱۵)

ترجمہ: اے میرے رب! مجھے توفیق دیجیے کہ میں آپ کی اس نعمت کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی اور ایسے نیک عمل کروں جن سے آپ

راضی ہو جائیں، اور میرے لیے میری اولاد کو بھی صلاحیت دے دیجیے، میں آپ کے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں فرماں برداروں میں شامل ہوں۔

﴿۵۶﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ○ (الحشر : ۱۰)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہماری بھی مغفرت فرمایئے اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی بغض نہ رکھئے، اے ہمارے رب! آپ بہت شفیق بہت مہربان ہیں۔

﴿۵۷﴾ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ج اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ○ (التحریم : ۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمارے لیے اس نور کو مکمل کر دیجیے اور ہماری مغفرت فرما دیجیے، یقیناً آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

﴿۵۸﴾ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ○ (التحریم : ۱۱)

ترجمہ: اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس سے جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے دے اور مجھے ظالم لوگوں سے بھی نجات عطا فرما۔

﴿۵۹﴾ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ○ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا○ (نوح : ۲۶-۲۷)

ترجمہ: اے میرے رب! ان بے ایمانوں میں سے کوئی باشندہ بھی زمین پر نہ رکھیے، اگر آپ ان کو باقی رکھیں گے تو یہ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ بدکار اور پکی بے ایمان پیدا ہوگی۔

﴿۶۰﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ط

وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا۝ (نوح : ۲۸)

ترجمہ: اے میرے رب! میری بھی بخشش فرما دیجیے، میرے والدین کی بھی اور اس شخص کی بھی جو میرے گھر میں بحالت ایمان داخل ہوا، اور مؤمن مردوں اور عورتوں کی بھی مغفرت فرما دے، اور ظالموں کے لیے سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہ بڑھا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هُوَ اللّٰهُ (یَا اَللّٰهُ) اَلَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ (یَا اَللّٰهُ) اَلرَّحِیْمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمَلِكُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْقُدُّوْسُ (یَا اَللّٰهُ) اَلسَّلَامُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُؤْمِنُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُهَیْمِنُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْعَزِیْزُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْجَبَّارُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُتَكَبِّرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْخَالِقُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْبَارِئُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُصَوِّرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْغَفَّارُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْقَهَّارُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْوَهَّابُ (یَا اَللّٰهُ) اَلرَّزَّاقُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْفَتَّاحُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْعَلِیْمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْقَابِضُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْبَاسِطُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْخَافِضُ (یَا اَللّٰهُ) اَلرَّافِعُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُعِزُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُذِلُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلسَّمِیْعُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْبَصِیْرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْحَكَمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْعَدْلُ (یَا اَللّٰهُ) اَللَّطِیْفُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْخَبِیْرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْحَلِیْمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْعَظِیْمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْغَفُوْرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلشَّكُوْرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْعَلِیُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلْكَبِیْرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْحَفِیْظُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُقِیْتُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْحَسِیْبُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْجَلِیْلُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْكَرِیْمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلرَّقِیْبُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُجِیْبُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْوَاسِعُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْحَكِیْمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْوَدُوْدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمَجِیْدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْبَاعِثُ (یَا اَللّٰهُ) اَلشَّهِیْدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْحَقُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلْوَكِیْلُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْقَوِیُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمَتِیْنُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْوَلِیُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلْحَمِیْدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُحْصِیْ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُبْدِئُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُعِیْدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُحْیِیْ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُمِیْتُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْحَیُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلْقَیُّوْمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْوَاجِدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمَاجِدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْوَاحِدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْاَحَدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلصَّمَدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْقَادِرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُقْتَدِرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُقَدِّمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُؤَخِّرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْاَوَّلُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْاٰخِرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلظَّاهِرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْبَاطِنُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْوَالِیْ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُتَعَالِیْ (یَا اَللّٰهُ)

اَلْبَرُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلتَّوَّابُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُنْتَقِمُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْعَفُوُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلرَّؤُوْفُ (یَا اَللّٰهُ) مَالِكُ الْمُلْكِ (یَا اَللّٰهُ) ذُوْ الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُقْسِطُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْجَامِعُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْغَنِیُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمُغْنِیْ (یَا اَللّٰهُ) اَلْمَانِعُ (یَا اَللّٰهُ) اَلضَّارُّ (یَا اَللّٰهُ) اَلنَّافِعُ (یَا اَللّٰهُ) اَلنُّوْرُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْهَادِیْ (یَا اَللّٰهُ) اَلْبَدِیْعُ (یَا اَللّٰهُ) اَلْبَاقِیْ (یَا اَللّٰهُ) اَلْوَارِثُ (یَا اَللّٰهُ) اَلرَّشِیْدُ (یَا اَللّٰهُ) اَلصَّبُوْرُ (یَا اَللّٰهُ) (یَا اَللّٰهُ) (یَا اَللّٰهُ) (یَا اَللّٰهُ) (یَا اَللّٰهُ) (یَا اَللّٰهُ) (ترمذی، مشکوٰۃ : ۱۹۹)

یا اللہ! یہ آپ کے نہایت مبارک، مقبول اور مقدس نام ہیں، آج ان ہی کا حوالہ اور سہارا لے کر ہم آپ کے نہایت عاجز، مسکین اور فقیر بندے آپ سے ڈر کر آپ کے در پر حاضر ہیں، ربِ کعبہ! آپ نے اپنے سب سے بڑے گھر اور دربار کے متعلق فرمایا: ﴿وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ (آل عمران : ۹۷) **''یہاں آنے والا امن پاجاتا ہے۔'' اے اللہ! ہم آپ کے کرم سے آپ کے دربار میں حاضر ہیں، ہمیں دارین میں اپنے عذاب اور حساب سے امن دے دیجیے، اپنے غضب اور غصہ سے امن دے دیجیے، اپنی پکڑ اور ناراضگی سے امن دے دیجیے، یا اللہ! آپ ہی کا یہ فرمان ہے:** ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ﴾ (الفاطر: ۱۵) **''اے لوگو! تم سب امیر و کبیر ہونے کے باوجود میرے در کے فقیر ہو۔'' دوسری جگہ آپ کا یہ بھی فرمانِ عظیم الشان ہے:** ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ﴾ (التوبۃ : ۶۰) **''کہ صدقات و خیرات فقراء کے لیے ہیں۔'' اے اللہ! جب ہم سب ہی فقیر ہیں اور بلا شبہ ہم آپ کے دربار میں ازاوّل تا اَبد سراپا فقیر ہیں، اور صدقات و خیرات فقراء کا حق ہے، تو اے اللہ! ہم فقیروں کو اپنی رحمت کا، عنایت کا، مغفرت کا، فضل و کرم کا، عفو و رحم کا صدقہ عطا فرما دیجیے۔**

یا اللہ! ہمارا حال بھی برادرانِ یوسف علیہ السلام کی طرح ہے، جو دربارِ یوسفی میں حاضر ہو کر کہنے لگے: ﴿فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ۝﴾ (یوسف: ۸۸) **کہ ہمارے پاس اگرچہ پورا پیسہ نہیں ہے، مگر ہمیں غلہ پورا**

دے دیجیے، حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو غلہ اور صدقہ دیا تھا، ہمارے پاس بھی اگرچہ کامل ایمان و اعمال نہیں ہیں؛ مگر آپ ہمیں بھی اپنی رحمت و مغفرت کا صدقہ دے دیجیے، اے اللہ! ہم سوالی ہیں، آپ سخی ہیں، ہم آپ سے بھیک مانگتے ہیں آپ کی ستاری کی، بھیک مانگتے ہیں آپ کی غفاری کی، بھیک مانگتے ہیں آپ کی رضا و خوشنودی کی، اے اللہ! سیدنا آدم علیہ السلام سے جب خطا ہوگئی تو انہوں نے اعتراف کرتے ہوئے آپ سے عرض کیا: ”رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنْفُسَنَا وَ إِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○﴾ (الأعراف:۲۳)

اے غفار الذنوب! آپ کو بندوں کا اعترافِ ذنوب پسند ہے، ہم اپنی خطاؤں اور کوتاہیوں کا اعتراف و اِقرار کرتے ہیں، بے شک ہم سراپا اِقراری مجرم ہیں، سراپا گندے ہیں؛ مگر آپ ہی کے بندے ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے مجرموں اور گنہگاروں کو معاف کیا ہے، ہمیں بھی معاف فرما دیجیے، مولیٰ! ہم نے ماؤں کو دیکھا ہے کہ ان کا بچہ جب نجاست سے گندہ ہو جاتا ہے تو وہ اسے چھوڑ نہیں دیتیں، اس سے نفرت نہیں کرتیں، اسے نظر انداز بھی نہیں کرتیں، کیوں کہ ان کے دلوں میں آپ نے مامتا، محبت اور شفقت رکھی ہے، اس لیے وہ یہی سمجھتی ہیں کہ میرا بچہ نادان اور ناسمجھ سہی؛ مگر ہے تو میرا ہی، وہ اسے گندگی سے پاک وصاف کر دیتی ہیں، پھر پاؤڈر لگا کر اسے چوم لیتی ہیں، تو مولیٰ! آپ تو ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہیں، ہم آپ کے گندے بندے ہیں، گناہوں کی باطنی ناپاکی اور نجاستوں سے لت پت ہیں، اے اللہ! آپ بھی مہربان ماؤں کی طرح ہمارے ظاہر و باطن کو گناہوں کی نجاستوں سے پاک و صاف فرما دیجیے، جو گناہ ہم نادانی میں کر گئے، جانے اَن جانے میں کر چکے، کر کے بھول چکے، دِن میں کیے، رات میں کیے، خلوت میں کیے، جلوت میں کیے، تنہائیوں میں کیے، مجمعوں میں کیے، چھوٹے اور بڑے تمام گناہوں پر معافی کا قلم پھیر دیجیے، پھر اپنی رضا، محبت اور تقویٰ سے ہماری زندگیوں کو خوب صورت و مزین فرما دیجیے، اے اللہ! ہمارے دلوں کو پاک فرما کر اپنی رضا و محبت کا مرکز، اپنا مسکن اور تقویٰ کا مخزن بنا دیجیے، اے اللہ! ماں اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی کا معاملہ کرتی ہے، پھر آپ تو اس سے بھی زیادہ مہربان ہیں، اس

لیے آپ بھی اپنے بندوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی ہی کا معاملہ فرماتے ہیں۔

آپ نے تو سیدنا موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو بھی فرعون کے پاس جاتے وقت حکم دیا تھا کہ ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (طٰہٰ: ٤٤) ”اس کے ساتھ نرمی سے پیش آنا۔“ اے اللہ! آپ نے تو اس فرعون کے ساتھ بھی نرمی سے پیش آنے کا حکم فرمایا تھا جو مشرک، متکبر اور آپ کا باغی تھا، جو ﴿ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى﴾ (النازعات: ٢٤) کا نعرہ لگاتا تھا، اے اللہ! ہم تو آپ کے وہ بندے ہیں جو اگرچہ سراپا گندے ہیں؛ مگر آپ کے حضور سر جھکا کر، سجدے میں سر ڈال کر ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى“ کہتے ہیں، اے اللہ! ہمارے ساتھ بھی دارین میں معافی و نرمی کا معاملہ فرمائیے، محروم نہ فرمائیے، مردود نہ فرمائیے، مایوس نہ کیجیے۔

اے اللہ! آپ کے پیارے پیغمبر سیدنا یوسف علیہ السلام کریم تھے، انہوں نے بھائیوں کی زیادتیوں کو معاف کرتے ہوئے فرمایا تھا: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (یوسف: ۹۲) ”آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہوگی“، آج تمہیں شرمندہ بھی نہیں کیا جائے گا، آج تمہیں معاف کر دیا جائے گا، یا اللہ! آپ کے حبیب سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ بھی کریم تھے، انہوں نے بھی قریش مکہ سے فتح مکہ کے موقع پر یہی فرمایا تھا کہ ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ اے اللہ! کریموں کی شان اور پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنے مجرموں کو شرمندہ نہیں کرتے، معاف کر دیا کرتے ہیں، اے اللہ! آپ تو کریموں کے کریم ہیں، ہم اِقراری مجرم ہیں، آپ کے حضور حاضر ہیں، اپنے گناہوں پر نادم و شرمندہ ہیں، معافی، مغفرت اور آپ کی معرفت کے طلب گار ہیں، ربِ کریم! آج عرفات کے میدان میں آپ بھی ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ فرما دیجیے ”آج تمہیں بھی معاف کیا جاتا ہے“ اے اللہ! ہماری، ہمارے والدین، اہل و عیال، عزیز و اقرباء اور محسنین و مرحومین کی آج اپنے فضل و کرم سے معافی کا اعلان اور فیصلہ فرما کر اس عرفات کے میدان میں ہمیں اپنی معرفت عطا فرما دیجیے۔

اے اللہ! ہم نے دنیا میں نیکوں اور شریفوں کو دیکھا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے مجرموں،

قصور واروں اور بروں کے ساتھ بھی اچھائی وخوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں، کیوں کہ یہی آپ کا حکم بھی ہے کہ ﴿ خُذِ الْعَفْوَ ﴾ (الأعراف : ۱۹۹) ''معاف کردیجیے۔'' اس لیے اچھے لوگ ہمیشہ بروں کے ساتھ معافی ہی کا معاملہ کیا کرتے ہیں، اے اللہ! ہم مانتے ہیں کہ ہم خطا کار، سیاہ کار اور بدکار ہیں، مگر آپ تو اچھے ہیں مولیٰ! پھر معاف کرنا تو آپ کا نہایت محبوب اور پسندیدہ عمل ہے، جس کی خبر ہمارے آقا ﷺ نے ہمیں دی ہے، شب قدر کی دعا میں فرمایا: ''اَللّٰھُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا۔'' (ترمذی، مشکوۃ : ۱۸۲) اے اللہ! یہ حقیقت ہے کہ ہم سے بدتر اور بڑھ کر گنہگار کوئی نہیں، تو آپ سے بہتر اور بڑھ کر معاف کرنے والا بھی کوئی نہیں، مولیٰ! آج اپنی معافی والی پسندیدہ صفت کا مظاہرہ فرما کر دارین میں ہمارے لیے مہربانی ومعافی کا فیصلہ فرما دیجیے۔

اے اللہ! جب بچہ پریشان ہوتا ہے تو روتا ہے اور ماں کی طرف دوڑتا اور متوجہ ہوتا ہے، اسی طرح جب بندہ پریشان ہوتا ہے تو وہ بھی روتا ہے اور آپ کی طرف دوڑتا اور متوجہ ہوتا ہے، اور یہی تو آپ کی چاہت اور آپ کا فرمان ہے کہ ﴿ فَفِرُّوْا إِلَى اللّٰهِ ﴾ (الطور : ۵۰) میرے بندو! کہاں مارے مارے پھرتے ہو؟ تمہارا میرے علاوہ بھی کوئی ہے؟ آ جاؤ! مجھے منا لو، میری طرف سب سے ہٹ کٹ کر متوجہ ہو جاؤ، تم میری طرف چل کر آؤ گے تو میری رحمت دوڑ کر تمہاری طرف متوجہ ہوگی، تم میری طرف ایک بالشت بڑھو گے تو میری رحمت تمہاری طرف ایک ہاتھ متوجہ ہوگی، تو مولیٰ! آج ہم آ گئے ہیں، سب سے ہٹ کٹ کر اور سب ہی سے مایوس ہو کر آپ کو بڑی اُمید سے منانے آئے ہیں، مولیٰ! جگہ جگہ ہم یہی کہتے ہیں کہ ''سب کو منانا مشکل ہے، رب کو منانا آسان ہے۔'' اے اللہ! آج تو بس مان ہی جائیے! ہمیں، ہمارے والدین، اہل وعیال، اعزہ واقرباء اور محسنین ومرحومین کو ہمیشہ کے لیے معاف فرما کر اپنا بنا لیجیے، اپنے دین کے کاموں میں لگا دیجیے، نفس وشیطان کے شر سے بچا لیجیے، اے اللہ! ہمیں ایمانِ کامل، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ اور علومِ نافعہ عطا فرما کر اخلاقِ محمدی کا نمونہ بنا دیجیے، ہماری زندگیوں کو اور بندگیوں کو قبول فرما کر تقوی اور اپنی رضا سے

مزین فرما دیجیے، ہمارے گھروں کو نبی ﷺ کی سنتوں کا گلشن بنا دیجیے، مولیٰ! ہدایت عطا کرنے کے بعد ضلالت و بدعت سے بچا لیجیے، قبولیت عطا کرنے کے بعد مردودیت و محرومیت سے بچا لیجیے، اپنا قربِ خاص عطا کرنے کے بعد دوری سے بچا لیجیے، عزت عطا کرنے کے بعد ذلت سے بچا لیجیے، علم عطا کرنے کے بعد جہل سے بچا لیجیے، عافیت عطا کرنے کے بعد امراض ومشقت اور مصیبت سے بچا لیجیے، فراوانی اور کشادگی عطا کرنے کے بعد تنگی وتنگ دستی سے بچا لیجیے، اپنی رحمت وعنایت کا سہارا عطا فرما کر کبھی ہمیں بے سہارا اور بے آسرا مت چھوڑیے، یا اللہ! ہماری پیشانیوں کو غیر کے سامنے جھکانے اور ہاتھوں کو غیر کے سامنے پھیلانے سے بچائیے۔

مولیٰ! آپ کی شان ہے: ﴿ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ﴾ (يسين : ۸۲) آپ جو چاہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے، آپ ﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ ﴾ (البروج : ۱۶) ہیں، اے اللہ! آپ ہمیں بھی چاہ لیجیے، ہمیں اپنا لیجیے، قبولیت عطا فرما دیجیے، اپنا پسندیدہ بندہ بنا دیجیے، ہمیں ایسا بنا دیجیے کہ ہم آپ کو پسند آ جائیں، اور مرنے کے بعد جب پیارے نبی ﷺ سے ملاقات ہو تو وہ ہمیں دیکھ کر خوش ہو جائیں اور خوش ہو کر اپنے دست مبارک سے ہمیں جامِ کوثر پلائیں، مولیٰ! دنیا یہی سمجھتی ہے کہ ہم اللہ والے ہیں، ہم آپ کے مقرب اور محبوب بندے ہیں، حالانکہ حق یہ ہے کہ ''من آنم کہ من دانم'' اس کے باوجود مولیٰ! آج تو آپ بھی فرما دیجیے کہ ''ہاں، تم میرے ہو''، اللہ! پلیز (Please!) ایک مرتبہ فرما دیجیے کہ ''ہاں، ہاں، تم میرے ہی ہو''، میرے ہی نام لیوا ہو، میرے ہی نام پر مارے اور ستائے جاتے ہو، جاؤ! تمہارا میرا نام لینا قبول اور تمہارا ہر عمل منظور ہے، مولیٰ! اگر آپ نے ہمیں قبول اور منظور فرما لیا تو ہمارا تو کام بن جائے گا، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے آقا بھی خوش ہو جائیں گے، اور اگر آپ نے رَد کر دیا تو ہمارا بیڑا غرق ہو جائے گا، یا اللہ! آپ کے بندے تو ہمارے علاوہ بھی بے شمار ہیں، لیکن ہمارا تو آپ کے علاوہ کوئی رب، کوئی سہارا اور آسرا نہیں ہے، مولیٰ ہم کہاں جائیں؟

إِلٰهِیُ عَبُدُكَ الُعَاصِیُ أَتَاكَ   مُقِرًّا بِالذُّنُوبِ وَ قَدُ دَعَاكَ
وَ إِنُ تَغُفِرُ فَأَنُتَ أَهُلٌ لِذَاكَ   وَ إِنُ تَطُرُدُ فَمَنُ يَرُحَمُ سِوَاكَ

مولیٰ! آپ کو آپ کی صفت رحمانیت ورحیمیت کا واسطہ، ہمیں اپنی رحمت وعنایت سے نواز کر عافیت کے ساتھ ہماری، ہمارے اہل وعیال اور قیامت تک کی نسلوں کی کفالت کا بہتر سے بہترین انتظام فرما دیجیے، ربِ کریم! جس طرح آپ نے ہمارے آقا ﷺ کو امام الانبیاء بنا کر نبوّت کا دروازہ تو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا؛ لیکن ولایت کا دروازہ تو کھول رکھا ہے نا، اس لیے آپ ہمیں بھی امام الاولیاء بنا دیجیے، ربِ کریم! آپ نے جس طرح جد الانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد وازواج کو ان کا معاون بنایا، آپ ہماری اولاد وازواج اور بھائی بہنوں کو بھی ہمارا معاون بنا دیجیے، ربِ کریم! ہمیں، ہمارے اہل وعیال، آل واولاد اور قیامت تک کی نسلوں کو وطن میں برکت والی روزی عزت کے ساتھ عطا فرما کر دنیا وآخرت کی صلاح وفلاح نصیب فرما دیجیے، اے اللہ! آپ نے پیارے نبی ﷺ سے فرمایا: ﴿وَ لَلۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لَّكَ مِنَ الۡاُولٰى﴾ (الضحیٰ: ۴) ”یقیناً آنے والے حالات تمہارے لیے پہلے حالات سے بہتر ہیں۔“ اے اللہ! اس آیت کی برکت اور نبی پاک ﷺ کے وسیلے سے ہماری بھی دنیا وآخرت سنوار دیجیے، اور زندگی کے آخری حصے کو زندگی کا بہترین حصہ بنا دیجیے، ہماری جوانی کو بچپن سے بہتر بنا دیجیے، بڑھاپے کو جوانی سے بہتر بنا دیجیے اور موت کو زندگی سے بہتر بنا دیجیے، ہماری قبر کو موت سے بہتر بنا دیجیے، ہمارے حشر کو قبر سے بہتر بنا دیجیے، پھر عافیت اور بغیر حساب کے جنت میں داخل فرما دیجیے، اے اللہ! ہماری جوانی کو نورانی اور بڑھاپے کو بابرکت بنا دیجیے، عمر رذیل، مہلک امراض اور معذور بن جانے سے بچا لیجیے، ہماری بیویوں کو بیوہ نہ بنائیے، ہماری آل واولاد کو یتیم، ہمارے والدین کو بے سہارا اور بے آسرا نہ بنائیے، اپنی رضا والی زندگی اور رضا والی موت نصیب فرما دیجیے، یا اللہ! ساری دنیا کے مظلوموں، بیواؤں، یتیموں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کا غیبی انتظام فرما دیجیے۔

یا اللہ! آپ کے وہ مخصوص بندے جن کے متعلق آپ نے فرمایا: ﴿إِنَّ عِبَادِیُ لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ﴾ (الحجر: ۴۲) ”جو میرے بندے ہیں، شیطان! تیرا ان پر کوئی داؤ نہیں چلے گا۔“ یا اللہ! ہمیں اپنے کرم سے ان بندوں میں شامل فرما دیجیے، نفس وشیطان اور ظالمین وفاسقین کو ہم پر مسلط ہونے سے ہمیں بچا لیجیے، گناہوں اور تہمت کے موقعوں سے بچا لیجیے، اپنی ناراضگی کی طرف بڑھتے قدموں کو عافیت کے ساتھ روک دیجیے، اے اللہ! گناہ کی ذلت سے محفوظ فرمائیے، طاعت کی عزت نصیب فرمائیے، ہماری ساری دلی جائز مرادیں پوری فرما دیجیے، ہمیں، ہماری اولاد اور قیامت تک کی نسلوں کو، ہمارے رفقاء اور مخلص شاگردوں کو سارے عالم میں اپنی رضا کے ساتھ دین کی خدمت کے لیے قبول فرما لیجیے، استغنا کے ساتھ دین کا کام کرنے کی توفیق عطا فرمائیے، پھر ہمارے اوقات، اسباب اور اموال میں برکت عطا فرمائیے، کام کو قبول فرما کر اپنے قرب کا ذریعہ بنا دیجیے، وقت کے ساتھ جو ضروریات ہوں سب اپنے غیبی خزانوں سے پوری فرما دیجیے، ہمیں ہر جگہ، ہر وقت اپنے کرم سے مخلص رفقاء اور معاونین نصیب فرما دیجیے، یا اللہ! موت کو ہماری زندگی کی سب سے بڑی خوشی، عید اور اپنی رضا ودید کا ذریعہ بنا دیجیے، اپنی رحمت کے فرشتوں کے ذریعہ ہمیں موت کے وقت یہ بشارت عطا فرما دیجیے کہ ﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ۝ ارۡجِعِىۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً ۝ فَادۡخُلِىۡ فِىۡ عِبٰدِىۡ ۝ وَادۡخُلِىۡ جَنَّتِىۡ ۝﴾ (الفجر: ۲۷ تا ۳۰) ”اے اطمینان پانے والے نفس! تو مجھ سے خوش اور میں تجھ سے خوش ہوں، تو میرے کامل بندوں میں شامل ہو جا، اور میری جنت میں داخل ہو جا“ اے اللہ! اس سے پہلے کہ لوگ مرنے کے بعد ہمیں غسل دیں ہمیں غسل توبہ کی توفیق عطا فرما دیجیے، اس سے پہلے کہ موت کے بعد لوگ ہمیں کفن پہنائیں، ہمیں ایمان وتقویٰ کا لباس پہنا دیجیے، اس سے پہلے کہ لوگ موت کے بعد نمازِ جنازہ پڑھ کر ہمیں مٹی کے سپرد کریں ہمیں خود کو ﴿وَ اُفَوِّضُ اَمۡرِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ (المؤمن: ۴۴) کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے آپ کے سپرد ہونے کی توفیق عطا فرما دیجیے، اس سے پہلے کہ قیامت میں ہمیں آپ کے دربار میں لایا جائے آج اپنے اختیار

سے آپ کی طرف متوجہ ہونے اور آپ کو منا لینے کی توفیق عطا فرمائیے۔

پیارے یوسف علیہ السلام نے دعا کی تھی: ﴿تَوَفَّنِیۡ مُسۡلِمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ۝﴾ (یوسف:۱۰۱) یا اللہ! ہمیں بھی اسلام پر وفات اور صالحین کے ساتھ الحاق نصیب فرما دیجیے۔ مولیٰ! بڑی تمنا ہے کہ ہم اس چہرے کو دیکھیں جسے آپ نے ﴿وَ الضُّحٰی ۝﴾ (الضحیٰ:۱) فرمایا، ان زلفوں کو دیکھیں جنہیں آپ نے ﴿وَ الَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۝﴾ (الضحیٰ:۲) فرمایا، لیکن اے اللہ! ہم دنیا میں ایسے وقت آئے کہ آپ کے محبوب ﷺ کا دیدار نہ کر سکے، اس لیے اے اللہ! قیامت کے دِن آپ اپنا اور اپنے محبوب ﷺ کا دیدار نصیب فرما دیجیے، اے اللہ! آپ کے محبوب ﷺ کا شہر مدینہ اور پیارا روضہ دِکھا دیجیے، اور ﴿وَ امۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۝﴾ (یٰسٓ:۵۹) کا اعلان ہو تو ہمیں مجرمین کے بجائے مؤمنین و مخلصین میں داخل فرما دیجیے۔ اے اللہ! ہمیں قیامت کے دِن اپنے عرش کے زیرِ سایہ جگہ عطا فرما کر اپنا اور اپنے محبوب ﷺ کا قرب عطا فرمائیے، مولیٰ! ہمارا دامن تو بالکل خالی ہے، ہمیں اپنے کسی عمل پر بھروسہ نہیں، ہماری نجات تو آپ کی رحمت اور نبی ﷺ کی شفاعت سے ہو سکتی ہے، اپنی رحمت اور نبی ﷺ کی شفاعت کی برکت سے ہماری مغفرت فرما دیجیے، مولیٰ! قیامت کے دِن کی رُسوائی سے محفوظ فرمائیے، اپنی نظرِ رحمت وعنایت کا حقدار بنا دیجیے، یا اللہ! آپ کا فرمان ہے: ﴿فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ﴾ (آل عمران:۱۸۵) ''جو بندہ قیامت کے دِن دوزخ کی آگ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا گیا وہ تو کامیاب ہے۔'' لیکن ربِ کریم! ہماری بڑی کامیابی آپ کی نظرِ رحمت کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے اے اللہ! آپ کو آپ کے کرم اور آپ کے نبی ﷺ کی قربانیوں کا واسطہ! ہمیں قیامت کے دن اپنی نظرِ رحمت سے محروم مت فرمائیے۔

یا اللہ!

تیری کی ایک نگاہ کی بات ہے میری زندگی کا سوال ہے

ربِ کریم! ہم مانتے ہیں کہ آپ کی نظرِ رحمت کے حقدار تو حضراتِ انبیاء و مرسلین علیہم السلام، صدیقین و صالحین ہیں، لیکن اے اللہ! آپ کا یہ بھی تو فرمان ہے کہ ﴿اَللّٰهُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ (الشوریٰ:۱۳) ''اللہ جس کو چاہتا ہے چن کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔'' اے اللہ! جیسے آپ نے سیدنا فاروقِ اعظمؓ، طفیل بن عمرو دوسیؓ، ابوسفیانؓ، بشر حافیؒ، جنید بغدادیؒ اور فضیل بن عیاضؒ جیسوں پر نظرِ رحمت ڈال کر اُنہیں چن لیا، اپنی طرف کھینچ لیا، اپنا بنا لیا، اپنے دین کا کام لے لیا، ربِ کریم! آپ کی اُسی شانِ قدرت کا واسطہ، آپ ہمیں، ہمارے والدین، بھائی بہن (حافظ سعید، مفتی سالم، محسنہ اور ان سب کے) اہل وعیال، اَعِزّہ واقرباء، محسنین، معاونین اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو بھی چن لیجیے، اپنا بنا لیجیے، اور ہمارے مردوں اور عورتوں میں ﴿اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَ الۡمُسۡلِمٰتِ﴾ (اسلام اور اسلامی احکام پر عمل کرنے والے مرد وزن) ﴿وَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ﴾ (ایمانی عقائد کے مطابق زندگی گزارنے والے مرد وزن) ﴿وَ الۡقٰنِتِیۡنَ وَ الۡقٰنِتٰتِ﴾ (اطاعت گزار اور تابع دار مرد و زن) ﴿وَ الصّٰدِقِیۡنَ وَ الصّٰدِقٰتِ﴾ (قلب اور قول و عمل کی سچائی والے مرد وزن) ﴿وَ الصّٰبِرِیۡنَ وَ الصّٰبِرٰتِ﴾ (صبر کرنے والے مرد وزن) ﴿وَ الۡخٰشِعِیۡنَ وَ الۡخٰشِعٰتِ﴾ (عاجزی کرنے والے مرد وزن) ﴿وَ الۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَ الۡمُتَصَدِّقٰتِ﴾ (صدقات وخیرات کرنے والے مرد وزن) ﴿وَ الصَّآئِمِیۡنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ﴾ (روزوں کی پابندی کرنے والے مرد وزن) ﴿وَ الۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَهُمۡ وَ الۡحٰفِظٰتِ﴾ (اپنی عزت و عفت کی حفاظت کرنے والے مرد وزن) ﴿وَ الذّٰکِرِیۡنَ اللّٰهَ کَثِیۡرًا وَّ الذّٰکِرٰتِ﴾ (قلباً، قولاً و عملاً ہر حال میں تیرا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد وزن) (الأحزاب:۳۵) میں شامل فرما کر دارین میں صلاح و فلاح اور اجرِ عظیم کا حقدار بنا دیجیے۔ اے اللہ! ہمیں، ہمارے والدین، اہل وعیال اور نسلوں کو سچا خادمِ قرآن اور وارثِ قرآن بنا کر ''سابق بالخیرات'' میں داخل فرما دیجیے۔

ربِ کعبہ! آپ کے کتنے چیدہ، برگزیدہ اور خوش نصیب بندے اور بندیاں ہیں جو

اپنی دولت کے بجائے قسمت سے حج وعمرہ کی سعادت سے بہرہ ور ہیں، کعبہ کا دیدار اور طواف کررہے ہیں، حجر اسود کا استلام اور بوسہ لے رہے ہیں، مقامِ ابراہیم کے قریب نماز ادا کررہے ہیں، زم زم پی رہے ہیں، صفا ومروہ کی سعی کررہے ہیں، منیٰ میں خیمہ زن ہوکر آپ کی یاد میں اور وعظ ونصیحت ودعوت وتبلیغ میں مشغول ہیں، عرفات میں آپ سے مناجات اور دعا کررہے ہیں، مزدلفہ میں شب باشی کرتے ہوئے ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا﴾ (السجدة: ۱۶) کا منظر پیش کررہے ہیں، پھر جمرات کی رمی، قربانی، حلق وقصر، طوافِ زیارت وطوافِ وداع کی سعادت حاصل کرکے دربارِ رسالت اور ریاض الجنۃ میں حاضری کا شرف پارہے ہیں، ربِ کریم! ہمیں بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ یہ مواقع زندگی میں بار بار نصیب فرما کر اسے اپنی رضا وخوشنودی کا ذریعہ بنادیجیے۔

اے اللہ! آپ کا ارشاد ہے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرة:۲۵۷) ''اللہ ایمان والوں کا ولی اور دوست ہے، جو انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آتا ہے۔'' اے اللہ! ہم ایمان لائے آپ پر، آپ کے احکام پر، "رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ ﷺ نَبِيًّا." (مشکوٰة/ باب ما يقول عند الصباح والمساء) اے اللہ! ہم آپ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں، اے اللہ! ہمیں اپنے کرم سے ایمانِ کامل عطا فرما کر اپنی دوستی کا حقدار بنالیجیے اور اسی پر جینے اور مرنے کی توفیق عطا فرمادیجیے، اے اللہ! ہمیں ﴿إِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الأنعام:۱۶۲) کا مصداق بنادیجیے، ہمارا جینا، مرنا اور ہر عمل آپ کی رضا کے مطابق بنادیجیے۔

اے اللہ! آپ سے بہتر کوئی معین ومددگار نہیں، ﴿نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ (الحج:۷۸) آپ ہمارے والی، رکھوالے اور دوست بن جائیے، پھر آپ ہی ہمارے کفیل، معین ومددگار بن جائیے، یا معین! آپ کی مدد اور نصرت کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں، ﴿إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ (آل عمران:۱۶۰) مولیٰ! آپ ہمیں اپنی نصرت ومدد

والے اعمال کی توفیق عطا فرما کر اپنی نصرت ومدد کا حقدار بنادیجیے، ہمیں اپنی نصرت ومدد سے محروم نہ فرمائیے۔ ربِ کریم! آپ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے یہ دعا مانگی تھی: ﴿وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ﴾ ''ان کو پھلوں کا رزق عطا فرما۔'' ﴿لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝﴾ (إبراهيم:۳۷) ''تاکہ وہ آپ کے شکر گزار بنیں۔'' ہم بھی ان کے اتباع میں اپنی اولاد اور قیامت تک کی نسلوں کے لیے دارین کی نعمتوں اور کامیابیوں کا سوال کرتے ہیں، یا اللہ! ہمیں اپنے بچوں (بیٹی طیبہ، بیٹا محمد خلیق اور محمد خلیل) سے بڑی محبت ہے، لیکن بلا شبہ آپ کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بھی کہیں زیادہ محبت ہے، ہم اپنے بچوں کے لیے یہی چاہتے ہیں کہ انہیں دارین کی سعادتیں نصیب ہوں، یا ودود! ہم آپ ہی کے بندے ہیں، آپ کو اس محبت کا واسطہ جو آپ کو اپنے بندوں سے ہے، ہمارے لیے بھی دارین کی سعادتیں مقدر فرمائیے۔

اے اللہ! آپ کی ایک صفت ﴿السَّلَامُ﴾ (الحشر:۲۳) بھی ہے، علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں اس کی تفسیر اس طرح بیان فرمائی: "اَلَّذِيْ يُسَلِّمُ عَلٰى أَوْلِيَائِهٖ." (روح المعاني:۶۳/ الجزء:۲۸) (یعنی "السَّلَامُ" وہ ہے جو اپنے ولیوں اور دوستوں کو ہر ڈرانے والے سے سلامت رکھتا ہے)۔ اے اللہ! آج ہمیں ہر کوئی ڈرا دھمکا رہا ہے، آپ ہمیں، ہماری مساجد، مجالس، مدارس، خانقاہیں اور دینی مراکز کو ہر ظالم کے ظلم سے، ہر شریر کی شرارت سے، ہر فتین کے فتنوں سے اور خوف وشرور سے سلامتی عطا فرمائیے۔

مولیٰ! ہم کمزور ہیں، آپ قوی ہیں۔ ﴿وَ خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝﴾ (النساء:۲۸) ہم سے زیادہ کمزور کوئی نہیں اور آپ سے زیادہ قوی کوئی نہیں، آپ کا حکم ہے کہ ہر طاقت ور اپنے کمزوروں کی مدد کرے، تو اے اللہ! آپ بھی نفس وشیطان اور ظالمین کے مقابلے میں ہماری اور دنیا بھر کے تمام مظلوموں کی مدد ونصرت فرمائیے۔

ربِ کریم!

حق پرستوں کی اگر تو نے دل جوئی نہ کی   طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

رب کریم!

خوار ہیں، بدکار ہیں، ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
جو بھی ہیں مولیٰ! تیرے محبوب کی امت میں ہیں

رب کریم!

رحم کر! اپنے آئین کرم کو نہ بھول جا   ہم تجھے بھولے ہیں؛لیکن تو ہمیں نہ بھول جا

کریم کا قانون اور کریموں کا شیوہ یہی ہے کہ جب مجرم اپنے جرائم کا اقرار کرتے ہوئے معافی کا طلب گار ہوتا ہے تو اسے معاف کر دیا جاتا ہے، رب کریم! آپ نے قرآنِ کریم میں نبی کریم ﷺ سے فرمایا: ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ أَنِّيْٓ أَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ○﴾ (الحجر:۴۹) ''میرے بندوں کو بتا دو کہ میں بڑا غفور ورحیم ہوں''۔ ہمارے نبی ﷺ نے بھی ہمیں یہی بتایا ہے کہ جب گنہگار معافی کے طلب گار ہوتے ہیں تو آپ انہیں طعنہ بھی نہیں دیتے اور معاف کر دیتے ہیں، اے اللہ! ہم معافی کے طلب گار ہیں، ہمیں معاف کر دیجیے، اپنی صفت مغفرت وصفت رحمت کا مظاہرہ فرما کر ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو معافی عطا فرمائیے۔ اے اللہ! ہمیں اور ہماری بیویوں کو ایمانی صفات سے متصف فرما کر اپنی اس بشارت کا مصداق وحقدار بنائیے جس میں فرمایا: ﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَ أَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ﴾ (الزخرف:۷۰) ''تم اور تمہاری بیویاں خوشی سے مہکتے چہروں کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ'' پھر اے اللہ! ہمیں، ہمارے آباو اجداد، والدین اور ہماری اولاد کو بلکہ قیامت تک کی نسلوں کو بھی ایمانی صفات سے متصف فرما کر جنت میں ہمیشہ کے لیے ہم سے ملا کر ﴿أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ (الطور:۲۱) کا مصداق اور حقدار بنائیے۔

اے اللہ! ہم سوالی ہیں، آپ سخی ہیں، دنیا کا ہر سخی اپنے در کے سوالی کو کچھ نہ کچھ تو دے ہی دیتا ہے، پھر آپ کا حکم بھی ہے: ﴿وَ أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ○﴾ (الضحیٰ:۱۰) اے کریم آقا! آپ بھی ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹائیے، مولیٰ! ہم سوالیوں کی جھولیوں کو اپنی رحمت، مغفرت اور لطف وکرم سے بھر دیجیے۔ کہتے ہیں کہ حاتم طائی سخی سے کسی نے پانچ دینار

طلب کیے تو اس نے سائل کو پانچ سو دینار عطا کر دیے، پوچھنے پر بتایا کہ سائل نے اپنی حیثیت اور اَوقات کے مطابق مانگا اور میں نے اپنی شان کے مطابق اسے دیا۔ اے آسمان و زمین کے خزانوں کے مالک! اے کریموں کے کریم اور سخیوں کے سخی! اگر دنیا کے سخی یہ کر سکتے ہیں تو آپ تو ان سب کے بھی رب ہیں، ہم نے آج تک جو کچھ مانگا، جہاں مانگا، بہر حال اپنی حیثیت اور اَوقات کے مطابق مانگا، آپ ہمیں وہ سب کچھ جو دارین میں ہمارے لیے بہتر ہو اپنی شایانِ شان عطا فرمائیے۔

اے اللہ! ہم تو اس لیے بھی دعا مانگتے ہیں کہ آپ کا حکم ہے: ﴿اُدْعُوْنِيْ﴾ مجھ سے مانگو! میرے غیر سے نہ مانگو، آپ سے مانگنا آپ کا حکم اور چاہت ہے، تو ہماری ضرورت ہے، ہم مانگتے ہوئے اچھے لگتے ہیں، آپ دیتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔

أَدْعُوْكَ رَبِّيْ ! كَمَا أَمَرْتَ تَضَرُّعًا   فَإِذَا رَدَدْتَ يَدَيَّ فَمَنْ ذَا يَرْحَمُ؟

''میں آپ سے اس طرح گڑگڑا کر مانگتا ہوں جیسا کہ آپ نے حکم دیا ہے، اگر آپ ہی میرے دست سوال کو رد کر دیں تو کون مجھ پر رحم کرے گا؟''

یا اللہ! اپنے وعدے ﴿أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (الغافر:۶۰) کے مطابق ہماری مانگی ہوئی مرادیں پوری فرما دیجیے اور محض اپنے فضل وکرم اور نبی اکرم ﷺ کے طفیل ہماری دعاؤں، حج بیت اللہ، حرمین شریفین کی حاضری اور دیگر تمام اعمال کو قبول فرما لیجیے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَ تُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.

الخادم النادم والراقم الاثم

أبو خليق محمد شفيق البرودوی، غفر له الهادی

نزيل عرفات، المربع: ٢٤، الموقع: شارع (٤١٠)

طريق عرفات الدائرى، أمام مستشفىٰ عرفات الدائرى الشرقى

تم الجزء الخامس من دروس الحديث الشريف، وذالك قبل الظهر

/يوم الخميس/يوم عرفة/ ١٤٣٨ھ الموافق: ٣١/أغسطس/٢٠١٧ء